ذکر و فکر
علامہ جوادی
تنظیم المکاتب لکھنؤ

باسمہ سبحانہ

ذکر و فکر

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

ناشر:

تنظیم المکاتب

گولہ گنج۔ لکھنؤ ۱۸، یوپی (انڈیا)

فون : 91-522-215115
فیکس : 91-522-228923

※ نام کتاب : ـــــــــ ذکر و فکر

※ مصنّف : ـــــــــ علّامہ السیّد ذیشان حیدر جوادی اعلیٰ اللہ مقامہ

※ کتابت : ـــــــــ جے۔ احمد

※ پہلا ایڈیشن : ـــــــــ اپریل ۱۹۹۶ء

※ دوسرا ایڈیشن : ـــــــــ مارچ ۲۰۰۱ء

※ تعداد : ـــــــــ دو ہزار

※ ناشر : ـــــــــ تنظیم المکاتب۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ ۱۸ (انڈیا)

※ قیمت : Rs 135 P 0

بسمہ سبحانہ

"اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ
اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُوْلِی الْاَلْبَابِ ۝ اَلَّذِیْنَ
یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ
وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا
مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ
النَّارِ"۔

(آل عمران۔۱۹۱)

بسمہٖ سبحانہٗ

"بے شک زمین و آسمان کی خلقت، لیل و نہار کی آمد و رفت میں صاحبان عقل کے لئے قدرتِ خدا کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں کہ خدایا! تو نے یہ سب بیکار نہیں پیدا کیا ہے۔ تو پاک اور بے نیاز ہے ہمیں عذابِ جہنّم سے محفوظ فرما۔

(آل عمران ۔ ۱۹۱)

فہرست

حصہ دوم ۔ اخلاق ۱۳۱ تا ۲۳۲

حصہ سوم ۔ اعمال و احکام ۲۳۳ تا ۳۷۳

حصہ چہارم ۔ تاریخ و سیرت ۳۷۵ تا ۶۵۵

باسمہٖ سبحانہٗ

عرضِ تنظیم

قارئین کرام! "ذکر و فکر" کا دوسرا ایڈیشن آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

ہمارے نشریاتی خدمات قوم کے سامنے ہیں۔ اس شعبہ کی روح رواں سرکار علاّمہ جوادی طاب ثراہ کی ذات تھی، ہمارے اشاعتی پروگرام کا بڑا حصہ انھیں کے قلم کار ہینِ منّت تھا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر ان کی تحریریں موجود ہیں۔ ان کے قلمی خدمات کا سلسلہ کافی پھیلا ہوا ہے۔ تصانیف بھی ہیں، ترجمے بھی ہیں، تالیفات بھی ہیں، طویل مقالے بھی ہیں اور مختصر مضامین بھی ہیں۔ ان کی موضوعاتی تقریریں بھی اپنی افادیت اور اپنے علمی اور محققانہ معیار کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ انھیں کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ بہت کچھ چھپ چکا ہے اور بہت کچھ چھپنا باقی ہے۔ متعدد کتابیں جو ۳۰۔۴۰ سال پہلے پاکستان یا ہندوستان میں شائع ہوئی تھیں کمیاب یا نایاب ہو چکی ہیں ان کی دوبارہ اشاعت کی بھی ضرورت ہے۔ عصری تقاضوں کے پیش نظر اور ساری دنیا میں آباد شیعوں کے مطالعہ کے لئے ان کتابوں کا دوسری زبانوں میں منتقل کرنا بھی علمی فریضہ اور قومی ذمّہ داری ہے۔ ہم یہ خدمات ادا کرتے رہے ہیں اور ادا کرتے رہیں گے۔ اور جو سلسلہ علاّمہؒ قائم کر گئے ہیں اسے دینی فریضہ کے ساتھ ان کی یادگار کے طور پر باقی رکھیں گے۔

سرکار علامہ جوادی طاب ثراہ نے یہ اصول قائم کر دیا تھا کہ مومنین کے تعاون کے ذریعہ شائع ہونے والی کتابوں کا ساٹھ فیصد تنظیم المکاتب کے لئے اور چالیس

فیصد انوار العلوم الٰہ آباد کے لئے مخصوص تھا۔

ہم نے اور فرزندانِ علّامہ جوادی طاب ثراہ نے متفقہ طور پر ان کے قلمی خدمات کی اشاعت کو ان کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب تنظیم المکاتب اور ادارہ نشر افکار علامہ جوادیؒ ان اشاعتوں کا ذمّہ دار ہے۔

اربابِ خیر سے گذارش ہے کہ جس طرح علّامہ طاب ثراہ کی زندگی میں تعاون فرماتے تھے ان کے بعد بھی اس سلسلہ کو منقطع نہ ہونے دیں گے۔

زیر نظر کتاب کا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے اور قوم کی ضرورت باقی ہے۔ اسلئے دوبارہ شائع کی جا رہی ہے، کیونکہ اس کی مقبولیت اس کی افادیت کی دلیل ہے۔

صفی حیدر
سکریٹری تنظیم المکاتب
۱۵ر فروری سنہ ۲۰۰۱ء

بسمہ سبحانہ

چند اپنی باتیں

انسانی زندگی میں یقیناً چند ایسے مواقع آتے ہیں جو اس کی زندگی کے لئے تاریخ ساز یا کم از کم کردار ساز ضرور بن جاتے ہیں۔ یہی وہ احسانات ہوتے ہیں جن کا شکریہ ادا کرنا ناممکن ہوتا ہے اور جن کا احساس ہر وقت انسان کو سربسجود رہنے پر آمادہ کرتا ہے۔

مالک کائنات نے مجھے جن مخصوص احسانات اور انعامات سے نوازا ہے۔ ان میں والدین گرامی۔ خال محترم۔ برادر علام مولانا السید علی عابد الرضوی دام مجدہ کی تربیت آیۃ اللہ مدنی طاب ثراہ، شہید خامس آیۃ اللہ الصدر طاب ثراہ کی شاگردی کے علاوہ خطیب اعظم مولانا السید غلام عسکری مرحوم کی رفاقت بھی شامل ہے۔

میرے اور مرحوم کے درمیان عمر کا ایک طویل فاصلہ تھا۔ وہ جامعہ ناظمیہ لکھنؤ سے میرے آغاز تعلیم سے پہلے فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ میں نے پہلے پہل انھیں اپنے وطن کراری، الہ آباد کے عشرہ محرم میں مجالس عزا سے خطاب کرتے دیکھا تھا اور ان سے بیحد متاثر ہوا تھا۔ اس کے بعد جب عراق سے تقریباً ۶ سال کے بعد عارضی طور پر واپس آیا اور مظفر پور بہار میں تھوڑے عرصہ کے لئے امامت جماعت کے کام پر ظفر الملۃ مولانا السیّد ظفر الحسن طاب ثراہ کی طرف سے منصوب کر دیا گیا تو وہاں کی سالانہ مجالس میں کافی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

خطیب اعظم نے اسی زمانہ میں سرکار آیۃ اللہ الحکیم طاب ثراہ کے رسالہ منہاج الصالحین کا ترجمہ شائع کیا تھا اور اس میں بعض مقامات پر غلطیاں رہ گئی تھیں میں نے نجف اشرف کے ماحول کی عادت اور ہندوستانی تہذیب سے بے خبری کی بنیاد پر نہایت درجہ بیباکی سے اپنے اعتراضات کا ذکر کر دیا۔ خیال یہی تھا کہ اس پر ایک شدید ردعمل ہوگا اور بہت ممکن

ہے کہ مجلس میں بھی حقیر کا ذکر خیر ہو جائے یا شائد کوئی عشرہ میری ہی نذر ہو جائے ۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مرحوم نے نہایت درجہ خندہ پیشانی سے اعتراضات کا استقبال کیا بلکہ غلطیوں کا بلا توجیہ و تاویل اعتراف کر کے حقیر کو نظر ثانی کا حکم دے دیا تا کہ اگر کوئی دوسری غلطی بھی رہ گئی ہے تو اس کی بھی اصلاح کر دی جائے ۔

اس واقعہ نے حقیر کو اس قدر متاثر کیا کہ میں لاشعوری طور پر مرحوم سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ پھر ان کے ساتھ ایک باغ و بہار جماعت نے اور دلچسپی کا سامان فراہم کر دیا اور صورت حال ایسی ہو گئی کہ انھیں میرے بغیر اپنا وجود نامکمل دکھائی دیتا تھا اور مجھے اپنی زندگی عملی میدان میں بے سہارا نظر آتی تھی ۔

مرحوم کو اصلاح قوم کا جذبہ ان کی فطرت کی رفتار یا ان کے والدین مرحومین اور ان کے شفیق استاد علامہ عدیل اختر مرحوم کی شاگردی سے ملا تھا لہٰذا ہر وقت ایک نہ ایک منصوبہ تیار کیا کرتے تھے اور ہر عمل خیر میں مجھے شریک رکھنا اپنا فرض منصبی تصور کرتے تھے ۔ میں انکے سامنے بہر حال ایک بچہ نہ سہی تو ناتجربہ کار ضرور تھا لہٰذا ہر منصوبہ سے فرار کو اپنا حق فطری تصور کرتا تھا لیکن آخر ان کے اخلاص عمل کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا پڑتا تھا ۔

اسی زمانہ میں تنظیم المکاتب کا وجود عمل میں آیا جو بحمد اللہ ان کے اخلاص نیت کی بنا پر آجتک سرگرم عمل ہے بلکہ ان کے رفقاء کار کی زحمتوں کے زیر اثر مسلسل ترقی کی راہوں پر گامزن ہے اور انشاء اللہ جدید عمارت کی خریداری کے بعد مزید ترقی کرے گا ۔

تنظیم المکاتب کے بعد تنظیم المدارس کا خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان کے تمام دینی مدارس میں ایک نصاب تعلیم ۔ ایک طریقۂ کار اور ایک امتحان رائج ہو جائے اور اس کا کام کافی حد تک آگے بڑھ چکا تھا لیکن خدا بُرا کرے ابلیس لعین کا کہ وہ اولاد آدمؑ کے کسی کام کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا اور اسی بنیاد پر اس پرانے قدیم ترین حربہ کو استعمال کر کے پہلے ہی جلسہ میں اس کا خاتمہ کرا دیا اور گویا یہ بچہ گہوارہ ہی سے لحد کی طرف منتقل ہو گیا ۔

اسی دور میں جب ہندوستان کے مشہور و معروف خطیب مولانا فیاض حسین ولید ہوری کا انتقال ہو گیا اور ان کے کمسن بچے لاوارث نظر آنے لگے تو مرحوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ذاکرین کرام

کی ایک انجمن تیار کی جائے اور اس کی طرف سے ایسے فنڈ کا انتظام کیا جائے جو کسی بھی خطیب کے گھرانے کے بے سہارا افراد کو سہارا دے سکے اور اس طرح "مجلس ذاکرین" کا قیام عمل میں آ گیا۔ مرحوم نے اس ادارہ کی انتظامیہ کا بوجھ بھی میرے ہی سر ڈال دیا اور میں نے اس کا دستور العمل بھی تیار کیا۔ قواعد و ضوابط بھی بنائے اور اس کے بعض جلسے بھی ہوئے ۔

اُدھر آیۃ اللہ الخوئی طاب ثراہ کے نمائندہ خاص حجۃ الاسلام السید محمد الموسوی ہندوستان میں کچھ کام کرنے کی فکر میں تھے اور ناتجربہ کاری کی بنا پر پریشان تھے انھیں بھی تبلیغات ایمانی جیسی تنظیم کی ضرورت تھی ۔ حقیر نے ان سے بھی رابطہ قائم کیا اور اس طرح ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا گیا جس کی اطلاع اس کے تمام ارکان اور ممبران کو بھی نہیں تھی ۔

موصوف محترم کی امداد میرے لئے ایک بڑے سہارے کا کام کر رہی تھی کہ اُس دور میں میرے پاس مالی وسائل کا فقدان تھا۔ چنانچہ میں نے ایک تبلیغی دورہ کا پروگرام مرتب کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ تمام ذاکرین کرام مختلف علاقوں میں بغیر قوم کی دعوت کے تبلیغی دورے کریں اور مخصوص موضوعات کے تحت مجالس سے خطاب فرمائیں جن میں تقلید ۔ حقوق شرعیہ ۔ تعلیم دین کے مسائل سر فہرست تھے ۔ مصارف کا انتظام ادارہ کے ذمہ ہو گا اگر ذاکرین کرام مصارف کا مطالبہ کریں گے ۔

خدا کا شکر ہے کہ پہلے سال یہ تبلیغی ہفتہ بیحد کامیاب ہوا اور جن ذاکرین کرام کے بارے میں تصور بھی نہیں تھا انھوں نے بھی اس پروگرام میں حصہ لیا اور اس کے خاطر خواہ فائدہ کا اقرار کیا ۔

لیکن نہ جانے کس شیطان رجیم نے کس کے کان میں یہ پھونک دیا کہ اگر قوم کا ذوق سماعت تبدیل ہو گیا ۔۔ یا اگر لوگ بلا دعوت مجالس سے فیضیاب ہونے لگے تو ذاکرین کا مستقبل خطرہ میں پڑ سکتا ہے ۔۔ کہ اچانک اختلافات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر دوسرے باقاعدہ دورہ کی نوبت نہ آ سکی ۔ اگرچہ تبلیغات ایمانی کے نام سے یہ سلسلہ تادیر قائم رہا اور کسی نہ کسی شکل میں آجتک قائم ہے ۔ "وللہ الحمد"

مجلس ذاکرین ہی کی ایک نشست کا ذکر ہے جس میں لکھنؤ میں ہونے والے شیعہ

سُنّی فسادات پر بحث ہو رہی تھی اور یہ موضوع زیر بحث تھا کہ مبتدی ذاکرین ناتجربکاری کی بناپر نامناسب ماحول میں ایسے نکات بیان کر دیتے ہیں جو ایک بڑے فساد کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور اس کا مقابلہ ساری قوم کو کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ان ذاکرین پر پابندی لگائی جائے یا انھیں سمجھایا جائے کہ کون سی بات کس مقام پر بیان کی جائے۔

حقیر نے عرض کیا کہ یہ دونوں باتیں ناقابل عمل ہیں۔ نہ ذاکرین پر پابندی لگائی جاسکتی ہے اور نہ انھیں سمجھایا جاسکتا ہے۔

پابندی اس لئے ناممکن ہے کہ وہ کسی اجازہ کے محتاج نہیں ہیں اور نہ کوئی ادارہ ان کے واسطے سارٹیفکٹ صادر کرتا ہے۔ پھر اس پابندی کو نہایت خوبصورتی سے ذکر اہلبیتؑ پر پابندی کا نام دے دیا جائے گا اور مجلس ذاکرین کو منصور و متوکل کا ادارہ قرار دے دیا جائے گا۔

اور سمجھانا اس لئے ناممکن ہے کہ ہر جگہ کے حالات الگ الگ ہوتے ہیں اور کسی شخص کے پاس اتنی فرصت نہیں ہے کہ تمام جگہوں کے حالات کا جائزہ لے کر وہاں جانے والے ذاکرین کے ساتھ بیٹھ کر تبادلہ خیالات کرے اور انھیں آگاہ کرے کہ کہاں کس قسم کے موضوعات پر تقریر کرنا ہے۔

ان تمام باتوں سے بہتر یہ ہے کہ ان مبتدی حضرات کے لئے ایک کتاب ذاکری مرتب کر دی جائے جس میں کم سے کم سو موضوعات پر مجالس لکھی جائیں اور اسے ہر ذاکر کے حوالے کر دیا جائے کہ انھیں موضوعات پر اسی انداز کی ذاکری کرے ورنہ اس کے عمل کی ذمہ داری کسی فرد یا ادارہ پر نہ ہو گی اور اسے مجلس ذاکرین کی طرف سے "ممنوع" قرار دیا جاسکتا ہے۔

ہمارے بچے لکھنؤ کے مخصوص عزاخانوں میں کسی نکتہ پر داد وتحسین کی آوازیں سُنتے ہیں تو انھیں بھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں نکات کو دُہرا کر اپنی مجالس کو کامیاب بنائیں۔ انھیں کیا خبر کہ ان عزاخانوں کا ماحول الگ ہے اور جہاں محرم میں گئے ہیں وہاں کا ماحول الگ ہے لہٰذا پہلی ذمہ داری بڑے ذاکرین کی ہے اور دوسری ذمہ داری مبتدی ذاکرین کی۔

حقیر کی اس تجویز کو اس لئے ناقابل عمل قرار دیدیا گیا کہ زمانہ شوال یا ذی قعدہ کا تھا اور ایام عزا سے قریب تر تھا۔ اس قدر جلدی یہ کام ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا حقیر نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ جملہ ذاکرین کرام کو تین تین چار چار موضوعات دیدئے جائیں اور تین دن کا وقت دے دیا جائے۔ ۱۰۰ مجالس کا مجموعہ ایک ہفتہ کے اندر تیار ہو جائے گا اور ایک ماہ کے اندر کتابت و طباعت کے مراحل بھی طے ہو جائیں گے اور ایک تعمیری کام منظر عام پر آجائے گا۔

اسباب کی وضاحت سے قطع نظر یہ تجویز ایک احمقانہ تجویز قرار پائی اور رائے عامہ سے محروم ہو گئی۔ لیکن حقیر نے اس منصوبہ کو اپنی زندگی کا ایک اہم ترین منصوبہ قرار دے لیا اور مسلسل اسی فکر میں رہا جس کے زیر اثر مجالس کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں اور بحمد اللہ مختلف ممالک میں مقبول بھی ہوئیں اور مبتدی حضرات نے ان سے فائدہ بھی حاصل کیا۔

اب یہ کتاب "ذکر و فکر" اسی سلسلہ کی ایک دوسری کڑی ہے جس میں مجالس کی شکل میں مضامین نہیں ہیں بلکہ مضامین کی شکل میں مجالس ہیں جن کا تعلق بچوں سے نہیں ہے بلکہ نسبتاً اونچی سطح کے افراد سے ہے۔ ان سے عام مومنین کرام بھی استفادہ کر سکتے ہیں اور ذاکرین کرام بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں بشرطیکہ ذکر کو فکر سے مربوط رکھنا چاہیں ورنہ زمانہ وہ آگیا ہے جس میں ذکر و فکر کا فاصلہ بڑھتا جارہا ہے اور ذاکری فکر سے یکسر آزاد ہوتی جارہی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب دیگر اقوام و مذاہب کے لوگوں کو مجالس میں علمی مضامین سے استفادہ کرنے کے لئے مدعو کیا جاتا تھا۔ اور اب صرف مقرر کی ایکٹنگ اور اس کے انداز کو دکھلانے کے لئے بلایا جاتا ہے۔ یہ صورت حال دیر تک قائم رہ گئی تو قوم کا علمی بھرم خطرہ میں پڑ جائے گا اور اس درد کا علاج ناممکن ہو جائے گا۔ مثل مشہور ہے کہ "عزت بنتی دیر میں ہے مگر جاتی بہت جلدی ہے اور جب چلی جاتی ہے تو پلٹ کر پھر نہیں آتی ہے"۔

کتاب کے جملہ مضامین سے اتفاق ضروری نہیں ہے اور نہ یہ شرط ہے کہ ذاکرین کرام ہر موضوع کے تحت اسی انداز سے بیانات کو مرتب کریں۔ یہ فکر کی ایک راہ ہے اور ظاہر ہے کہ کسی بھی عام انسان کی ہر فکر صائب نہیں ہوتی ہے۔ اس میں خطا و سہو و نسیان کے امکانات ضرور رہتے ہیں۔ تاہم اگر یہ کتاب فکر کی راہیں کھولنے کا کام بھی انجام دے سکے تو یہ بارگاہ احدیت

میں اس کی مقبولیت کی علامت ہوگی۔

واضح رہے کہ یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کے بعد دوسری جلدوں کے امکانات بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان کے لئے وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ سردست حقیر اپنے قدیم منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لئے شرح نہج البلاغہ کا کام شروع کر رہا ہے اور ناظرین کرام سے گذارش ہے کہ اس منصوبہ کی کامیابی کے لئے خصوصی دعائیں فرمائیں کہ کام بڑا ہے اور آدمی چھوٹا۔ پھر بھی پروردگار توفیق دیدے تو ہر کام آسان ہے خصوصاً مشکلکشا کی راہ میں انجام پانے والا کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ ان کا عرفان مشکل ہے لیکن ان کی امداد مشکل نہیں ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد وآلہ الطاہرین

جوادی

۵ر اپریل ۱۹۹۶ء

حصۂ اوّل

عقائد

اقبال اور علم کلام

بنیادی طور پر علم کلام، علم عقائد تھا جس میں اصول دین و مذہب کے بارے میں بحث ہوتی تھی اور ان کے اثبات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس علم کا فلسفہ کے مقابلہ میں امتیاز یہ تھا کہ فلسفہ کے موضوعات وسیع تر تھے اور اس کا انداز بحث بھی خالص عقلی قسم کا تھا چاہے نتیجہ مذہب سے ہم آہنگ ہو یا اس کے خلاف نکل جائے۔

علم کلام اسی فلسفی آزادی کے توڑ کے طور پر منظر عام پر آیا تھا جہاں موضوعات کے اعتبار سے اس کے موضوعات محدود تھے اور اس کا دائرہ بحث و تمحیص صرف اصول دین و مذہب تک تھا اور اسلوب استدلال کے اعتبار سے بھی اس کے دلائل عقل و نقل دونوں سے ماخوذ ہوتے تھے اور حتی الامکان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی یا واضح لفظوں میں آیات و احادیث سے حاصل ہونے والے عقائد پر عقلی دلائل قائم کئے جاتے تھے اور فلاسفہ کے آزادانہ خیالات کی تردید کی جاتی تھی۔

اصول دین کی اسی موضوعیت کے تحت اسے فقہ اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کہ عام فقہ میں فروع دین کے مسائل زیر بحث آتے ہیں اور فروع دین کے مسائل کی اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں ہے جب تک اصول اعتقاد طے نہ ہو جائیں۔ ورنہ عقیدہ ہی مشکوک رہ گیا تو واجب و حرام کی کیا اہمیت رہ جائے گی اور انسان کو جذبۂ عمل پر کون آمادہ کریگا۔

علم کلام ابتدائی طور پر انتہائی اہم و سنجیدہ۔ شریف اور بابرکت علم تھا۔ یہ اور بات ہے کہ نفس کی کارفرمائی ہر دور میں جاری رہی اور اکثر مسائل کو یونانی فلاسفہ کے شبہات نے حقائق سے دور لے جا کر پھینک دیا اور مسلمان متکلمین انھیں کی تقلید کو سرمایۂ افتخار سمجھتے رہے

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ فلسفہ کو کلام کی دنیا میں دخل اندازی کا موقع مل گیا اور حکومتیں اس وقت کی منتظر رہیں کہ جب بھی سیاسی حالات خراب ہوں گے، امت کو متکلمین اور فلاسفہ کے جھگڑے میں لگا دیا جائے گا اور ہمیں اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع مل جائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حکومت نے کلام الٰہی کے مسٔلہ کو اٹھا دیا اور اس مسٔلہ نے اسلام و کفر کی اتنی راہیں اختیار کیں کہ بالآخر پورے علم عقائد کا نام علم کلام ہو گیا

● کلام الٰہی کے بارے میں دو اہم موضوعات سامنے لائے گئے:

۱۔ کلام الٰہی ان الفاظ و عبارات کا نام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں یا کلام ان علوم و افکار کا نام ہے جو ذات واجب سے وابستہ ہیں اور جنھیں کلام نفسی کہا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی تشریح اس انداز سے کی جاتی ہے کہ علم و قدرت کے علاوہ کوئی شے ہوں اور فکر بشر سے بالاتر ہوں تاکہ من مانی تفسیر کی جا سکے اور کسی کے بولنے کی گنجائش نہ ہو۔

۲۔ کلام الٰہی مخلوق ہے یا قدیم بالذات ہے۔ بعض حضرات نے الفاظ و عبارات کو دیکھ کر کلام کو مخلوق قرار دیا اور بعض نے علم و قدرت کو نگاہ میں رکھ کر اسے قدیم قرار دیا اور ذات واجب سے وابستہ کر دیا۔ لیکن بعض ایسے سمجھ دار بھی پیدا ہو گئے جنھوں نے کلام کی تفسیر الفاظ و عبارات ہی سے کی لیکن انھیں بھی قدیم قرار دے دیا اور اس طرح قدماء کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا اور اسلام توہمات میں گم ہو گیا۔

معمہ بازی کے اس جنگل میں امت راستہ بھول گئی اور حکومت کے دلالوں کو مزید دلال بنانے کا موقع مل گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ عقائد و اصول کا شریف ترین علم بازی گری کا مرکز بن گیا اور اہل علم کا ایک طبقہ بے عمل ہو کر دنیا بیزار ہو گیا اور دوسرا مقرب بارگاہ سلاطین بن کر حکومتوں کا غلام بن گیا۔

اقبالؔ نے اسی صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے بلکہ اسی صورت حال کا مرثیہ پڑھا ہے:

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

طبع مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علم کلام

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات — ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امت مرحوم کی ہے کس عقیدہ میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

توحید الٰہی

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ . . . .

• لفظ قُلْ عام طور سے عقیدہ کی منزل میں استعمال ہوتا ہے کہ ابھی رسولؐ کی حیثیت رسالت تسلیم نہیں کی گئی لہٰذا بات پروردگار کی طرف سے نقل کی جاتی ہے ورنہ جب اس کی حیثیت مُسلّم ہو جائے گی تو اس کا امر ہی عمل کے لئے کافی ہو جائے گا۔

• لفظ هُوَ اشارہ ہے کہ پروردگار کا اجمالی تصور ہر ذہن میں پایا جاتا ہے اور اصل خدا کا عقیدہ مذہب کی دین نہیں ہے۔ مذہب وجود خدا کے بعد سے شروع ہوتا ہے جہاں وجود خدا کے دُھندلے تصوّر کو واضح کیا جاتا ہے اور اس کے سلسلہ میں پائے جانے والے اختلافات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

دورِ جاہلیت و الحاد میں وجود خالق کا موضوع زیر بحث نہیں ہوتا ہے۔ اصل بحث یہ ہوتی ہے کہ وہ خالق ایک ہے یا متعدد، محتاج ہے یا بے نیاز۔ اس کا رابطہ مخلوقات سے مادی ہے یا صرف معنوی اور روحانی۔ سورۂ توحید نے انھیں مسائل کی وضاحت کی ہے اور اصل وجود کے مسلّم ہونے کی طرف لفظ هُوَ سے اشارہ کر دیا ہے۔

• اللہ اس ذات اقدس کا نام ہے جس میں تمام صفات کمال و جمال و جلال پائے جاتے ہوں اور سب اپنے ہوں۔ کسی کی عطا کے محتاج نہ ہوں اور اسی بنا پر یہ لفظ سوائے ذات واجب کے کسی اور کے لئے استعمال نہیں ہوتا ہے کہ نبیؐ اور امامؑ کمال ذات و صفات کے باوجود یہ کمزوری رکھتے ہیں کہ سب پروردگار کا دیا ہوا ہے اور اسی کے کرم کا نتیجہ ہے۔ ورنہ کمال ذات و صفات صرف پروردگار کا اپنا حق ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔

وحدت کے جملہ اقسام میں پروردگار کی وحدت "احدیت" کی منزل میں ہے جہاں نہ اجزا ہیں نہ تقسیم۔ نہ ترکیب ہے اور نہ حلول۔ کفر کے خداؤں کی کثرت یا تو خدا سازی سے پیدا ہوئی ہے یا اس کی شکل و صورت سے۔ اسلام نے اپنے خدا کو ان تمام نقائص سے پاک رکھا ہے لہٰذا وہاں دو چار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

• کفر کے خدا تین طرح سے محتاج تھے۔ کوئی بنائے تو بنیں۔ کہیں بٹھائے جائیں تو بیٹھیں۔ کوئی مانے تو خدائی چلے۔ اسلام نے اپنے خدا کو ہر مرحلہ پر صمد اور بے نیاز قرار دیا ہے جس میں کسی طرح کا کھوکھلا پن نہیں ہے۔ وہ نہ بنانے کا محتاج ہے۔ نہ بٹھانے کا اور نہ ماننے کا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ایسا ہی بے نیاز بنا دیا ہے کہ وہ کسی کے بنانے۔ بٹھانے یا ماننے کے محتاج نہیں ہیں بلکہ ہر شخص ان کا محتاج ہے۔ جیسا کہ تاریخ میں درج ہے کہ "علیؑ" کا ساری امت سے مستغنی ہونا اور امت کا علیؑ کی طرف محتاج ہونا دلیل ہے کہ علیؑ سے بالاتر کوئی نہیں ہے۔

• امام باقرؑ کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر مجھے میرے خدائی علم کے واقعی حامل مل جاتے تو میں ایک صمد سے تمام توحید اسلام۔ ایمان دین اور شریعتوں کی تشریح کر دیتا۔

• لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۔ اشارہ ہے کہ اسلامی قانون پر رشتوں کی حکمرانی ممکن نہیں ہے۔ ایسے مقدس قانون کا ذمہ دار انھیں افراد کو قرار دیا جا سکتا ہے جو رشتوں کی کارفرمائی سے آزاد ہوں اور ہزار رشتوں میں گرفتار ہونے کے بعد بھی ان سے متاثر نہ ہو سکیں۔

• معرفت الٰہی کا مسئلہ انتہائی سنگین ہے۔ خدا عقل میں آجائے تو ذہن کا پروردہ ہو جائے اور نگاہ میں آجائے تو محدود ہو جائے۔ اس کی معرفت کا ذریعہ صرف آثار ہیں لیکن آثار خود ہی ناقص ہیں ان سے وجود خالق کا اندازہ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن کمال خالق کا اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا وسیلہ صرف وہ افراد ہیں جو تمام کمالات کے مالک ہوں تاکہ کمال ذات کی طرف رہنمائی کر سکیں۔

• توحید کا یہ تصور کہ صرف خدا کو مانیں گے اور وہ جس کو منوائے گا اس کو بھی نہ مانیں گے۔ توحید خالص نہیں ہے بلکہ ابلیسیت ہے۔ ابلیس نے بھی یہی کہا تھا کہ تجھے مانتا رہا ہوں مانتا رہوں گا لیکن تیرے علاوہ کسی کی عظمت کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا چاہے تو خود ہی حکم کیوں نہ دے۔

• سورۂ توحید کے تین خصوصیات ہیں :

۱۔ اس کی تین مرتبہ تلاوت پورے قرآن کے برابر ہے۔

۲۔ اس کا روزانہ کسی نہ کسی نماز میں پڑھنا تقریباً ضروری ہے۔

۳۔ اس کی تلاوت ٹھہر ٹھہر کر کرنی چاہئے۔

• رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو بمنزلہ قل ھو اللہ احد قرار دیا ہے گویا علیؑ کی بے نیازی کو تین مرتبہ میں سمجھا جا سکتا ہے اور اس مسئلہ پر روزانہ غور کرنا ضروری ہے اور اس سے بآسانی گذر جانا مناسب نہیں ہے بلکہ ٹھہر کر غور کرنا ضروری اور لازمی ہے۔

• مذہب کے دو بنیادی کام ہیں۔ خدا کو پہچنوانا اور پھر اسے منوانا۔ کفار کا عیب یہ تھا کہ ۳۶۰ صامت خداؤں کے قائل تھے۔ ایک ناطق اور متکلم خدا کے قائل نہ تھے اور یہی عادت اسلام کے بعد تک باقی رہ گئی۔ اسلام نے اپنے فریضہ کو پورا کیا اور چونکہ پہچنوانا علم کا طلبگار تھا اور منوانا طاقت کا متقاضی تھا۔ اس لئے اپنے ہر نمائندہ کو دونوں طاقتوں سے نوازا "زادہ بسطة فی العلم والجسم"۔ توحید و معرفت کا واقعی معلم اور مرشد وہ ہوگا جو علم و معرفت کے اعتبار سے پیدا ہوتے ہی صحف سماویہ کی تلاوت کرے اور طاقت کے اعتبار سے گہوارہ میں اژدر کے دو ٹکڑے کر دے۔!

اللہ اکبر

یہ کلمہ مسلمان کا نشان ایمان بھی ہے اور شعار اطمینان بھی۔ اس کی گونج دنیا کے ہر گوشہ میں سنائی دیتی ہے اور اس کی آواز متعدد بار ہر گلدستہ اذان سے گونجتی ہے۔ مسلمان نماز کے لئے مسجد آتا ہے تو تکبیرۃ الاحرام سے لے کر سجدۂ آخر کے اختتام تک بار بار اسی آواز کو بلند کرتا ہے اور میدان جہاد میں قدم رکھتا ہے تو وہاں بھی اسی نعرہ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ یہ نعرہ مسلمان کی زندگی بھی ہے اور زندگی کی علامت بھی۔ اس پر اس کا ایمان بھی ہے اور اسی سے اس کی شان بھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اس میں دور دور تک اس نعرہ کی صدائے بازگشت نہیں سنائی دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر ہونا تو بڑی بات ہے خدا اصغر بھی نہیں ہے اور مسلمان کا سراپا وجود اس کے تصور سے یکسر خالی ہے۔ اس کا وجود صرف اس کی زبان پر ہے اور دل و دماغ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مثال کے طور پر چند باتیں ملاحظہ ہوں :

ا۔ ایک مقام پر انتہائی خلوت تلاش کرنے کے بعد ایک شخص ایک عورت سے محو گفتگو تھا اور محبّت آمیز گفتگو کا سلسلہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ قول عمل میں تبدیل ہونے والا تھا اور محبّت اپنے دعویٰ کا عملی ثبوت پیش کرنے والی تھی کہ اچانک ۵۔۶ برس کا بچہ آگیا۔ اس بچہ کے آتے ہی دونوں اس طرح اجنبی ہو گئے جیسے ایک دوسرے کو پہچانتے ہی نہیں ہیں اور یہ اجتماع حادثاتی طور پر اچانک ہو گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس بچہ سے انھیں ظاہری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ نہ وہ انھیں روک سکتا

ہے۔ نہ ان کی "راہ عمل" میں حائل ہو سکتا ہے۔ نہ شور مچا سکتا ہے۔ وہ دونوں اس کا گلا بھی گھونٹ سکتے ہیں اور اس کی زندگی کا خاتمہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن انسانی فطرت ہے کہ ایسے جرائم میں جب تیسرے کے دیکھنے کا تصوّر پیدا ہو جاتا ہے تو ہمّتِ گناہ پست ہو جاتی ہے اور انسان گھبرا جاتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک بچہ کے دیکھنے سے ہمّتِ گناہ پست ہو جاتی ہے تو "اللہ اکبر" کے عقیدہ نے اس ہمّت کو پست کیوں نہیں کیا تھا اور بچہ کے آنے سے پہلے گناہ کی طرف قدم کیوں بڑھ رہے تھے۔؟

ب۔ چند بچے گھر کے باہر کھیل رہے تھے۔ شور قیامت برپا تھا اور محلہ والوں کی نیند حرام ہو رہی تھی کہ اچانک باپ دروازہ کھول کر باہر آگیا اور اس نے سوال کر لیا کہ کیا ہو رہا تھا؟ سب نے شرارت کا صریحی انکار کر دیا اور شرارت کے یہ پیکر شرافت کے مجسّموں میں تبدیل ہو گئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس انقلاب کا راز کیا ہے اور شرارت شرافت میں کس طرح تبدیل ہو گئی۔؟

بات صرف یہ ہے کہ ابھی تک باپ کے دیکھنے کا خیال نہیں تھا اور اب یہ احساس ہو گیا ہے کہ باپ ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور بزرگوں کے دیکھتے ہوئے بچّوں میں شرارت کی جرأت نہیں ہوتی ہے۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پروردگار کی بزرگی باپ کے برابر بھی نہیں ہے یا وہ اُس کی نظر میں باپ سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ "اللہ اکبر" کے معنی کیا ہیں اور "ھو یدرک الابصار" کا مفہوم کیا ہو گیا ہے۔؟

ج۔ دنیا کا دستور ہے کہ اگر کسی مقام پر دعوت ہو اور صاحب خانہ کا بچہ بھی آکر خبر دیدے کہ بابا جان نے آپ کو ناشتہ پر یاد فرمایا ہے تو انسان فی الفور پہونچ جاتا ہے اور اس بات پر غور نہیں کرتا ہے کہ بچہ بچہ ہے۔ شرارت بھی کر سکتا ہے۔ غلط بیانی سے بھی کام لے سکتا ہے۔ مقام مقام عزّت و آبرو ہے لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تحقیق و تصدیق کے بغیر قدم نہ بڑھائے

جائیں اور کھانے کے نام پر کسی کے دروازہ پر دستک نہ دی جائے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے اور انسان یہ تاویل کر لیتا ہے کہ مسئلہ بچہ کا نہیں ہے۔ مسئلہ بزرگِ خانہ کا ہے۔ بچہ تو صرف ایک داعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بزرگِ خانہ کی بزرگی کا تقاضا ہے کہ اس کی دعوت کے احتمال پر بھی حاضری دی جائے اور اس کی دعوت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا واقعاً اکبر ہے اور اس نے جنّت کا دستر خوان بچھا کر ایک لاکھ چوبیس ہزار باہوش۔ باوقار اور معصوم کردار افراد کو دعوت دینے کے لئے بھیج دیا ہے تو یہ ساری تاویلیں کیوں نہیں ہوتی ہیں اور انسان کے قدم نیکیوں کی طرف کیوں نہیں بڑھتے ہیں؟ وہ راہِ خدا میں مال دے کر جنّت کی نعمتوں کا استحقاق کیوں نہیں پیدا کرتا ہے۔ کیا خدائے اکبر کی بزرگی گھر کے بزرگ کے برابر بھی نہیں ہے۔؟

د۔ چند بزرگانِ قوم گھر سے باہر نکلنا چاہتے ہیں کہ اچانک گھر کے بچے نے آکر خبر دی کہ علاقہ میں فساد ہو گیا ہے۔ پولیس گشت کر رہی ہے۔ کرفیو لگنے والا ہے۔ گولیوں کی آواز فضا میں گونج رہی ہے اور یہ خبر سُنتے ہی سب کے قدم رُک گئے اور کوئی ایک قدم آگے بڑھنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا ہے۔ اس لئے کہ عقلِ سلیم کا فیصلہ ہے کہ خطرہ کا احتمال بھی پیدا ہو جائے تو احتیاط واجب ہے۔ اس کے لئے تحقیق و تصدیق کی ضرورت نہیں ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب لاکھوں ہادیانِ دین خطرۂ جہنم کی خبر دیتے ہیں تو مسلمان کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی ہے اور وہ مسلسل اپنے اقدامات میں لگا رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کا خطرہ خطرہ ہے اور دار و غۂ جہنم کا خطرہ خطرہ نہیں ہے یا محلہ کے بچہ کی خبر سے خطرہ کا احتمال پیدا ہوتا ہے اور معصومینؑ کی خبر سے احتمال بھی نہیں پیدا ہوتا ہے اور انکی حیثیت ایک بچہ کے برابر بھی نہیں ہے یا اہل دنیا میں اتنی طاقت ہے کہ وہ مخالفت قانون پر سزا دے سکتے ہیں اور خدائے اکبر میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے اور وہ صرف نام کا اکبر ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے اصغر بھی نہیں ہے۔

ہ۔ انسان گھر میں سکون سے بیٹھا ہے کہ اچانک بچہ نے تقاضا کیا کہ باہر چلئے۔ بازار چلئے۔ پارک چلئے۔ باپ نے ٹالنا چاہا اور اپنے خیال میں سمجھا بُجھا کر خاموش کرنا چاہا۔

لیکن بچہ کا اصرار بڑھتا رہا اور وہ مسلسل تقاضا کرتا رہا یہانتک بزرگِ خانہ گھر سے باہر نکل آئے اب نہ گرمی کا خیال ہے نہ سردی کا۔ نہ تھکن کا احساس ہے نہ مصروفیات کا۔ سارے عذر ختم ہو گئے اور بچہ کی دعوت پر گھر سے نکل آئے۔ اس لئے کہ انسانی فطرت ہے کہ جب محبوب بار بار تقاضا کرتا ہے تو اس کے تقاضوں کو قبول کر لیا جاتا ہے اور اس راہ میں زحمت اور تکلیف کا خیال نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ داعی الٰہی بار بار حیّ علی الصلوٰۃ حیّ علی الفلاح۔ حیّ علیٰ خیر العمل کی آواز بلند کرتا ہے اور مسلمان بستر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔ کیا اللہ اکبر کے یہی معنی ہیں اور پروردگار کی کبریائی کا یہی تقاضا ہے۔ سچ ہے :

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

دُعا

"خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا" کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کا کوئی انسان اپنے سارے کام اپنی طاقت سے انجام نہیں دے سکتا ہے۔ یہ کائنات بہت بڑی ہے اور یہ انسان بہت چھوٹا ہے اس کا شمار ایک مشت خاک میں کیا جاتا ہے۔ یہ پہاڑوں کی سربلندی اور دریا کی روانی پر کیا قابو حاصل کر سکے گا۔ یہ ظلمت کدہ کا پروردہ ہے نظام شمسی پر کیا حکومت کرے گا۔ اس کی شرافت اور ہوشمندی یہ ہے کہ جہاں اپنی طاقت جواب دے جائے وہاں ہمّت نہ ہارے بلکہ دوسرے کا سہارا لے کر آگے بڑھ جائے۔ اور اسی طریقہ کار پر ساری دنیا چل رہی ہے۔ کوئی رستم دوراں یا سلطان السلاطین بھی اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اپنے جملہ کام اپنی طاقت سے انجام دیتا ہوں۔ سہارے کے سب محتاج ہیں اور سہارے کے بغیر کسی کا کام نہیں چلتا ہے یہی قانون فطرت بھی ہے اور یہی تعلیم مذہب بھی "تعاونوا علی البرّ والتقویٰ" کا حکم اسی لئے دیا گیا کہ انسان سارے کام اکیلا انجام نہیں دے سکتا ہے۔

لیکن اس کے بعد ایک مرحلہ دانشمندی اور آتا ہے جہاں کچھ لوگ اپنے ہی جیسے ناتواں اور کمزور سہاروں پر اکتفا کر لیتے ہیں اور جہاں سہارا جواب دے دیتا ہے وہاں مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے پاس اس سے بالاتر کوئی سہارا نہیں ہے۔ مذہب نے اپنے چاہنے والوں کو سب سے پہلے معرفت پروردگار کا سبق اسی لئے دیا تھا کہ انسان کی زندگی مایوسی کا شکار نہ ہونے پائے اور وہ ایک ایسے سہارے پر بھروسہ کرے جس کی طاقت کائنات سے بالاتر ہے کہ وہ خود ہی کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس کے سہارے کے بعد کسی مایوسی اور ناکامی کا امکان نہیں رہ جاتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ جس کا بھی سہارا لینا ہوتا ہے اس کے شرائط پر عمل کرنا ہوتا ہے اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کس وقت عرض مدعا مفید ہو سکتا ہے اور کس وقت بات کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مذہب نے اسی نکتہ کو شرائط و آداب دعا کی شکل میں پیش کیا ہے اور انسان کو متوجہ کیا ہے کہ اگر واقعاً رب العالمین سے مدد لینا ہے اور اسی پر بھروسہ کرنے کا ارادہ ہے تو عرض مدعا سے پہلے حسب ذیل امور کا انتظام کرو تاکہ تمھاری دعا سننے کے قابل اور بات قبول کرنے کے لائق ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ ان آداب کا بیان کرنا بھی ہر انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ان افراد کی ضرورت ہے جو رب العالمین کی بارگاہ سے ہادی اور رہنما بن کر آئے ہوں تاکہ وہاں کے آداب و شرائط سے باخبر ہوں اور بے خبر انسان کو باخبر بنا سکیں۔

حضرات محمدؐ و آل محمد علیہم السلام کا امتیاز یہی ہے کہ وہ نور اول ہونے کے اعتبار سے اسی بارگاہ کے رہنے والے ہیں اور اس دنیا میں اسی کی طرف سے بھیجے گئے ہیں لہٰذا انھیں اس بارگاہ کے آداب کی مکمل اطلاع ہے اور ان سے بہتر اس مسئلہ کی وضاحت کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

معصومین علیہم السلام کے بیان کردہ احکام کو علامہ محسن امین عاملی مرحوم نے مفتاح الجنات میں اس انداز سے بیان کیا ہے:

آداب دعا:

۱۔ طہارت
۲۔ خوشبو
۳۔ رو بقبلہ ہونا
۴۔ حضور قلب
۵۔ خدا سے حسن ظن کہ دعا کو قبول کرلے گا
۶۔ صدقہ دینا
۷۔ حرام کا سوال نہ کرنا

۸۔ اصرار کے ساتھ طلب کرنا۔
۹۔ حاجت کا صراحت کے ساتھ ذکر کرنا اور شرم نہ کرنا۔
۱۰۔ سب کے لئے دعا کرنا۔
۱۱۔ صیغۂ راز میں عرض مدعا کرنا۔
۱۲۔ اجتماع میں دعا کرنا۔
۱۳۔ خضوع و خشوع کے ساتھ دعا کرنا۔
۱۴۔ پہلے پروردگار کی حمد و ثنا کرنا۔
۱۵۔ دعا سے پہلے صلوات پڑھنا۔
۱۶۔ دعا کے بعد صلوات پڑھنا۔
۱۷۔ گریہ کرنا۔
۱۸۔ گناہوں کا اعتراف کرنا۔
۱۹۔ دل سے متوجہ ہونا۔
۲۰۔ نزول بلا سے پہلے دعا کرنا۔
۲۱۔ برادران ایمانی سے التماس دعا کرنا۔
۲۲۔ برادران ایمانی کے لئے دعا کرنا۔
۲۳۔ ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا۔
۲۴۔ عقیق یا فیروزہ کی انگشتری پہن کر دعا کرنا۔
۲۵۔ بار بار دعا کرنا۔
۲۶۔ دعا کے بعد ہاتھوں کا چہرہ پر ملنا۔
۲۷۔ دعا کے بعد ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ کہنا۔
۲۸۔ دعا کے بعد کے حالات کا پہلے سے بہتر ہونا۔
۲۹۔ گناہوں سے قطعاً کنارہ کش ہو جانا۔
۳۰۔ لوگوں کے حقوق کا ادا کر دینا۔

۳۱۔ دعا کا صحیح ہونا۔

۳۲۔ بزرگان مذہب کو وسیلہ قرار دینا۔

ہاتھوں کی کیفیت :

۱۔ مصیبت سے پناہ مانگے تو ہتھیلی قبلہ کی طرف ہو۔

۲۔ رزق طلب کرنا ہو تو ہتھیلی آسمان کی طرف ہو۔

۳۔ صرف خدا کی طرف توجہ کرنا ہو تو درمیانی انگلی سے اشارہ کرے۔

۴۔ فریاد کرنا ہو تو ہاتھوں کو سر سے بھی اونچا رکھے۔

۵۔ گڑگڑانا ہو تو درمیانی انگلی کو چہرہ کے قریب حرکت دے۔

اوقات قبولیت دعا :

۱۔ شب جمعہ دعا کرے۔

۲۔ روز جمعہ دعا کرے۔

۳۔ جمعہ کے دن کی آخری ساعت میں دعا کرے۔

۴۔ رات کے آخری تہائی حصہ میں حصہ دعا کرے۔

۵۔ ماہ رمضان المبارک میں دعا کرے۔

۶۔ شبہائے قدر میں دعا کرے۔

۷۔ شب عرفہ اور روز عرفہ دعا کرے۔

۸۔ شب بعثت اور روز بعثت دعا کرے۔

۹۔ شب غدیر و عید اضحیٰ و عید فطر اور ان کے دنوں میں دعا کرے۔

۱۰۔ شب اول رجب دعا کرے۔

۱۱۔ شب نیمۂ شعبان دعا کرے۔

۱۲۔ شب نیمۂ رجب اور روز نیمۂ رجب دعا کرے۔

۱۳۔ ۱۷ ربیع الاول کو دعا کرے۔

۱۴۔ وقت زوال۔ وقت ہوائے تند۔ وقت نزول باران۔ وقت طلوع فجر اور

وقت اذان دعا کرے۔

مقامات استجابت دعا :

مسجد۔ خانۂ کعبہ۔ میدان عرفات۔ مزدلفہ۔ نزد قبر نبی اکرمؐ۔ مشاہد مقدسہ ائمہ معصومینؑ۔ حرم سیدالشہداء۔

حالات قبولیت دعا :

مریض کی دعا عیادت کرنے والے کے لئے۔

سائل کی دعا عطا کرنے والے کے لئے۔

حاجی کی دعا استقبال کرنے والے کے لئے۔

باپ کی دعا اور بد دعا اولاد کے لئے۔

ماں کی دعا اولاد کے لئے۔

اولاد کی دعا والدین کے لئے۔

ماں باپ کی دعا اولاد کے حق میں اس قدر موثر ہوتی ہے کہ روایات میں ان کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنے کی بھی تائید پائی جاتی ہے اور شائد اس کا راز یہ ہو کہ اولاد کی دعا کو سُن کر عالم ارواح سے دعا یا آمین کی آواز بلند ہو سکتی ہے اور پروردگار ماں باپ کی اس دعا یا آمین کے طفیل میں اس دعا کو قبول کر سکتا ہے کہ ماں باپ اولاد پر اسقدر مہربان نہیں ہیں جتنا پروردگار اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

آیئے ہم سب مل کر بطفیل معصومینؑ دعا کریں کہ پروردگار ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہمیں اعمال صالحہ کی توفیق کرامت فرمائے۔ آمین

وسیلۂ استجابت دعا

دنیا میں کوئی ہوشمند انسان ایسا نہیں ہے جسے اپنی فطری کمزوری کا احساس نہ ہو۔ "خلق الانسان ضعیفا"، اور اس احساس کی بنیاد پر وہ کسی وسیلہ اور ذریعہ کا محتاج نہ ہو۔

یہ تو اپنے اپنے ذوق نظر اور انداز فکر کی بات ہے کہ بعض کمزور، کمزور ہی کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں اور بعض "علیٰ کل شیئٍ قدیر" کا سہارا لیتے ہیں۔

بعض جاہل، ناواقف اور بے خبر ہی سے بھیک مانگتے ہیں اور بعض "بکل شیئٍ خبیر" کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ مانگتے سب ہیں اور مانگنا سب کی فطرت میں شامل ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ کس سے مانگا جائے اور اس سے مانگنے کا وسیلہ اور ذریعہ کیا ہوگا۔

دین اسلام نے مالک کائنات کے کمال مطلق کو دیکھتے ہوئے ہر صاحب عقل و ہوش کو حکم دیا ہے کہ اگر مانگنا ہے تو اسی سے مانگو کہ اس کے علاوہ ہر ایک کی حاجت روائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ فقیر بے نوا کا بھی حاجت روا ہے اور کائنات کے مشکلکشا کا بھی۔ اس کی بارگاہ میں محتاج محض بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اور مولائے کائنات بھی۔ اس کے سامنے بندۂ عاجز کو بھی ہاتھ پھیلائے دیکھا ہے اور مرسل اعظمؐ صاحب معراج کو بھی۔!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خالق و مخلوق اور عبد و معبود میں وجوب و امکان اور حدوث و قدم کا فاصلہ پایا جاتا ہے تو مانگنے کا وسیلہ اور ذریعہ کیا ہوگا اور اس سے گفتگو کرنے کا سلیقہ کیا ہوگا۔

مالک کائنات نے اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا کہ "پروردگار کے بیشمار اسمار حسنیٰ ہیں۔ انھیں کے ذریعہ مانگو اور پکارو۔"

دنیا کا طریقہ ہے کہ اگر ایک انسان کے پاس مختلف کمالات پائے جاتے ہوں تو ہر مانگنے والا اپنے مدعا سے متناسب کمال کا حوالہ دیتا ہے۔ علم مانگنے والا اسے عالم اور استاد کہہ کر پکارتا ہے اور مال کا طلبگار اسے سرکار والا تبار کہتا ہے۔ کرم کا بھکاری اسے کریم کہہ کر آواز دیتا ہے اور رحمت کا طلبگار اسے رحیم کے لقب سے یاد کرتا ہے۔

مالک کائنات نے بھی انسان کو ایسا ہی سلیقہ تعلیم دیا ہے کہ ہمارے پاس ہر مدعا سے ہم آہنگ کمال موجود ہے لہذا جس کے ذریعہ سے بھی چاہو مانگ سکتے ہو۔ تمھارا کوئی مدعا ایسا نہ ہوگا جسے ہم پورا نہ کر سکیں اور تمھارا کوئی سوال ایسا نہ ہوگا جس کے لئے کوئی وسیلہ نہ موجود ہو۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسمار حسنیٰ کی مکمل معرفت حاصل کر کے ان کے ذریعہ دعا کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بھی مخصوص سلیقہ درکار ہے۔ اب انسان عاجز اور عبد جاہل کو اس سلیقہ کی تعلیم کون دے گا۔ جن افراد کو مالک کائنات نے علم و فضل و شعور دے کر بھیجا ہے، وہ تو اسی علم و فضل کے سہارے دعا کر لیں گے۔ لیکن جنھیں اس کا سلیقہ بھی نہیں ہے وہ کیا کریں گے۔

اس سوال کا جواب بہت آسان ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر ناواقف ہوتا ہے تو واقف کار کی طرف رجوع کرتا ہے، لہذا اسے سلیقۂ دعا بھی انھیں افراد سے سیکھنا ہوگا جنھیں مالک کائنات نے سکھا پڑھا کر دنیا میں بھیجا ہے۔

آیت کریمہ "وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنیٰ"، کے بارے میں ایک تصور یہ بھی ہے کہ اسم اور نام اسے کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ ذات کی معرفت حاصل ہوتی ہے لہذا اگر ذات کا تعارف کرانے والے حروف کو اسمار حسنیٰ کہا جا سکتا ہے تو جن ذوات مقدسہ کو پروردگار نے اپنے تعارف کا مکمل ذریعہ قرار دیا ہے انھیں اسمار حسنیٰ کیونکر نہ تصور کیا جائے اور ان کے وسیلہ سے کیونکر دعا نہ کی جائے۔

ان کے وسیلہ سے دعا کرنا سلیقہ دعا ہے منافی عبدیت نہیں ہے۔ دعا کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ انسان پہلے اسے پہچانے جس سے مانگنا ہے۔ اس کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے لہٰذا انسان دعا کو دعا بنانے میں معرفت کا محتاج ہے اور معرفت حاصل کرنے کے لئے ان بندوں کا محتاج ہے جنھوں نے براہ راست پروردگار سے درس معرفت لیا ہے۔ پھر دنیا میں معلم اور معرف بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

دعا کی قبولیت کے سلسلہ میں تین باتوں کا لحاظ انتہائی اہم ہے۔ اس کے بغیر کوئی دعا قابل قبولیت نہیں ہے۔ پروردگار قبول کرلے تو یہ اس کا کرم ہے۔

۱۔ دعا کرنے والے کا فرض ہے کہ دعا کو عرض مدعا کا ذریعہ سمجھے۔ تجارت کی دکان نہ سمجھے کہ حروف والفاظ کی رشوت دے کر کام نکال لینا ہے اور ایک مال بیچ کر ایک قیمت وصول کرنا ہے۔ یہ تصور عبدیت کے سراسر منافی ہے اور اس سے انسان کی بندگی تک مجروح ہو جاتی ہے۔ قبولیت دعا کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ دعا کرنے والا پروردگار کا بندہ محتاج ہے۔ انکم ٹیکس کا آفیسر نہیں ہے کہ مالک کے خزانہ کا حساب لگا کر اس میں سے ٹیکس وصول کرنا چاہتا ہے اور گویا زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر زمین وآسمان کے خزانوں پر قبضہ رکھنا ہے کہ اس قدر ٹیکس ادا کرنا ہوگا ورنہ خدائی کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔

یہ انداز فکر یا انداز دعا کفر سے ہم آہنگ ہے۔ اسے اسلام وایمان یا عبدیت و بندگی کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

۳۔ دعا عبدیت اور بندگی کے اظہار کا ذریعہ ہے اور عبدیت کسی طرح کی انانیت کو برداشت نہیں کر سکتی ہے، لہٰذا تقاضائے عبدیت وشرافت یہ ہے کہ مقام دعا میں غیروں کو اپنے اوپر مقدم رکھا جائے اور یہ تصور کیا جائے کہ گویا انسان تمام ایمانی برادری کی نیابت میں دعا کر رہا ہے اور جو کچھ حاصل ہوگا اسے ساری برادری پر تقسیم کر دے گا۔ سورہ حمد میں "ایاک نستعین" میں جمع کا صیغہ کبریائی اور انانیت نہیں بلکہ اجتماعی نیابت کا اظہار ہے تاکہ جو کچھ حاصل ہو وہ سب میں تقسیم کر دیا جائے۔ ائمہ معصومینؑ کی شدید تاکید

تھی کہ مقام دعا میں ہمیشہ غیروں کو مقدم رکھا جائے اور پہلے برادران ایمانی کے حق میں دعا کی جائے۔

یہ صرف دعائے مغفرت ہے جہاں اپنی ذات کو دوسروں پر مقدم رکھا جاتا ہے "ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین" اور اس کا راز بھی یہی ہے کہ دعائے مغفرت میں ایک طرح کا احساس گناہ پایا جاتا ہے اور اسلام یہ نہیں چاہتا ہے کہ انسان اپنے اعمال سے غافل ہو کر دوسروں کے گناہ کا احساس کرے اور انھیں گنہگار قرار دے بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ پہلے اپنی کمزوری کا اقرار کرو، اس کے بعد دوسرے کی کمزوری پر رحم کرو۔ دوسرے کی کمزوری پر نگاہ رکھنا انانیت ہے اور اپنی کمزوری کی معافی مانگنا عبدیت و بندگی۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

عدالت الٰہیہ

• عدالت کا لغوی مفہوم ہے "وضع الشیٔ فی محلّہٖ"۔ عدالت اور ظلم کے تعین کے لئے محل کا تعین ضروری ہے۔ محل کا تعین انسان کے اختیار میں ہوگا تو ہر شخص اپنے اقدام کو برمحل قرار دے گا۔ محل کا واقعی تعین وہی کر سکتا ہے جو کائنات کا خالق اور مالک ہو لہٰذا عدالت کا صحیح فیصلہ پروردگار کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

• محل کے تعین میں افعال کو بھی دیکھنا ہوگا اور شخصیات کو بھی۔ افعال میں ہر عمل برمحل ہو۔ رونے کی جگہ روئے اور ہنسنے کی جگہ ہنسے۔ شخصیات میں جو جس کی جگہ ہو اسکو وہاں رکھے۔ نہ کسی کو بے محل خدا بنائے نہ رسولؐ اور نہ جانشین رسولؐ۔ جو جس کی منزل ہے اس کو وہیں رکھے تو عدالت ہے ورنہ "الصحابۃ کُلّھم عدول" صرف ایک نعرہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔

• عدالت کا حقوقی مفہوم ہے "ہر شے کو اس کا حق دے دینا" اس کا تعین بھی مالک کے ہاتھ میں ہوگا کہ اس نے کس مخلوق کا کیا حق قرار دیا ہے۔ حق کے تعیّن کے بغیر عدالت کا تعین ممکن نہیں ہے۔ نظام عدل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اس میں ہر شے کا حق بیان کر دیا گیا ہو اور کسی طرح کے جعل و وضع کی ضرورت نہ ہو۔ نہ قیاس نہ استحسان اور نہ کوئی اور شے۔

• حقوق کے بیان کا کام پروردگار نے پیغمبرؐ کے حوالے کیا اور تمام جزئیات کا بیان ممکن نہ تھا لہٰذا پیغمبرؐ نے "فھٰذا علیؑ مولاہ" کہہ کر یہ کام علیؑ کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے سلسلہ کو آگے بڑھا دیا اور ہر دور کے امامؑ کا فرض قرار پایا نظام عدالت کی توضیح و تشریح۔ اور آخری امامؑ کا فرض قرار پایا "یملأ الارض قسطاً وعدلاً کما ملئت ظلماً وجوراً"۔

• اسلام میں علیؑ کی منزل ولادت کے موقع پر خانۂ کعبہ۔ وصایت میں ذوالعشیرہ۔ ہجرت میں بستر رسولؐ۔ بدر و احد میں سرداری۔ خندق میں سینۂ عمرو۔ خیبر میں دوشِ ہوا۔ معراج میں پردہ اسرار۔ فتح مکہ میں دوشِ رسولؐ۔ غدیر میں منبر یعنی ساری امت سے بالاتر۔ اب اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے سب ظلم ہے اور کچھ نہیں ہے۔

• اسلام کا نظام عدل۔ مرد کے لئے میدان عمل۔ عورت کے لئے "قرن فی بیوتکن"۔ امانت کے لئے "أن تودوا الأمانات الیٰ اھلھا"۔ فیصلہ کے لئے "واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل"۔ شہادت کے لئے "اشھدوا ذوی عدل منکم"۔ وزن کے لئے "واقیموا الوزن بالقسط"۔ بعثت کے لئے "وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط"۔ نماز جماعت کے لئے "لا ترکنوا الی الذین ظلموا"۔ زوجیت کے لئے "فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ"۔ عداوت کے لئے "ولا یجرمنّکم شنأن قوم علیٰ الّا تعدلوا اعدلوا"۔

• عدالت الٰہیہ۔ عدل جملہ عقائد کی بنیاد ہے۔ نبوت کا اثبات معجزہ سے اور معجزہ کا اثبات عدالت سے کہ خدا غیر مستحق کی تائید نہ کرے گا اور اسے معجزہ نہ دے گا۔ قیامت کا دار و مدار بھی عدل پر ہے۔ اسی لئے عدل کو توحید کے بعد اصول دین و مذہب کا درجہ دیا گیا ہے۔

• عدل الٰہی کا سب سے پہلا منکر ابلیس تھا کہ غیر افضل کو مسجود بنا دیا ہے۔

• عدل کا ایک شعبہ مسئلہ جبر و اختیار ہے کہ بندہ مجبور ہوگا تو اسے سزا دینا خلاف عدل ہوگا۔ جبر کا عقیدہ ظالموں کی ایجاد ہے تاکہ اپنے عیوب کی ذمہ داری پروردگار پر ڈال کر قوم کو خاموش کر سکیں۔ امت نے اپنے تحفّظ کے لئے خدا کو قربان کیا۔ آلِ محمدؐ نے عظمتِ الٰہی کے تحفّظ کے لئے اپنے کو قربان کیا۔

• جبر و اختیار کا صحیح فیصلہ امام موسیٰ کاظمؑ نے بچپنے میں ابوحنیفہ سے گفتگو کے دوران کیا کہ معصیت کا ذمہ دار خدا ہے تو بندوں پر عذاب کیوں کرتا ہے اور اگر عبد و معبود دونوں ہیں تو عذاب میں حصّہ کیوں نہیں لیتا ہے۔ اور جب ایسا کچھ نہیں ہے تو بندہ ذمہ دار ہے

اور وہی فاعل مختار ہے۔

• عدل الٰہی کے انکار کی دلیل یہ ہے کہ وہ "یفعل مایشاء ویحکم مایرید۔" جو چاہتا ہے کرتا ہے اسے قانون عدالت کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ غیر صحیح کا ارادہ بھی کرتا ہے یا نہیں۔

• ظلم کے دو ہی اسباب ہوتے ہیں۔ جہالت اور احتیاج۔ پروردگار دونوں سے پاک و پاکیزہ ہے لہٰذا اس کے یہاں ظلم کا کوئی امکان نہیں ہے۔

• نمرود نے اپنی خدائی ثابت کرنے کے لئے ایک بے گناہ قیدی کو قتل کر دیا کہ گویا زندہ کو مُردہ بنا دیا اور یہ دلیل الوہیت ہے۔ جب کہ بے گناہ کو قتل کرنا ظلم ہے اور یہ دلیل ہے کہ باطل کی خدائی ظلم سے چلتی ہے تو اب خدائے برحق کے بارے میں عدل کا عقیدہ عظیم ترین واجبات میں ہوگا۔

• جب خدا عادل ہے تو اس کا نمائندہ بھی عادل ہوگا۔ جو ہر محاذ زندگی پر انصاف نہ کر سکے وہ نہ رسول ہو سکتا ہے اور نہ امامؑ۔

• قرآن مجید میں ظلم کے مصادیق میں شرک۔ حدود الٰہیہ سے تجاوز کرنا۔ کفر اختیار کرنا۔ قانون خدا کے خلاف فیصلہ کرنا۔ آیات الٰہیہ کا انکار کرنا۔ گناہ کر کے توبہ نہ کرنا۔ مسجدوں کی آبادی سے روکنا۔ گواہی کا چھپا دینا۔ آیاتِ خدا سے اعراض کرنا وغیرہ جیسے اعمال شامل ہیں اور انھیں کی روشنی میں پوری تاریخ اسلام کے ظلم کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

• ظلم کی شناخت اور اس کے فیصلے کے بعد قرآن مجید کے اس اعلان کا مفہوم واضح ہو جائے گا "لاینال عہدی الظالمین" میرا عہدہ ظالموں تک نہیں جا سکتا ہے۔!

نبوّت اور رسالت

• ہمارے ملک میں اخبار بھی نکلتے ہیں اور رسالے بھی۔ اخبار کا موضوع یہ ہوتا ہے کہ جو بات جیسی ہے بتا دی جائے چاہے اس میں عملدر آمد کا عنصر ہو یا نہ ہو۔ لیکن رسالہ میں ایک مستقل پیغام ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس بات کو عملی شکل دی جائے یا اسے آگے بڑھایا جائے۔

عربی زبان میں خبر کو نبأ کہتے ہیں اور رسالہ کو رسالت۔ نبأ سے انسان نبی بنتا ہے اور رسالت سے رسول۔ نبی وہ انسان ہوتا ہے جو کسی انسانی واسطہ کے بغیر پروردگار سے خبر حاصل کرتا ہے اور اگر اس پر عمل ضروری ہوتا ہے تو عمل کرتا ہے لیکن اسے پیغام الٰہی قرار دے کر آگے بڑھانا ضروری نہیں ہوتا ہے۔ لیکن رسول، رسالت اور پیغام کا حامل ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہوتا ہے کہ پیغام پر عمل کرنے کے ساتھ اسے آگے بڑھائے اور صرف بطور خبر نہیں بلکہ بطور پیغام آگے بڑھائے اور دوسروں کو بھی عمل کرنے پر آمادہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ جب کسی کو "یا ایھا الرسول" کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے تو کوتاہی کو "وان لم تفعل" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا عمل رسالت کا بنیادی عنصر ہے۔

• صاحب پیغام کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ کبھی پیغام براہ راست اسی کو دیا جاتا ہے تو اسے صاحب شریعت اور اولوالعزم شمار کیا جاتا ہے۔ اور کبھی پیغام کا نزول دوسرے افراد پر ہوتا ہے لیکن اسے بھی پیغام رسانی کا ذمہ دار بنا دیا جاتا ہے تو یہ اولوالعزم میں شامل نہیں ہوتا ہے لیکن رسول ضرور ہوتا ہے۔

• نبوت میں پیغام رسانی کا شرط نہ ہونا اور رسالت میں اس کا بنیادی عنصر ہونا علامت ہے کہ نبی اپنی ذات کے لئے نبی ہو سکتا ہے لیکن رسول اپنی ذات کے لئے رسول نہیں ہو سکتا ہے۔

• اپنی ذات کے لئے نبی ہونے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ انسان قانون الٰہی پر عمل کر کے لوگوں کو یہ دکھلائے کہ یہ قانون قابلِ عمل ہے اور اس سے انسانی کردار کس قدر ارفع و اعلیٰ ہو جاتا ہے۔

• رسول کی ابتدائی زندگی بھی ایک نبی کی زندگی ہوتی ہے کہ وہ پہلے اپنے کردار کو پیش کرتا ہے اور اس کے بعد رسالت اور پیغام کا اعلان کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے بھی قبل خلقتِ آدمؑ اپنی نبوت کا اعلان کیا ہے، رسالت کا نہیں "کنتُ نبیًّا وآدم بین الماء والطین"۔ اور جناب عیسیٰؑ نے بھی گہوارہ میں نبوت ہی کا اعلان کیا ہے "جعلنی نبیًّا"۔

• رسول اکرمؐ بھی ابتدائے حیات میں کملی اوڑھ کر عبادت ہی کیا کرتے تھے اور کرداری نمونے ہی پیش کیا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ قدرت نے حکم دیا کہ اب اس چادر کو پھینک کر میدان میں آجاؤ "یا ایھا المدثر قم فانذر" اور پھر مسلسل رسالت کا اعلان ہوتا رہا "ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً" ــــ "ھو الذی ارسل رسولہ" ــــ "وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین" ــــ "انا ارسلناک شاھداً ومبشراً ونذیراً" ــــ وغیرہ۔

• جناب آدمؑ نبی تھے تو انھوں نے ثابت کر دیا کہ فریضۂ خلافت کی ادائیگی کے لئے جنّت کے پُرسکون ماحول کو خیرباد کہا جا سکتا ہے۔

• مرسلین دوسروں سے عمل کرانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں لیکن ان کا فرض ہوتا ہے کہ عمل کی راہ ہموار کریں اور لوگوں پر ثابت کریں کہ یہ کام ان کے امکان میں ہے۔ انبیاء کرام کا بکریاں چرانا اسی حقیقت کا اعلان تھا کہ ہم جانوروں کو بھی سیدھے راستہ پر چلا سکتے ہیں۔ ان کی باغبانی صحراؤں میں پھول کھلانے کی علامت تھی۔ ان کی تجارت دیانت داری سے کامیاب عمل انجام دینے کی نشانی تھی۔ ان کی بدترین ماحول اور سخت ترین حالات میں زندگی اس امر کا اعلان تھی کہ ان کی زندگی پر ماحول اثرانداز نہیں ہوتا ہے۔

• پروردگار نے ماحول کا مقابلہ کرنے کے لئے مرسلین کے علاوہ نیک سیرت خواتین کا بھی انتخاب کیا ہے۔ اگر فرعونیت کے ماحول میں جناب موسیٰ رہے ہیں تو آسیہ بھی رہی ہیں۔ اگر مشرکین کا مقابلہ جناب ابراہیمؑ نے کیا ہے تو جناب ہاجرہ نے بھی کیا ہے۔ اگر یہودیوں کے الزامات کو جناب عیسیٰ نے برداشت کیا ہے تو جناب مریم نے بھی بہت طعنے سہے ہیں۔

• نبوت اور رسالت کا سلسلہ تقریباً ایسا تھا کہ نبوّت رسالت کی زمین ہموار کرتی تھی اور پھر صاحب شریعت قانون پیش کرتا تھا اور مرسلین اسے آگے بڑھاتے تھے اور اس طرح ہر شخص پہلے نبوتی کام انجام دیتا تھا اس کے بعد وہی رسالت کا فرض انجام دیتا تھا یا دوسرا رسول اس ذمہ داری کو سنبھال لیتا تھا۔ یہاں تک کہ جب نبوت کی آخری منزل آگئی تو ایک ہی شخص کو نبوت، رسالت اور شریعت تینوں مراحل کو طے کرنا تھا چنانچہ سرکار دو عالمؐ نے چالیسؐ سال نبوت کا فرض انجام دیا۔ اس کے بعد رسالت کا کام شروع ہوا تو شریعت کے احکام نازل ہونے لگے اور سنہ ۱۰ھ میں میدانِ غدیر میں احکام مکمل ہو گئے اور اکملت لکم دینکم کی سند مل گئی۔

• تکمیل رسالت کے بعد تعمیل اور تحفّظ کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ اس کے لئے امامت کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی میدانِ غدیر میں اعلان ہو گیا کہ "من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ"۔ بلکہ اسی اعلان ہی کی بنیاد پر کمال دین کا اعلان ہوا۔ گویا کہ کمال دین میں مولائیت ایک بنیادی عنصر ہے کہ اس کے بغیر دین بھی کامل نہیں ہو سکتا ہے اور نعمت بھی تمام نہیں ہو سکتی ہے اور جب ولایتِ علیؑ کے بغیر دین مرضی اور پسندیدہ نہیں ہو سکتا ہے تو انسان کے "رضی اللہ عنہ" ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ختم نبوّت

• مزاجِ فطرت کائنات عدم مساوات ہے۔ جمادات۔ نباتات۔ حیوان۔ انسان۔ پھر تمام جمادات و نباتات و حیوانات بھی یکساں نہیں ہیں جب کہ ان کا امتیاز اختیاری نہیں ہے۔

• جب خالق نے امتیاز رکھا ہے تو مساوات کا نعرہ احمقانہ ہے۔ مخلوقات کی طرح مناصب میں بھی مساوات نہیں ہے۔ "تلک الرسل فضلنا بعضهم علىٰ بعض"۔

• جمادات کی شان ایک جگہ رہنا تھی لیکن کبھی کبھی دوسرے کی جگہ بھی قبضہ کر لیتے ہیں مثل اصنام۔ نباتات کی منزل زمین تھی لیکن کبھی کبھی پہاڑ پر نظر آتے ہیں۔ حیوانات کی منزل غذا کا بندوبست تھا لیکن کبھی کبھی مال غیر بھی ہضم کر جاتے ہیں۔ انسان پست ہوتا ہے تو یہی صفات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور واضح رہے کہ ان تینوں اقسام کو فلسفہ میں "موالید ثلاثہ" کہا جاتا ہے۔

• انسانوں میں امتیاز کے اسباب:

۱۔ علم ۔ "قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون"۔

۲۔ ایمان ۔ "أفمن كان مومناً كمن كان فاسقاً لا يستوٗن"۔

۳۔ تقویٰ ۔ "ان اكرمكم عند الله اتقاكم"۔

۴۔ جہاد ۔ "فضّل الله المجاهدين على القاعدين"۔

• افضل کائنات وہ ہوگا جو علم میں "سلونی" ہو۔ اور ایمان میں کل ایمان ۔ تقویٰ میں امام المتقین ہو اور جہاد میں لافتیٰ الاّ علیؑ۔

• منصب اگرچہ کمال کا نام نہیں ہے۔ منصب "جعل الٰہی" کا محتاج ہے۔ لیکن کمال

شرط منصب ہے اور صاحب منصب کو چاروں صفات میں اپنے دور سے افضل ہونا چاہیئے۔ جناب آدمؑ کو بھی ملائکہ سے اسی لئے افضل بنایا تھا کہ صاحب منصب تھے ورنہ تعلیم دونوں کو دی گئی تھی۔ ملائکہ نے خود اقرار کیا تھا "الاّ ما علّمتنا"۔

• خدائی مناصب۔ نبوت، رسالت، اولوالعزم، امامت، ختم نبوت۔

انسان خدائی خبریں بدون واسطہ بشر حاصل کرے اور تبلیغ کا ذمہ دار نہ ہو تو نبی۔

تبلیغ کا ذمہ دار بھی ہو جائے تو رسول۔

تبلیغ میں اپنے قانون کی شرط نہ ہو تو عام رسول ورنہ اولوالعزم کہ اولوالعزم ہونے کے لئے صاحب شریعت ہونا ضروری ہے جس طرح جناب نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمد مصطفیٰؐ

• سارے انبیاء میں افضل حضرت ابراہیمؑ تھے کہ انھیں خلیل قرار دیا گیا اور ان سے افضل پیغمبر اسلامؐ تھے کہ انھیں حبیب بنایا۔

خلیل اور حبیب کا لفظی فرق یہ ہے خ کا مخرج دل سے دور ہے اور ح کا مخرج دل سے قریب ہے۔ اور دل عرش الٰہی ہے۔

معنوی فرق یہ ہے کہ خلیل التماس کرتا ہے "ربّ ارنی"۔ اور حبیب سوتا رہتا ہے۔ پروردگار اسے عرش تک لے جاتا ہے "لنريه من آياتنا"۔

• انبیاء و ائمہ طاہرینؑ کی حیات میں وحی۔ الہام اور القاء خدائی منصب دار ہونے کی علامات ہیں اور معجزہ اس منصب کا اظہار ہے۔

• مرسل اعظمؐ تک آتے آتے نبوت اس درجۂ کمال تک آگئی جہاں علم کے اعتبار سے مدینۃ العلم "يعلمهم الكتاب والحكمة"۔ ایمان کے اعتبار سے "فلا وربّك لا يومنون حتىٰ يحكموك"۔ جہاد کے اعتبار سے "جاهد الكفار والمنافقين"۔ اس کے بعد اب کوئی منزل باقی نہیں رہ گئی ہے۔

• مرسل اعظمؐ قرب الٰہی کی اس منزل پر ہیں جہاں زمانی اعتبار سے "اوّل ما خلق الله نوری"۔ مکانی اعتبار سے "فكان قاب قوسين او ادنىٰ"۔ معنوی اعتبار سے "لله رب العٰلمين"۔

• عبادت قربِ الٰہی کا بہترین سبب ہے۔ نماز کا قرب معراج ہوتا ہے۔ اور روزہ کا قرب مہمان ہونا ہے۔ حج کا قرب خانۂ خدا کا طواف ہے اور زکوٰۃ کا قرب تربیت عیال اللہ۔ خمس حق اللہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ۔ لہٰذا اس سے بہتر وسائلِ قربِ الٰہی کا امکان نہیں ہے۔

• جہاد میں جان و مال دونوں سے جہاد کی شرط علامت ہے کہ جہاد مال لوٹنے کا نام نہیں ہے۔ جہاد مال لٹانے کا نام ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کو پہلے جہاد میں پہلا مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو پروردگار نے فریضۂ خمس عائد کر دیا تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ جہاد راہِ خدا میں ہوا ہے راہِ مالِ غنیمت میں نہیں ہوا ہے۔

• جب تک صاحب شریعت کے پیغام کو انبیاء و مرسلین آگے بڑھاتے رہے۔ یہ ایک اعلان تھا کہ کوئی صاحب شریعت آنے والا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے پیغام کو اولیاء نے آگے بڑھایا لیکن وہ زندہ رہے جس کا مقصد یہ تھا کہ ابھی نئی شریعت اور نئے رسول کی گنجائش ہے لیکن سرکار دو عالمؐ کے بعد منصب کا نام تبدیل ہو گیا اور نبوت و رسالت کے بجائے اسے امامت کا نام دے دیا گیا تاکہ لوگ نئے رسول یا نئی شریعت کا انتظار نہ کریں۔ اب نظام ہدایت یکسر تبدیل ہو گیا ہے۔ اب کام نبوت یا رسالت کا نہیں ہے بلکہ امامت کا ہے۔

• نبوت و رسالت اور امامت کا بنیادی فرق یہ ہے کہ نبی اور رسول کا کام اُدھر کی خبر یا اُدھر کے پیغام کو اِدھر لانا تھا۔ اور امام کا کام اِدھر کے انسان کو اُدھر لے جانا ہے۔ امام قائد ہوتا ہے اور قیادت کا منصب انسان کو منزلِ مقصود تک پہونچا دینا ہے اور بس۔ اس کے لئے کسی نئے پیغام یا نظام کی ضرورت نہیں ہے۔

امامت

• اسلام میں مذہب کے بنیادی اصول پانچ ہیں: توحید، عدالت، نبوت، امامت، قیامت۔ اور ان کی ترتیب یہ ہے کہ ذات واجب موجود تھی جب کہ کچھ نہ تھا۔ اسکی عدالت اس کے ساتھ تھی اور اسی عدالت نے تقاضا کیا کہ جن مخلوقات میں وجود کی صلاحیت ہے انھیں منظرِ عام پر لایا جائے۔ چنانچہ عدالت ہی نے مخلوقات کو منزلِ تخلیق تک پہونچانے کا انتظام کیا۔ اور چونکہ مخلوقات حالات روزگار سے باخبر ہونے والی نہ تھی لہذا عدالت ہی نے تقاضا کیا کہ ان کی ہدایت کا انتظام کیا جائے اور اس طرح نبوت کا تصور منظرِ عام پر آیا کہ اول مخلوق کو نبوت کا منصب دے کر ان مخلوقات کو پیدا کیا جو ہدایت اور راہنمائی کی محتاج تھیں۔

نبوت کے خاتمہ پر نظام ہدایت کو باقی رکھنے کے لئے امامت کا سلسلہ شروع کیا اور اس سلسلہ کو قیامت سے ملا دیا اور یہی وجہ ہے کہ قیامت میں ہر گروہ کو اس کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔

• امامت نظام الٰہی کی حفاظت بھی ہے اور امت اسلام کی قیادت بھی۔ لہٰذا امام کا معصوم ہونا دونوں اعتبار سے ضروری ہے۔ نبوت اپنی ذات کے لئے بھی ہو سکتی تھی لہٰذا اس کے لئے عصمت اس قدر ضروری نہیں تھی جس قدر امامت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دونوں کام عصمت کے متقاضی ہیں اور اس کے بغیر نہ قانون کا واقعی تحفظ ہو سکتا ہے اور نہ امت کی واقعی قیادت۔

• امام خدا کے اعتبار سے ولی اور حاکم ہوتا ہے اور نبی کے اعتبار سے وصی اور جانشین۔

اس کی امامت قوم کے اعتبار سے ہوتی ہے لیکن خدا تک لیجانا ہے تو تقرر خدا ہی کی طرف سے ہوگا۔

• امام قافلہ سالار بشریت ہے تو اس کے کمالات کو قافلہ سے زیادہ ہونا چاہیئے ورنہ کسی مقام پر بھی قافلہ کو تباہ کرسکتا ہے۔

• رسول اکرمؐ نے اپنا کام امامت کے حوالہ کیا تو قافلہ کی شکل میں۔ چنانچہ غدیر میں قافلۂ حجاج کے سامنے مولائیت کا اعلان کیا اور یہ قافلہ عالم اسلام کے اعتبار سے دنیا کا عظیم ترین قافلہ تھا جس میں ہر فرد شرف کے دونوں درجات پر فائز تھا یعنی حاجی بھی تھا اور صحابی بھی۔ اور عالم اسلام میں اس سے بالاتر شرف کا تصور بھی نہیں ہے۔ لیکن علیؑ کو تمام حاجیوں اور صحابیوں کا مولا بنادیا گیا کہ ان سے بالاتر کوئی انسان نہیں ہے۔ یہ مومنین کے امیر بھی ہیں اور متقین کے امام بھی۔

• امام خلیفۂ خدا و رسولؐ ہے تو اسے دونوں کے کمالات کا آئینہ دار ہونا چاہیئے اور یہی وجہ ہے کہ پروردگار نے ہجرت میں امام کے نفس کو اپنا نفس بنایا اور مباہلہ میں اسے نفس رسولؐ قرار دے دیا۔

• امام اصول میں شامل ہے فروع میں نہیں اور یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے معرفت امام کے بغیر مرنے والے کی موت کو جاہلیت کی موت قرار دیا ہے اور یہ بات اصول میں پائی جاتی ہے فروع میں نہیں ہے۔

• اصول و فروع کا بنیادی فرق یہ ہے کہ:

۱۔ اصول کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور فروع کا تعلق ظاہر سے۔

۲۔ اصول میں حقیقت ثابت ہوتی ہے صرف اقرار کیا جاتا ہے اور فروع میں کام بھی خود ہی انجام دینا ہوتا ہے۔

۳۔ اصول کا تعلق پروردگار سے ہوتا ہے اور فروع کا تعلق بندوں سے ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے اصول و ضوابط بھی پروردگار ہی طے کرتا ہے۔

۴۔ فروع میں قضا کا امکان ہے اور مرنے کے بعد دوسرا شخص بھی انجام دے سکتا

ہے لیکن اصول میں محمدؐ کا ایمان بھی باپ کے کام نہیں آسکتا ہے۔

۵۔ فروع کے ترک کرنے سے انسان گنہگار ہوتا ہے لیکن اصول کے انکار سے کفار سے ملحق ہوجاتا ہے۔ "مات کافرًا"۔

۶۔ اصول میں تلافی کا امکان نہیں ہے تو اس کے حساب کے لئے قیامت کا انتظار بیکار ہے۔ اسی لئے قبر میں حساب ہوجاتا ہے اور برزخ میں عذاب شروع ہوجاتا ہے۔

• امامت حافظ شریعت بھی ہے اور قائد امت بھی۔ حفظ شریعت کے لئے علم لازم ہے اور حفظ امت کے لئے قوت و طاقت۔ "زادہ بسطۃ فی العلم والجسم"۔ اب امام امت وہی ہوگا جو علم میں ساری امت سے بالاتر ہو یعنی باب مدینۃ العلم ہو اور طاقت میں ساری دنیا سے قوی تر ہو، یعنی لافتیٰ الا علیؑ۔

• علیؑ نے ولادت کے بعد پہلے صحف سماویہ کی تلاوت کی تاکہ علم کا اعلان ہوجائے اور اس کے بعد اژدر کو دو پارہ کر دیا تاکہ قوت و طاقت کا اظہار ہوجائے۔

• مذہب شیعہ میں امامت کمالات اور جعل الٰہی کا نتیجہ ہے۔ اس کا وراثت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ معصومۂ عالمؑ نے فدک کا مطالبہ کیا منصب کا مطالبہ نہیں کیا اور منصب کے ذیل میں اپنے شوہر کے فضائل کا تذکرہ خطبۂ فدک میں کیا تاکہ واضح ہوجائے کہ فدک وراثت ہے لہٰذا میرا حق ہے اور منصب عطائے الٰہی ہے لہٰذا میرے شوہر کا حق ہے۔

• امامت میراث ہوتی تو ہر امام کی ساری اولاد امام ہوتی حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وراثت تو لڑکیوں کو بھی ملتی ہے حالانکہ کوئی دختر امام، امام نہیں ہے۔ میراث میں اولاد کے ہوتے ہوئے بھائی وارث نہیں ہوتا ہے اور امامت میں پہلے ہی مرحلہ پر امام حسنؑ کے بعد امام حسینؑ امام تھے حالانکہ اولاد موجود تھی۔

• امامت صرف اس اعتبار سے میراث ہے کہ اس کے مطلوبہ کمالات جن افراد میں تھے ان کے ذریعہ ان کی اولاد کی طرف منتقل کر دیئے گئے اور اس طرح امامت کے ایک شرف کا اور اعلان ہوگیا کہ امام کے باپ سے بہتر کائنات کا کوئی انسان نہیں ہے کہ وہ خود بھی امام ہے۔!

وزارت

• جناب موسیٰ کو حکم پروردگار ہوا "اذھب الیٰ فرعون انہ طغیٰ "۔

• جناب موسیٰ نے اپنے حالات کو دیکھ کر دعا کی "رب اشرح لی صدری۔ ویسّر لی امری۔ واحلل عقدۃ من لسانی۔ یفقھوا قولی۔ واجعل لی وزیراً من اھلی۔ ھارون اخی۔ اشدد بہ ازری۔ واشرکہ فی امری۔ (طٰہٰ ۲۵-۳۲)

"خدایا میرے سینے کو کشادہ کردے۔ میرے امر کو آسان کردے۔ میری زبان کی گرہ کو کھول دے تاکہ یہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ میرے لئے میرے اہل سے ایک وزیر بنادے جو ہارون میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعہ میری پُشت مضبوط کردے اور اسے میرا شریک کار بنادے۔"

۔ شرح صدر اس لئے درکار ہے کہ قوت برداشت سلامت رہے اور جذبۂ انتقام نہ پیدا ہو۔ اسی کام کے لئے پروردگار نے انبیاء کرام سے بکریاں چرانے کا کام لیا تھا۔

۔ عقدۂ زبان کو اس لئے کُھل جانا ہے تاکہ لوگ بات سمجھ سکیں اور اسی لئے اپنے بھائی کو "افصح" کہہ کر یاد کیا ہے کہ افہام و تفہیم کے لئے فصاحت زیادہ موثر ہوتی ہے۔

۔ شرح صدر کی دعا اس لئے ضروری ہے کہ شیطان کا حملہ عام طور سے سینہ ہی پر ہوتا ہے۔ "یوسوس فی صدور الناس"۔

۔ شیطان سینہ پر حملہ کرتا ہے تو "یجعل صدرہ ضیقا" انسان کا سینہ تنگ ہوجاتا ہے اور کشادگی ختم ہوجاتی ہے۔

اسلام شرح صدر چاہتا ہے "فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ

للاسلام"۔ خدا جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کُشادہ کردیتا ہے۔

۔ شرح صدر کا اثر نورانیت ہے "ومن یشرح صدرہ للاسلام فھو علیٰ نور من ربہ"۔ جس کا سینہ اسلام کے لئے کُشادہ ہوجاتا ہے وہ پروردگار کی طرف سے نور کا حامل ہوتا ہے۔

۔ شرح صدر نہ ہو تو ایمان نہیں ہے "فلا وربک لا یومنون .... ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت" خدا کی قسم یہ لوگ صاحب ایمان نہیں ہوسکتے جب تک اختلافات میں پیغمبرؐ سے فیصلہ نہ کرائیں اور پھر فیصلہ کے خلاف دل میں تنگی کا احساس نہ کریں۔

۔ جناب موسیٰ کے پاس عصا اور ید بیضا موجود ہے لیکن پھر بھی وزیر کی ضرورت ہے۔ صامت کرامات ناطق معجزہ سے بے نیاز نہیں بنا سکتیں۔

جناب موسیٰ نے نام اور رشتہ سب بتادیا لیکن پروردگار سے مطالبہ کیا کہ تو وزیر بنادے۔ خود ہارون کو وزیر نامزد نہیں کیا۔ "بلّغ ما انزل الیک من ربّک"۔

۔ جناب موسیٰ نے وزیر کے بغیر کار تبلیغ شروع نہیں کیا "انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھداً علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً"۔ ہم نے تمہاری طرف ایک رسول کو شاہد بنا کر اسی طرح بھیجا ہے جس طرح کل فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ گویا سرکار دو عالمؐ اپنے دور کے موسیٰ ہیں اور ماحول فرعون بے سامان۔

۔ پیغمبرؐ کا وزیر صرف نائب نہیں ہوتا ہے بلکہ شریک کار بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاسکتا ہے۔

استنتاج

• شیطان نے اپنا مرکز سینہ کو قرار دیا تو پروردگار نے اپنا عرش قلب مومن کو قرار دیا تاکہ عقیدہ ہر حملہ سے محفوظ رہے۔

• جن کے یہاں بھی پیغمبرؐ کے فیصلہ کے خلاف تنگ دلی پائی جاتی ہے وہ صاحب ایمان نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔

• جناب موسیٰؑ کی دعا دلیل ہے کہ وزارت کا عہدہ پروردگار کے علاوہ کوئی پیغمبر بھی نہیں دے سکتا ہے۔

• جناب موسیٰؑ نے اپنے وزیر کی فصاحت کا اعلان کیا تو سرکار دوعالمؐ کے وزیر کا کلام نہج بلاغت بن گیا۔

• جناب موسیٰؑ کو ساری نعمتیں دعا کے بعد ملیں اور سرکار دوعالمؐ سے ارشاد ہوا "ألم نشرح لك صدرك....

۔ جناب موسیٰؑ کو مانگنے پر ملا تھا لہٰذا معاوضہ کا مطالبہ نہیں ہوا۔ سرکار دوعالمؐ کو بے طلب دیا تھا لہٰذا اس کا معاوضہ یہ قرار پایا "فاذا فرغت فانصب"۔

وزارت کے مختلف شعبے ہوتے ہیں: وزارت تعلیم۔ وزارت داخلہ۔ وزارت خارجہ۔ وزارت دفاع۔ مواصلات، صنعت، تجارت وغیرہ۔ پیغمبر اسلامؐ کا ایک وزیر تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ انا مدینة العلم وعلی بابها۔ یا علی حبك ایمان۔ بغضك کفر۔ لاعطین الرّایة غداً۔ انی اعرف بطرق السماء۔ خاصف النعل۔ من الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات الله والله رؤف بالعباد۔!

حق طہارت

اسلام نے طہارت پر جس قدر زور دیا ہے اور اسے جس قدر اہم قرار دیا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب یا نظام میں نہیں ہے۔

• اسلام میں طہارت محبوبیت پروردگار کا بہترین ذریعہ ہے" ان الله یحب التوابین ویحب المتطهرین" (بقرہ-۲۲۲)

• قرآن کو مس کرنا اور اس کے حقائق کا ادراک کرنا صرف منطہرین کا کام ہے "لا یمسه الا المطّهرون۔ (واقعہ-۷۹)

• بزرگ ترین گھروں کے سکان کی پہچان یہ ہے کہ وہ طہارت کو دوست رکھتے ہیں" فیه رجال یحبون ان یتطهروا"۔ (توبہ-۱۰۸)

• جنت کی حوریں ازواج مطہرہ ہیں" ولهم فیها ازواج مطهرة"۔ (بقرہ-۲۵)

• خلیل و ذبیح کا فریضہ یہ تھا کہ خانۂ خدا کی طہارت کا اہتمام کریں" وعهدنا الیٰ ابراهیم واسمٰعیل ان طهرا بیتی"۔ (بقرہ-۱۲۵)

• آسمان سے پانی طہارت کے لئے نازل کیا گیا ہے" وینزل علیکم من السماء ماءً لیطهرکم به"۔ (انفال-۱۱)

• صدقہ انسان کی طہارت کے لئے واجب کیا گیا ہے" خذ من اموالهم صدقة تطهرهم"۔ (توبہ-۱۰۳)

اقسامِ طہارت

اسلام میں طہارت کی دو[۲] قسمیں ہیں: طہارت[۱] ظاہری اور طہارت[۲] باطنی۔

طہارت ظاہری کا تعلق لباس اور بدن سے ہوتا ہے لیکن طہارت باطنی کا تعلق نفس اور روح سے ہوتا ہے جہاں انسان خباثتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور معنوی کمالات سے آراستہ و پیراستہ ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ظاہری طہارت کا وہ مرتبہ نہیں ہے جو باطنی طہارت کا ہے اور در حقیقت طہارت اُسی طہارت کو کہا جاتا ہے جس کا تعلق نفس اور روح سے ہوتا ہے ورنہ انسان کی انسانیت اور اس کا واقعی کمال نہ اس کے لباس سے وابستہ ہے اور نہ بدن سے۔ انسان کی انسانیت کا دار و مدار نفس و روح پر ہے لہٰذا اس کے کمال طہارت کا تعلق بھی اس کے باطن اور معنویات ہی سے ہوگا۔

درجات طہارت

• طہارت نفس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان واجبات کا لحاظ رکھے اور محرمات سے پرہیز کرے۔ اس لئے کہ ترک واجب اور فعل حرام ہی وہ شے ہے جو انسان کے نفس کو خبیث اور ناپاک بنا دیتا ہے اور اس کی طہارت کا بہترین ذریعہ عبادت و بندگی اور واجبات و محرمات کا مکمل لحاظ ہے۔

• طہارت نفس کا دوسرا مرتبہ مستحبات کی پابندی اور مکروہات سے پرہیز ہے کہ ترک مستحب اور فعل مکروہ انسان کے نفس کو واجبات و محرمات کی طرح خبیث و کثیف نہیں بنا سکتا ہے لیکن مستحبات کی طرف سے لاپرواہی اور مکروہات کی پسندیدگی اس بات کی علامت ہے کہ نفس میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور پائی جاتی ہے۔

• طہارت نفس کا تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان مکروہات سے پرہیز کی طرح ترک اولیٰ سے بھی محفوظ رہے اور کوئی ایسا کام بھی ترک نہ کرے جس کا کرنا کسی بھی اعتبار سے اولویت رکھتا ہو اور اس کا ترک کر دینا نفس کی کسی کمزوری کی علامت بن جائے۔

• ظاہر ہے کہ انسان کا اس آخری درجۂ طہارت تک پہونچ جانا ناممکن نہیں تو دشوار گذار ضرور ہے اور ناممکن ہے کہ انسان بے پناہ ریاضت و مشقت کے بغیر اس

درجۂ کمال کا تصور بھی کر سکے۔ اس منزل تک پہونچنا تو عام شہدا و صالحین کو بھی نصیب نہیں ہوتا ہے۔ عوام الناس اور مسلمین و مومنین کا کیا ذکر ہے۔

لیکن اس کے بعد انسان کی زندگی میں دو کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو اس کے کمال طہارت نفس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں اور وہ حق طہارت کی منزل پر فائز نہیں ہو سکتا ہے۔ ایک کمزوری سہو و نسیان کی ہے کہ انسان کمال طہارت کے باوجود اگر سہو و نسیان سے محفوظ نہیں ہے تو کسی وقت بھی مکروہ یا ترک اولیٰ کا ارتکاب کر سکتا ہے اور اس طرح سہو و نسیان کے طفیل میں منزل کمال سے نیچے آسکتا ہے۔

دوسری کمزوری خواب غفلت کی ہے کہ انسان فطری طور پر خواب غفلت سے بری نہیں ہے اور اس طرح اس کی زندگی میں ہر وقت یہ امکان پایا جاتا ہے کہ بیداری میں کمال کردار کے باوجود خواب میں ازراہِ غفلت کوئی ایسا عمل انجام دیدے جو بیداری کے اعتبار سے حرام۔ مکروہ یا ترک اولیٰ کی حیثیت رکھتا ہو کہ اس طرح مجرم اور خطاکار تو نہ ہوگا لیکن کمال طہارت نفس سے محروم ضرور ہو جائے گا۔

استفادہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ حق طہارت کا واقعی مفہوم انتہائی بلند ترین مفہوم ہے جہاں زندگی میں نہ حرام کا گذر ہوتا ہے نہ مکروہ کا۔ حق طہارت کا مالک نہ ناپسندیدہ عمل کر سکتا ہے اور نہ کسی اولیٰ کو ترک کر سکتا ہے۔

اور اس کا کمال بھی یہ ہے کہ اس کی زندگی پر نہ سہو و نسیان کی حکومت ہوتی ہے اور نہ خواب غفلت کی۔ وہ بیداری اور خواب دونوں میں پاکیزہ نفس ہوتا ہے اور سہو و نسیان سے اس قدر مبرّا اور منزّہ ہوتا ہے کہ بھول چوک میں بھی کسی کمزوری کا راستہ اختیار نہیں کر سکتا ہے۔

مذکورہ بالا خصوصیات کو دیکھنے کے بعد آیت کریمہ کا صحیح مفہوم محسوس کیا جا سکتا ہے "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس ویطھرکم تطھیرا"۔

وراثت کتاب

وراثت کتاب کا فیصلہ کرنے کے لئے چند امور کا لحاظ ضروری ہے:
شان وراثت، وجہ وراثت، عظمت میراث۔

• شان وراثت کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ وراثت اور مال میں مناسبت ضروری ہے۔ پروردگار نے مادی میراث میں بھی کافر اور قاتل کو وارث نہیں قرار دیا ہے اور معنوی وراثت "جنّت" میں صاف واضح کر دیا ہے کہ اس کے وارث صرف وہ افراد ہوں گے جو متقی اور پرہیزگار ہوں گے۔ وراثت کتاب کے لئے اصطفاء کی شرط اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

• مقدمات میں وارث اسی کو تسلیم کیا جاتا ہے جسے وراثت کا علم ہو ورنہ مال سے بے خبر افراد کو کوئی مال کا وارث ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔ بنا بریں وارث کتاب وہی انسان ہوگا جس کی طرف سے یہ دعویٰ ہو سکتا ہو کہ میں ہر ایک آیت کے بارے میں تمام خصوصیات نزول سے بھی واقف ہوں کہ کب اور کہاں نازل ہوئی ہے اور خصوصیات مفہوم سے بھی آشنا ہوں کہ عام ہے یا خاص، ناسخ ہے یا منسوخ، مطلق ہے یا مقید، مجمل ہے یا مبیّن وغیرہ۔

• الفاظ کے معنی اور مفہوم میں لہجہ کی تبدیلی سے بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا علم کتاب کے لئے لہجۂ قدرت کی معرفت ضروری ہے تاکہ انسان حقیقی معانی کا ادراک کر سکے اور صرف لغت کے بھروسہ پر الفاظ کی تفسیر نہ کرے۔

• وجہ وراثت کے بارے میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں:

• وارث کو صاحب مال سے قرابت کا حامل ہونا چاہیئے۔ اگر مال مادی ہے تو قرابت مادی رشتوں کی ہوگی اور وارث باپ، بیٹا۔ بھائی یا چچا اور ماموں ہوگا۔ اور وراثت معنوی ہے تو قرابت بھی معنوی ہوگی اور جس طرح بیٹا باپ کا ایک جزء ہوتا ہے اسی طرح وارث مالک کے لئے منّیت کا حامل ہوگا۔

• ورثہ میں بلا فصل رشتہ دار کے ہوتے ہوئے طبقہ دوم وارث نہیں ہوتا ہے لہذا منّی کے مصداق کے موجود ہوتے ہوئے "بزم نشین" وراثت کا دعویٰ نہیں کر سکتے ہیں۔

• متروکات میں صامت اور ناطق دو چیزیں ہوں تو ناطق کو صامت کا وارث قرار دیا جاتا ہے۔ صاحب کتاب نے ثقلین کو چھوڑ کر دنیا سے سفر کیا ہے تو عترت کو کتاب کا وارث ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ عترت ناطق ہے اور قرآن صامت۔

• وراثت میں قرابت کے بعد سن و سال کی قید نہیں ہوتی ہے لہٰذا جو شخص بھی صاحب کتاب سے معنوی قرب کا حامل ہوگا وہ وارث کتاب ہوگا چاہے بوڑھا ہو یا بچہ۔

• وراثت میں مال پر تصرف کرنے کا اختیار وارث کو ہوتا ہے لہٰذا کتاب کے مفہوم کی تعیین کا اختیار بھی وارث کتاب کو ہوگا۔ دیگر افراد کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

• عظمت میراث کے بارے میں حسب ذیل آیات کو دیکھنے کے بعد وارثِ کتاب کو معین کیا جا سکتا ہے۔

• یٰسٓ والقرآن الحکیم۔
• قٓ والقرآن المجید۔
• لقد آتیناك سبعًا من المثانی والقرآن العظیم۔
• انہ لقرآن کریم۔
• لو انزلنا ھٰذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعًا من خشیۃ اللہ۔ (حشر ۲۱)
• ولو ان قرآنًا سیرت بہ الجبال او قطعت بہ الارض او کلم بہ الموتیٰ۔ (رعد ۳۱)

- ذٰلك الكتاب لاريب فيه هدى للمتقين۔ (الٓمٓ)
- نزل عليكم الكتاب مصدقاً لما بين يديه۔ آل عمران)
- ولا رطب ولا يابس الّا فی کتاب مبين۔ (انعام ۵۹)
- ولا اصغر من ذٰلك ولا اكبر الّا فی کتاب مبين۔ (سبا ۳)

استنتاج

مذکورہ آیات کریمہ کی روشنی میں وارث کتاب کو صاحب حکمت، صاحب مجد و بزرگی۔ صاحب عظمت وکرم۔ حاکم ارض وجبال۔ صاحب طی الارض واحیاء الموتیٰ۔ امام المتقین۔ مصدق رسل اور عالم ما کان وما یکون ہونا چاہیئے۔ پھر کتاب کے حق ہونے کی بنا پر حق کو اس کے ساتھ اُدھر اُدھر مڑ جانا چاہیئے جس طرف اس کا رُخ مڑ جائے۔

استغفار معصومؑ

• ائمہ طاہرینؑ، اور سرکار دو عالمؐ کی تاریخ حیات میں استغفار کا ذکر دیکھ کر اکثر لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حضرات بھی معصوم نہیں تھے ورنہ عصمت کے بعد استغفار کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔ ان بیچاروں کا خیال یہ ہے کہ استغفار صرف گناہوں کو بخشوانے کے لئے ہوتا ہے اور انسان کی زندگی میں گناہ نہ ہو تو اسے "استغفر اللہ ربی واتوب الیہ" کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ غالباً ان حضرات نے قرآن کریم کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ انھیں اندازہ ہوتا کہ پروردگار کے نزدیک توبہ اور استغفار کی کیا حیثیت ہے اور اسے مالک نے کیا درجہ دیا ہے۔

۔ استغفار بلندیٔ درجات کا ذریعہ ہے ۔ "ثم افیضوا من حیث افاض الناس واستغفروا اللہ"۔ مزدلفہ سے منیٰ کی طرف تمام لوگوں کے ساتھ کوچ کرو اور اللہ سے استغفار کرو۔

ظاہر ہے کہ عرفات ومزدلفہ میں قیام کرنا کوئی جُرم نہیں تھا کہ اس کے لئے استغفار ضروری ہوتا۔

۔ استغفار شکر خدا ہے ۔ "ھو انشاٴکم من الارض واستعمرکم فیھا فاستغفروا" (خدا نے تمھیں زمین سے پیدا کر کے زمین میں آباد کر دیا ہے لہذا اس کی بارگاہ میں استغفار کرو)۔

۔ استغفار ایک قسم کی سفارش ۔ "فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیماً" (اگر یہ لوگ استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے لئے استغفار کرتا تو یہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے)۔ یہاں رسولؐ کا استغفار کسی گناہ

کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی شفاعت ہے۔

ــ استغفار وجہ برکات۔ "فقلت استغفروا ربکم انہ کان غفاراً٥ یرسل السماء علیکم مدراراً٥ ویمددکم باموال وبنین ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انہارا۔" (نوح ۱۰)

"میں نے قوم سے کہا کہ اپنے پروردگار سے استغفار کرو۔ وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ آسمان سے موسلادھار بارش کرے گا۔ اموال و اولاد سے تمھاری امداد کرے گا۔ تمھارے لئے باغات اور نہریں قرار دے گا۔"

انسان ان تمام برکات سے فائدہ اٹھانا چاہے تو ان سب کا واحد ذریعہ استغفار ہے۔ استغفار کے لئے گناہوں کی بخشش کا نظر میں رکھنا شرط نہیں ہے۔

ــ استغفار علامت بلندیٔ ایمان۔ "العابدین والصادقین والقانتین والمستغفرین بالاسحار۔" (آل عمران ۱۷)

"اہل جنت کی پہچان یہ ہے کہ وہ صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، دعا کرنے والے اور وقت سحر استغفار کرنے والے ہیں۔"

ــ توبہ وجہ محبوبیت۔ "ان اللّٰہ یحب التوابین" ــ "پروردگار توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

• توبہ و استغفار کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ یہ دونوں جذبات انسان کی اپنی بے مائگی اور پروردگار کی عظمت کے احساس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے گھر میں عظیم شخصیت کو مدعو کرنے والا ساری کائنات کی غذائیں بھی سامنے لاکر رکھ دے تو مہمان سے معذرت کرتا ہے کہ اپنی حیثیت سے زیادہ کردیا ہے لیکن مہمان کی حیثیت کے مطابق نہیں کرسکا ہے۔

خاصان خدا کا استغفار اسی جذبہ کے تحت ہوتا ہے کہ انھیں عظمت پروردگار کا احساس ہوتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اپنی حیثیت سے کتنا ہی زیادہ بلند تر عمل کیوں نہ کردیا جائے عظمت پروردگار کے مطابق نہیں ہوسکتا ہے لہٰذا اس کی معافی طلب کرنا ضروری ہے کہ اس سے کم سے کم اس بات کا اظہار تو ہوتا ہے کہ انسان انانیت کا شکار نہیں ہے بلکہ

اسے عظمت پروردگار کا احساس ہے۔

• دنیا میں جذبات کے تبادلہ کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی عظمت کا اقرار کرکے اس کے سامنے کوتاہیٔ عمل کا اعتراف کرتا ہے تو وہ اس سے فطری طور پر محبت کرتا ہے اور زیادہ مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے کہ اسے میری حیثیت کا احساس ہے۔ اس کے برخلاف تکبّر و استکبار سے کام لینے والے سے کوئی ہمدردی نہیں کرتا ہے۔

اللہ کے معصوم بندوں کا بھی یہی طریقۂ کار تھا کہ پروردگار کی بارگاہ میں اس کی عظمت اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کی مہربانی کا استحقاق پیدا ہوسکے۔

• تبادلہ محبت کا ایک انداز یہ بھی دیکھا ہے کہ کمزور انسان جب بڑے انسان کے سامنے اپنی حقارت اور اس کی عظمت کا برملا اقرار کرتا ہے تو وہ بھی اس کے عمل کی قدردانی کا اظہار کرتا ہے اور عمل اُس کے اعتبار سے معمولی بھی ہو تو اسے عظیم بناکر پیش کرتا ہے۔

پروردگار اپنے بندوں سے بے پناہ محبّت کرنے والا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میری عظمت کے مطابق نہ کسی کا عمل ہے نہ کسی کی محنت۔ لیکن اس کے باوجود جب بندہ استغفار کرنے لگتا ہے تو وہ آواز دیتا ہے۔ طٰہٰ ہم نے مشقت کے واسطے قرآن نازل نہیں کیا ہے۔ مزمل ذرا راتوں کو آرام کرلیا کرو۔ اہلبیتؑ! ہم نے تمھاری سعی کو مشکور قرار دے دیا ہے تاکہ دنیا محسوس کرلے کہ اگر بندہ بے گناہ ہوکر اعتراف قصور کرنا جانتا ہے تو ہم بھی اس جذبہ خیر و صلاح کی قدردانی کرنا جانتے ہیں۔!

اخلاص نیت

• اگر کسی شخص نے خلوص نیت سے شہادت کی دعا کی تو خدا اسے شہداء کا درجہ دیدے گا چاہے بستر ہی پر کیوں نہ شہید ہو۔ رسول اکرمؐ (صحیح مسلم ۳/ ۱۵۱۷)

• بہت سے لوگ ہیں جو اسلحہ سے مارے گئے لیکن شہید نہیں ہیں اور بہت سے لوگ جو بستر پر مر گئے ہیں لیکن صدیق و شہید ہیں۔ رسول اکرمؐ (کنزالعمال خ ۱۱۲۰۰)

شہادت حکمیہ

• جس شخص کا مال ناحق غصب کیا جائے اور وہ تحفظ میں مارا جائے تو وہ بھی شہید ہے ۔ رسول اکرمؐ (کنز العمال خ ۱۱۲۰۳)

• جو شخص اپنے اہل کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے اور جو اپنے مال کی حفاظت میں یا اپنے ہمسایہ کی حفاظت میں یا راہ خدا میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔
(کنز العمال ۱۱۲۳۷)

• بہترین موت یہ ہے کہ انسان اپنے حق کے تحفظ میں مر جائے ۔ (کنز العمال خ ۱۱۲۰۹)

• جو شخص اپنے عشق پر پردہ ڈال کر اپنی عفت کو بچا لے وہ بھی شہید ہے ۔
(کنز العمال خ ۱۱۲۰۳)

• راہ خدا میں جہاد کر کے قتل ہو جانے والے کا اجر اس سے زیادہ نہیں ہے جو حالات ساز گار ہونے کے باوجود پاکدامن رہ جائے ۔ امیر المومنینؑ (نہج البلاغہ حکمت ۴۷۴)

• راہ خدا میں جنگ کر کے شہید ہونے والے کے علاوہ نیزہ کا زخم کھانے والا ___ مرض اسہال کا مبتلا ۔ پانی میں ڈوب جانے والا ۔ دیوار کے نیچے دب جانے والا اور وضع حمل کی تکلیف سے مر جانے والی عورت سب شہید ہیں ۔ رسول اکرمؐ (بحار ۸۱/ ۲۴۵)

• طاعون کی موت مرد مسلم کے لئے شہادت ہے ۔ رسول اکرم (صحیح مسلم ۳/۱۵۲۲)

• مومن کسی حال میں اور کسی وقت بھی مر جائے شہید ہوتا ہے ۔ (امیر المومنینؑ بحار ۶۸/۱۴۰)

• جو آل محمدؐ کی محبت پر مر جائے وہ شہید مرتا ہے ۔ رسول اکرمؐ (بحار ۶۸/ ۱۳۷)

• ہمارا ہر شیعہ صدیق اور شہید ہوتا ہے ۔ یا بن رسول اللہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے یہ لوگ تو بستر پر مرتے ہیں ؟ ۔ فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے کہ "جو لوگ خدا اور رسولؐ پر ایمان لے آئے وہ سب صدیق اور شہید ہیں" ۔ اگر شہادت صرف قتل سے ہوتی تو شہدار کی تعداد کس قدر کم ہوتی ۔ امام حسینؑ (بحار ۸۲/ ۱۷۳ ۔ امام زین العابدین (نور الثقلین)

• تم میں سے جو شخص بھی خدا اور رسولؐ اور اہلبیتؑ کی معرفت رکھتے ہوئے بستر پر مر جائے وہ شہید مرے گا اور اس کا اجر پروردگار کے ذمہ ہوگا ۔ وہ اسے تمام نیک

اعمال کا اجر دے گا جس کا ارادہ کیا تھا اور ارادہ ہی تلوار کھینچنے کا قائمقام ہو جائے گا ۔
امیر المومنینؑ (شرح النہج ۱۳/ ۱۱۱)

• زمانۂ غیبت قائمؑ میں جو شخص بھی ہماری محبت میں مر جائے خدا اسے شہدا بدر واحد جیسے ہزار شہیدوں کا اجر عطا کرے گا ۔
(امام زین العابدینؑ ۔ بحار ۸۲/ ۱۷۳)

سید الشہدار

• امیر المومنینؑ نے معاویہ کے خط میں تحریر فرمایا کہ میں صرف نعمت الٰہی کا تذکرہ کر رہا ہوں کہ مہاجرین و انصار کے تمام شہدار صاحبان فضل ہیں لیکن سید الشہدار ہمارا ہی شہید حمزہ ہے جس کے جنازہ پر رسول نے ۷۰ تکبیریں کہی تھیں ۔ (نہج البلاغہ مکتوب ۲۸)

شہادت اور اہلبیتؑ

• میرے جد بزرگوار نے بیان کیا ہے کہ امر خلافت کے مالک میرے خاندان کے بارہ افراد ہوں گے لیکن ہم میں کا ہر ایک مقتول ہوگا یا زہر سے شہید کیا جائے گا ۔
امام حسنؑ (بحار ۲۷/ ۲۱۷)

• ہم میں کا ہر ایک مقتول ہے ۔ امام رضاؑ (۲۷/ ۲۱۴)

• خدا کی قسم ہم میں کا ہر ایک مقتول اور شہید ہے ۔ امام صادقؑ (بحار ۲۷/۲۰۹)

استنتاج

• لفظ شہید دنیا کی ہر قوم میں محترم ہے ۔ احترام کے تمام القاب و خطابات اقوام میں بٹے ہوئے ہیں لیکن شہادت کا احترام جملہ اقوام میں مسلم الثبوت ہے ۔

• ہر نیکی سے بالاتر نیکی ہے ۔ لیکن شہادت سے بالاتر کوئی نیکی نہیں ہے کہ زندگی سے بالاتر کوئی دولت نہیں ہے ۔

• شہادت ایک مرگ مقدس ہے جہاں حوصلہ کا اظہار بھی ہوتا ہے اور مقصد کی بلندی

بھی ہوتی ہے۔

• ناواقفیت کی موت "مرگ ناگہانی" ہے۔ شہادت نہیں ہے لہٰذا شہید کو جان بوجھ کر موت کے میدان میں قدم رکھنا ہوگا۔

• شہادت عبادت ہے کہ شہید کا رُخ ہمیشہ پروردگار کی طرف ہوتا ہے (یقاتلون فی سبیل اللہ)۔

• شہادت ہر عبادت سے افضل ہے کہ اس میں توجہ الی اللہ کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔

• شہید ساری قوم کا خادم اور محسن ہوتا ہے کہ اس نے جان دے کر سب کا دین بچایا ہے۔ یہ وہ شمع ہے جو خود جل جاتی ہے لیکن انجمن کو منور کر دیتی ہے۔

• شہید کا بدن بھی محترم ہے کہ اس کے احکام عام افراد سے الگ ہیں۔

• شہید کا خون بھی محترم ہے کہ اسے دھویا نہیں جاتا ہے۔

• شہید کو درجہ شفاعت سے نوازا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی سفارش بھی کر سکتا ہے۔

• شہید کی سب سے بڑی ذمہ داری جہاد ہے جسے بطور فرض انجام دینا ہے نہ برائے فائدہ۔

• خاک تربت شہید اس قدر محترم ہے کہ جناب فاطمہؑ نے قبر جناب حمزہ کی تسبیح بنائی۔

• خاک تربت سید الشہداء کا کمال یہ ہے کہ وہ خود تسبیح پروردگار کرتی ہے۔

• شہید مرنے سے پہلے جنّت کا مشاہدہ کر لیتا ہے "یدخلھم الجنۃ عرفھا لھم (سورۂ محمدؐ)

• شہید بہادر ہوتا ہے کہ جان قربان کر دیتا ہے اور عالم ہوتا ہے کہ قربانی کے موارد سے باخبر ہوتا ہے۔ زادہ بسطۃ فی العلم والجسم۔

• شہید روز قیامت گواہ بنا کر لایا جائے گا۔ جناب حمزہ و جعفر انبیاء کرام کی تبلیغ کی گواہی دیں گے۔

• شہید کی منطق دنیا سے الگ ہوتی ہے وہ محمد حنفیہ اور ابن عباس کے مشوروں پر عمل نہیں کر سکتا ہے۔

تاریخ شہادت میں چند نمونے عظیم ترین ہیں:

۱۔ عمرو بن الجموح کے پیر میں لنگ تھا۔ ان کے چار فرزند جہاد کے لیے احد میں تیار

تھے لیکن اس کے باوجود رسول اکرمؐ سے اجازت لے کر شریک جہاد ہوئے اور درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان کی زوجہ ہند میدان میں آئی۔ شوہر، فرزند اور برادر سب کے لاشے اونٹ پر لاد کر مدینہ کی طرف چلی۔ اونٹ بیٹھ گیا۔ بیحد کوشش کی لیکن نہ چلا۔ جب احد کی طرف واپس چلی تو تیز رفتاری سے چلنے لگا۔ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا کہ یہ اونٹ مامور ہے۔ عمرو نے دعا کی تھی کہ خدایا! مجھے مدینہ واپس نہ کرنا، لہٰذا اب وہ میدان ہی میں دفن ہوں گے۔

۲۔ حنظلہ۔ ان کا باپ ابو عامر بدترین دشمن اسلام تھا۔ احد سے ایک روز قبل شادی ہوئی۔ زوجہ بدترین منافق عبداللہ بن اُبی بن سلول کی بیٹی تھی۔ رسول اکرمؐ کی اجازت سے شب زوجہ کے ساتھ گذاری اور صبح سویرے لشکر اسلام میں شامل ہو گئے۔ زوجہ نے لوگوں کو گواہ بنایا کہ رات کو تعلقات قائم ہو چکے ہیں لیکن حنظلہ میں شوق شہادت پایا جاتا ہے لہٰذا میں نے رخصت کر دیا۔ میدان میں شہید ہو گئے تو رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ میں نے آسمان و زمین کے درمیان ملائکہ کو دیکھا ہے جو حنظلہ کی لاش کو غسل دے رہے تھے اس لیے کہ وہ حالت جنابت میں شہید ہوئے ہیں۔

دعوت الی اللہ

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

" ادع الیٰ سبیل ربّک بالحکمة والموعظة الحسنة
وجادلھم بالتی ھی احسن "

(پیغمبرؐ! آپ اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف
دعوت دیں۔ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ اور ان سے
اس طرح بحث کریں جو بہترین طریقہ ہو)۔

آیت کریمہ نے کم سے کم اس نکتہ کی وضاحت کردی ہے کہ اسلام انفرادی قانون نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی نظام ہے جس میں دعوت الی اللہ بھی ایک فریضہ ہے۔ اسلام انفرادی طریقۂ زندگی ہوتا تو انبیاء و مرسلین کے آنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان کا کردار پہلے ہی سے طیّب و طاہر اور پاک و پاکیزہ تھا اور دوسروں کے حالات پر توجہ دینا کوئی فریضہ نہیں تھا اور اس طرح سارا نظام فضول اور بے فائدہ ہو کر رہ جاتا۔ انبیاء و مرسلین کی بعثت کی ضرورت ہی اس لئے پڑی کہ یہ ایک اجتماعی نظام تھا اور اس میں ہر ایک کو دوسرے کے حالات پر توجہ دینا اور اس کی اصلاح کرنا ایک فریضہ تھا۔

اسلام کے ساتھ سب سے بڑا حادثہ یہ ہوا کہ یہ بنیادی طور پر انتہائی مثبت اور فعال قانون تھا جو سماج کے اندر رہ کر سماج کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نزول ہی مکہ کے جاہلوں کے درمیان ہوا تھا تاکہ ان کے نفوس کو پاکیزہ بنا کر انھیں کتاب و حکمت سے آشنا بنایا جاسکے۔

لیکن استعماری سازشوں نے اس کے ہر مثبت پہلو کو منفی بنا دیا اور اسے سماج اور معاشرہ سے کوسوں دور لے جاکر پھینک دیا۔ اب عالم کا مطلب یہ ہے کہ انسان حجرہ میں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے اور سماج کے حالات سے بالکل بے خبر رہے۔ مقدس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کے تمام منکرات کو دیکھتا رہے اور مُڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کرے کہ مبادا اسے دنیا دار نہ کہہ دیا جائے۔ حد یہ ہے کہ بازار کا سودا بھی دوسرے افراد سے منگائے اور خود بازار میں قدم نہ رکھے۔ جب کہ مکہ کے کفار و مشرکین نے مرسل اعظمؐ پر یہی اعتراض کیا تھا کہ یہ بازار میں گردش کرتے رہتے ہیں تو رسول کس طرح ہوسکتے ہیں۔ گویا اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ ان کی زندگی سماج اور معاشرہ سے الگ نہیں ہے بلکہ معاشرہ کے اندر رہی ہے۔

زہد کا تصور ترک دنیا اور ترک لذّات کا ہے اور صبر ہر ذلّت کو برداشت کرلینے کے معنی میں ہے۔ گریہ اذیتوں کا تحمّل ہے اور انتظار بدترین حالات میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کسی مصلح کی آس لگانا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اچھا خاصا فعال نظام بدعملی کا شکار ہوگیا اور اصلاح عالم کے سارے راستے بند ہوگئے۔ حالانکہ نہج البلاغہ ہی کا مطالعہ کرلیا جائے تو اس میں اس طرح کے تمام مہمل نظریات کی تردید انتہائی صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

۔ علماء کے بارے میں مولائے کائنات کا ارشاد ہے کہ "خدا نے علماء سے عہد لے لیا ہے کہ مظلوم کی بھوک اور ظالم کی شکم سیری پر مطمئن نہ بیٹھیں" جو اس بات کی علامت ہے کہ سماج کے بدترین حالات پر خاموش بیٹھ جانا عالم کا کام نہیں ہے۔ جہلاء کا کام ہے۔

۔ تقویٰ کے بارے میں نہج البلاغہ میں ایک مستقل خطبہ ہے جس میں متقین کے تمام مثبت اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے۔ "متقین وہ ہیں جن کی گفتگو نپی تلی۔ لباس میانہ۔ رفتار متواضع۔ محرمات سے نگاہیں نیچی کئے ہوئے اور مفید باتوں کے مسلسل سننے والے ہیں۔۔۔ خالق ان کی نگاہ میں عظیم اور دنیا ان کی نگاہ میں حقیر ہوتی ہے۔۔۔ قلیل اعمال پر راضی نہیں ہوتے ہیں اور زیادہ اعمال کو زیادہ نہیں سمجھتے ہیں۔"

مذکورہ بالا فقرات سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ متقین چپ نہیں رہتے ہیں بلکہ سوچ سمجھ کر

بولتے ہیں۔ فقیرانہ ملبوس پر گذارا نہیں کرتے بلکہ فضول خرچی سے پرہیز کرتے ہیں۔ ایک مقام پر نہیں بیٹھتے ہیں بلکہ متواضع رفتار سے چلتے رہتے ہیں۔ سماج میں باہر نکلتے ہیں لیکن نگاہیں نیچی رکھتے ہیں۔ مہمل باتوں پر توجہ نہیں دیتے ہیں لیکن کارآمد باتیں سنتے ہیں۔ دنیا سے الگ نہیں ہیں بلکہ دنیا کو عظمت خالق کے مقابلہ میں حقیر سمجھتے ہیں۔ بے عمل نہیں ہوتے ہیں بلکہ کثیر اعمال کو بھی قلیل تصور کرتے ہیں۔ اور یہ تمام باتیں اس تصور سے قطعاً مختلف ہیں کہ اسلام ترک دنیا کا مذہب ہے۔

زہد کے بارے میں مولائے کائنات نے نہایت مختصر الفاظ میں فرما دیا ہے کہ "زہد یہ نہیں ہے کہ تم کسی شے کے مالک نہ ہو بلکہ زہد یہ ہے کہ کوئی شے تمھاری مالک نہ بننے پائے" اور یہ بات زہد کے عام تصوّر سے بالکل متضاد ہے جہاں زہد ترک لذّات کا نام ہے اور ترک لذات کا جذبہ ہی انسان پر حکمرانی کرتا ہے۔

مذکورہ بالا تمہید کے بعد اسلام کے انداز دعوت پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اسلام نے اپنے انداز دعوت کو مخاطبین کے اعتبار سے تین قسموں پر تقسیم کر دیا ہے اس لئے کہ معاشرہ کے افراد بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔

بعض لوگ مسائل کو عقل و منطق کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں اور کوئی بات مطابق عقل و فہم ہوتی ہے تو قبول کر لیتے ہیں ورنہ ٹھکرا دیتے ہیں۔ اسلام نے ایسے افراد کے لئے حکمت کا راستہ اختیار کیا ہے۔ حکمت محکم اور پائیدار انداز گفتگو کا نام ہے اور یہ طریقہ کار انھیں افراد کے کام آتا ہے جو صاحبانِ عقل و فہم اور حاملانِ فکر و دانش ہوتے ہیں ورنہ عوام الناس کیلئے یہ طریقۂ تفہیم قطعی طور پر بیکار اور بے فائدہ ہے۔

دوسری قسم ان عوام الناس کی ہے جن کے پاس عقل و فکر کی بلندیاں تو نہیں ہیں لیکن جذبات و احساسات ضرور ہیں کہ اگر بات ان کے جذبات سے ہم آہنگ ہو جائے تو فوراً قبول کر لیتے ہیں ورنہ اس سے ہٹ کر ان میں دلائل و براہین کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ اسلام نے ایسے لوگوں کے لئے موعظہ حسنہ اور نیک نصیحت کا راستہ رکھا ہے جس کے ذریعہ احساسات کو بیدار کیا جاتا ہے اور جذبات کے اطمینان کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

تیسری قسم ان نالائق افراد کی ہوتی ہے جو ضدی۔ ہٹ دھرم اور فتنہ پرور ہوتے ہیں اور ہر بات کو جھگڑے میں ڈال کر اس سے جان بچا لینا چاہتے ہیں۔ اسلام نے ایسے افراد کے لئے "جدال احسن" کا راستہ رکھا ہے تاکہ بات فتنہ و فساد کی نذر نہ ہونے پائے اور حتی الامکان مفسدوں کو فساد کرنے کا موقع نہ ملے۔

یہ ایک مکمّل نظام دعوت ہے جس پر توجہ دینے کے بعد معاشرہ کے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں اور ہر فساد کی اس طرح اصلاح کی جا سکتی ہے کہ سرکشوں کو نمازی بنا دیا جائے۔ پیٹ کے بندوں کو روزہ دار بنا دیا جائے۔ لٹیروں کو زکوٰۃ و خمس کا پابند بنا دیا جائے۔ برہنہ طواف کرنے والوں کو عظمت احرام سے آشنا کر دیا جائے اور فسادیوں کو مجاہدوں کی شکل دے دی جائے۔

والسّلام علی من اتبع الھدیٰ

شرح صدر

انسان کے دل میں وسعت بھی پائی جاتی ہے اور تنگی بھی۔ اس کا سینہ کشادہ بھی ہوتا ہے اور تنگ بھی۔ ان دونوں صفتوں میں کوئی صفت نہ مطلق طور پر خیر ہے اور نہ شر۔ دونوں کے خیر و شر کا دار و مدار اس امر پر ہے جس کے بارے میں انسان کا دل کشادہ ہوتا ہے یا انسان دل تنگ ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر انسان کا دل خیر، صلاح اور فلاح کے لئے کشادہ ہو جائے تو انسان بہترین انسان ہے اور یہی دل اگر شر، فساد اور ظلم کے لئے کشادہ ہو جائے تو انسان بدترین انسان کہے جانے کے قابل ہے۔

انسانی وجود میں دل ایک مرکز ہے اور سینہ اس تک پہونچنے کا راستہ یا دروازہ۔ دل کے وسیع ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں حقائق و معارف، معلومات و اطلاعات کے ذخیرہ کرنے کی صلاحیت ہو، اور سینہ کے کشادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مطالب کے دل تک جانے کا راستہ کھلا ہو۔ ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دل میں حقائق کو جگہ دینے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن سینہ ان مطالب کو وہاں تک پہونچنے ہی نہیں دیتا ہے اور درمیان ہی میں راستہ روک دیتا ہے۔

بینک کے خزانہ میں اموال کے جمع کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے لیکن اگر کوئی انسان رات کے وقت بینک بند ہونے کے بعد اپنے اموال کو جمع کرنا چاہے تو یہ کام ممکن نہیں ہے۔ نہ اس لئے کہ خزانہ میں ذخیرہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کی صلاحیت تو بے پناہ ہے۔ بلکہ اس لئے کہ خزانہ تک پہونچنے کا راستہ نہیں ہے اور اس کا وقت

گذر چکا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حقائق کے قبول کرنے میں زمان و مکان کا بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے ورنہ اس کے بغیر کوئی حقیقت قابل قبول و تاثیر نہیں رہ جاتی ہے۔

شیطان کا سارا حملہ بھی انسان کے سینہ پر ہوتا ہے اور وہ راستہ ہی کو روک دینا چاہتا ہے "یوسوس فی صدور الناس" اور اس کا سبب یہ ہے کہ مالک کائنات نے اپنا عرش مومن کے دل کو قرار دیا ہے۔ شیطان یہ چاہتا ہے کہ سینہ میں وسوسہ پیدا کر کے یادِ خدا کے دل تک پہونچنے کا راستہ بند کر دے اور انسان حقائق سے یکسر غافل ہو جائے اور اس طرح انسان یادِ خدا کے برکات سے محروم رہ جائے۔

اس حقیقت سے اس امر کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شیطان کا حملہ مرکز پر نہیں ہوتا ہے بلکہ دروازہ پر ہوتا ہے تاکہ مرکز تک رسائی کا راستہ بند ہو جائے اور انسان مختلف راستوں میں بھٹکتا رہ جائے۔

سرکار دو عالمؐ نے اپنی ذات کو شہر علم اور علیؑ کو اس کا دروازہ قرار دیا تھا تو شیطان نے بھی طے کر لیا کہ دروازہ پر حملہ کیا جائے تاکہ شہر تک جانے کے امکانات ختم ہو جائیں اور انسان علم سے محروم ہو کر جہالت کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتا رہے۔

قرآن مجید نے شرح صدر کے فوائد و اثرات کا اس انداز سے تذکرہ کیا ہے:

• "ولکن من شرح بالکفر صدرًا فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم"۔ (نحل ۱۰۶)

"جس کا سینہ کفر کے لئے کشادہ رہے اس کے لئے غضب پروردگار بھی ہے اور عذاب عظیم بھی"۔

• "ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقًا"۔ (انعام ۲۵)

"خدا جس کو گمراہی میں رکھنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو تنگ بنا دیتا ہے"۔

• "أفمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علیٰ نور من

ربہ۔" (زمر ۲۲)

"جس کے سینہ کو خدا نے کشادہ بنا دیا ہے۔ وہ اپنے پروردگار کی طرف سے نور کا حامل ہے"۔

• "یا ایها الناس قد جاءتکم موعظة من ربکم وشفاء لما فی الصدور"۔ (یونس ۱۸)

"انسانو! تمھارے پاس وہ پیغام آیا ہے جو پروردگار کی طرف سے موعظہ بھی ہے اور سینہ کی بیماریوں کا علاج بھی ہے"۔

• فمن یرد الله ان یهدیه یشرح صدره للاسلام"۔ (انعام ۱۲۵)

"خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے"۔
شرح صدر کے یہی اثرات تھے جس کی بنا پر جناب موسیٰؑ نے تبلیغ کا آغاز کرنے سے پہلے دعا کی تھی "رب اشرح لی صدری" (خدایا! میرے سینہ کو کشادہ کر دے کہ شرح صدر کے بغیر انسان نہ مصائب کا استقبال کر سکتا ہے اور نہ حقائق کی تبلیغ کی راہ کی زحمتیں برداشت کر سکتا ہے۔

استنتاج:

۔ مذکورہ بالا آیات سے پہلا نتیجہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ بعض افراد کا دل حقائق کے لئے کشادہ ہوتا ہے اور بعض کا دل مفاسد اور فسادات کے لئے۔ جن کا دل حقائق کے لئے کشادہ ہوتا ہے، وہ فارس میں رہ کر بھی مدینہ کا پیغام قبول کر لیتے ہیں اور جن کے دل میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی ہے وہ محفل میں رہ کر بھی قبول حقائق سے محروم رہ جاتے ہیں۔

۔ شرح صدر کی منزل میں حضرت موسیٰ اور سرکار دو عالمؐ کا نمایاں فرق یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے شرح صدر کے لئے دعا کی ہے اور رسول اکرمؐ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ "کیا ہم نے تمھارے سینہ کو کشادہ نہیں کیا ہے"۔

۔ جس کا سینہ کشادہ نہ ہو وہ صاحب ایمان بھی نہیں ہو سکتا ہے "ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت" ایمان کا لازمہ یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں پیغمبر سے فیصلہ کرائے اور پھر اس فیصلہ کے خلاف دل میں تنگی کا احساس بھی نہ کرے۔

۔ جس کا دل ایمان کے لئے مطمئن ہو اس کے ظاہری حالات عقیدہ سے ہم آہنگ نہ بھی ہوں تو بھی کردار پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

۔ مالک کائنات نے قرآن کا مرکز بھی سینہ کو قرار دیا ہے اور آیات بینات کو ان کے سینوں میں رکھا ہے جنھیں علم عطا کر دیا گیا ہے لہٰذا جس کا سینہ مرکز علم نہیں ہے وہ آیات بینات کا مرکز بھی نہیں ہے۔

۔ شرح صدر اس بات کی علامت ہے کہ انسان منزل نور پر فائز ہے اور اسے پروردگار نے نور عنایت فرما دیا ہے جو اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ جسے "الم نشرح" کا مصداق قرار دیا ہے اس کی زندگی سراپا نور ہے اور اس سے زیادہ نورانیت کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

داعی اور راعی

صاحبان عقل وفہم کو صلاح وفلاح کی طرف دعوت دینے والے کو داعی کہا جاتا ہے اور اپنے سے کمزور افراد کے مصالح کی نگرانی کرنے والے کو راعی کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔

دین اسلام میں دعوت اور رعایت دونوں کی بے پناہ اہمیت ہے۔ کبھی دعوت رعایت پر مقدم ہو جاتی ہے اور کبھی رعایت دعوت پر مقدم ہو جاتی ہے۔

مالک کائنات نے اپنے اکثر نمائندوں کو داعی بنانے سے پہلے راعی بنایا اور انھیں گلہ بانی کی ذمہ داری سپرد کر دی کہ ایک طرف انھیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملے گا اور دوسری طرف قوم کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ جو انسان جانوروں کو نہایت درجہ خوش اسلوبی سے چرا سکتا ہے۔ وہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو بھی راہ راست پر لگا سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام جانور چرانے والوں میں انسانوں کو دعوت الی اللہ دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ اور یہ راعی، داعی الی اللہ بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے بلکہ اسی صلاحیت کے اظہار کے لئے اسے گلہ بانی کا کام سپرد کیا گیا ہے۔

داعی کی حیثیت راعی سے اس لئے بھی بلند تر ہوتی ہے کہ راعی کا کام جانوروں سے بھی متعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن داعی کا کام صرف صاحبان عقل وفہم سے تعلق رکھتا ہے۔ راعی میں اذن الٰہی کی شرط نہیں ہے لیکن داعی کی شان ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو "اذن خدا" سے دعوت دیتا ہے۔

راعی کا مقابلہ عام طور سے ایک مزاج کے جانوروں سے ہوتا ہے لیکن داعی کے سامنے تین طرح کے انسان ہوتے ہیں:

وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو عقل وحکمت کی باتیں سن کر فوراً حقیقت کا اعتراف کر لیتے ہیں۔
اور وہ بھی ہوتے ہیں جو عقل وفہم کے مسائل سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں لیکن انھیں خوبصورتی سے

نصیحت کر دی جائے اور دل لگتی بات کہہ دی جائے تو فوراً راہ راست پر آجاتے ہیں۔

تیسری قسم ان افراد کی ہوتی ہے جو نہ عقل وحکمت سے قائل ہوتے ہیں اور نہ موعظہ ونصیحت سے۔ ان کا کام صرف جھگڑے پیدا کرنا ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ بات اس قدر الجھ جائے کہ حق کے تسلیم کرنے کا موقع ہی نہ آنے پائے۔

قرآن مجید نے انھیں اقسام کو نظر میں رکھنے کے بعد پیغمبر اسلامؐ کے دعوت کا یہ حسین اسلوب تعلیم کیا تھا "ادع الیٰ سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن"۔ آپ راہ خدا کی طرف دعوت دینے میں تینوں باتوں کا خیال رکھیں۔ حکمت کو بھی استعمال کریں، موعظہ حسنہ بھی کریں اور جھگڑا کرنے والوں کے مقابلہ میں جدال احسن سے بھی کام لیں۔

انسانوں کو راہ خدا کی طرف دعوت دینے کا مرحلہ جب سر ہو جاتا ہے تو ایک قوم وجود میں آتی ہے جس نے پرانے آداب زندگی کو ترک کر کے نئی دنیا میں قدم رکھا ہے اور اپنی ایک جدید دنیا آباد کی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس دنیا کے آداب و اطوار گذشتہ دنیا سے قطعی مختلف ہیں۔ لہٰذا اس کی نگرانی بیحد ضروری ہے تاکہ پرانی خصلتیں دوبارہ حملہ آور نہ ہونے پائیں اور بنا بنایا کام بگڑنے نہ پائے۔

اسلام نے انفرادی طور پر ہر شخص کو راعی کا درجہ اسی لئے دیدیا ہے کہ نئی عمارت کا بنا لینا آسان ہوتا ہے اس کا تحفظ مشکل ہوتا ہے۔ مسلمان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے زیر تربیت کمزور افراد کو اس طرح ہر خطرہ سے محفوظ رکھے جس طرح ایک راعی اپنے گلہ کی نگرانی کرتا ہے اور انھیں ان کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نگرانی بڑی حد تک آسان بھی ہے کہ اس کا تعلق چند افراد سے ہوتا ہے اور وہ عام طور سے اسی ماحول کے پروردہ ہوتے ہیں جس ماحول کا خود راعی اور نگراں ہوتا ہے۔ لیکن ایک جدید امت اور نئی قوم کی نگرانی اسقدر آسان نہیں ہے۔ اس کا مرحلہ بیحد دشوار گذار ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے دعوت الی اللہ کا کام صحرائی بدوؤں میں شروع کیا اور چند دنوں میں ایک عظیم قوم تیار کر لی جس کا مقصد حیات خیر کی طرف دعوت دینا بن گیا اور جس کے سر امر ونہی کی ذمہ داری ڈال دی گئی۔

یہ قوم عقائد وافکار کے اعتبار سے اپنے معاشرہ وماحول سے بالکل الگ اور آداب زندگی کے

اعتبار سے ہر طرح کے خطرہ میں گرفتار تھی۔ اس قوم کی رعایت اور نگرانی کا کام اسقدر آسان نہیں تھا جس قدر ایک گھر یا گھرانہ کی نگرانی کا کام ہوتا ہے۔ اس لئے آپ نے ہر قدم پر نگرانی کا فرض بھی انجام دیا، اور کبھی بشارت کبھی انذار کے ذریعہ قوم کو اپنے قبضہ میں رکھا اور اس کے حرکات وسکنات کی نگرانی کرتے رہے۔

لیکن ایک دن وہ آیا جب اچانک حکم پروردگار آگیا کہ آپ آج رات کو قوم کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ پیغمبر اسلامؐ کے لئے ہجرت کا کام کوئی مشکل نہیں تھا خطرات سے نکل کر پروردگار کی حفاظت کے زیر سایہ پرسکون ماحول کی طرف سفر کر جانا کونسا مشکل امر تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ تیرہ سالہ دعوت کے زیر اثر جو قوم تیار ہوئی ہے اور جو ماحول بنا ہے اس کا کیا حشر ہوگا۔؟

پروردگار نے اس مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا کہ آپ علیؑ کو اپنے بستر پر چھوڑ جائیں تاکہ دنیا کو یہ اندازہ ہو جائے کہ قوم کی تشکیل و تربیت کے لئے ایک داعی درکار ہوتا ہے اور ایک راعی۔ امت اسلامیہ کے لئے پیغمبرؐ داعی کی حیثیت رکھتے ہیں اور علیؑ راعی ہیں، اور داعی اسوقت تک قوم سے الگ نہیں ہوتا ہے جب تک راعی کا بندوبست نہ کر دے۔ لہذا اس کے بعد جب داعی مستقل طور پر دنیا سے سفر کرے گا تو قوم کو اسی راعی کے حوالے کر کے جائے گا جس کے حوالے ہجرت کی رات کیا تھا۔ من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

ضیافت و دعوت

دین اسلام نے جن امور پر شدّت سے زور دیا ہے، ان میں ایک ضیافت اور مہمان نوازی بھی ہے۔ مہمان نوازی کے بارے میں معصومین علیہم السلام سے متعدد روایات وارد ہوئی ہیں جن میں مہمان نوازی کی فضیلت۔ اس کی عظمت اور اس کے آداب کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ روایات ملاحظہ ہوں :

عظمتِ ضیافت

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے والے کا فرض ہے کہ مہمان کا احترام کرے۔ مہمان نوازی کی ذمہ داری تین شبانہ روز ہے۔ اس کے بعد پھر کار خیر ہے۔

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ جو شخص بھی مہمان کی آہٹ سُن کر خوش ہو جاتا ہے پروردگار اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے چاہے زمین و آسمان کے برابر کیوں نہ ہوں۔

متعدد روایات میں وارد ہوا ہے کہ مہمان وارد ہوتا ہے تو اپنا رزق لے کر آتا ہے اور جاتا ہے تو گھر والوں کے گناہ بخشوا کر جاتا ہے۔ جس گھر میں مہمان نہیں آتے ہیں اسمیں ملائکہ بھی نہیں آتے ہیں۔

آدابِ ضیافت

- مہمان کا یہ حق ہے کہ اسے دروازہ تک پہونچایا جائے۔ (رسول اکرمؐ)
- مہمانی کا اصول یہ ہے کہ کھانے سے پہلے میوہ پیش کیا جائے کہ مالک کائنات نے

فاکہہ کا ذکر لحم سے پہلے کیا ہے۔

• میزبان مہمان کو قسم دلائے تو اس پر عمل واجب نہیں ہے کہ یہ قسم صرف احترام کی بنا پر ہے۔ (امام صادقؑ)

• برادر مومن کے دسترخوان پر کھانے کا احترام یہ ہے کہ اس سے پہلے ہاتھ کھینچ لے۔ (امام صادقؑ)

• مسلمان کا احترام یہ ہے کہ اسے تحفہ دے اور وہ جو تحفہ پیش کرے اسے قبول کرلے۔ (رسول اکرمؐ)

• ریاکاری کے لئے کھلانا خود اپنے پیٹ کو آتش جہنم سے بھرنا ہے۔ (رسول اکرمؐ)

• مہمان کا احترام یہ ہے کہ جلدی کھانا پیش کردے، خوش روئی سے پیش آئے۔ کھاتے وقت اچھی گفتگو کرے۔ دروازہ تک پہونچانے جائے۔ تکلّف سے کام نہ لے۔ جو حاضر ہو اسے پیش کردے۔ (شیخ بہائی شرح اربعین)

• مہمان سے یہ دریافت نہ کرو کہ آج کچھ کھایا ہے یا نہیں بلکہ جو کچھ موجود ہے اسے حاضر کردو۔ کرم کا تقاضا یہ ہے کہ ماحضر کو پیش کردیا جائے۔ (امام صادقؑ)

مہمان نوازہائے تاریخ

روایات میں انبیاء کرامؑ کی سیرت میں مہمان نوازی کا بکثرت تذکرہ ملتا ہے۔ جناب شعیبؑ مہمان نوازی میں مشہور تھے۔ جناب لوطؑ مہمانوں کا خصوصی احترام کیا کرتے تھے۔ جناب ابراہیمؑ نے مہمان نوازی کی بنیاد قائم کی ہے اور ان کا عالم یہ تھا کہ مہمان نہیں آتا تھا تو اس کی تلاش میں نکل جایا کرتے تھے۔

• مولائے کائناتؑ کو بھی ایک مرتبہ بیحد رنجیدہ دیکھا گیا اور سبب پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ سات روز سے کوئی مہمان فراہم نہیں ہوا ہے۔

• ابوالبختری وہب بن وہب اپنے کرم میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ ایک شاعر نے اس کی مدح میں قصیدہ پڑھا تو اس نے بے پناہ عطایا عطا کردئے لیکن جب جانے لگا تو کسی نوکر نے اس کے سامان باندھنے میں اس کا ہاتھ نہ بٹایا۔ وہ بیحد بددل ہوا اور اس نے کہا کہ ایسے کریم کے گھر میں ایسے نالائق نوکروں کا کیا کام ہے؟ تو غلام نے فی الفور جواب دیا کہ ہم مہمانوں کے آنے کا استقبال کرتے

ہیں۔ جانے میں کوئی امداد نہیں کرتے ہیں۔ شاعر یہ سُن کر تڑپ گیا اور کہنے لگا کہ مالک سے زیادہ کریم تو اس کے نوکر اور غلام ہیں۔ (سفینۃ البحار باب الضیف)

استفادہ:

مہمان نوازی ذاتی طور پر بھی ایک شرف اور فضیلت ہے۔ لیکن اللہ والوں نے اس فضیلت کو بھی راہ خدا ہی میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ جناب ابراہیمؑ کی بُت شکنی کے بعد جب قوم جناب ابراہیمؑ کی تلاش میں نکلی اور سرراہ ملاقات ہوگئی تو انھوں نے فرمایا کہ پہلے کھانا کھالو۔ اس کے بعد ابراہیم سے ملاقات کرادوں گا۔ قوم نے کھانا کھالیا اور اس کے بعد ابراہیمؑ کا پتہ پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ابراہیم تو میرا ہی نام ہے! قوم حیران ہوگئی کہ اب کس طرح سزا دیں گے اور جناب ابراہیمؑ سے قیمت لینے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرے کھانے کی قیمت یہ ہے کہ میرے خدا کا سجدہ کرلو۔ قوم نے مجبور ہو کر سجدہ میں سر رکھا اور ابراہیمؑ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیے۔ خدایا! سر کا جھکا دینا میرا کام تھا اور دل کا جھکا لینا تیرا کام ہے۔

• اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کفر کا مزاج یہ ہے کہ کھانا مل جاتا ہے تو خداؤں کو بھی بھول جاتے ہیں۔

• کفر خداؤں کی میت کی فکر نہیں کرتا ہے۔ صرف اپنے مفاد کے تحفّظ کے لئے انتقام کی فکر میں لگ جاتا ہے۔

• کفر کی خدائی کا عالم یہ ہے کہ خدا مُردہ پڑے ہیں اور پرستار سب زندہ ہیں۔ جبکہ اسلام کا خدا ھوالحی الذی لایموت ہے۔

• کفر کے خدا کی مجبوری یہ ہے کہ اپنے مارنے والے کا پتہ نہیں بتا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں بھی حزب مخالف ہی کا بیان لینا پڑے گا۔!

بندگی یا فرزندی

اسلام اور عیسائیت کے درمیان بلکہ اسلام اور دیگر تمام آسمانی ادیان کے دعویداروں کے درمیان یہ بنیادی فرق پایا جاتا ہے کہ اسلام بندگی کی دعوت دیتا ہے اور بندگی ہی کو انسان کا سب سے عظیم تر شرف قرار دیتا ہے۔ اس کے عقیدہ میں انسان کی رسالت کا اقرار بعد میں ہوتا ہے اور بندگی کا اقرار پہلے ہوتا ہے۔

اس نے توحید پروردگار کی توضیح ہی اس نکتہ کو قرار دیا ہے کہ اس کے خدا کے یہاں نسبی کوئی رشتہ نہیں ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ سببی رشتہ سے بھی بالاتر ہے۔ اس کے برخلاف دیگر مذاہب میں عظمت کی دلیل بندگی نہیں ہے بلکہ فرزندی ہے۔ عیسائیوں نے جناب عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا ہے اور یہودیوں نے جناب عُزَیر کو، جب کہ مولائے کائنات کے ارشاد کے مطابق یہ وہ اولاد ہے جس کی خبر "صاحب اولاد" کو بھی نہیں ہے۔

یہودیوں نے اس عقیدہ میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ خود اپنے کو بھی "ابناء اللّٰہ" قرار دے دیا اور اس طرح اپنے تقرّب کا اعلان کر دیا جب کہ اسلام کے عقیدہ کے مُطابق جناب عُزیر نے بھی اپنی بندگی کا اعلان کیا تھا اور جناب عیسیٰ نے آنکھ کھولتے ہی گہوارہ ہی سے اعلان کر دیا تھا "انی عبد اللّٰہ"۔

اسلام اور عیسائیت کے اس اختلاف نظر کے بہت سے اسباب بھی ہیں اور نتائج بھی جن کی طرف ادنیٰ التفات سے بھی حقائق کا صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

• بندگی ایک روحانی اور معنوی شرف ہے جو انھیں افراد کو حاصل ہوتا ہے جن کی زندگی میں معنویات کا دخل ہو اور جو شخصیت کی تشکیل کردار کے ذریعہ کرنا چاہتے ہوں ورنہ فرزندی کا رشتہ ہر شخص کو حاصل ہو سکتا ہے چاہے وہ معنویات سے کوئی دلچسپی رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

• بندگی کے نظام میں انسان کتنا ہی ذی شرف کیوں نہ ہو مالک کے سامنے بہرحال لرزہ براندام رہتا ہے اور اس کے احکام کی تعمیل کو اپنی شرافت کی بنیاد قرار دیتا ہے لیکن فرزندی میں فرزند کو ہر اختیار حاصل رہتا ہے اور وہ باپ کے سامنے لرزنے کے بجائے اس کے کاندھوں پر بھی سوار ہو جاتا ہے اور اس کی گود میں بھی بیٹھ جاتا ہے۔

اسلام پروردگار کے ساتھ اس طرح کے تصورات سے قطعاً راضی نہیں ہے لہٰذا وہ انسان کو بندہ ہی دیکھنا چاہتا ہے "ابن اللّٰہ" کی شکل میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

• بندگی اور فرزندی کے اسی دقیق فرق کو نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض افراد نے دونوں کو مخلوط کر دیا اور اپنی بندگی کی حیثیت کو نظرانداز کر کے مادی رشتہ ہی کو دلیل فضل و کمال قرار دے لیا اور ان تمام حدود سے تجاوز کر گئے جو بندگی اور غلامی کے لئے طے کئے گئے تھے۔

مثال کے طور پر بعض مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ پیدا کرنے والے باپ کی طرح تعلیم دینے والا استاد اور لڑکی دینے والا خسر بھی باپ کی جگہ پر ہوتا ہے تو انھیں یہ مادی رشتہ اس قدر پسند آ گیا کہ انھوں نے اپنی غلامی کو فراموش کر دیا اور ابُوت کو یاد رکھا اور داماد کے ساتھ وہی سلوک کرنا شروع کر دیا جو ایک باپ اپنی اولاد کے ساتھ کرتا ہے جب کہ مولائے کائناتؑ نے ٹھیک اسی کے مقابل میں اسلامی نظریات کا اعلان کیا اور مادیت کے مقابلہ میں معنویت کا اظہار کر دیا۔

آپ کو سرکار دو عالمؐ سے تین طرح کے رشتہ حاصل تھے۔ ایک مادی رشتہ سے آپ سرکار دو عالمؐ کے بھائی تھے اور ایک مادی رشتہ سے اولاد کی منزل میں تھے۔ تعلیم کے اعتبار سے بھی آپ کو فرزندی کا شرف حاصل تھا لیکن ان تمام امور کے باوجود آپ نے نہ فرزندی کو دلیل فضیلت قرار دیا اور نہ اخوت اور برادری کو ــ بلکہ جب بھی فخر کیا تو اس بات پر کہ میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں ــ تا کہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ اسلام کی نگاہ میں اصل شرف عبدیت ہے۔ اس سے بالاتر کوئی شرف نہیں ہے۔ یہ عبدیت بندوں سے متعلق ہوتی ہے تو غلامی اور خدمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پروردگار کی طرف منسوب ہو جاتی ہے تو ربوبیت کی جلوہ بردار بن جاتی ہے اور اس میں ربوبیت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔!

اسلام و ایمان

• قرآن مجید میں اسلام کا تذکرہ مختلف اشکال میں ۷۲ مقامات پر ہوا ہے :

اَسْلَمَ - اسلما - اسلمتُ - اسلمتم - اسلمنا - اسلموا - اُسْلِمَ - لنسلم - یُسلم - یُسلمون - اَسْلِمْ - اَسْلِموا - الاسلام - اسلامکم - اسلامھم - مسلما - مسلمَین - مسلمون - مسلمین - مسلمہ - مسلمات - تسلمون -

• ایمان کا تذکرہ ۸۰۸ مقامات پر ہوا ہے :

آمن - آمنَتْ - آمنتُ - آمنتم - آمنّا - آمَنوا - نومن - لتومنن - تومنوا - تومنون - نومن - لنومنن - یومن - یومنّ - لیومنَنّ - لیومنُنّ - یومنوا - یومنون - آمِنْ - آمِنوا - الایمان - ایمان - ایمانا - ایمانکم - ایمانہ - ایمانھم - بایمانھن - مومن - مومنا - مومنَین - مومنون - مومنین - مومنۃ - مومنات -

ــ دونوں قسم کے کلمات کو ملا کر دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ ابتدا میں اسلام کی کیا نوعیت تھی اور آخر میں سرکار دو عالمؐ کے زحمات کے زیر اثر ایمان کی کیا کیفیت ہو گئی۔ مثال کے طور پر "اَسْلَمَ" اگر پانچ مقامات پر ہے تو "آمَنَ" ۳۳ مقامات پر۔ اسی طرح باقی متشابہات کا بھی حساب لگایا جا سکتا ہے :

اسلمتم، آمنتم ــ اسلمنا، آمنا ــ اسلموا، آمنوا ــ یسلمون، یومنون ــ اسلموا، آمنوا ــ الاسلام، الایمان ــ اسلامکم، ایمانکم ــ اسلامھم، ایمانھم ــ مسلمون، مومنون ــ مسلمین، مومنین ــ مسلم، مومن ــ مسلمات، مومنات -

استنتاج :

ــ مذکورہ آیات کریمہ سے اسلام و ایمان کے ۱۴ فرق نکالے جا سکتے ہیں :

۱۔ اسلام زبان پر ہوتا ہے اور ایمان دل میں۔ "ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم"۔ (حجرات ۱۴)

۲۔ ایمان شرط جزا ہے۔ "ومن عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فاولٰئک یدخلون الجنۃ"۔ (غافر ۴۰)

۳۔ ایمان منافی فسق ہے۔ "أفمن کان مومناً کمن کان فاسقاً لایستوون"۔ (سجدہ ۱۸)

۴۔ ایمان وسعت نظر کا باعث ہے۔ "وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمومنون"۔ (توبہ ۱۰۵)

۵۔ ایمان میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ "انما المومنون الذین آمنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا"۔ (نور ۶۲)

۶۔ ایمان مرکز تقیہ ہے۔ "قال رجل مومن من آل فرعون یکتم ایمانہ"۔ (غافر ۲۸)

۷۔ ایمان بنیاد آخرت ہے۔ "ومن اراد الآخرۃ وسعیٰ لھا سعیھا وھو مومن"۔ (اسراء ۱۹)

۸۔ ایمان بنیاد عمل صالح ہے۔ "آمنوا وعملوا الصالحات"۔

۹۔ ایمان صلاحیت خطاب الٰہی ہے۔ "یا ایھا الذین آمنوا۔ در مقابل "قُل یا ایھا الذین ھادوا"۔

۱۰۔ ایمان بنیاد ادائے خمس ہے۔ "فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین ان کنتم آمنتم باللہ"۔ (انفال ۴۱)

۱۱۔ ایمان باعث تحکیم رسولؐ ہے۔ "فلا وربک لا یومنون حتی یحکّموک

فیما شجر بینھم۔" (نساء ۶۵)

۱۲۔ ایمان میں رشتہ داری نہیں۔ "یا ایھا الذین آمنوا ان من ازواجکم و اولادکم عدوا لکم فاحذروھم۔" (تغابن ۱۴)

۱۳۔ ایمان میں ارتداد ہے نفاق نہیں۔ "یا ایھا الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینہ۔" (مائدہ ۵۴)

۱۴۔ ایمان باعث اتباع نور ہے۔ "فالذین آمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ۔" (اعراف ۱۵۷) "یا علی حبّک ایمان" اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

الوراثۃ فی القرآن

قرآن مجید میں وراثت کا تذکرہ، ۳۵ مقامات پر کیا گیا ہے۔
اور اس کی مجموعی طور پر دو قسمیں ہیں:

۱۔ مادی وراثت
۲۔ معنوی وراثت

● مادی وراثت کا تذکرہ آیات میراث میں پایا جاتا ہے جہاں اصل میراث یا میراث کی تقسیم کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔

۔ اصل میراث کا تذکرہ جناب سلیمانؑ کے بارے میں کیا گیا ہے کہ وہ جناب داؤدؑ کے وارث ہوئے۔ (نمل ۱۶)
دوسرا تذکرہ جناب زکریا کا ہے کہ انھوں نے دعا کی کہ مجھے ایک ولی عنایت فرما جو میرا اور آل یعقوب کا وارث قرار پائے۔ (مریم ۶)
اصول تقسیم کا تذکرہ مختلف آیات میں کیا گیا ہے جن میں سورۂ نساء ۱۱، نساء ۱۷۶، نساء ۱۲، بقرہ ۲۳۳۔

● معنوی وراثت کے ذیل میں تین چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور انھیں کی وراثت کا اعلان کیا گیا ہے:

۱۔ زمین

۔ انا نحن نرث الارض ومن علیھا۔ (مریم ۴۰) ہم زمین اور اہل زمین کے وارث ہیں اور سب کی بازگشت ہماری طرف ہے۔

— ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔ (انبیاء ۱۰۵) زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔

— ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ۔ (اعراف ۱۲۸) زمین اللہ کی ہے وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے وارث قرار دیتا ہے۔

۲۔ کتاب

— فخلف من بعدھم خلف ورثوا الکتاب۔ (اعراف ۱۶۹) اس کے بعد ایک نسل پیدا ہوئی جو اُن کی کتاب کی وارث بنی۔

— ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔ (فاطر ۳۲) پھر ہم نے اپنی کتاب کا وارث اپنے ان بندوں کو قرار دیا جن کا ہم نے انتخاب کیا۔

— وان الذین اورثوا الکتاب من بعدھم لفی شک منہ مریب۔ (شوریٰ ۱۴) اور اُن کے بعد جنھیں کتاب کا وارث بنایا گیا وہ اس کی طرف سے شدید شبہ میں مبتلا ہیں۔

ان آیات میں آیت ۱ اور ۳ میں قہری وراثت کا تذکرہ ہے جو انسان کو حاصل ہو گئی ہے اور اسی لئے وارث کی مذمت کی گئی ہے۔

اور آیت ۲ میں خدا کی طرف سے وارث قرار دینے کا تذکرہ ہے اور اسی لئے وارث کو مصطفیٰ اور منتخب قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ جنّت

— اولٰئک ھم الوارثون الذین یرثون الفردوس۔ (مومنون ۱۱) یہ وہ وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہیں ہمیشہ رہیں گے۔

— تلک الجنۃ التی نورث من عبادنا من کان تقیا۔ (مریم ۶۳) یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم ان بندوں کو قرار دیتے ہیں جو پرہیزگار ہوتے ہیں۔

— ونودوا ان تلکم الجنۃ اورثتموھا بما کنتم تعملون۔ (اعراف ۴۳) انھیں آواز دی جائے گی کہ اب تم اپنے اعمال کی بنا پر اس جنت کے وارث بنائے گئے ہو۔

— واجعلنی من ورثۃ جنۃ النعیم۔ (شعراء ۸۵) خدایا! مجھے جنۃ النعیم کے وارثوں میں قرار دیدے۔

استنتاج

۱۔ مذکورہ بالا آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مادی وراثت میں صرف قرابت کی شرط ہے اور کردار کی شرط نہیں ہے بشرطیکہ وارث کافر اور قاتل نہ ہو کہ وہ مادی میراث کا بھی حقدار نہیں ہے۔

۲۔ زمین کی وراثت مالک زمین سے وابستہ ہے اور وہ صرف نیک بندوں کو وارث قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام قابض اور حاکم افراد غاصب ہیں، وارث نہیں ہیں۔

۳۔ کتاب کی وراثت کے لئے اصطفاء اور انتخاب ضروری ہے۔ اس کے بغیر انسان شک میں تو مبتلا ہو سکتا ہے کتاب کا وارث نہیں ہو سکتا ہے۔

۴۔ جنّت کی وراثت کے لئے ایمان۔ نماز، زکوٰۃ، لغویات سے اعراض، شہادت کا تحفظ۔ آبرو کی حفاظت، امانتداری، عہد کی پابندی اور اوقات و شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۵۔ جنّت کی وراثت اس قدر عظیم درجہ ہے جس کے لئے خلیل خدا بھی دست بدعا ہیں اور اپنے کو وارثوں میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔

نکتہ

اب ان کی عظمت کا تصوّر کیا جائے جنھیں امامت دے کر زمین کا وارث بنایا گیا۔ کتاب کا محافظ قرار دیا گیا اور جنت کا سردار قرار دے دیا گیا۔

تبلیغ اسلام کی جھلکیاں

رد عمل

پروردگار کی طرف سے قانونی طور پر سرکار دو عالمؐ کی رسالت کے اعلان کے بعد تین سال تک خفیہ دعوت کا سلسلہ جاری رہا اور آپ لوگوں کے درمیان اپنی رسالت ونبوت کا تذکرہ کرتے رہے۔ تین سال کے بعد مالک کائنات نے اعلان رسالت کا حکم دے دیا تو آپ نے پہلی مرتبہ کوہ صفا پر کھڑے ہو کر قوم کو عذاب الٰہی سے ڈرایا اور بعد میں خاندان والوں کی دعوت کر کے رسمی طور پر انھیں اسلام اور رسالت سے روشناس کرایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابولہب نے آپ کو جادوگر کہہ کر ہنگامہ کھڑا کر دیا اور آپ کی تقریر مکمل نہ ہو سکی۔

۱۔ اسلام کی تبلیغ کا آغاز رسمی منبر سے نہیں ہوا بلکہ کوہ صفا کے پتھروں کو منبر کے طور پر استعمال کیا گیا تاکہ اسلام کا پیغام نقش کالحجر اور پتھر کی لکیر بن جائے اور اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام میں رسالت یا مولائیت اول کا اعلان ایک جدید ترین منبر سے ہوا ہے لہٰذا ضرورت تھی کہ دوسرے مولا اور دوسرے رہنما کا اعلان بھی کسی نئے اور نرالے منبر سے ہو۔ چنانچہ اس کام کے لئے سرکار دو عالمؐ نے اونٹوں کے کجاوؤں کا منبر تیار کیا اور عہدہ کی انفرادیت اپنے مقام پر باقی رہ گئی۔

۲۔ آخری اعلان کے لئے اونٹوں کے کجاوؤں کا انتخاب اس لئے بھی مناسب تھا کہ جن حضرات کو جمل اور اونٹ سے دلچسپی ہے۔ ان کی تاریخ میں بھی مولائیت علیؑ کا

عقیدہ ثبت ہو جائے اور جب بھی اونٹوں کے کجاوے دیکھیں علیؑ کی مولائیت کی یاد تازہ ہو جائے۔

۳۔ پیغمبر اسلامؐ نے پہلا اعلان کرنا چاہا تو ایک شخص بشکل ابولہب حائل ہو گیا اور حضورؐ کی بات کو مکمل نہ ہونے دیا۔ لیکن یہ شخص کھلا ہوا کافر تھا اور اس نے کافرانہ ذہنیت کا ثبوت دے دیا۔ اب مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کی تاریخ میں کوئی ایسی حرکت نہ ہونے پائے تاکہ اسلام کی دنیا کفر کی دنیا سے الگ ہو جائے۔

۴۔ تبلیغ کے دو طریقے ہوتے ہیں: تقریر اور تحریر۔ سرکار دو عالمؐ نے ابتداءِ تبلیغ میں تقریر کا سہارا لیا اور آخری مرحلہ میں تحریر کا سہارا لیا لیکن افسوس کہ دونوں مقامات پر ایسا مقابلہ سامنے آ گیا کہ بات واضح نہ ہو سکی اور سرکار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

سہارے

ظاہر ہے کہ عالم اسباب کا ہر کام ظاہری اسباب کا محتاج ہے اور اس کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے۔ مالک کائنات نے ایسا نظام نہ بنایا ہوتا تو سرکار دو عالمؐ کو تبلیغ اسلام میں معین و مددگار طلب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور آپ تن تنہا کام شروع کر دیتے اور اس سے پہلے حضرت موسیٰ بھی ہارون کی معیت کی درخواست نہ کرتے لیکن عالم کا نظامِ اسباب اس بات کا محتاج تھا کہ کام قوانین فطرت کے مطابق انجام دیا جائے۔

چنانچہ ہر نبی نے قوم سے امداد کی درخواست کی اور اسے کسی دور میں نہ کفر کہا گیا ہے اور نہ شرک۔ یہ بیسوی صدی کی بدعتی فکر ہے جس کے پس منظر میں کافرانہ سیاست کام کر رہی ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام کو آغاز تبلیغ میں دو سہارے ملے ایک ابوطالب اور ایک خدیجہ۔

جناب ابوطالب نے اپنی قوت و طاقت سے پیغمبرؐ کو سہارا دیا اور جناب خدیجہ نے اپنے مال و دولت سے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ پیغمبرؐ پر طمع دنیا کا الزام نہ آنے پائے

اور ان کے رشتہ کو حُبِ مال کا نتیجہ نہ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ جناب خدیجہ نے خود ہی پیغامِ عقد بھی دیا اور خود ہی مہر ادا کرنے کی بھی پیشکش کر دی۔ جس پر ابوجہل ملعون نے طنز کر دیا کہ اب بنی ہاشم بیویوں سے مہر وصول کرنے لگے ہیں اور جناب ابوطالب نے نہایت درجہ طمانیت اور افتخار کے ساتھ جواب دیا:

"مثل محمد يحمل اليه ويعطىٰ ومثلك يهدى ولايقبل منه"

(فاطمۃ الزہرا من المہد الی اللحد)

(پیغمبرؐ جیسا انسان ہو تو اسے مال دیا بھی جاتا ہے اور اس کی خدمت میں نذرانہ پیش بھی کیا جاتا ہے لیکن تجھ جیسا انسان ہو تو وہ خود بھی مال دیتا ہے تو اسے رد کر دیا جاتا ہے۔)

فتح و شکست

سرکار دو عالمؐ نے تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا تو میدان تبلیغ میں شدید مقابلہ کا سامنا کرنا پڑا اور سب سے پہلے آپ کا ساتھ جناب ابوطالبؑ نے دیا۔ اس کے برخلاف کفر صف آرا ہوا تو اس کے سب سے بڑے مددگار کا نام ابوسفیان تھا جس نے ہر مرحلہ پر اسلام کی مخالفت کی اور ہر معرکہ میں کفر کو سہارا دیا ہے۔

ایک مدت تک یہ معرکہ یوں ہی چلتا رہا۔ کفر ابوسفیان کے سہارے آگے بڑھتا رہا اور اسلام ابوطالبؑ کے زور پر مسلسل ترقی کرتا رہا اور آخر میں تاریخ نے دیکھ لیا کہ کامیابی اور فتح اس نظریہ کو حاصل ہوئی جس کے طرفدار ابوطالب تھے اور جس کی راہ میں انھوں نے قربانیاں دی تھیں ورنہ کفر کو شکست فاش اور ذلّت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور یہ بات صفحۂ تاریخ پر نقش ہو گئی کہ ابوطالب اوّل سے آخر تک اپنے جذبۂ نصرت پر قائم رہے اور ایک لمحہ کے لئے سرکار دو عالمؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا جب کہ اس کے برخلاف ابوسفیان فتح مکہ میں اپنے نظریہ کو چھوڑ کر دامن اسلام میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ جو اس بات کی کھُلی ہوئی دلیل ہے کہ جس کے ساتھ ابوطالبؑ کی حمایت ہو اس کے حصہ میں شکست نہیں ہے اور جس کے ساتھ ابوسفیان کی حمایت ہو اس کے حصہ میں فتح اور کامرانی نہیں ہے۔

آخری معرکہ

سرکار دو عالمؐ نے تبلیغ اسلام کا کام مکہ سے شروع کیا ہے اور یہ بات قرین قیاس ہے کہ مکہ مرکز توحید اور مقام خانۂ خدا ہونے کے باوجود کفر کا مرکز اور شرک کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ اسلام اور توحید کا اعلان مکہ سے شروع کیا جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبیؐ کا آخری وارث جب قطع فساد اور سد باب ظلم و جور کے لئے آئے گا تو اس کا ظہور مکہ سے کیوں ہوگا۔ اب تو مکہ مرکز توحید خالص بن چکا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مرکز توحید ہی مرکز فساد و ظلم و ستم بن گیا ہے۔ اس لئے اصلاح کے عمل کا آغاز بھی اسی مقام سے ضروری اور مناسب ہے۔

والسّلام علىٰ من اتبع الهدىٰ

قیامت

اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے اصول وقواعد اسی مالک نے وضع کئے ہیں جس نے اس کائنات کو بنایا ہے لہٰذا اپنی تشریع میں تکوین سے مطابقت رکھی ہے اور اپنی تکوین کو تشریع کی بنیاد قرار دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کے اصول وعقائد کی بنیادیں انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہیں۔ فطرت ہی نے یہ بتایا ہے کہ صانع کے بغیر مصنوع اور خالق کے بغیر مخلوق کا وجود محال ہے۔ فطرت ہی نے انسان کی ضرورت کا اشارہ دیا ہے۔ فطرت ہی شکر منعم کے لئے ایسے افراد کا وجود ضروری قرار دیتی ہے جنھیں مالک کی بارگاہ کے آداب معلوم ہوں اور وہ شکریہ کے اسلوب وانداز سے باخبر کرسکیں۔ اور فطرت ہی کا یہ طریقہ کار ہے کہ انسان نیک عمل انجام دیتا ہے تو اندر سے اس کی تعریف نکلتی ہے اور اس کے لئے جزا وانعام کا مطالبہ ہوتا ہے اور بُرا کام کرتا ہے تو مذمّت وملامت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور سزا کے استحقاق کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

اسلام کا عقیدۂ قیامت اسی فطری قانون کی صدائے بازگشت ہے کہ اگر فطرت میں نیکی اور بدی کی جزا وسزا کا احساس پایا جاتا ہے تو نظام تشریع میں بھی ایک ایسا تصور ہونا چاہیئے اور ایک ایسا موقع ہونا چاہیئے جہاں نیک کردار لوگوں کو انعام دیا جاسکے اور بدکرداروں کو ان کے کیفر کردار تک پہونچایا جاسکے۔

تفصیلات قیامت میں افراد یا مذاہب کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اصل قیامت کا مسئلہ فطرت اور عقل کا وہ مسلم قانون ہے جس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا ہے

اور حقیقت امر یہ ہے کہ انسان میں موت سے جو وحشت پائی جاتی ہے اس کی بنیاد بھی یہی مسئلہ جزا وسزا ہے ورنہ اس کے علاوہ موت ایک فنا ہے اور فنا سے گھبرانے کا کوئی تصوّر ہی نہیں بنتا ہے۔ اس لئے کہ فنا کے بعد کوئی وجود نہیں رہ جاتا ہے جس سے گھبرانے کا امکان پیدا ہو۔

گویا کہ انسان جس کو فنا کا نام دے رہا ہے وہ درحقیقت ایک بقا یا نشأۃ ثانیہ ہے جس کا صحیح اندازہ انسان کو نہیں ہے اور وہ نہیں جانتا ہے کہ موت اس عالم کیلئے موت ہے اور دوسرے عالم کے لئے ولادت ہے اور جس طرح اس عالم میں ناقص پیدا ہونے والا بچہ زندگی بھر مصائب اور مشکلات کا شکار رہتا ہے۔ اسی طرح اُس عالم میں اگر ناقص طور پر وارد ہوگیا تو اسے قیامت تک اس نقص اور کمزوری کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

۔ قیامت کے فطری احساس نے انسان کو موت سے اسقدر وحشت زدہ کردیا ہے کہ انسان ہر دَور میں اس احساس وحشت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے اور اپنے کو اس تصور سے الگ رکھنے کے لئے کوشاں رہا ہے۔ چاہے اس کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو۔

۔ انسان کی زندگی میں آبِ حیات کی تلاش۔ دواخانوں میں اکسیر جوانی کی دریافت۔ مرگ کو خطرہ کا نام دینا۔ اجل کو پنجہ یا بھیڑئے سے تعبیر کرنا۔ موت کو سیلاب کے لفظ سے یاد کرنا اور قبرستانوں میں گلکاری کا عمل انجام دینا وحشت موت کے وہ آثار ہیں جو انسان کے داخلی کیفیات کی غمازی کر رہے ہیں اور بغیر زبان سے اقرار کئے ہوئے اس کے مافی الضمیر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

۔ قیامت کے احساس نے انسان کو موت سے اس قدر وحشت زدہ کردیا ہے کہ وہ لفظوں کا سہارا لینے سے بھی نہیں چوکتا ہے۔ ہارون رشید نے خواب دیکھا کہ اسکے دانت گر گئے ہیں اور لوگوں سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی۔ ایک شخص نے کہا کہ اس میں اصحاب اور درباریوں کی موت کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ ہارون نے اس کے لئے لفظ موت کے استعمال پر سَو کوڑوں کی سزا سنا دی اور اس کے بعد جب دوسرے شخص نے تعبیر کے الفاظ بدل دئے کہ اس میں سرکار کی بقا کا اشارہ پایا جاتا ہے تو اسے سَو اشرفی کا انعام دے دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا الفاظ کے بدل دینے سے حقائق میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی یا آنے والی موت ٹل جائے گی ؟ ایسا کچھ نہیں ہے لیکن ظالموں کو احساسِ قیامت نے اس قدر پریشان کر رکھا ہے کہ لفظ موت سے بھی گھبرانے لگے ہیں۔ انھیں اس امر کا بھی احساس ہے کہ موت قیامت کا پہلا مرحلہ ہے بلکہ بعض اعتبارات سے تو موت ہی قیامِ قیامت ہے کہ موت کے بعد اعمال کی اصلاح یا نیابت کا امکان پیدا بھی ہو جائے تو عقائد کی اصلاح کا امکان بہرحال ختم ہو جاتا ہے اور انسان کی قیامت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اسے روزِ قیامت تک اسی دردناک عذاب کے ماحول میں رہنا ہے جو اس کے عقائد اور نظریات کا نتیجہ ہے۔

— اسلام کا عقیدۂ قیامت انسان کی فطرت کی آواز اور اس کے ضمیر کا تقاضا ہے۔ انسان کے اندر ایک عدالت قائم کر دی گئی ہے جہاں ضمیر بغیر کسی شاہد اور گواہ کے فیصلہ کر دیتا ہے اور اس فیصلہ پر کسی طرح کی اپیل سُننے کے لئے تیار نہیں ہے بلکہ فیصلہ کے ساتھ ہی سزا کا آغاز ہو جاتا ہے اور انسان اندر سے ایک ایسا کرب محسوس کرتا ہے جس سے کوئی طاقت نجات نہیں دلا سکتی ہے۔ اس مرحلہ میں یزید و ابن زیاد جیسے مُردہ ضمیر افراد میں بھی کبھی کبھی یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم نے یہ کام غلط کیا ہے اور ضمیر کی ملامت وہ کرب زندگی پیدا کر دیتی ہے کہ راتوں کو بستر سے اُٹھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ آخر حسینؑ نے میرا کیا بگاڑا تھا۔

تو جب مالک کائنات کی ایک مخلوق ضمیر و وجدان میں اتنی صلاحیت پائی جاتی ہے اور وہ بُرائی پر خاموش نہیں رہ سکتا ہے — تو خود مالک کس طرح فیصلہ سے قطع نظر کر سکتا ہے۔ اس کی عدالت کا تقاضا ہے کہ انسانی اعمال کے بارے میں صحیح فیصلہ کرے اور پھر اپنے فیصلہ کے مطابق اس کی جزا یا سزا کا انتظام کرے۔ قیامت اسی انتظام جزا و سزا کا نام ہے اور اس کی ضرورت کا احساس اسی عدالت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ نظام مذہب سے عدالت پروردگار کو نکال دیا جائے تو قیامت کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

شبہات

انسان نے قیامت کے حالات کا اندازہ کر کے اپنے دل کو بہلانے کے لئے طرح طرح کے شبہات ایجاد کر لئے تاکہ انھیں کا سہارا لے کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے ذہن کو خیال قیامت سے آزاد کر لیا جائے اور اس طرح چند لمحوں کا سکون نصیب ہو جائے۔

— کبھی یہ کہا گیا کہ جب انسان خاک میں مل جائے گا اور مٹی کا ڈھیر ہو جائے گا تو اسے دوبارہ کس طرح اٹھایا جائے گا اور اس کی قیامت کا کیا امکان رہ جائے گا ؟ حالانکہ ہر انسان جانتا ہے کہ قیامت کا تعلق انسانی طاقت سے نہیں ہے۔ یہ کام پروردگار کو انجام دینا ہے اور جو مالک انسان کو اس وقت ایجاد کر سکتا ہے جب اس کے وجود کی کوئی اصل موجود نہ تھی تو اب تو مٹی کا ڈھیر موجود ہے اب دوبارہ پیدا کر دینے میں کیا زحمت اور پریشانی ہے اور اسی لئے قرآن مجید نے اس دوسری زندگی کو تخلیق سے تعبیر نہیں کیا ہے بلکہ اخراج سے تعبیر کیا ہے "ومنها نخرجكم تارة اخرىٰ"۔

— کبھی یہ شبہ پیدا کیا گیا کہ جب مختلف افراد کے اجزاء بدن مٹی میں مل جانے کے بعد مخلوط ہو جائیں گے تو انھیں جُدا کس طرح کیا جائے گا ؟ —— اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ قیامت میں دوبارہ زندہ کرنے والا ذرّہ ذرّہ اور قطرہ قطرہ کا علم رکھتا ہے۔ اس کے لئے ذرّات کا الگ کر لینا اور مختلف قسم کی خاک کو ایک دوسرے سے جُدا کر دینا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

کبھی اسی شبہ کو اور قوی بنایا گیا کہ اگر ایک شخص نے دوسرے کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو کھا لیا اور اس کا گوشت قاتل کے بدن کا جزء بن گیا تو اب قیامت میں اس خاک سے جو انسان اُٹھایا جائے گا اسے قاتل قرار دیا جائے گا یا مقتول ؟ اگر قاتل بنا کر سزا دے دی گئی تو گویا مقتول کے اجزا کو سزا میں شریک کر دیا گیا اور اگر مقتول بنا کر انعام دیدیا گیا تو گویا قاتل کو اس کے قتل پر انعام کا حقدار قرار دے دیا گیا جو کسی طرح بھی مقتضائے عدل و انصاف نہیں ہے۔

حالانکہ اس حقیقت کو ہر پڑھا لکھا انسان جانتا ہے کہ انسان کے جسم کے اصلی اجزا نہ فنا ہوتے ہیں اور نہ مخلوط ہوتے ہیں۔ ان کا وجود ہمیشہ الگ رہتا ہے اور ان کے دوسرے میں ضم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مسئلہ صرف الگ کرنے کا ہے اور یہ کام قادر مطلق کے لئے کوئی کام نہیں ہے۔

اس نے خود یہ اعلان کر دیا کہ ہم جب انگلیوں کے پور بنا سکتے ہیں اور ان میں یہ امتیاز رکھ سکتے ہیں کہ ایک کے نشانات دوسرے سے مخلوط نہ ہونے پائیں تو ہمارے لئے مخلوط ہو جانے والے اجزا کا الگ کر لینا کون سا بڑا کام ہے۔ ہم جب بھی چاہیں انھیں الگ کر سکتے ہیں اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے سکتے ہیں۔

— کبھی یہ شبہ پیدا کیا گیا کہ قیامت میں تمام اوّلین و آخرین کو جمع کرنے کے لئے ایک عظیم ترین میدان درکار ہوگا اور اس دنیا میں ایسا کوئی میدان نہیں ہے جس میں آدمؑ سے لے کر قیامت تک کے انسانوں کو جمع کر کے ان کا حساب و کتاب کیا جا سکے لہذا قیامت کا تصور صرف ایک وہم و خیال ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس سوال کے اندر ہی جواب کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ بے شک اس دنیا میں ایسی کوئی جگہ اور ایسا کوئی میدان نہیں ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے۔ اس کے آثار میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ زمین دوسری زمین میں تبدیل ہو جائے گی اور آسمان دوسرے آسمان ہو جائیں گے۔ ایسے حالات میں ایک ایسے میدان کا فراہم ہو جانا کونسا مشکل کام ہے جب کہ خود موجودہ دنیا کی فضائے بسیط میں بھی اس قدر وسعت پائی جاتی ہے جس میں ستارے لاکھوں برس سے دوڑ لگا رہے ہیں اور اس وسعت کی حدوں کو نہیں پا سکے ہیں تو چند ہزار برس کے کروڑوں یا اربوں انسان کا ایک مقام پر جمع کر دینا کون سا مشکل کام ہے۔

تنگی انسانی ذہن اور دماغ میں ہے۔ تنگی مالک کی کائنات اور فضائے دہر کی وسعت میں نہیں ہے۔ اس میں سینکڑوں دنیائیں آباد کی جا سکتی ہیں اور آباد ہیں جن کا سُراغ

نہیں مل سکا ہے اور نہ مستقبل میں مل سکتا ہے۔

— واضح رہے کہ قیامت کا یہی اجمالی عقیدہ کہ ایک دن سزا و جزا کے فیصلے کیلئے آنے والا ہے اور اس دن ہر انسان کو اس کے اعمال و عقائد کے اعتبار سے سزا یا جزا دے دی جائے گی۔ ایک فطری عقیدہ ہے جس کا تسلیم کرنا ہر فرد بشر کی ذمہ داری ہے — اس کے بعد اس کے تفصیلات میں جن امور کا قرآن مجید یا مستند احادیث میں تذکرہ کر دیا گیا ہے ان کا ماننا اسلامی اور ایمانی فریضہ ہے ورنہ باقی تفصیلات پر ایمان لانا یا اس کے حقائق کا علم پیدا کرنا نہ انسان کے امکان میں ہے اور نہ اس کے فرائض میں شامل ہے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

عظمت موت

موت انسانی زندگی کی واضح ترین حقیقت ہے جس سے کوئی فرد بشر انکار نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انسان اس کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی اس سے نفرت کرتا ہے اور اس کے تصوّر سے وحشت محسوس کرتا ہے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس وحشت کے علاج کی فکر بھی نہیں کرتا ہے۔

قبرستانوں کی آرائش۔ مُردوں پر پھول چڑھانا۔ قبروں پر درخت کاری اور گلاب کے پھول اُگانا موت سے وحشت کی بہترین علامتیں ہیں جو انسان کے باطن کی غمازی کرتی ہیں اور اس راز کو فاش کر دیتی ہیں جنھیں انسان پھولوں کی آڑ میں چھپانا چاہتا ہے۔

—اسلام نے موت کو حقیقت ضرور قرار دیا ہے لیکن اسے بلا یا مصیبت نہیں قرار دیا اور نہ اسے کسی وحشتناک مخلوق سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ" کی آیت سورۂ رحمٰن میں رکھی ہے جہاں پروردگار کی عظیم ترین نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گویا موت بھی ایک نعمت پروردگار ہے جس کے بغیر انسان کا گذارا نہیں ہو سکتا ہے۔

—موت کے نعمت پروردگار ہونے کے حسب ذیل اسباب ہیں:

معاشی مسائل کا حل

آج جب کہ دنیا میں موت کی گرم بازاری ہے اور سڑک کے حادثوں سے زلزلوں اور ایٹمی تجربوں تک تھوک کے بھاؤ موت بک رہی ہے اور لوگ بلاقیمت اس سے استفادہ کر رہے ہیں تو دنیا کا حال یہ ہے کہ ہر طرف معاشی بحران کی پکار ہے اور کوئی بڑے سے بڑا

ملک بھی آسودہ نہیں ہے۔ کسی کے یہاں روٹی کا مسئلہ سنگین صورت حال اختیار کر گیا ہے اور کسی کے یہاں کپڑے کی قلت نے برہنگی کا لباس پنہا دیا ہے۔ ایک ملک میں مکان کا قحط ہے تو دوسرے ملک میں کثرت آبادی کی فریاد ہے۔

غرضکہ ساری دنیا معاشی بحران کا شکار ہے اور ہر طرف ضبط تولید۔ فیملی پلاننگ کی چیخ پکار ہے۔

سوچئے اگر موت نے عالم انسانیت پر رحم نہ کیا ہوتا اور آبادی کے بیلنس کو برابر نہ رکھا ہوتا تو آج دنیا کا نقشہ کیا ہوتا اور بھوک سے مرنے والوں کا اوسط زندہ رہنے والوں کے مقابلہ میں کیا ہوتا۔

آبادکاری کا حل

دوسرا مسئلہ جس سے عالم انسانیت دوچار ہے۔ وہ آبادی کے مسلسل اضافہ کا مسئلہ ہے کہ زمین اپنی پیداوار میں اضافہ کر کے غذائیات کے مسئلہ کو حل بھی کر دے۔ سمندر اس کی امداد کر کے مزید غذا فراہم بھی کر دے تو مکان کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا۔ زمین مسلسل سکڑتی جا رہی ہے اور اس کے بڑھنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا ہے اسی لئے ہر فرد اور ملک آبادی کے مسلسل اضافہ سے پریشان ہے۔

موت نے اس مسئلہ کا بھی حل نکال دیا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب مسافروں کی کثرت ہو جاتی ہے تو گاڑیاں دومنزلہ بنا دی جاتی ہیں۔

جب شہر کی آبادی میں اضافہ ہونے لگتا ہے تو عمارتیں سو پچاس منزلہ کر دی جاتی ہیں۔

لیکن بہرحال عمارتوں میں رہنے والوں کو ایک جگہ درکار ہوتی ہے اور عمارت کا حجم رہنے والوں کے اعتبار سے نہیں بڑھ سکتا ہے۔

یہ صرف موت کی برکت ہے کہ اس نے ساری دنیا کو دومنزلہ بنا دیا ہے اور ایک حصۂ آبادی کو زیر زمین منتقل کر دیا ہے تاکہ دوسروں کے لئے جگہ خالی کرائی جا سکے اور

آبادکاری کے مسئلہ کو حل کیا جاسکے۔

مرض ضعیفی کا حل

کہتے ہیں کہ ضعیفی ایک ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ انسان اپنی دولت میں بے پناہ اضافہ کرسکتا ہے۔ اپنے اقتدار کو آخر دنیا تک وسعت دے سکتا ہے۔ اپنے فضل و کمال کو سارے عالم سے بالاتر بنا سکتا ہے۔ لیکن اپنی ضعیفی کو نہیں ٹال سکتا ہے اور اسے بہرحال انسان کو اس کی اوقات اور بیچارگی سے باخبر کرنا ہے۔ ایسی صورت میں جس قدر عمر میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ضعیفی بڑھتی ہی جائیگی اور انسان بیکسی اور بے بسی کی گود میں چلا جائے گا۔ جس کے بعد سانس لینا بھی مشکل ہوجائے گا اور لاکھوں پر حکومت کرنے والا کروڑوں کا محتاج ہوجائے گا۔ دولت اس مرض کا علاج نہ کرسکے گی اور اقتدار اس بیکسی سے نجات نہ دلاسکے گا۔

یہ صرف موت کی کرم نوازی ہے کہ وہ اس لاعلاج مرض کا بھی علاج کردیتی ہے اور انسان کو اس کے شکنجہ سے بھی آزاد کرادیتی ہے۔ جس کے بعد انسان نہ کسی کے رحم و کرم کا محتاج رہ جاتا ہے اور نہ اسے کسی کی پرواہ رہ جاتی ہے۔ موت کی آغوش میں سوجاتا ہے اور ہر طرح کی محتاجی سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔

ناممکن مسائل کا حل

مذہبی دنیا میں ہر انسان اپنے پیغمبرؐ اور امام کی زیارت کا مشتاق رہتا ہے اور اسے اپنی اس بدنصیبی کا احساس رہتا ہے کہ اگر دور معصومینؑ میں پیدا ہوا ہوتا تو کم سے کم ان رہنماؤں کی زیارت کا شرف حاصل کرلیتا جن کی قیادت میں دنیا سے آخرت تک کا سفر طے کر رہا ہے۔ لیکن ایسا کوئی چارہ گر نہیں ہے جو اس بظاہر ناممکن عمل کو ممکن بنادے۔

انسان اشتیاق زیارت میں مدینہ۔ کربلا۔ نجف۔ کاظمین، سامرہ اور خراسان کا سفر بھی کرلیتا ہے لیکن اسے روضہ و بارگاہ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ ظاہری نگاہوں سے صرف

قبروں کا مشاہدہ کرتا ہے، صاحب قبر کی زیارت کا شرف حاصل نہیں کرتا ہے۔

یہ صرف موت کی برکت ہے کہ وہ سرھانے آتی ہے تو معصومینؑ کو اپنے ہمراہ لے کر آتی ہے اور مرنے والا ان کی زیارت کا شرف حاصل کرکے نفس مطمئن کی شکل میں دنیا سے آخرت کا سفر کرتا ہے۔

مولائے کائناتؑ نے حارث ہمدانی سے فرمایا تھا کہ "حارث ہمدانی جو شخص بھی دنیا سے جاتا ہے وہ وقت آخر میری زیارت ضرور کرتا ہے۔ مومن ہوتا ہے تو خوشحال اور مطمئن ہوکر دنیا سے جاتا ہے اور منافق ہوتا ہے تو حسرت و الم لے کر رخصت ہوتا ہے۔"

واضح رہے کہ قرآن مجید میں موت کا تذکرہ، ۱۶۵ مقامات پر کیا گیا ہے اور سب کا خلاصہ اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ انسان رہنے کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ جانے کے لئے آیا ہے۔ اور جب جانے کے لئے آیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ سامان سفر فراہم کرے اور خالی ہاتھ سفر کرنے کا ارادہ نہ کرے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

مسئلہ شفاعت

قرآن مجید میں شفاعت کا تذکرہ ۳۰ مقامات پر وارد ہوا ہے اور اس تذکرہ کی چند قسمیں ہیں۔ بعض مقامات پر گویا کہ اصل شفاعت کا انکار یا اس کی عدم افادیت کا تذکرہ ہے:

• ہل لنا من شفعاء فیشفعوا لنا۔ (اعراف ۵۳) کفار روز قیامت شفیع تلاش کریں گے اور کوئی شفیع نہ ہوگا۔

• فما لنا من شافعین۔ (شعراء ۱۰۰) کفار افسوس کریں گے کہ آج ہمارا کوئی شفیع یا دوست نہیں ہے۔

• لیس لہم من دونہ ولی ولا شفیع۔ (انعام ۵۱) کفار کو باخبر کر دیں کہ خدا کو چھوڑ کر نہ کوئی ولی ہے اور نہ شفیع۔

• ما للظالمین من حمیم ولا شفیع یطاع۔ (غافر ۱۸) ظالمین کے لئے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ شفیع جس کی بات سُنی جاسکے۔

— بعض مقامات میں شفاعت کا صریحی اثبات ہے لیکن اس کے شرائط کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے:

• من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ۔ (بقرہ ۲۵۵) یہاں شفاعت میں اذن خدا کی شرط ہے۔

• ما من شفیع الا من بعد اذنہ۔ (یونس ۳) یہاں بھی شفاعت اذنِ الٰہی کے ساتھ مشروط ہے۔

• لا یملکون الشفاعۃ الا من اتخذ عند الرحمٰن عہدًا۔ (مریم ۸۷) یہاں شفاعت میں عہد الٰہی کی شرط ہے۔

• یومئذ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمٰن۔ (طٰہٰ ۱۰۹) یہاں بھی شفاعت کی افادیت میں اذن الٰہی کی شرط ہے۔

• لا یشفعون الا لمن ارتضیٰ۔ (انبیاء ۲۸) یہاں شفاعت کے لئے رضا کی شرط ہے کہ انسان پسندیدہ ہو۔

ان آیات کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں شفاعت کا عقیدہ موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض شرائط شفاعت کرنے والے کے لئے ہیں اور بعض شرائط اس شخص کے لئے ہیں جس کی شفاعت کی جارہی ہے۔ شفاعت کا مطلق انکار قرآن مجید کی متعدد آیات کی کھلی ہوئی تکذیب ہے اور یہ بات کفر کے مرادف ہے۔

کفار کے لئے شفاعت کا نہ ہونا یا غیر مفید ہونا اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ انبیاء و اولیاء کرام کو شفاعت کرنے سے اور مومنین و مخلصین کو شفاعت سے فائدہ اٹھانے سے روک دیا جائے۔ اسلام میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے بلکہ قرآن مجید صریحی طور پر اسکی مخالفت کر رہا ہے۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ شفاعت کے معنی کیا ہیں۔ عربی زبان میں شفع، وتر کے مقابلہ میں ہے جیسے اردو زبان میں جفت اور طاق کہا جاتا ہے کہ کوئی چیز تنہا اور اکیلی ہو تو اسے طاق کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کسی شے کو ملا دیا جائے تو اسے جفت کہا جاتا ہے۔

شفاعت کا عقیدہ بھی ایسا ہی ہے کہ اللہ کے نیک بندے اپنے ذاتی ایمان و کردار کی بنا پر اس مرتبہ پر فائز ہوں گے کہ پروردگار انھیں اس امر کا اختیار دے گا کہ وہ کسی گنہگار بندے کو سہارا دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔ ان کا سہارا دینا اذن پروردگار کی بنا پر ہوگا لہذا اس کا کفار کے عقیدۂ استقلال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور جس کو سہارا دیں گے اسکی شناخت یہ ہے کہ کسی نہ کسی اعتبار سے ان کی نگاہ میں پسندیدہ ہو۔ چاہے اس اعتبار سے ہو کہ اپنی اصلاح کے لئے فکر مند تھا لیکن ہوائے نفس یا وسوسۂ شیطان کی بنا پر یہ کام نہ کر سکا اور گنہگار ہی دنیا سے رخصت ہوگیا۔

مسئلہ شفاعت

قرآن مجید میں شفاعت کا تذکرہ ۳۰ مقامات پر وارد ہوا ہے اور اس تذکرہ کی چند قسمیں ہیں۔ بعض مقامات پر گویا کہ اصل شفاعت کا انکار یا اس کی عدم افادیت کا تذکرہ ہے:

• هل لنا من شفعاء فيشفعوا لنا۔ (اعراف ۵۳) کفار روز قیامت شفیع تلاش کریں گے اور کوئی شفیع نہ ہوگا۔

• فما لنا من شافعين۔ (شعراء ۱۰۰) کفار افسوس کریں گے کہ آج ہمارا کوئی شفیع یا دوست نہیں ہے۔

• ليس لهم من دونه ولي ولا شفيع۔ (انعام ۵۱) کفار کو باخبر کردیں کہ خدا کو چھوڑ کر نہ کوئی ولی ہے اور نہ شفیع۔

• ما للظالمين من حميم ولا شفيع يطاع۔ (غافر ۱۸) ظالمین کے لئے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ شفیع جس کی بات سُنی جاسکے۔

— بعض مقامات میں شفاعت کا صریحی اثبات ہے لیکن اس کے شرائط کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے:

• من ذا الذي يشفع عنده الا باذنه۔ (بقرہ ۲۵۵) یہاں شفاعت میں اذن خدا کی شرط ہے۔

• ما من شفيع الا من بعد اذنه۔ (یونس ۳) یہاں بھی شفاعت اذنِ الٰہی کے ساتھ مشروط ہے۔

• لا يملكون الشفاعة الا من اتخذ عند الرحمٰن عهدًا۔ (مریم ۸۷) یہاں شفاعت میں عہدِ الٰہی کی شرط ہے۔

• يومئذ لا تنفع الشفاعة الا من اذن له الرحمٰن۔ (طٰہٰ ۱۰۹) یہاں بھی شفاعت کی افادیت میں اذن الٰہی کی شرط ہے۔

• لا يشفعون الا لمن ارتضىٰ۔ (انبیاء ۲۸) یہاں شفاعت کے لئے رضا کی شرط ہے کہ انسان پسندیدہ ہو۔

ان آیات کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں شفاعت کا عقیدہ موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض شرائط شفاعت کرنے والے کے لئے ہیں اور بعض شرائط اس شخص کے لئے ہیں جس کی شفاعت کی جا رہی ہے۔ شفاعت کا مطلق انکار قرآن مجید کی متعدد آیات کی کھلی ہوئی تکذیب ہے اور یہ بات کفر کے مرادف ہے۔

کفار کے لئے شفاعت کا نہ ہونا یا غیر مفید ہونا اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ انبیاء و اولیاء کرام کو شفاعت کرنے سے اور مومنین و مخلصین کو شفاعت سے فائدہ اٹھانے سے روک دیا جائے۔ اسلام میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے بلکہ قرآن مجید صریحی طور پر اسکی مخالفت کر رہا ہے۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ شفاعت کے معنی کیا ہیں۔ عربی زبان میں شفع، وتر کے مقابلہ میں ہے جیسے اردو زبان میں جفت اور طاق کہا جاتا ہے کہ کوئی چیز تنہا اور اکیلی ہو تو اسے طاق کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کسی شے کو ملا دیا جائے تو اسے جفت کہا جاتا ہے۔

شفاعت کا عقیدہ بھی ایسا ہی ہے کہ اللہ کے نیک بندے اپنے ذاتی ایمان و کردار کی بنا پر اس مرتبہ پر فائز ہوں گے کہ پروردگار انھیں اس امر کا اختیار دے گا کہ وہ کسی گنہگار بندے کو سہارا دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔ ان کا سہارا دینا اذن پروردگار کی بنا پر ہوگا لہٰذا اس کا کفار کے عقیدۂ استقلال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور جس کو سہارا دیں گے اسکی شناخت یہ ہے کہ کسی نہ کسی اعتبار سے ان کی نگاہ میں پسندیدہ ہو۔ چاہے اس اعتبار سے ہو کہ اپنی اصلاح کے لئے فکرمند تھا لیکن ہوائے نفس یا وسوسۂ شیطان کی بنا پر یہ کام نہ کر سکا اور گنہگار ہی دنیا سے رخصت ہوگیا۔

ـ کہا جاتا ہے کہ پسندیدہ ہونے کی شرط علامت ہے کہ شفاعت صرف متقی اور پارسا افراد کے لئے ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان اپنے جملہ افعال و اعمال کی بنا پر پسندیدہ قرار پا گیا تو اُسے شفاعت کی ضرورت ہی کیا ہے کہ اس کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا سوال اٹھایا جائے۔

شفاعت کی ضرورت تو اس انسان کو ہے جس کے کردار میں نقص اور عیب پایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں پسندیدگی کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں جیسا کہ بیعت شجرہ کے بارے میں پروردگار نے اپنی رضا کا اعلان کر دیا اور بیعت کرنے والے باعتبار بیعت پسندیدہ قرار پا گئے چاہے دوسرے اعتبارات سے ان کا کردار کچھ بھی رہا ہو۔ یا گواہوں کو باعتبار اسلام و عدالت پسندیدہ قرار دیا گیا ہے حالانکہ ان کی زندگی کے ہر اعتبار سے پسندیدہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔

ـ البتہ واضح رہے کہ شفاعت حاصل کرنے کے لئے انسان کو اپنی زندگی کو تاحد امکان پسندیدہ بنانا پڑے گا اور شفاعت کرنے والوں کی نگاہ عنایت کا حقدار بنانا پڑے گا اور یہ بات خود ہی اصلاح نفس کا بہترین ذریعہ ہے۔ صاحبان تطہیر سے قرب حاصل کرنے والا خود بخود پاکیزہ کردار ہو جائے گا اور اس طرح شفاعت گناہ معاف کرانے سے زیادہ گناہ ختم کرانے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔!

ایصالِ ثواب

• اسلام دین رجاء و امید ہے، دین یاس و حرمان نہیں ہے۔ اسلام نے رجاء و امید کو علامتِ ایمان قرار دیا ہے اور مایوسی کو علامت کفر و ضلالت قرار دیا ہے۔

ـ "ان تکونوا تالمون فانهم یالمون کما تالمون و ترجون من الله ما لا یرجون"۔ (نساء ۱۰۴) "اگر میدان جنگ میں تمھیں تکلیف ہوتی ہے تو تمھارے دشمن کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تم ثواب آخرت کی امید رکھتے ہو اور وہ اس امید سے بھی محروم ہے"۔

ـ فمن کان یرجو لقاء ربه فلیعمل عملاً صالحاً۔" (کہف ۱۱۰) "جو پروردگار کی ملاقات کی امید رکھتا ہے اسے عمل صالح انجام دینا چاہیئے"۔

ـ "لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة لمن کان یرجو الله و الیوم الآخر"۔ (احزاب ۲۱) "سیرت پیغمبرؐ بہترین نمونۂ عمل ہے ان افراد کے لئے جو اللہ اور آخرت سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں"۔

ـ "لا تقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعاً۔" (زمر ۵۳)
"رحمتِ خدا سے مایوس نہ ہو اللہ تمام گناہوں کا بخشنے والا ہے"۔

ـ "ومن یقنط من رحمة ربه الا الضالون"۔ (حجر ۵۶) "رحمتِ خدا سے گمراہوں کے علاوہ اور کون مایوس ہو سکتا ہے"۔

ـ "لا تیأسوا من روح الله انه لا ییأس من روح الله الا القوم الکفرون"۔ (یوسف ۸۷) خبردار! رحمتِ خدا سے مایوس نہ ہونا کہ رحمتِ خدا سے

صرف کافر مایوس ہوتے ہیں۔"

ارکان رجاء

۱۔ جس سے امید کی جائے اسے حالات کا علم ہو جیسا کہ جناب ابراہیمؑ نے آگ میں جاتے ہوئے جبریل کے جواب میں کہا تھا کہ "علمہ بحالی یغنی عن سوالی" وہ میرے حالات جانتا ہے اس سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ علم کے علاوہ صاحب قدرت بھی ہو جیسا کہ "علیٰ کل شیئ قدیر" سے ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنا پر نمرود مضطرب تھا اور جناب ابراہیمؑ مطمئن تھے۔

۳۔ قدرت کے علاوہ صاحب رحم و کرم بھی ہو۔ "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ"۔ "رحمتی وسعت کل شیئ"۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"۔

۴۔ عقیدۂ آخرت بھی ہو تاکہ انسان زندگی کے آخری عمل میں بھی اجر سے مایوس نہ ہو اور مقتول کو بھی مایوسی کا شکار نہ ہونا پڑے۔

استنتاج

• نماز و روزۂ قضا۔ حج بدل۔ ایصال ثواب کا راستہ بند کر دیا جائے تو مرنے والا نقص عمل کی بنا پر مایوس ہو جائے گا اور ورثہ عدم امکان خدمت کی بنا پر مایوس ہو جائیں گے۔ ایصال ثواب مایوسی کا علاج ہے اور مایوسی کفر و ضلالت ہے۔ لہٰذا ایصال ثواب کا سلسلہ ضروری ہے۔

• امید بنیاد عمل بھی ہے اور وجہ جہاد بھی۔ رجا ہی کی بنیاد پر دعاؤں کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ نماز میں قنوت رجائیت کا بہترین مظہر ہے۔ قنوت نہیں ہے تو پھر قنوط ہے۔

• آل محمدؐ سے امیدیں اسی لئے وابستہ کی جاتی ہیں کہ پروردگار عالم نے انھیں علم، قدرت، رحمت اور کمال سب سے نوازا ہے۔

• ان کا علم سلونی سے ظاہر ہے اور ان کی قدرت ردشمس سے۔ ان کی رحمت سورۂ دہر

سے نمایاں ہے اور ان کا کمال کرم اونٹوں کی قطار سے۔

• لقاء رب میں عمل صالح کی شرط دلیل ہے کہ صرف امید رحمت سے کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ بقدر امکان عمل بہرحال ضروری ہے۔

• غدیر کا دن اسلام کے لئے امید بقا و ارتقاء کا دن تھا اور کفر کے لئے یاس و حرمان کا دن۔ "الیوم یئس الذین کفروا من دینکم"۔

• میدان جہاد سے فرار امید رحمت کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے ورنہ پروردگار چند روزہ حیات کے بدلے حیاتِ جاودانی دینے کے لئے تیار ہے۔

• اسلام نے رجاء کے پہلو میں عمل اور جہاد کو رکھ کر یہ واضح کر دیا کہ تنہا رجائیت کافی نہیں ہے بلکہ خوف بھی درکار ہے اور مومن کی زندگی کو بین الخوف والرجاء ہونا چاہیئے۔

• اسلام نے عالم دین کی تعریف یہی کی ہے کہ لوگوں کو رحمتِ خدا سے مایوس نہ کر دے اور عذابِ الٰہی کی طرف سے مطمئن نہ بنا دے۔

• سورۂ حمد خوف و رجاء کی بہترین تصویر ہے۔ "الحمد للہ رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم" رجائیت ہے اور "مالک یوم الدین" خوف۔ "ایاک نعبد" خوف ہے اور "ایاک نستعین" رجاء۔ "اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم" رجاء ہے اور "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" خوف۔!

کمزوری یا حکمت

• مسائل اسلام پر نظر کرنے والے افراد اکثر اس حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں کہ اسلام خدائے حکیم کا حکیمانہ نظام ہے۔ اس کے قواعد و قوانین میں تمام تر حکمت و عدالت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کی بنیاد طاقت یا قوت پر نہیں ہے۔ لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ اس کے بیشمار اقدامات میں کمزوری کا رُخ نظر آتا ہو اور اسے بر بنائے حکمت و مصلحت اختیار کیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلکہ حکمت اور کمزوری کا موازنہ کر کے یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس حکمت کے باوجود اس طرزِ عمل کو کمزوری کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔

اگر نہیں کہا جا سکتا ہے تو کہنے والے کے ذہن و دماغ کی کمزوری ہے۔ اسلام کے اصول و ضوابط کی کمزوری نہیں ہے۔ اس سلسلہ کی چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں :

۔ سرکار دو عالمؐ نے پہلے دن خاندان کے کفار و مشرکین کی دعوت کی اور سب نے کھانے کے بعد پیغام سُننے سے انکار کر دیا اور جادوگر کہہ کر چل دئے تو حضورؐ نے دوسرے دن کے لئے پھر مدعو کر دیا اور قوم کو دوسرے دن پھر کھلایا۔

بظاہر یہ عمل عجیب و غریب نظر آتا ہے لیکن اس کی عظیم ترین حکمت یہ ہے کہ کفار ہی کے عمل سے ان کے الزام جادوگری کی تردید کر دی جائے کہ اگر میں واقعتاً جادوگر ہوتا اور یہ شکم سیر نہ ہوئے ہوتے تو دوسرے دن ہرگز نہ آتے۔ یا اگر مجھے دیوانہ سمجھتے ہوتے تو دیوانے کی دعوت پر ہرگز لبیک نہ کہتے۔

۔ ہجرت میں سرکار دو عالمؐ نے اپنا آبائی وطن چھوڑ دیا تو مورخ نے اس پر کمزوری کا الزام لگا دیا۔ حالانکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہتر محاذ عمل فراہم نہ ہوتا اور بعد کے تمام معرکوں میں کفار کو جارح

نہ قرار دیا جا سکتا اور نہ مکہ کو فتح کرنے کا جواز پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے ۶ھ میں عُمرہ کو ملتوی کر دیا اور حدیبیہ میں صلح کر کے واپس چلے گئے کہ سرکار کے اقدام پر جارحیت کا الزام نہ لگنے پائے۔

۔ حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ نے صلح کی تو بعض اصحاب کو رسالت ہی میں شک ہو گیا اور اسے حضورؐ کی کمزوری کی دلیل بنا دیا۔

حالانکہ یہ صلح نہ ہوتی تو اسلام پر جارحیت کا الزام آ جاتا۔ اور یہ بھی ثابت نہ ہو سکتا کہ اسلام تلوار کا مذہب ہے یا کردار کا۔ حضرت علیؑ جیسے سورما کے ہوتے ہوئے صلح کرنا اور پھر صلح کا قلم بھی صاحب ذوالفقار کے ہاتھ میں دے دینا اس امر کی علامت ہے کہ اسلام شمشیر کی طرح قلم چلانا بھی جانتا ہے اور قلم سے کام چل سکتا ہے تو تلوار کو استعمال نہیں کرتا۔ اسلام کی بنیادی کوشش صلح ہے۔ صلح ممکن نہ ہو تو میدان جنگ میں قدم رکھا جاتا ہے۔

۔ امیر المومنینؑ نے ۲۵ سال سکوت اور خانہ نشینی کی زندگی بسر کی تو اس کے بارے میں بھی کمزوری کا تصور پیدا ہو گیا۔

حالانکہ یہ سکوت اس الزام کا بہترین جواب تھا کہ علیؑ میں حرص حکومت پائی جاتی ہے۔ اور پھر حضرت علیؑ کو معلوم تھا کہ ہر دَور میں اسلام حقیقی کی حکومت نہ رہے گی لہٰذا چاہتے تھے کہ صاحبان ایمان کے لئے ایک نظیر قائم کر دیں کہ حکومت اسلامی آئین سے الگ ہو تو اس کے ساتھ کیسا برتاؤ ہونا چاہیئے اور اس کے زیر سایہ کس طرح زندگی گذارنا چاہیئے۔

۔ فدک کے موقع پر امیر المومنینؑ نے جناب سیدہؑ کو دربار حکومت میں بھیج دیا تو یہ بات خلاف طاقت و ہمّت نظر آئی۔

حالانکہ اوّلاً تو صاحب حق جناب سیدہؑ تھیں لہٰذا ان کا فرض تھا کہ اپنے حق کا مطالبہ کریں اور نہ ملنے کی صورت میں اعلان کر دیتیں کہ جو حکومت دُختر پیغمبر کے حقوق کو غصب کر سکتی ہے، اس پر امت کے حقوق کے بارے میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر امیر المومنینؑ براہ راست میدان میں آ جاتے تو اسے انقلاب کی کوشش قرار دے کر ان کے ساتھ بدترین سلوک کا جواز بنا لیا جاتا۔ امیر المومنینؑ

نے جناب سیدہؑ کے ذریعہ اعلان حق کر کے حکومت کو رونے پر مجبور کر دیا تاکہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ امامت میں اتنی طاقت پائی جاتی ہے کہ وہ پس پردہ رہ کر بھی حکومت کو رلا سکتی ہے۔ امامت کے سامنے حکومت کی کوئی حیثیت یا اوقات نہیں ہوتی ہے۔

۔ صفین کے موقع پر جب معاویہ نے بطور مکاری نیزوں پر قرآن بلند کر دئے تو امیرالمومنینؑ نے جنگ روک دی حالانکہ فتح قدموں میں آچکی تھی۔

یہ عمل بھی کمزوری نہیں ہے بلکہ مصالح اسلامیہ کی اصلی بنیاد ہے جس سے ایک طرف عظمت قرآن کا اظہار کیا گیا۔ دوسری طرف دشمن کی مکاری کو بے نقاب کیا گیا۔ اور تیسری طرف یہ واضح کر دیا گیا کہ اسلام کے ہر مسئلہ کو قرآن کے ذریعہ طے ہونا چاہیئے اور جس مسئلہ میں قرآن کا ذکر نہ آئے وہ اسلامی مسئلہ نہیں ہے چاہے مسئلہ خلافت ہو یا مسئلہ فدک یا مسئلہ تحکیم جہاں قرآن کریم کو پس پشت ڈال کر عمرو عاص کی عیاری سے کام لیا گیا۔

۔ جناب امیرؑ نے خبر شہادت پانے کے بعد بھی مسجد کا رُخ کیا اور قاتل کو بیدار کر کے نماز شروع کی تو دنیا غرق حیرت ہو گئی۔

حالانکہ اس طرح ایک طرف عظمت نماز۔ وضو۔ مسجد۔ اذان کا اعلان کیا گیا اور دوسری طرف امر بالمعروف کی اہمیت کا اظہار کیا گیا کہ دشمن اور قاتل بھی ہو تو اسے نماز کے لئے آمادہ کرنا مسلمان کا فرض ہے۔

اس کے علاوہ سجدہ میں جناب امیرؑ کی شہادت اس امر کا اعلان ہے کہ قاتل میں کسی ایسی حالت نماز میں حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہے جب علیؑ کے ہاتھ آزاد ہوں۔ سجدہ میں سر جھک جاتا ہے اور ہاتھ پابند ہو جاتے ہیں تو کوئی شخص بھی ضربت لگا سکتا ہے۔

ایسی ضربت قاتل کی کمزوری کی علامت ہو گی اور مقتول کی ہیبت و جلالت کی۔

۔ امام حسنؑ کی صلح بھی درحقیقت ظالم سے اس امر کا اقرار لینے کے لئے تھی کہ اس کا عمل کتاب و سنت پر نہیں ہے اور اس کے دور میں سبّ علیؑ کا سلسلہ جاری ہے جو رسول اکرمؐ کو گالیاں دینے کے مرادف ہے۔

۔ امام حسینؑ کا بہتّر افراد کیساتھ ہزاروں کے لشکر سے مقابلہ کرنا ہمت و طاقت کی دلیل ہے اور پھر پیاس کا برداشت کرنا صبر و اطمینان کی علامت ہے۔ ان تمام واقعات میں کمزوری کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

اسلامی علوم

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مذاہب عالم اور متمدن اقوام میں جس قدر اہمیت علم کے بارے میں اسلام قائل ہے دنیا کا کوئی مذہب یا تمدّن قائل نہیں ہے۔ اسلام نے علم کو اولین فریضہ قرار دیا ہے اور اپنے دین کا آغاز ہی علم و معرفت سے کیا ہے "اوّل الدین معرفته"۔

قرآن مجید کی پہلی وحی "اقرأ باسم ربك الذی خلق ۞ خلق الانسان من علق ۞ اقرأ وربك الاكرم الذی علم بالقلم" میں اقرأ۔ اقرأ۔ علم۔ بالقلم۔ گویا اسلام نے قرارت و کتابت کو اس وقت آغاز تبلیغ اور وحی اول قرار دیا ہے جب سارے عربستان میں صرف ۲۷ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور پورے علاقہ میں جہالت، جاہلیت اور اُمّیت کا دور دورہ تھا۔ اسلام نے یہ نہیں چاہا کہ اس کے ماننے والے بھی جاہل اور ناخواندہ رہ جائیں۔ وہ جاہلوں کی فوج منظم کرنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ بلکہ جہالت کے اندھیرے میں علم کی شمع روشن کرنے آیا تھا اور انسان کو جاہلیت کی تاریکی سے نکال کر علم و تمدن کی روشنی تک پہونچانا چاہتا تھا "یخرجهم من الظلمات الی النور"۔

۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اسلام صرف جاننے کو علم قرار نہیں دیتا ہے بلکہ وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہے کہ بعض امور کا نہ جاننا ہی جاننے سے بہتر ہوتا ہے اور اسی لئے پیدا کرنے والے نے اسے قلیل علم سے نوازا ہے "وما اوتیتم من العلم الا قلیلا" کہ کثیر علم ہر انسان کے بس کا کام نہیں ہے اور نہ ہر شخص اسے برداشت کر سکتا ہے۔ اس کیلئے معصوم کردار اور متقی ظرف درکار ہے کہ علم کے استعمال سے مکمل طور پر باخبر ہو اور ایک لمحہ کیلئے

بھی اس کا غلط استعمال نہ کرے۔

۔ اسلام نے علوم کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے، جائز علوم اور حرام علوم۔

جو علوم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے تھے انہیں جائز قرار دیا ہے اور جن سے انسان کو کوئی نقصان پہونچنے والا تھا انہیں حرام کر دیا ہے چاہے وہ نقصان عقائدی ہو جیسے علم نجوم کہ ستاروں کی تاثیر پر اعتماد کرنیوالے ایک دن پروردگار سے غافل یا مستغنی ہو جاتے ہیں اور ستاروں ہی کو مکمل طور پر کائنات کا موثر اور مدبّر تصور کر لیتے ہیں۔ یا وہ نقصان اجتماعی ہو جیسے قیافہ شناسی۔ کہانت اور شعبدہ بازی وغیرہ کہ قیافہ شناسوں کے فیصلے حتمی نہیں ہوتے ہیں لیکن ان پر اعتماد سماج میں ہزاروں قسم کے جھگڑے اور فساد پیدا کر دیتا ہے۔ یہی حال کاہنوں کے معلومات کا ہے کہ ان کی کوئی علمی سند نہیں ہے لیکن ان پر اعتماد کرنے والے خدائی احکام پر بھی اس قدر اعتماد نہیں کرتے ہیں جس قدر کاہنوں پر اعتماد کرتے ہیں جس کا منظر اس دن بھی دیکھنے میں آیا جب سرکار دو عالمؐ پر اعتبار نہ کرنے والے بھی کاہنوں کے بیان کی بنا پر آپ کی شخصیت کا اعتراف کرنے لگے یا اس سے پہلے فرعون جیسے مدعی ربوبیت نے کاہنوں کے قول کی بنا پر ۷۰ ہزار بے گناہ بچوں کا خون کر دیا اور انسانیت نے محسوس کر لیا کہ کہانت کا فائدہ تو کچھ نہیں ہے البتہ نقصان بے پناہ ہے کہ "وقت کا خدا" بھی اس کے چکر میں پڑ جاتا ہے تو ظلم کی انتہا کو پہونچ جاتا ہے۔

۔ اسلام کے جائز علوم کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بعض علوم انسانیت کے لئے ضروری ہیں تو اسلام نے انھیں واجب قرار دیا ہے جیسے علم دین کہ اسلام اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا ہے کہ انسان مخلوق ہونے کے باوجود اپنے خالق سے غافل رہے یا خالق کا تصور پیدا کرنے کے بعد بھی اس کے احکام سے غافل رہے اور اس کی دی ہوئی طاقت اور صلاحیت کو اس کی مرضی کے خلاف یا مرضی کے بغیر استعمال کر کے خیانت کا مجرم ہو جائے۔

بعض علوم اس مرتبہ پر فائز نہیں ہیں کہ ان کا حاصل کرنا ہر فرد بشر پر فرض ہو لیکن معاشرہ میں ان کے جاننے والوں کا ہونا ضروری ہے تو اسلام نے ان علوم کو بھی فرائض کی صف میں رکھا ہے لیکن انھیں فرض عین نہیں بنایا ہے بلکہ فرض کفائی قرار دیا ہے کہ اتنے افراد کا عالم ہونا

کافی ہے جو معاشرہ کی بقا کے لئے ضروری ہیں۔ باقی افراد جاہل بھی رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اہل علم کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جیسے علم طب۔ علم تعمیرات وغیرہ کہ انسان بدن کیلئے ایک مکان بھی چاہتا ہے اور مرض کے لئے ایک علاج بھی۔ لہذا معاشرہ میں علاج کرنے والوں کا ہونا بھی ضروری ہے اور تعمیرات کے جاننے والوں کا بھی اور اسی لئے اسلام نے ان علوم کو "واجبات نظامیہ" میں قرار دیا ہے کہ ان کا جاننا نظام عالم کے برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے اور ان کے بغیر معاشرہ کی بقا ممکن نہیں ہے۔

۔ اس کے بعد اسلام نے بعض علوم کو ذاتی طور پر شریف قرار دیا ہے جیسے معرفت خدا و رسولؐ اور بعض علوم کو عمل کا مقدمہ قرار دیا ہے کہ اگر عمل ضروری ہے تو علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے ورنہ علم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصول و فروع دین کے علوم میں غالباً یہی بنیادی فرق پایا جاتا ہے کہ اصول دین کا علم ذاتی طور پر مطلوب ہے اور فروع دین کا علم عمل کا مقدمہ ہے لہذا جب بھی عمل واجب ہوگا اس کا علم واجب ہو جائے گا ورنہ ذاتی طور پر علم کے تحصیل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

خالص اسلامی علم

ان تمام علوم کے ساتھ وہ علم جو خالص اسلامی علم ہے اور اس سے بالاتر کوئی علم نہیں ہے بلکہ وہی اسلام کے تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ علم قرآن ہے۔ کہ قرآن جملہ علوم دین و دنیا کا مصدر ہے اور اس نے ہر علم کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے۔ وحی اول میں "خلق الانسان من علق" کہہ کر علم تخلیق کی طرف بھی متوجہ کیا ہے اور علم الحیوانات کی طرف بھی۔ بالقلم علم کتابت کی طرف اشارہ ہے اور اقرأ علم قرارت کا مصدر ہے۔ پھر اسی میں وسائل علم کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔

دوسرے مقام پر "الذی خلق فسوّیٰ والذی قدّر فھدیٰ والذی اخرج المرعیٰ فجعلہ غثاءً احویٰ" اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ علم نباتات کے عتبار سے جہاں گھاس کا زمین سے برآمد ہونا ایک کرم پروردگار ہے ورنہ اس کا خشک و سیاہ

ہو جانا بھی ایک کرم الٰہی ہے کہ یہ حالات اشارہ کرتے ہیں کہ زیر زمین پٹرول کا ایک ذخیرہ ہے جس نے گھاس کو خشک اور سیاہ بنا دیا ہے۔

علوم قرآن

علماء اسلام نے علوم قرآن کو بھی متعدد انواع و اقسام پر تقسیم کیا ہے :

• باعتبار الفاظ :

اس قسم میں اوّلاً تلفظ کے مسائل آتے ہیں جیسے ادغام۔ ابدال۔ وقف۔ ابتدا وغیرہ۔
اس کے بعد ضبط قرات کے مسائل شروع ہوتے ہیں۔
اس کے بعد فن ضبط اعداد حروف و آیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔
اس کے بعد رسم الخط کے مسائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

• باعتبار معانی :

اس قسم میں معانی کے کلیات تنزیل۔ تاویل۔ ظاہر۔ باطن۔ محکم۔ متشابہ۔ ناسخ منسوخ جیسے مسائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔
اس کے بعد آیات احکام کی بحث ہوتی ہے اور اس سے استنباط کے طریقے طے کئے جاتے ہیں۔
اس کے بعد فن تفسیر کے احکام پر بحث ہوتی ہے کہ تفسیر قرآن لغت کے ذریعہ ہوگی یا احادیث کے ذریعہ یا خود دیگر آیات قرآن کے ذریعہ۔
اس کے بعد ترتیب و تقسیم سور کی گفتگو ہوتی ہے کہ کونسا سورہ کب نازل ہوا ہے اور سوروں میں مکی اور مدنی ہونے کا معیار کیا ہے اور کونسا سورہ مکی ہے اور کونسا مدنی۔
اس کے بعد شان نزول سے بحث ہوتی ہے کہ کون سی آیت کب نازل ہوئی ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے۔
اہلسنت کے نزدیک اسباب نزول کی روایات ہزاروں کی تعداد میں ہیں جبکہ مذہب شیعہ میں سیکڑوں کے حساب میں ہیں اور اکثر روایات تو مستند بھی نہیں ہیں۔

• باعتبار تقسیم آیات :

کہ قرآن مجید میں کون سی آیت کتنی مرتبہ دُہرائی گئی ہے یا سب سے مختصر آیت کونسی ہے اور سب سے طویل آیت کونسی ہے۔ مثلاً "فبایّ آلاء ربکما تکذّبان" کی تکرار ۳۱ مرتبہ ہوئی ہے۔ مختصر ترین آیت "مدھامتان" ہے۔ طویل ترین سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ ہے۔
یا سورۂ مدثر کی آیت ۳۰ ایک جملہ ہے اور آیت ۳۱ میں ۱۵ جملے شامل ہیں۔

• باعتبار کتابت :

مثلاً خط کوفی میں نقطہ کی موجودہ شکل عبدالملک کے دور میں ایجاد ہوئی ہے اور اعراب خلیل بن احمد فراہیدی کے زمانہ میں لگائے گئے ہیں۔

• باعتبار طبقات قرّاء :

طبقۂ اولیٰ میں صحابۂ کرام تھے جنھوں نے قرآن حافظہ میں محفوظ کیا تھا۔
طبقۂ ثانیہ میں تابعین تھے جیسے مکہ میں عبید بن عمیر۔ عطار بن ابی رباح۔ طاؤس۔ مجاہد۔ عکرمہ بن ابی ملیکہ ــــ مدینہ میں ابن المسیب۔ عروہ۔ سالم۔ عمر بن عبدالعزیز۔ سلیمان بن یسار۔ عطار بن یسار۔ معاذ۔ عبداللہ بن الاعرج۔ ابن شہاب المخزومی۔ مسلم بن جذب۔ زید بن اسلم ــــ کوفہ میں علقمہ۔ اسود۔ مسروق۔ عبیدہ۔ عمرو بن شرجبیل۔ حارث بن القیس۔ ربیع بن خیثم۔ عمرو بن میمون۔ ابو عبدالرحمٰن السلمی۔ زر بن جیش۔ عبید بن نفلہ۔ سعید بن جُبیر۔ نخعی۔ شعبی۔
بصرہ میں ابو عالیہ۔ ابو الرجار۔ نصر بن عاصم۔ یحییٰ بن یعمر۔ حسن بصری۔ ابن سیرین قتادہ۔
شام میں مغیرہ بن ابی شہاب۔ خلیفہ بن سعد۔
طبقۂ ثالثہ : یعنی دوسری صدی ہجری کا آغاز اور مشاہیر قرّاء کا دور۔
مکہ میں عبداللہ کثیر (جو قرّاء سبعہ میں سے ایک ہیں) حمید بن قیس الاعرج۔ محمد بن ابی محیصین۔
مدینہ میں ابو جعفر۔ یزید بن القعقاع۔ شیبہ بن النفاح۔ نافع بن نعیم (جو قرّاء سبعہ میں

شامل ہیں)۔

کوفہ میں یحییٰ بن وثاب۔ عاصم بن ابی النجود (جو قرا سبعہ میں شامل ہیں)، سلیمان الاعمش۔ حمزہ (جو قرا سبعہ میں شامل ہیں)، کسائی (جو قرا سبعہ میں شامل ہیں)۔

بصرہ میں عبداللہ بن ابی اسحاق۔ عیسیٰ بن عمر۔ ابو عمرو بن العلاء (جو قرا سبعہ میں شامل ہیں) عاصم مجددی۔ یعقوب حضرمی۔

شام میں عبداللہ بن عامر (جو قرا سبعہ میں شامل ہیں)، عطیہ بن قیس کلابی۔ اسماعیل بن عبداللہ بن مہاجر۔ یحییٰ بن الحارث۔ شریح بن یزید حضرمی۔

نثری ادب

قرآن مجید کے بارے میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دورِ جاہلیت کا سارا ادب نظم و شعر کی حیثیت رکھتا تھا اور عرب اس میدان میں اعلیٰ ترین منزل کمال پر فائز تھے تو اعجاز کے اظہار کا تقاضا یہ تھا کہ قرآن مجید بھی اسی اسلوب کو اختیار کرتا تاکہ عرب کے لئے اس کی شان اعجاز کا سمجھنا آسان ہوتا اور ان کا اعتراف عجز واقعی اہمیت پیدا کر سکتا۔

لیکن اس سوال کے تین جوابات ہیں:

۱۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں شعری ادب کا چرچا زیادہ تھا لیکن ایسا نہیں ہے کہ نثری ادب کوئی اجنبی شے رہا ہو اور لوگ اس کے خصوصیات سے واقف نہ رہے ہوں. یہی وجہ ہے کہ مختلف جماعتوں نے جواب لانے کی کوشش بھی کی اور مختلف آیات قرآنی کا موضوعہ جملوں سے موازنہ بھی کیا گیا اور اس موازنہ کے بعد یہ اقرار بھی کیا گیا کہ اس کلام کا جواب لانا ممکن نہیں ہے کہ یہ کلام بشر نہیں ہے بلکہ مافوق بشر ہستی کا کلام ہے۔

۲۔ عرب کا خیال یہ تھا کہ فصاحت و بلاغت کا مکمل اظہار شعری ادب کے بغیر ممکن نہیں ہے اور نثری ادب کسی قیمت پر شعری ادب کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے اس لئے مالک کائنات نے چاہا کہ اپنا کلام اس اسلوب میں پیش کیا جائے جو عرب کی نظر میں غیر اہم ہو اور جس کا مقابلہ کرنا آسان ترین عمل ہو، تاکہ اس کے جواب سے عاجزی اس بات کی دلیل بن جائے کہ جب شعری ادب کے ماہرین نثری ادب کا جواب نہیں پیش کر سکتے تو قرآن مجید کی معنویت اور مقصدیت کا جواب کیسے پیش کر سکتے ہیں۔

۳۔ شعری اور نثری ادب کا بنیادی فرق یہ ہے کہ شعری ادب جذبات سے قریب تر

ہونے کی بنا پر عام طور سے نفس کو متاثر کرتا ہے اور نفسیات کو اپیل کرتا ہے لیکن اس کے برخلاف نثری ادب عام طور سے عقل کو اپیل کرتا ہے اور اس کا تعلق عالمِ فکر و شعور سے ہوتا ہے۔

مالکِ کائنات نے چاہا کہ بندوں پر اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ میری تعلیمات خواہشاتی اور جذباتی نہیں ہیں اور نہ ان کا مقصد نفس کو مطمئن کرنا ہے۔ یہ تعلیمات تمامتر عقلی اور فکری ہیں اور ان کا مقصد انسان کو دعوتِ فکر و شعور دینا ہے لہٰذا اس مقصد کے لئے نثر کا اختیار کرنا ضروری ہے اور یہ کام نظم سے نہیں لیا جا سکتا ہے۔

یہ بات ضرور رہ جاتی ہے کہ شعریت سے نفسیات کو متاثر کیا جاتا ہے تو اسلام بھی تمامتر عقل ہی کو مخاطب نہیں کرنا چاہتا اور نہ تمام افراد ایسے صاحبانِ عقل ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے تمامتر عقلی انداز سے بات کی جائے۔ عوام الناس کا معیار فہم عقلی سے زیادہ نفسیاتی ہوتا ہے لہٰذا ضرورت تھی کہ قرآن مجید اس رُخ کا بھی خیال کرتا اور اپنے اندازِ کلام میں نفس کی تسکین کا سامان بھی کرتا۔

لیکن اس کا جواب بھی واضح ہے کہ اسلام نے یہ کام اپنے اسلوبِ کلام سے لیا ہے کہ عام طور سے ایک ہی جیسے قوافی میں بات کی ہے تاکہ مسئلہ عقلی رہے اور اسلوب نفسیاتی رہے اور اس طرح عوام اور خواص دونوں بیک وقت استفادہ کر سکیں۔

سورۂ مبارکہ "رحمٰن" اس کی واضح ترین دلیل ہے کہ مطالب آغازِ کلام ہی سے تمامتر علمی اور عقلی ہیں لیکن انداز اور اسلوب بالکل شاعرانہ ہے اور اس طرح عقل اور نفس دونوں ایک ساتھ متاثر ہوتے ہیں۔

نثری ادب اختیار کرنے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ صنعتِ التفات کو شعری ادب میں ایطاء سے تعبیر کیا جاتا ہے اور نثری ادب میں اس امر کو جانِ ادب اور روحِ کلام تصور کیا جاتا ہے اور مالکِ کائنات کو اسی انداز سے کام لینا تھا لہٰذا اس نے نثری اسلوب کو مقدم کیا اور شعریت کو نظر انداز کر دیا۔

سورۂ مبارکہ "حمد" سے لے کر آخر قرآن تک اس التفات کی بیشمار مثالیں پائی جاتی ہیں "الحمد للہ ربّ العٰلمین" سے "ایاك نعبد" کی طرف گریز نثر کا حسن ہے اور نظم کا عیب اور عظمت بندگی سمجھانے کے لئے یہ اسلوب بیحد ضروری تھا تاکہ انسان یہ احساس کر سکے کہ حمدِ الٰہی نے انسان کو تقرب کی ان منزلوں تک پہونچا دیا ہے کہ گویا مالکِ کائنات نگاہوں کے سامنے آگیا ہے اور انسان براہ راست گفتگو کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔!

اسلام اور شاعری

شعر کے بارے میں ایک بنیادی اختلاف یہ ہے کہ شعر کی شعریت کا تعلق اس کے مادہ سے ہے یا ہیئت سے۔

فلاسفہ یونان کا خیال تھا کہ شعریت کا دار و مدار خیالی مواد پر ہے۔ اس کا ہیئت سے کوئی تعلق نہیں ہے لہذا خیالی تصوّرات کو نثر میں بھی بیان کیا جائے گا تو اس کا نام شعر ہی ہوگا۔ بعد کے فلاسفہ نے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے اور شعر کی شعریت میں خیالی مواد کے علاوہ ہیئت کو بھی ایک رکن اعظم تسلیم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شعریت کی تکمیل کے لئے وزن و قافیہ کا ہونا ضروری ہے اور ان کا شمار بنیادی ارکان میں ہوتا ہے۔

یہ بات بہرحال طے شدہ ہے کہ شعر کی شعریت کا دار و مدار خیالی مضامین پر ہے چاہے اس میں وزن و قافیہ کا التزام ہو یا نہ ہو۔ وزن و قافیہ خیال کی تاثیر کو مزید قوی تر بنا دیتے ہیں اور اس کا حملہ براہ راست انسانی دل و دماغ پر ہو جاتا ہے۔

شعریت کو عام طور سے حسب ذیل مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے:

۱۔ فوجیوں کے حوصلۂ جنگ کو بیدار کرنا۔
۲۔ کسی خاص دینی یا سیاسی مقصد کے لئے عوام الناس کے جذبات کو بیدار کرنا۔
۳۔ روسار کی تائید اور مخالفین کی مذمت۔
۴۔ لذّت و طرب کا ماحول پیدا کرنا۔
۵۔ حُزن و الم کے احساسات کو بیدار کرنا۔
۶۔ محبوب سے محبّت یا اس کی ملاقات کا اشتیاق پیدا کرانا۔

۷۔ نیکیوں کے لئے مزاج کو آمادہ کرنا۔
۸۔ بُرائیوں سے بیزاری پیدا کرانا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر ایسے اثرات کس طرح پیدا کر لیتا ہے اور اس میں یہ بات کہاں سے آجاتی ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ شعر کی بنیاد تخیل پر ہے اور تخیل ایک طرح کی تمثیل اور محاکات کا نام ہے اور انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اصل واقعہ سے اس قدر متاثر نہیں ہوتا ہے جس قدر اس کی محاکات اور تمثیل سے متاثر ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تمثیل اس کے ذہن پر اس طرح غالب آجاتی ہے کہ اصل حقیقت سے بھی غافل ہو جاتا ہے اور تمثیل کے مطابق عقیدہ تبدیل کر لیتا ہے۔

بہترین خطبا اور شعرا کا کل کمال ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو حقیقت کی طرف سے غافل بنا دیتے ہیں اور ان کی تمام تر توجہ اس بیان اور تمثیل کی طرف ہو جاتی ہے جو خطیب یا شاعر پیش کرتا ہے۔ حقیقت کا احساس تو اسی وقت ہوتا ہے جب یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور یہ تانے بانے بکھر جاتے ہیں۔

شعر میں یہ تاثیر زیادہ ہوتی ہے اور اس کا سبب مضمون، الفاظ اور وزن کا مجموعہ ہوتا ہے کہ مضمون و الفاظ کے علاوہ وزن خود بھی ایک اثر رکھتا ہے اور اس کا راز غالباً یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک طرح کی موسیقیت پائی جاتی ہے اور بات جب اس فطرت سے قریب تر ہو جاتی ہے تو اس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسجّع و مقفّیٰ نثر کا اثر بھی سادہ نثر سے زیادہ ہوتا ہے اور قرآن مجید نے بھی اکثر مقامات پر یہ اسلوب اختیار کیا ہے اور پورا پورا سورہ یا سورہ کا بیشتر حصہ ایک ہی وزن و ہیئت پر مکمل کر دیا ہے اور انسانی نفس پر وہ سارے اثرات مرتب کر دئے ہیں جو شاعر اپنے اشعار کے ذریعہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن کلام کو شعر نہیں بننے دیا۔ اسے حقیقت ہی رکھا اور اس کا مخاطب نفس کے بجائے عقل ہی کو قرار دیا۔

عرب نے رسول اکرمؐ کو شاعر اور قرآن کو شعر اسی خیالی مواد کے اعتبار سے قرار دیا تھا اسی لئے مالک کائنات نے اس کی شدّت سے تردید کر دی اور واضح کر دیا کہ شعرار کا اتباع گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ شعرار ہر وادیٔ خیال میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ان کے قول و فعل

میں تطابق نہیں ہوتا ہے اور رسول اکرمؐ کے کردار میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔
وہ شعرا الگ حیثیت رکھتے ہیں جن کے پاس ایمان اور عمل صالح ہے۔ جو کثرت سے ذکر پروردگار کرتے ہیں اور مظلومیت کے بعد ظالم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

استنتاج

- خیالی شعرا کا موضوعِ کلام عورت، اونٹ، گھوڑا، شراب اور کھنڈر تھا۔ قرآن مجید کا موضوع اخلاق، کردار، ایمان اور پروردگار ہے۔
- شعر کی اصل خیال ہوتی ہے لیکن شعر کے پس منظر میں مذہب ہو تو خیال حقائق میں تبدیل ہو جاتا ہے اور شاعری معنویت پیدا کر لیتی ہے اور یہی قصیدہ کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔
- مظلوم کی فریاد اور اس کی حمایت دنیائے شعر و سخن سے الگ ایک اخلاقی موضوع ہے لہٰذا اس پر عام شعریت کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے اور یہی مرثیہ کا امتیاز ہے۔
- ادبی مسائل میں قرآن سے استدلال اس لئے مناسب اور ضروری ہے کہ اس سے بالاتر کوئی ادب نہیں ہے۔ وہ فنی طور پر ادب بھی ہے اور واقعی طور پر مذہب بھی۔
- شعرا کا باہمی اختلاف ممدوحوں کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلام نے اپنا ممدوح جملہ صفات جلال و جمال کے مالک کو بنایا ہے۔ الحمد للہ رب العٰلمین

تعظیم شعائرُاللہ ــــ ایک علمی دامن نظر

مالک کائنات نے سورۂ مبارکہ حج میں آیت نمبر ۳۰ اور آیت نمبر ۳۲ میں اس امر کی تاکید فرمائی ہے کہ "حرمات الٰہیہ کی تعظیم میں پروردگار کے نزدیک خیر ہی خیر ہے" اور شعائراللہ کی تعظیم تقویٰ قلوب کی علامت ہے" اور اس امر کی نشانی ہے کہ انسان کے دل میں تقویٰ الٰہی اور خوفِ خدا پایا جاتا ہے۔

اور پھر آیت نمبر ۳۷ میں اس امر کی مزید تاکید کر دی ہے کہ پروردگار کی بارگاہ میں مادیات کی رسائی نہیں ہے۔ اس کی بارگاہ میں تقویٰ ہی جانے والا ہے اور وہی روز آخرت کام آنے والا ہے۔

ان تینوں آیات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شعائراللہ جنھیں حُرُمات اللہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی ایک بنیاد ہے اور ایک نتیجہ۔

بنیاد تقویٰ الٰہی ہے جو انسان کو تعظیم پر آمادہ کرتا ہے اور نتیجہ خیر ہے جس کے لئے ہر انسان بے چین رہتا ہے اور جس کی بنیاد پر امت اسلامیہ کو خیر امت اور صاحبان ایمان و کردار کو خیر البریہ قرار دیا گیا ہے۔

قرآن حکیم کے جملہ آیات کے مضامین کو یکجا کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ تعظیم شعائراللہ وہ عظیم ترین عمل ہے جو انسان کو خیر امت اور خیر البریہ کی منزل تک پہونچا دیتا ہے اور اسکی بنیادوں میں وہ تقویٰ شامل ہے جو انسان کو جنت الفردوس سے قریب تر بنا دیتا ہے "اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ"۔

ان حقائق کو نگاہ میں رکھنے کے بعد ایک ادنیٰ طالب علم بھی تعظیم شعائراللہ کی عظمت

اور اہمیت کا اندازہ لگا سکتا ہے اور بخوبی محسوس کر سکتا ہے کہ یہ عمل نگاہِ پروردگار میں محبوب ترین عمل ہے اور یہ عمل انسان کو معبود سے قریب تر بنا دیتا ہے اور اسے منزل ایمان سے بلند تر کر کے منزل تقویٰ تک پہونچا دیتا ہے اور اس کا تقویٰ بھی صرف ظاہری اعمال اور احتیاطِ عمل تک محدود نہیں رہتا ہے بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور دلوں کی گہرائیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

۔ اس کے برخلاف ایک فہرست بدترین اعمال کی ہے جن میں دو طرح کے گناہ شامل ہیں۔ ایک وہ قسم ہے جس پر عمومی طور پر جہنم کی خبر دی گئی ہے اور اسے جبار سماوات وارض کی مخالفت کی بنا پر مستحق جہنم قرار دیا گیا ہے۔ اور دوسری وہ قسم ہے جہاں صراحتًا اصل عمل ہی پر جہنم کی سزا سنائی گئی ہے یا اسے کسی جہنم واصل بنا دینے والے عمل سے بدتر قرار دیا گیا ہے۔

علمائے اعلام کے درمیان گناہوں کے صغیرہ اور کبیرہ ہونے کی ایک بنیاد یہ بھی ہے کہ گناہانِ صغیرہ پر عمومی طور پر جہنم کی خبر دی گئی ہے اور گناہانِ کبیرہ پر بالخصوص جہنم کی سزا سنائی گئی ہے ورنہ مالک ارض وسما کی مخالفت کے پیش نظر کوئی گناہ صغیرہ نہیں ہے اور گناہ کو ہلکا اور معمولی تصور کر لینا خود بھی ایک گناہ کبیرہ ہے۔

ایمانی زندگی کا خاصہ یہ ہے کہ مومن نہ رحمت خدا سے مایوس ہوتا ہے اور نہ اپنے کو عذاب الٰہی سے مکمل طور پر محفوظ تصور کر لیتا ہے۔ اس کے کردار میں خوف و رجاء۔ امید و بیم دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا نمونۂ عمل وہ کردار ہے جہاں بندگانِ خدا مسلسل روزہ رکھنے کے بعد پانی سے افطار کر لیتے ہیں اور افطار کا سامان یتیم و مسکین و اسیر کے حوالہ کر دیتے ہیں لیکن اسکے باوجود پروردگار ان الفاظ میں مدح کرتا ہے کہ "وہ نذر کو پورا کرتے ہیں اور قیامت کے دن کا خوف بھی رکھتے ہیں"۔ گویا اس قدر عظیم کردار رکھنے والے انسانوں کیلئے بھی خوفِ قیامت ایک قابلِ مدح و ثنا عمل ہے اور وہ بھی اپنے کو ہول قیامت کے خوف سے الگ نہیں رکھنا چاہتے ہیں کہ ان سے محبت کرنے والے اس انداز بے خوفی کو بھی ایک اسوۂ حسنہ بنا لیں اور عذاب آخرت کی طرف سے یکسر غافل ہو جائیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے چاہنے والے خوفِ آخرت کو اسوۂ حسنہ قرار دیں اور بے خوفی کے بہانے نہ تلاش کریں۔

بہر حال گناہوں کی دونوں قسموں میں معافی اور بخشش کے امکانات پائے جاتے ہیں، اور رب کریم کسی بھی گناہ کو معاف کر سکتا ہے لیکن ایک گناہ ایسا ہے جس کے بارے میں اس نے خود اعلان کر دیا ہے کہ "اللہ شرک کو معاف نہیں کر سکتا ہے اور اس کے علاوہ ہر گناہگار کو معاف کر سکتا ہے"۔ اس آیت میں بھی اگرچہ تمام گناہگاروں سے مغفرت کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ مغفرت کو مشیت الٰہی سے وابستہ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس امکان کا ضرور اعلان کیا گیا ہے کہ ہر گناہ قابل مغفرت و بخشش ہے۔ البتہ شرک ایک ایسا گناہ ہے جو کسی قیمت پر معاف نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس کی بخشش کا توبہ اور اسلام و ایمان کے بغیر کوئی امکان نہیں ہے۔

۔ ان دونوں حقائق کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس نتیجہ تک پہونچنا انتہائی آسان ہے کہ تعظیم شعائر اللہ اور شرک، دو متضاد اعمال ہیں جن کا ایک مقام پر جمع ہونا تقریبًا ناممکن ہے۔ تعظیم شعائر اللہ مدح کی آخری سرحد پہ ہے اور شرک مذمت کی آخری سرحد پر۔

تعظیم شعائر اللہ علامت تقویٰ و خوف خدا ہے اور شرک علامت استکبار و انانیت۔

تعظیم شعائر اللہ گناہوں کی بخشش کا سہارا ہے اور شرک ناقابل بخشش عمل ہے۔

ایسے حالات میں تعظیم شعائر اللہ کو شرک اور بدعت کا نام دینا حقائق ایمان سے غفلت اور فہم قرآن کی دنیا میں مکمل جہالت کا ثبوت ہے۔ ورنہ قرآن حکیم نے کسی وقت بھی ایک کا اطلاق دوسرے پر نہیں کیا ہے اور نہ ایک کے احکام دوسرے پر مرتب کئے ہیں۔ اس کے یہاں تعظیم کی دنیا اور ہے اور شرک کی دنیا اور۔

تعظیم کی دنیا خیر ہی خیر ہے اور شرک کی دنیا میں کسی خیر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تعظیم کی دنیا خوفِ خدا اور ایمان و تقویٰ کی دنیا ہے اور شرک کی دنیا اس سے قطعًا مختلف ہے۔

دوسرا مرحلہ

قرآن مجید نے جس چیز کو عالم انسانیت کے لیے خیر اور تقویٰ کی بنیاد قرار دیا ہے وہ خود ذات واجب کی تکریم و تعظیم نہیں ہے بلکہ شعائر اللہ کی تعظیم ہے جس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی طرح شعائر اللہ بھی قابل تعظیم ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ ذاتی طور پر عظمتوں کا مالک اور

قابل تعظیم ہے اور شعائر اللہ کو اس نے قابل تعظیم قرار دیا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام میں کوئی شے اس وقت تک قابل تعظیم نہیں ہو سکتی ہے جب تک اس میں عظمت کا کوئی پہلو نہ پایا جاتا ہو اور مالک کائنات نے اسے عظیم نہ قرار دیا ہو۔ تعظیم بلا عظمت ایک لایعنی تصور ہے جسے اسلام کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا ہے۔

شعائر اللہ کی عظمت کے لئے یہی کیا کم ہے کہ انھیں ذات واجب اور عظمت پروردگار کی علامت قرار دیا گیا ہے اور ان کو دیکھ کر مالک کی عظمت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور اس کی یاد صفحۂ ذہن پر ابھر کر آجاتی ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جو شعائر اللہ کے دائرہ کی تحدید کرتا ہے کہ کون کون سی چیز شعائر اللہ میں شامل ہونے کے قابل ہے اور کون سی شے اس قابل نہیں ہے۔ کس چیز کو دیکھ کر یاد پروردگار پیدا ہوتی ہے اور کس چیز کو دیکھ کر نہیں پیدا ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے اس سلسلہ میں دو ایک مثالیں بھی بیان کر دی ہیں تاکہ شعائر اللہ کی معرفت میں زیادہ زحمت نہ پیدا ہو اور اس کا ادراک بآسانی پیدا ہو سکے۔

"انّ الصّفا والمروۃ من شعائر اللہ" صفا و مروہ شعائر اللہ میں ہیں کہ ان سے ایک نبی خدا کی یاد وابستہ ہے اور انھیں دیکھ کر مالک کا وہ کرم یاد آتا ہے جب ایک کنیز خدا ایک نبی خدا کی زندگی کے لئے دوڑ لگا رہی تھی اور قدرت اس کے نتیجہ میں چشمۂ زمزم جاری کر رہی تھی۔

"والبُدن جعلناھا لکم من شعائر اللہ" ہم نے قربانی کے اونٹ کو بھی تمھارے لئے شعائر اللہ میں قرار دے دیا ہے ـــ کہ اسے دیکھ کر وہ قربانی یاد آتی ہے جب ایک نبی خدا حکم خدا کے سہارے اپنے عزیز ترین فرزند کو راہ خدا میں قربان کر رہا تھا اور اسے خُلّت کا خلعت عنایت کیا جا رہا تھا۔

لیکن یہ بات بلا کہے واضح ہے کہ قرآن مجید نے شعائر اللہ کو انھیں دو چیزوں میں منحصر نہیں کیا ہے بلکہ انھیں شعائر اللہ کی ایک فرد قرار دیا ہے اور اس نکتہ سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ جب پہاڑوں یا جانوروں سے ایک تاریخ کا وابستہ ہو جانا انھیں شعائر اللہ میں شمار ہونے کے قابل بنا دیتا ہے تو جن انسانوں کی تاریخ ان پہاڑوں اور جانوروں سے وابستہ ہے وہ کس طرح شعائر اللہ میں شامل نہ ہوں گے۔ ان کا شعائر اللہ میں شامل ہونا زیادہ واضح تھا اسی لئے اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے

اور صرف ان مصادیق کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا مسئلہ واضح نہیں تھا۔

انبیاء کرام اور اولیاء اللہ سے بہتر شعائر اللہ کا کوئی مصداق نہیں ہو سکتا ہے ـــ یہی وہ ہستیاں ہیں جن کے وجود سے وجود مالک اور جن کے کمالات سے کمال پروردگار کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ بشریت کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ آدمؑ کا روئے زمین پر خلیفۃ اللہ کی شکل میں آنا اس امر کا اعلان تھا کہ یہ روئے زمین پر عظمت خالق کی پہلی علامت اور قدرت پروردگار کا پہلا نمونہ ہے جس کے علم و کمال کے سامنے تمام کائنات سماوات کو سربسجود بنا دیا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ جو مالک کائنات کی عظمت کی علامت ہوتا ہے وہ قابل سجود بنایا جا سکتا ہے ـــ اب یہ مصلحت پروردگار ہے کہ کس کے سجدہ کا حکم دے گا اور کس کے سجدہ کا حکم نہ دے گا اور کسی دوسرے انداز سے اس کی عظمت کا اظہار و اعلان کرے گا۔

تیسرا مرحلہ

تعظیم کا مسئلہ اگرچہ لغوی اور عرفی مسئلہ ہے اور اسے ہر سماج اور معاشرہ اپنے حالات کے اعتبار سے طے کر لیتا ہے لیکن جب اس کا تعلق شعائر اللہ سے ہو تو اس کا طریقہ بھی پروردگار ہی طے کرے گا۔ چنانچہ اس نے اس حقیقت کا اظہار بھی کر دیا کہ جب تعظیم عظمت کے بغیر ناممکن ہے اور عظمت کے مختلف درجات ہیں تو جو جس طرح کی عظمت کا مالک ہوگا اس کی تعظیم کا انداز بھی ویسا ہی ہوگا۔ مثال کے طور پر رکوع، سجدہ۔ نماز۔ عبادت یہ تعظیم کی آخری منزلیں ہیں لہٰذا ان کا جواز اسی ذات اقدس کے لئے ہوگا جو انتہائی عظمت کی مالک ہے اور اس کے علاوہ کسی کے لئے نہ ہوگا جیسا کہ زیارت امیر المومنینؑ اور زیارت امام حسینؑ کے بعد نماز زیارت کے ذیل کی دعاؤں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز۔ رکوع اور سجدہ کا جواز غیر خدا کے لئے ہرگز نہیں ہے اور یہ جواز حکم خدا کے بغیر ناممکن ہے۔ پروردگار ہی آدمؑ کے سامنے سجدہ کرا دے تو اور بات ہے کہ یہ سجدہ حکم خدا کا نتیجہ ہے ورنہ اس کے حکم کے بغیر غیر خدا کے لئے سجدہ قطعاً ناجائز ہے ـــ لیکن رکوع و سجدہ کے علاوہ مس کرنا۔ بوسہ دینا۔ قیام کرنا۔ سلام کرنا یہ تعظیم کے وہ طریقے ہیں جو انتہائے عظمت کی علامت نہیں ہیں لہٰذا غیر خدا کے لئے بھی جائز ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ انسان ان کے برابر عظمت کا مالک ہو

اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے معصومین علیہم السلام کے لئے ان تمام طریقوں کو جائز قرار دیا ہے کہ وہ پروردگار کی طرف سے ان عظمتوں کے مالک ہیں اور مالک نے انھیں اس قسم کی تعظیم کے قابل بنایا ہے جس طرح آدمؑ کے لئے سجدہ کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ان حضرات کی شخصیت، ان کے آثار، ان کے مزارات مقدسہ کی تعظیم نہیں کرتا ہے تو وہ تعظیم شعائر اللہ کے آثار و برکات سے محروم ہے اور اس کے گوشۂ دل میں شیطنت کا کوئی رُخ ضرور پایا جاتا ہے جو اسے فخر اولاد آدمؑ کے سامنے سر جھکانے سے اسی طرح روک رہا ہے جس طرح خود اس نے آدمؑ کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

حصۂ دوم

اخلاق

اسبابِ فضیلت

انسانی زندگی میں فضیلت کے بےشمار اسباب پائے جاتے ہیں لیکن ان کی حقیقت پر غور کیا جائے تو ان کا خلاصہ چار قسموں میں تیار کیا جا سکتا ہے :

۱۔ وہ فضائل جو ولادت سے پیدا ہوتے ہیں جیسے بہترین نسب۔ صاحب ایمان ماں باپ کے یہاں پیدا ہونا۔ مقدس گھر میں دنیا میں قدم رکھنا۔ بہترین تاریخ میں پیدا ہونا یہ تمام باتیں انسان کے فضائل میں شمار ہوتی ہیں لیکن اس کا انسان کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس میں انسان کا کوئی دخل ہے۔ یہ مالک کائنات کا مخصوص کرم ہے جو مخصوص مصالح کے تحت بندوں کے شامل حال کر دیتا ہے۔

۲۔ نفسانی فضائل بدون عمل ـــ بعض افراد میں فطری طور پر کرم حسن اخلاق۔ شجاعت وغیرہ جیسے جذبات پائے جاتے ہیں اور یہ یقیناً انسان کے فضائل میں شامل ہیں لیکن ان میں انسانی اعمال کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ اعمال خود انھیں کیفیات کے ممنون کرم ہوتے ہیں اور انھیں کیفیات سے پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ عملی فضائل ـــ یہ وہ کمالات ہیں جو عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے چار طرح کے شرائط کا ہونا ضروری ہے ورنہ ان کے بغیر کوئی عمل فضائل میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہے۔

ا۔ انسان میں انتہائی درجہ کی احتیاط پائی جاتی ہو تاکہ کسی طرح کا غلط جذبہ شامل نہ ہونے پائے اور وہ نفس اللہ ہونے کے باوجود دشمن کے سینہ سے اتر آئے کہ کہیں نفس کی شمولیت کا تصور نہ پیدا ہو جائے۔

ب۔ وہ نفسانی شجاعت و ہمت ہو جو ہر طرح کی خواہش پر قابو پا سکے اور عمل پر کسی طرح کے جذبہ کا تسلط نہ ہونے پائے۔

ج۔ حقائق و کلیات سے باخبر ہو تا کہ وہی اعمال انجام دے جو خیر و خیرات کا مصداق بن سکیں اور ایسے اعمال میں مبتلا نہ ہو جائے جو دیکھنے میں حسین دکھائی دیتے ہوں اور واقعاً انسان کی تباہی اور بربادی کا سبب ہوں۔

د۔ کلیات کی تطبیق سے بھی باخبر ہو۔ تاکہ بدترین افراد پر بہترین کلیات کو منطبق نہ کردے کہ وہ اپنے خیال میں عظیم ترین منزل کو حاصل کر رہا ہے اور واقعاً نقائص کے گڑھے میں گرتا جا رہا ہے۔

مراتب اعمال

اس کے بعد انسان جن اعمال کو انجام دیتا ہے ان کے بھی چھ درجہ ہوتے ہیں:

۱۔ اعتباریات کا خرچ کر دینا۔ جیسے مال کی قربانی کہ انسان ملکیت سے دستبردار ہو جاتا ہے لیکن مال کا اس کے وجود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۔ حقیقی متعلقات کی قربانی۔ جیسے اولاد و برادران کی قربانی کہ ان کا وجود بھی انسانی وجود سے الگ ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت مال سے مختلف ہوتی ہے۔ مال کسی وقت بھی انسان کا جز نہیں رہا ہے لیکن اولاد انسان ہی کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ یا برادران ایک طبقہ اوپر سے اسی کے خاندان کا ایک جز اور ایک حصہ ہیں۔

۳۔ جسمانی صفات کی قربانی۔ انسان اسقدر اعمال انجام دے کہ پیروں پر ورم ہو جائے آنکھیں سُرخ ہو جائیں۔ جسم نحیف و ناتواں ہو جائے کہ ان تمام مقامات پر ایک جسمانی صفت یعنی صحت و تندرستی کو قربان کیا گیا ہے۔

۴۔ جسمانی اجزاء کی قربانی۔ انسان راہ خدا میں ایسے اعمال انجام دے جہاں دفاع دین میں ہاتھ قلم ہو جائیں۔ آنکھیں ضائع ہو جائیں۔ جسم مشلول و مفلوج ہو جائے یا اس کے دیگر اجزاء ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں کہ یہ ذات سے باہر کی قربانی نہیں ہے بلکہ ذات کے اندر کی قربانی ہے۔

۵۔ نفسانی صفات کی قربانی۔ جہاں انسان رات دن ایک کر کے اپنے کمالات کو دوسروں کی طرف منتقل کرتا ہے۔ جاہل کو عالم بناتا ہے۔ بے فضل کو فاضل بناتا ہے اور اس راہ میں بیشمار مشکلات و مصائب کا سامنا کرتا ہے کہ یہ عمل کوئی آسان عمل نہیں ہے۔

۶۔ مکمل ذات کی قربانی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بالاتر کسی عمل کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے سرکار دو عالمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر عمل سے بالاتر عمل کا وجود پایا جاتا ہے لیکن راہ خدا میں شہید ہو جانے سے بالاتر کسی عمل کا وجود نہیں ہے۔ یہاں انسان اپنے پورے وجود کو قربان کر دیتا ہے اور ہر طرح کی خیانت سے محفوظ ہو کر امانت الٰہی کو صاحب امانت کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ عمل ایک طرف انتہائے امانت و دیانت کی علامت ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کا فائدہ دین و مذہب کی بقا کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس سے بالاتر کوئی فائدہ نہیں ہے اور یہی انسانی اعمال کی منزل معراج ہے۔!

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

مقصد اعلیٰ

انسان اگر باشعور ہے اور ہوش و حواس کے ساتھ عمل انجام دے رہا ہے تو اسکے عمل کا مقصد ضرور ہوگا۔ بے مقصد عمل انجام دینے والا بد حواس تو کہا جاسکتا ہے باشعور وارادہ انسان نہیں کہا جاسکتا ہے۔

انسانی زندگی میں جس طرح اعمال مختلف ہوتے ہیں اسی طرح ان کے اغراض و مقاصد بھی مختلف ہوتے ہیں اور انھیں اغراض و مقاصد کے ذریعہ عمل کی قدر و قیمت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ پست مقصد کے لئے انجام پانے والا عمل پست ہوگا اور بلند مقصد کے لئے انجام پانے والا عمل بلند ہوگا۔

علماء اخلاق نے انسانی اعمال میں گیارہ طرح کے مقاصد کا پتہ لگایا ہے اور انھیں کے ذریعہ اعمال کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔

اعتباری امور۔ دنیا میں دو طرح کے امور کا وجود پایا جاتا ہے، بعض امور واقعی ہوتے ہیں جن کی کوئی حقیقت ہوتی ہے اور بعض صرف فرضی ہوتے ہیں جن کی بظاہر کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے۔ انسان فرض کرلے تو بہت بڑی شے ہے ورنہ اس کا کوئی وجود نہیں ہے جیسے مالکیت کہ انسان کا ملکیت پر واقعی کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔ نہ وہ پانی کو جواہرات بنا سکتا ہے اور نہ دیوار کو سونے میں تبدیل کرسکتا ہے لیکن اس بات پر خوش ہے کہ وہ علاقہ کا مالک ہے۔ اس لئے کہ کسی نہ کسی قانون نے اسے مالک فرض کرلیا ہے۔

۲۔ لوگوں کے دلوں میں کسی صفت کا وجود۔ بعض لوگ اس لئے اعمال انجام دیتے ہیں کہ لوگ ان کی شرافت اور فضیلت کا اعتقاد پیدا کرلیں۔ ظاہر ہے کہ یہ غرض ایک عمل سے پیدا

ہوسکتی ہے اور دوسرے عمل سے ضائع بھی ہوسکتی ہے۔

۳۔ دلوں میں واقعی محبت کی ایجاد۔ یہ جذبہ نفع و نقصان سے بالاتر ہوتا ہے لیکن اس میں نگاہ بندوں ہی پر ہوتی ہے۔

۴۔ جسمانی لذّتوں کا حصول۔ ایسے افعال بیشمار ہیں جنھیں انسان صرف جسمانی لذّت کی خاطر انجام دیتا ہے۔ ان میں حلال اعمال بھی شامل ہیں اور حرام بھی۔

۵۔ جسمانی آلام کا دفعیہ۔ بہت سے اعمال ایسے ہوتے ہیں جن سے کوئی لذّت تو حاصل نہیں ہوتی ہے لیکن جسم میں پائے جانے والے آلام کا دفعیہ ہوجاتا ہے۔

۶۔ محبوب صفات کی ایجاد۔ آج دنیا کے بیشمار اعمال ایسے ہی ہیں جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوجائیں اور ہم میں کوئی ایسی صفت پیدا ہوجائے جو لوگوں کی پسندیدہ ہو اور اس کے طفیل میں ہمیں بھی پسندیدہ بننے کا شرف حاصل ہوجائے۔

۷۔ لوگوں کو فائدہ پہونچانا۔ بہت سے اعمال خیر ہیں جن کا مقصد انسان کی نگاہ میں اپنا فائدہ نہیں ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو فائدہ پہونچانا ہوتا ہے۔

۸۔ عقلی اور روحانی کمالات کا حصول۔ انسان برسہا برس مدارس میں زندگی گذارتا ہے۔ کتابیں پڑھتا ہے۔ استادوں کی خدمت کرتا ہے۔ راتوں کو جاگ کر گذارتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجھ میں علم کا روحانی اور معنوی کمال پیدا ہوجائے اور جاہلوں کی صف سے الگ ہونے کا شرف مل جائے۔

۹۔ آخرت کی لذّتوں کا حصول۔ کتنے افراد ایسے ہیں جن کی نگاہ میں ہر وقت جنّت اور نعمات جنّت کا خیال رہتا ہے اور وہ مسلسل عمل خیر کرتے چلے جاتے ہیں کہ جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر درجہ حاصل کرلیں اور کسی نعمت جنت سے محروم نہ رہنے پائیں۔

۱۰۔ آخرت کے آلام کا دفعیہ۔ جس طرح دنیاوی اذیتوں سے نجات حاصل کرنا ایک بڑا کام ہے جس کیلئے انسان بیشمار اعمال انجام دیتا ہے۔ اسی طرح آخرت کے آلام و مشاکل سے نجات حاصل کرنا اس سے بڑا کام ہے جس کے لئے اہل آخرت صبح و شام مصروف عمل رہتے ہیں اور اس راہ میں دنیا کی ہر اذیت برداشت کرلیتے ہیں کہ یہ اذیت وقتی اور چند روزہ ہے

اور وہ اذیت عذاب دائم کی حیثیت رکھتی ہے جس کا برداشت کرنا انسان کے امکان میں نہیں ہے۔
۱۱۔ رضائے پروردگار۔ جہاں انسان تمام اغراض و مقاصد سے بلند تر ہو جاتا ہے اور اس کی نگاہ میں دنیا و آخرت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے بلکہ عمل کو صرف رضائے الٰہی کیلئے انجام دیتا ہے اور یہ تصور رکھتا ہے کہ رضائے پروردگار سے بالاتر کوئی فائدہ نہیں ہے۔

تجزیہ

ان تمام اغراض و مقاصد کا جائزہ لیا جائے تو خلاصہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلا مقصد بالکل غیر واقعی اور فرضی ہے۔ دوسرے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ اِسکا صاحب عمل سے کوئی تعلق ہے۔ تیسرا مقصد فطری ہے اس کے لئے قصد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چوتھا اور پانچواں مقصد جسمانی اور مادی ہے اس کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چھٹا مقصد واقعی ہے لیکن اس میں نگاہ مخلوقات پر ہوتی ہے۔ ساتویں مقصد میں کمال ہے لیکن دوسروں کے لئے ہے۔ آٹھویں، نویں اور دسویں مقصد میں نفسانیت پائی جاتی ہے جو کمال کو بھی نقص کی منزل میں لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ گیارہویں مقصد میں بالاتر ہستی سے ارتباط و تعلق ہے اور یہی انسانیت کی بلندترین منزل ہے اور یہی وجہ ہے کہ مولائے کائناتؑ ہجرت کی رات اس بلندترین مقصد کے لئے بستر پیغمبرؐ پر سونے کے لئے تیار ہو گئے اور اس عظیم ترین قیمت کے حصول کیلئے اپنے نفس نفیس کو بھی فروخت کر دیا جس کی سند پروردگار عالم نے بھی وضاحت فرما دی۔

والسلام علی من اتبع الہدیٰ

بصارت وبصیرت

ظاہری نگاہوں سے دیکھنے کا نام ہے بصارت اور دل کی نگاہ سے دیکھنے کا نام ہے بصیرت۔

قرآن مجید نے واضح لفظوں میں اعلان کیا ہے "فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور (حج ۴۶) آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں۔ اصل میں وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

۔ بصارت اور بصیرت کا بنیادی فرق یہ ہے کہ بصارت ظاہر کو دیکھتی ہے اور بصیرت باطن کو۔ مولائے کائنات کا ارشاد ہے کہ بہترین صاحب بصیرت وہ ہے جو اپنے عیوب کو دیکھ لے اور گناہوں سے الگ ہو جائے۔

۔ بصارت دنیا میں دیکھتی ہے اور بصیرت آخرت میں۔ "ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا ونحشره یوم القیامة اعمیٰ" جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن اندھا محشور کیا جائے گا۔ سوال کرے گا کہ خدایا! میں تو دنیا میں بینا تھا یہ اندھا کیسے ہو گیا؟ ۔ ارشاد ہوگا کہ اسی طرح میری نشانیاں تیرے سامنے آئیں اور تو نے انھیں بھلا دیا تو آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔

۔ بصارت حاضر کو دیکھتی ہے اور بصیرت غائب بھی دیکھ سکتی ہے۔ امام صادقؑ مسجد میں داخل ہوئے اور کسی نے نہ دیکھا، صرف ابو بصیر (نابینا) نے آپ کی زیارت کی اور جب یہ بحث شروع ہو گئی کہ حضرت مسجد میں آئے تھے یا نہیں۔ تو آپ نے ابو بصیر کی تصدیق کی اور ثابت کر دیا کہ جمال امامت کو دیکھنے کے لئے ظاہری آنکھیں کافی نہیں ہیں دل

کی آنکھیں درکار ہیں۔

۔ بصارت صرف مادیات کو دیکھ سکتی ہے اور بصیرت ماورار مادہ بھی دیکھ لیتی ہے ۔ زعلب یمانی نے مولائے کائناتؑ سے سوال کیا کہ کیا آپ نے اس خدا کو دیکھا ہے جسکی عبادت کرتے ہیں؟

فرمایا کہ میں اس خدا کی عبادت کس طرح کرسکتا ہوں جسے دیکھا نہ ہو ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ آنکھوں کے مشاہدہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے بلکہ ایمان کے حقائق سے دیکھا جاتا ہے اور ایسی نگاہ کل ایمان کے علاوہ کسے نصیب ہوگی۔

• سماجی اعتبار سے بھی اگر کوئی شخص راستہ میں غلط رُخ پر جارہا ہے اور کسی سے ٹکرا جائے تو پہلا جملہ یہ زبان پر آتا ہے کہ کیا اندھے ہوگئے ہو جو مقرر کردہ رُخ کے علاوہ دوسرے رُخ پر چلے جارہے ہو۔

• محفل سے نکلنے والا انسان اگر دوسرے کا جوتہ پہن کر روانہ ہو جائے تو اسے غاصب یا چور بعد میں کہا جاتا ہے۔ پہلا الزام یہی ہوتا ہے کہ کیا اندھے ہوگئے ہو جو اپنے اور پرائے کا فرق نظر نہیں آتا ہے اور دوسرے کے جوتہ کو اپنا تصور کرلیا ہے۔

• بزم میں داخل ہونے والا اگر جوتہ پہنے ہوئے فرش پر آجائے تو ہر آدمی اسے اندھا تصور کرتا ہے جب کہ اس کی آنکھیں برابر کام کررہی ہیں۔ صرف عیب یہ پیدا ہوگیا ہے کہ اپنی جگہ کو نہیں پہچانتا ہے اور جو چیز جس جگہ کی ہے اس جگہ نہیں رکھتا ہے۔

استنتاج

۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیاوی اعتبار سے بھی غلط رُخ پر چلنے والا۔ دوسرے کے مال کو اپنا سمجھ لینے والا۔ کسی چیز کو بے محل رکھ دینے والا اندھا ہی کہا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد کیا تعجب ہے کہ تاریخ کے مجرمین کو اندھا محشور کیا جائے اور ان کے دریافت کرنے پر بتادیا جائے کہ تم دنیا میں بھی واقعتاً اندھے ہی تھے۔ تم نے غلط راستہ پر زندگی گذاری ہے اور صراط مستقیم سے منحرف ہوگئے تھے ۔ تم نے غیر کی جاگیر کو اپنا بنا کر قبضہ کرلیا تھا۔ تم نے

اپنی جگہ نہیں پہچانی تھی اور غیر کے منصب پر قابض ہوگئے تھے۔ اب قیامت میں تمھیں اندھا ہی محشور کیا جاسکتا ہے۔

۔ بصیرت کا بہترین مظہر یہ ہے کہ انسان ظاہری حالات کے مطابق کام نہ کرے بلکہ عقل کے مشورہ کے مطابق عمل کرے۔ اس لئے کہ امیرالمومنینؑ کے ارشاد کے مطابق آنکھیں دھوکہ دے سکتی ہیں لیکن عقل کسی انسان کو دھوکہ نہیں دیتی ہے۔ آنکھ اور عقل کا معرکہ اسلام میں روز اول سے چلا آرہا ہے۔ آنکھ والوں نے جسے کرسیٔ خلافت پر دیکھ لیا اسی کی بیعت کرلی لیکن عقل والے مسلسل پرکھتے رہے کہ اس انسان میں اس کرسی کی صلاحیت پائی جاتی ہے یا نہیں ۔ اور یہ خود اپنے بارے میں کیا عقیدہ رکھتا ہے۔ اپنے کو عالم تصوّر کرتا ہے یا جاہل۔ اہل سمجھتا ہے یا نااہل۔ ہلاک ہونے والا خیال کرتا ہے یا نجات دلانے والا۔ قرآن مجید نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ "انسان اپنے نفس کے بارے میں خوب بصیرت رکھتا ہے چاہے کتنے ہی عذر کیوں نہ بیان کرے"۔ (قیامہ)

شجاعت وفتوّت

قرآن مجید میں لفظ شجاعت کا تذکرہ نہیں ہے البتہ فتوت کا تذکرہ متعدد مقامات پر ہوا ہے اور چھ قسم کے افراد کو لفظ فتیٰ سے یاد کیا گیا ہے:

۱۔ جناب ابراہیمؑ۔ قالواسمعنافتی یذکرهم یقال له ابراهیم۔ (انبیاء ۶۰)
۲۔ رفیق جناب موسیٰ۔ اذقال موسیٰ لفتاہ۔ (کہف ۶۰)
۳۔ جناب یوسفؑ — وقال نسوة فی المدینة امرأة العزیز تراود فتاها عن نفسه۔ (یوسف ۳۰)
۴۔ رفقاء زندانِ یوسفؑ۔ ودخل معه السجن فتیان۔ (یوسف ۳۶)
۵۔ اصحابِ کہف۔ انهم فتیة آمنوا بربّهم وزدناهم هدی۔ (کہف ۱۳)
۶۔ اصحابِ یوسفؑ۔ وقال لفتیانه اجعلوا بضاعتهم فی رحالهم لعلّهم یعرفونها۔ (یوسف ۶۲)

عورتوں میں بھی انھیں "فتیات" کہا گیا ہے کہ جن کی شان یہ ہے کہ اپنی عزّت کا تحفظ کرتی ہیں اور بدکاری کو پسند نہیں کرتی ہیں۔ (نور ۳۳)

روایات کی دنیا میں فتوت کی تعریف امام صادقؑ نے اس طرح کی ہے کہ "فتوّت وہ طعام ہے جو سامنے رکھ دیا جائے، وہ عطیہ ہے جو دے دیا جائے، وہ عفّت ہے جو معروف ہو، وہ اذیت ہے جسے روک لیا جائے — فسق و فجور کی ہمّت کا نام "شطارہ" ہے فتوّت نہیں ہے۔" (میزان الحکمہ ۷/۳۹۸)

امیرالمومنینؑ کے ارشاد کے مطابق انسان کی بہترین زینت فتوّت ہے۔ اور فتوّت کا

تقاضا پست اخلاق سے دوری ہے۔

شجاعت کا تذکرہ روایات میں بکثرت پایا جاتا ہے:

- امیرالمومنینؑ نے اسے "عزت حاضر" سے تعبیر کیا ہے اور دوسرے مقام پر "نصرت حاضر" فرمایا ہے۔
- فرماتے ہیں کہ شجاعت اور سخاوت وہ شریف صفات ہیں جنھیں پروردگار اپنے محبوب بندوں کو امتحان کے بعد عنایت کرتا ہے۔
- امام حسنؑ کا ارشاد ہے کہ شجاعت میدان جنگ میں صبر اور ساتھیوں کی موافقت کا نام ہے۔
- امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے کہ شجاعت تین چیزوں کے اجتماع سے پیدا ہوتی ہے: نفس[۱] کی قربانی۔ ذلت[۲] کا انکار اور ذکر خیر[۳] کی خواہش۔
- انسان میں جس قدر ہمّت ہوگی اسی قدر اس کا مرتبہ ہوگا اور جس قدر مروّت ہوگی اسی قدر سچّا ہوگا اور جس قدر غیرت ہوگی اسی قدر بہادر ہوگا۔
- پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ شجاعت اور ہمت کا تعلق صرف میدانِ جنگ سے نہیں ہے بلکہ قوی ترین انسان وہ ہے جسے خوشی گناہ میں مبتلا نہ کرے اور ناراضگی حق سے علیحدہ نہ کردے۔ (میزان الحکمہ ۵/۲۶)

استاذ ازہر علامہ شرباصی "اخلاق القرآن" میں نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے امام صادقؑ سے پوچھا کہ "فتوت کے معنی کیا ہیں؟" تو آپ نے فرمایا کہ "تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟"
اس نے کہا کہ "ہمیں ملتا ہے تو ہم شکر خدا کرتے ہیں اور نہیں ملتا ہے تو صبر کرتے ہیں"۔
فرمایا کہ ہمارے یہاں کے تو کُتّے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ کون سی فتوت ہے۔؟
اُس نے گھبرا کر عرض کی پھر آپ کے یہاں فتوت اور مردانگی کیا ہے۔؟
فرمایا کہ ہمیں ملتا ہے تو ایثار کر دیتے ہیں اور نہیں ملتا ہے تو شکر خدا کرتے ہیں۔

استنتاج

۱۔ قرآن مجید کے جملہ استعمالات سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ اللہ والوں، شریفوں،

مجاہدوں، باوفا اصحاب، پاک کردار اور پرستاران توحید کے بارے میں استعمال ہوا ہے اس کے بعد زبان وحی ترجمان سے اگر یہ اعلان ہو کر " لا فتیٰ الا علی " تب اندازہ ہوتا ہے کہ علیؑ صرف مرد میدان ہی نہیں ہیں بلکہ تاریخ کے تمام مردان نبرد آزما اور مہم آزما سے افضل و برتر ہیں۔

ب۔ شجاعت کا بلند ترین نمونہ خود امیرالمومنینؑ کی ذات گرامی ہے جن کے بارے میں معاویہ کا بیان تھا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ یا علیؑ اگر سارے اہل شرک عرب مل کر تم سے مقابلہ کریں تب بھی تم ان کا خاتمہ کردو گے۔

ج۔ امیرالمومنینؑ خود فرمایا کرتے تھے کہ اگر سارے عرب مجھ سے جنگ کرنے پر متحد ہو جائیں تو بھی میں ان کا خاتمہ کر سکتا ہوں۔

د۔ عمرو عاص کا قول تھا کہ علیؑ کے سامنے سے فرار کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ (ان سے مقابلہ موت کو دعوت دینا ہے۔)

ہ۔ امیرالمومنینؑ کی ضربت کے بارے میں تاریخ کا بیان ہے کہ کانت ضربات علی ابکاراً۔ ہر ضربت کا انداز الگ ہوتا تھا اور کبھی ایک انداز کو دُہرایا نہیں کرتے تھے۔

و۔ تاریخ کا یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عمر نے عمرو بن معدی کرب کی مشہور تلوار کو لے کر زمین پر مارا اور جب نشان نہ پڑا تو طنز کیا کہ اسی تلوار کی اسقدر شہرت ہے؟ تو اس نے برجستہ جواب دیا کہ آپ نے مجھ سے تلوار مانگی تھی کلائی نہیں مانگی تھی۔ اور:

تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیئے
ایسا کہ دست حضرت یزداں کہیں جسے

وفا

وعدہ کا وفا کرنا اور عہد کا پورا کرنا ایک ایسا کمال ہے جس میں عبد و معبود دونوں شریک ہیں۔ پروردگار عالم نے بندوں سے ایفائے عہد کا مطالبہ کرنے سے پہلے اپنے بارے میں اعلان کردیا "ومن اوفی بعھدہٖ من اللہ" (اللہ سے زیادہ اپنے عہد کا پورا کرنے والا کون ہے) ۔ تاکہ انسان پر واضح ہو جائے کہ وفائے عہد انتہائی اہم مسئلہ ہے ۔ اور حقیقت امر یہ ہے کہ دنیا کی اجتماعی زندگی کا دارومدار وفائے عہد و پیمان ہی پر ہے۔

دنیا میں دو طرح کے عہد پائے جاتے ہیں:

ایک وہ عہد ہے جو لفظوں کی شکل میں کیا جاتا ہے۔

اور ایک وہ عمرانی معاہدہ ہے جو فطری یا سماجی طور پر طے شدہ ہے اور ہر شخص فطری یا اجتماعی اصول کے طور پر اس کا پابند ہے اور اسی پابندی سے نظامِ زندگی قائم ہے۔ ورنہ ہر شخص عہد شکنی پر آمادہ ہو جائے اور تمام اجتماعی اور عمرانی خاموش معاہدے نظر انداز ہو جائیں تو معاشرہ ایک زندہ عجائب خانہ کی حیثیت حاصل کرلے اور سماج میں جنگل کا قانون رائج ہو جائے۔

قرآن حکیم نے وفائے عہد کی اسی اہمیت کے پیش نظر مشرکین سے برائت و بیزاری۔ اُن کی نجاست و خباثت، ان کے حدود حرم میں داخلہ پر پابندی کے باوجود یہ اعلان کردیا کہ جن مشرکین سے کوئی معاہدہ ہو گیا ہے۔ اس معاہدہ کا لحاظ رکھنا اس وقت تک ضروری ہے جب تک وہ خود عہد شکنی پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

" الّا الذین عاھدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ان اللہ یحب المتقین "۔ (توبہ ۷)

وفائے عہد کی اسی اہمیت کے پیش نظر اعلان ہوا :

ـ واوفوا بعھدی اوف بعھدکم (بقرہ ۴۰) تم میرے عہد کو پورا کرو۔ میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا۔

ـ یا ایھا الذین اٰمنوا اوفوا بالعقود (مائدہ ۱) ایمان والو! اپنے عہد و معاہدہ کو پورا کرو۔

ـ وبعھد اللہ اوفوا (انعام ۱۵۲) اللہ کے عہد کو پورا کرو۔

ـ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا (بقرہ ۱۷۷) صاحبانِ ایمان اپنے عہد کے پورا کرنے والے ہیں۔

ـ ومن اوفیٰ بما عاھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجراً عظیماً (فتح ۱۰) جو خدا کے عہد کو پورا کردے خدا اسے اجرِ عظیم عنایت کرے گا۔

ـ وابراھیم الذی وفیّٰ (نجم ۳۷) وہ ابراہیم جو وفادار تھے۔

ـ انہ کان صادق الوعد وکان رسولاً نبیاً (مریم ۵۴) اسماعیل صادق الوعد اور نبی مرسل تھے۔

اس کے بعد شرائط وفا کا اعلان ہوا "من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضیٰ نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدّلوا تبدیلاً" ــــ (صاحبانِ ایمان میں کچھ مردِ میدان ہیں جنھوں نے اللہ سے کئے وعدہ کو سچ کر دکھایا۔ ان میں سے کچھ گذر گئے اور کچھ اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں اور سب کی مشترکہ صفت یہ ہے کہ یہ اپنی بات بدلتے نہیں ہیں۔)

آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صداقت وعدہ و عہد ہر صاحب ایمان کا بھی کام نہیں ہے۔ اس کے لئے مردِ میدان بھی ہونا ضروری ہے اور ثابت قدم ہونا بھی۔

اس کے بعد مختلف عہدوں کو یاد دلایا کہ ہم نے اولاد آدمؑ سے یہ عہد لیا کہ شیطان کی عبادت نہ کریں گے اور ہماری عبادت کریں گے کہ یہی صراط مستقیم ہے۔

استنتاج

- معاشرہ کی بقا اور شرافت کے تحفّظ کا دار و مدار وفاداری پر ہے۔ وفاداری ختم ہو جائے تو معاشرہ جنگل میں تبدیل ہو جائے گا۔
- وفاداری پروردگار عالم۔ انبیاء کرام۔ اولیاء الٰہی کی مشترکہ صفت ہے اور اسی صداقتِ وعدہ پر آخرت کے جزا و ثواب کا دار و مدار ہے ورنہ بندہ خدا پر کوئی حق نہیں پیدا کر سکتا ہے۔
- وفاداری کے لئے ایمان اور مردِ میدان ہونے کی شرط ہے تو علیؑ سے بڑا کوئی وفادار نہ ہوگا کہ انھیں کو خندق میں کل ایمان قرار دیا گیا ہے اور خیبر میں مردِ میدان۔
- وفاداری نسل ابراہیمؑ و اسماعیلؑ میں بطور میراث باقی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ نسل اسحٰقؑ میں مادر مریم اور مریمؑ کی نذر کا ذکر کیا گیا اور نسل اسماعیلؑ میں اہلبیتؑ کے وفائے نذر کا۔
- طہارت کعبہ بھی عہد کا نتیجہ ہے اور صراط مستقیم پر برقرار رہنا بھی عہد ہی کا نتیجہ ہے لہٰذا کعبہ اور صراط مستقیم سے رشتہ وفائے عہد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

عِلم ومال

• مالک کائنات نے انسان کو دو اجزا سے مرکب بنایا ہے: جسم اور روح۔ اور دونوں اپنی حیات وبقا کے لئے غذا کے محتاج ہیں۔ جسم کی غذا کا نام ہے مال، اور روح کی غذا کا نام ہے علم۔

• علم ومال کے مراتب کے تعیّن کے لئے جسم و روح کی حیثیت پر نظر کرنا ہوگی جس قدر پست درجہ جسم کا ہوگا اسی قدر پست درجہ مال کا ہوگا۔ اور جس قدر بلند درجہ روح کا ہوگا اسی قدر بلند درجہ علم کا ہوگا۔

• جسم مادی ہے لہٰذا اس کی غذا بھی مادی ہے۔ روح مجرد ہے لہٰذا اسکی غذا بھی مجرد ہے۔

• جسم خاک میں مل جانے والا ہے لہٰذا اس کی غذا بھی فانی ہے۔ روح عالم ارواح سے ملحق ہونے والی ہے لہٰذا اس کی غذا بھی باقی رہنے والی شے ہے۔

• جسم مُردہ ہونے والا ہے لہٰذا اس کی غذا بھی مٹ جانے والی ہے۔ روح کے لئے موت نہیں ہے لہٰذا اس کی غذا بھی زندگی بخش ہے۔

• مال مادی ہوتا ہے لہٰذا اس کی کثرت مادیت میں اضافہ کرتی ہے "ان الانسان لیطغیٰ ان رآہ استغنیٰ"۔ علم غیر مادی ہے لہٰذا اس کی کثرت سے روحانیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پروردگار نے علم کو بھوک میں رکھا ہے کہ جس قدر مادیت کم ہوگی اسی قدر علمی نشاط زیادہ ہوگا۔

• جسم و روح کے مادی اور غیر مادی ہونے کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ جسم وقت گذرنے کے ساتھ انحطاط پذیر اور کمزور ہوجاتا ہے لیکن روح میں یہ کمزوری نہیں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ عمر کے اضافہ کے ساتھ علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور علم جسم کی کمزوری سے متاثر نہیں ہوتا ہے۔ ضعیفی میں حافظہ کی کمزوری علم کی کمزوری نہیں ہے علم کے ذخیرہ کی کمزوری ہے کہ مخزن دماغ میں ہونے کی بنا پر حالاتِ جسم سے متاثر ہوجاتا ہے۔

۔ اسلام نے روح کے لئے بہترین علم اصول وعقائد کو قرار دیا ہے اور جسم کے لئے بہترین عمل عبادات کو قرار دیا ہے۔ مال جسم کی بقا ہے اور اعمال جسم کا ارتقاء۔

۔ جسم و روح کا رابطہ اسقدر عمیق ہے کہ روح علم وعقل سے الگ ہوجائے تو جسم حیوانیت کے درجہ میں آجاتا ہے۔ اور روح تنہا رہ جائے تو جسم موت سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔

۔ اسلام کا منشاء یہ ہے کہ جسم و روح دونوں میں ہم آہنگی رہے اور انسان نہ رہبانیت کا شکار ہونے پائے اور نہ اشتراکیت و اشتمالیت کا۔

۔ اسلام نے روح کے ذریعہ جسم کو تقویت پہونچائی ہے اور عبادات کو طبّی فوائد کا ذریعہ بنا دیا ہے اور جسم کے ذریعہ روح کو فائدہ پہونچایا ہے کہ مالیات میں بھی نیت قربت شامل کردی ہے۔

۔ جسم و روح کی بقا کا ذریعہ مال وعلم ہے اور دونوں کی بقا مطلوب ہے لہٰذا نہ مال کو بُرا کہا جاسکتا ہے اور نہ علم کو۔ قرآن نے مال دنیا کو "خیر"۔ "فضل اللہ"۔ وغیرہ سے تعبیر کیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام دشمن مال نہیں ہے۔ دشمن فساد مال ہے اور فساد مال کا منشار مال نہیں ہے۔ انسان ہے۔

۔ جسم کی مادیت اور روح کی روحانیت کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ دونوں میں ہمیشہ کشمکش پائی جاتی ہے۔ جسم انسان کو مادیت کی طرف کھینچتا ہے اور روح روحانیت کی طرف۔ جسم کو اچھی غذا مل جاتی ہے تو وہ روح کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور روح کو بہترین علم مل جاتا ہے تو وہ جسم کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔

۔ جسم و روح کی کشمکش کا اثر مال وعلم کی حیثیت پر بھی پڑتا ہے اور ان میں بھی کشمکش جاری رہتی ہے۔ مال علم کو دنیا کی طرف کھینچنا چاہتا ہے اور علم مال کو آخرت کی طرف۔ انسان کی شرافت کا فیصلہ اسی کشمکش میں کامیابی اور ناکامیابی سے ہوتا ہے کہ وہ مال کے ساتھ کھنچ گیا یا علم کے ساتھ چلتا رہا۔

ـ مال اور علم کی مادیت و روحانیت کا ایک اثر یہ ہے کہ مال ہمیشہ مادیات کی دعوت دیتا ہے ـ روٹی ـ کپڑا ـ مکان ـ سامان اور ان کے انواع واقسام ـ لیکن علم انسان کو ان تمام امور سے بلند تر بنا دیتا ہے ـ وہ باب مدینۃ العلم ہی ہوتا ہے جس میں دنیا کو تین طلاق دینے کا حوصلہ ہوتا ہے ـ ہر شخص یہ کام انجام نہیں دے سکتا ہے ـ

ـ مال مادی ہونے کے اعتبار سے فانی ہے اور علم روحانی ہونے کے لحاظ سے جاودانی ہے ـ لہٰذا بہترین انسان وہ ہے جو فانی مال دے کر جاودانی علم حاصل کرلے ـ اور بدترین صاحب علم وہ ہے جو باقی علم کو دے کر مال لینے کی کوشش کرے ـ علم کا صرف برائے خدا ہونا چاہیئے نہ کہ برائے تحصیل مال ـ روایات میں "مستأکل بالعلم" علم کو کھانے پینے کا ذریعہ بنانے والا ملعون قرار دیا گیا ہے ـ لیکن مال دے کر علم حاصل کرنے والے کو قابل تعریف قرار دیا گیا ہے ـ

ـ مال کی مادیت کا تقاضا یہ ہے کہ خرچ کرنے سے کم ہوجاتا ہے اور علم کی روحانیت کا اثر یہ ہے کہ صرف کرنے سے مسلسل بڑھتا رہتا ہے ـ تجربہ بہترین ثبوت ہے ـ

ـ مال کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انسان سے الگ ہوئے بغیر کام نہیں آتا ہے اور علم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ساتھ رہتا ہے اور کام آتا رہتا ہے ـ مال یار بے وفا ہے اور علم ناصر باوفا ـ !

عِلم اور خوفِ خدا

قرآن مجید نے خوفِ خدا اور خشیۃ اللہ کے مختلف آثار کا تذکرہ کیا ہے :

- رضی اللہ عنهم ورضوا عنه ذٰلك لمن خشي ربه ـ (بینہ ۸)
  رضائے الٰہی ان کا حصہ ہے جن کے دل میں خوف پروردگار ہے ـ
- فاللہ احق ان تخشوه ان كنتم مومنين ـ (توبہ ۱۳)
  خوفِ خدا علامتِ ایمان ہے ـ
- ومن يطع اللہ ورسوله ويخش اللہ ويتقه فاولٰئك هم الفائزون ـ
  کامیابی اطاعتِ خدا و رسول کرنے والوں اور خوفِ خدا رکھنے والوں کا حصہ ہے ـ (نور ۵۲)
- سيذكر من يخشىٰ (اعلیٰ ۱۰)
  عبرت وہی حاصل کرتے ہیں جن کے دل میں خوفِ خدا ہوتا ہے ـ
- ان الذين يخشون ربّهم بالغيب لهم مغفرة واجر كبير ـ (ملک ۱۲)
  خوفِ خدا رکھنے والوں کے لئے مغفرت اور اجر کبیر ہے ـ
- ان الذين يبلغون رسالات اللہ ويخشونه ولا يخشون احدًا الّا اللہ ـ (احزاب ۳۹)
  پیغام الٰہی کا پہونچانا انھیں کا کام ہے جن کے دل میں خوفِ خدا ہو ـ
- لو انزلنا هٰذا القرآن علىٰ جبل لرأيته خاشعًا متصدعًا من خشية اللہ ـ (حشر ۲۱)
  یہ قرآن پہاڑ پر نازل ہوتا تو خوفِ خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ـ

• ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ ومن خشیتہٖ مشفقون ۔ (انبیاء ۲۸)
شفاعت کا استحقاق انھیں کو حاصل ہے جو خوف خدا رکھنے والے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب کے تمام معاملات کا تعلق خوفِ خدا سے ہے۔ خوفِ خدا کے بغیر نہ ایمان ہے نہ رضائے الٰہی۔ نہ کامیابی ہے نہ عبرت، نہ تبلیغ کا حق ہے اور نہ حق شفاعت۔

خوف خدا وہ عظیم طاقت ہے جو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خوفِ خدا کا ذریعہ کیا ہے اور یہ کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" (فاطر ۲۸) خوفِ خدا صرف ان کے پاس ہے جو صاحبانِ علم و معرفت ہیں۔

کھُلی ہوئی بات ہے کہ بچہ سانپ سے کھیلنا چاہتا ہے اور بڑا انسان دور سے دیکھ کر لرزتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچہ میں ہمت اور طاقت زیادہ ہے اور بڑے میں کوئی طاقت اور ہمت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا کھُلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بچہ سانپ کی معرفت نہیں رکھتا ہے اور بڑا اسے پہچانتا ہے۔ بچہ صرف اس کے چمک دار ظاہر کو دیکھتا ہے اور بڑا اس کے اندر چھپے ہوئے زہر کو بھی دیکھ لیتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ معرفت کے بعد بھی جو سانپ کو اپنے سے زیادہ طاقتور سمجھتا ہے وہی اس سے ڈرتا ہے ورنہ انسان کو اپنے اوپر اعتماد ہو اور اپنی بزرگی کا واقعی ادراک ہو تو گہوارہ میں رہ کر اسے دو پارہ بھی کر سکتا ہے۔

۔ علم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ علم تمام اوہام کا تنہا مقابلہ کرتا ہے۔ قوم میں وہم پرستی کا رواج علم کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے ورنہ صاحب علم کبھی اوہام کا شکار نہیں ہوتا ہے۔ اس کے دل میں خوفِ الٰہی رہتا ہے اور خوفِ الٰہی کا اثر یہ ہے کہ "جو خدا سے ڈرتا ہے ہر چیز اس سے ڈرتی ہے"۔

۔ علم اور وہم کا بنیادی فرق یہ ہے کہ علم حقائق پر نگاہ رکھتا ہے اور وہم پرچھائیوں

سے متاثر ہو جاتا ہے۔

۔ اسلام نے اپنی تبلیغ میں علم کا استعمال کیا ہے۔ وہم کا استعمال نہیں کیا ہے۔ اس نے کسی قانون کو موت سے ڈرا کر تسلیم نہیں کرایا ہے۔ یہ دور حاضر کے اوہام پرستوں کا طریقہ ہے کہ جس مہمل اور بے بنیاد بات کو منوانا ہوتا ہے اس کے پس منظر میں موت کو رکھ دیتے ہیں۔ فلاں آدمی نے فلاں کرامت کو نہیں مانا تھا تو اس کا بیٹا مر گیا۔ فلاں آدمی نے پرچہ نہیں تقسیم کیا تو اس کے گھر موت واقع ہو گئی۔ فلاں رسم پر عمل نہیں کرو گے تو موت کا خطرہ ہے۔ فلاں دن فلاں کام کرو گے تو موت کا اندیشہ ہے۔

یہ قدم قدم پر موت کا تذکرہ توہّم پرستی کے فروغ کا ذریعہ ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ قوم میں علم نہیں ہے اور کھُلی ہوئی بات ہے کہ جس ملک کی ڈیڑھ کروڑ ایمانی آبادی میں صرف ۲۰ ۔ ۲۵ دینی مدارس ہوں اور ان میں بھی حد آخر ۲۰۰ طلاب ہوں۔ باقی اس سے بھی کمتر آبادی کے مالک ہوں۔ اس قوم میں علم دین "وحی و الہام" کے ذریعہ تو آسکتا ہے درس و تدریس کے ذریعہ نہیں آسکتا ہے اور وحی و الہام کا سلسلہ معصومینؑ تک محدود ہے لہٰذا غیر معصوم کے مقدر میں جہالت کے علاوہ کیا رہ جاتا ہے۔

خدا سلامت رکھے ان مجالس عزا کو کہ ان سے علم کا کسی حد تک رواج ہو جاتا ہے لیکن افسوس کہ اب منبروں پر بھی جہالت اور توہّم پرستی کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے۔

شباب

انسان کی زندگی تین۳ ادوار سے گذرتی ہے:
بچپن۱۔ جوانی۲ اور ضعیفی۳۔

بچپنے میں انسان قوت شعور وادراک سے محروم ہوتا ہے اور ضعیفی میں دوبارہ قویٰ کمزور ہوجاتے ہیں "ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق"۔

جوانی وہ دور ہے جب انسان کا ادراک کامل ہوجاتا ہے اور اس کی طاقت کام کرنے کے قابل ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عالم انسانیت میں جملہ اہم کام جوانوں ہی سے لئے جاتے ہیں اور انھیں کو سنگین کاموں کا اہل سمجھا جاتا ہے۔

زمین کی تہ کے اندر سے معدنیات کو برآمد کرنا ہوتا ہے تو جوانوں سے مدد لی جاتی ہے کہ قیمتی جواہرات کا استحصال کرنا کمزور اور ضعیف افراد کو بھی آتا ہے۔ لیکن اس کے استخراج واستحصال کا کام جوانوں کے علاوہ کوئی انجام نہیں دے سکتا ہے۔

حدود مملکت کی حفاظت کا وقت آتا ہے تو مملکت کو جوان ہی یاد آتے ہیں اور یہ سنگین اور بنیادی کام انھیں سے لیا جاتا ہے اور غرض کے وقت "جے جوان" کا نعرہ لگایا جاتا ہے تاکہ ان کی صلاحیتوں اور زندگیوں کو قربان کرکے اپنی حکومت میں استحکام پیدا کیا جاسکے۔

اجتماعی کاموں میں حصہ لینے کا سلسلہ بھی عالم شباب سے شروع ہوتا ہے اور انسان اجتماعی زندگی میں قدم بھی شباب کے بعد ہی رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دور جاہلیت میں باقاعدہ طور پر جشن شباب منایا جاتا تھا تاکہ نوجوانوں کو محسوس کرایا جاسکے کہ اب تم میں اجتماعیات

کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے اور اب تمھارا فرض ہے کہ سماج کے اجتماعی کام انجام دو اور اپنی طاقتوں اور صلاحیتوں کا نذرانہ پیش کرو۔

شباب درحقیقت پہاڑ کی اس بلندی کا نام ہے جس کے دونوں طرف پستی ہوتی ہے کہ بلندی کوہ کی طرف جانے والا ایک پستی سے سفر شروع کرتا ہے اور بلندی تک پہونچ جانے کے بعد دوسری پستی کی طرف گرنے لگتا ہے۔

اس بلندی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو دونوں طرف کی خبر رہتی ہے اور وہ ہر منظر کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ دامنِ کوہ میں رہنے والے کو نہ بلندیٔ کوہ کی خبر ہے اور نہ دوسری طرف کی پستی کی کوئی اطلاع ہے لیکن بلندی پر پہونچ جانے پر اِدھر کا منظر بھی دیکھ رہا ہے اور اُدھر کے حالات کا بھی اندازہ کر رہا ہے۔

شباب اس کمال معرفت کا دور ہے جس میں بچپن کی کمزوریوں کا تجربہ بھی ہوتا ہے، اور ضعیفی کی کمزوریوں کا اندازہ بھی۔ ایسے وقت میں انسان غافل رہ جائے تو کبھی کام کرنے کے قابل نہ ہوگا اور ایسے وقت میں بیدار نہ ہو تو قیامت تک بیدار نہیں ہوسکتا ہے۔

حیرت ہے کہ ایسے شعور وادراک کے کمال کی منزل کو "جوانی دیوانی" کا نام دیا جاتا ہے اور اس طرح شباب کی علمی اور عملی صلاحیتوں کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ دین اسلام نے شباب کی اسی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر بچپنے کو مطلق طور پر اپنے احکام کی ذمہ داری سے آزاد رکھا اور ضعیفی کو بھی بہت سی ذمہ داریوں سے آزاد کردیا لیکن نوجوانوں کے کاندھوں پر ذمہ داری کا ہر بوجھ رکھ دیا اور انھیں محسوس کرادیا کہ یہ کام تمھارے ہی انجام دینے کا ہے۔

دنیا کی قومیں معدنیات کے استخراج اور سرحدوں کی حفاظت کے وقت نوجوانوں کو استعمال کرتی ہیں۔۔ لیکن جب علمی یا عملی قیادت کا وقت آتا ہے تو سن وسال کو معیار بناکر شباب کی صلاحیتوں کو ناقابل توجہ قرار دے دیا جاتا ہے اور ایک سے ایک بوڑھے انسان کو قبر سے نکال کر "خلافت مآب" کا ٹائیٹل دے دیا جاتا ہے۔

سرکارِ دو عالمؐ نے اس عالمی روش کے برخلاف ہمیشہ نوجوانوں کو آگے بڑھایا اور ان کی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا موقع دیا۔

● مصعب بن عمیر خفیہ طور پر اسلام لے آئے تو عثمان بن طلحہ نے انھیں نماز پڑھتے دیکھ کر ماں سے شکایت کر دی اور ماں نے گرفتار کرا دیا لیکن انھوں نے صبر کیا اور جب مدینہ کے بعض افراد نے اسلام قبول کر کے مدینہ کے لئے معلم اسلام کا مطالبہ کیا تو سرکارِ دو عالمؐ نے مصعب کو بھیج دیا حالانکہ وہ بالکل نوجوان تھے۔ مصعب نے مدینہ پہونچ کر اسید بن خضیر اور سعد بن معاذ کو مسلمان بنا لیا اور جمعہ کی نماز کا سلسلہ شروع کر دیا جس کے بعد لوگ مسلسل دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

● فتح مکہ کے بعد سرکارِ دو عالمؐ حنین کی طرف روانہ ہوئے تو مکہ میں عتاب بن اسید کو نائب بنا دیا جن کی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی۔ لوگوں نے اعتراض کیا کہ کسی بڑے آدمی کو نامزد کیجیے؟ ۔ تو فرمایا کہ اکبر افضل نہیں ہوتا ہے افضل اکبر ہوتا ہے۔ بزرگی کا معیار بڑائی نہیں ہے فضیلت ہے۔ (ناسخ التواریخ)

● سرکارِ دو عالمؐ نے زندگی کے آخری لشکر کا سردار اسامہ بن زید کو قرار دیا تھا جنکی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔ کربلا میں امام حسینؑ کا روزِ عاشور کا داعی اول اور موذن اسلام ۱۸ سال کا نوجوان ہی تھا۔

● امام صادقؑ کا ارشاد ہے کہ اگر مجھے کوئی شیعہ نوجوان دین سے بے بہرہ نظر آگیا تو میں اسے سخت سزا دوں گا۔

● امام عصرؑ قانون اسلام کے نفاذ کے عمل میں ۲۰ سال کے دین سے بے خبر نوجوان کو یکسر قتل کر دیں گے۔

بسم اللہ ولہ الحمد

المجد فی القرآن

یہ لفظ قرآن مجید میں صرف چار مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

● ۔"قالوا أتعجبين من امر اللّٰہ رحمة اللّٰہ وبركاته عليكم اهل البيت انه حميد مجيد" (ہود ۷۳)

جناب ابراہیمؑ کے پاس بشکل مہمان آنے والے فرشتوں نے کھانے سے انکار کر دیا تو انھوں نے پریشانی کا اظہار کیا اور ان کی زوجہ صورت حال پر مسکرانے لگی تو ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دے دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خبر بھی سنا دی۔ اس نے گھبرا کر کہا کہ میرے یہاں ولادت کس طرح ہوگی جب کہ میں بوڑھی ہوں اور میرا شوہر بھی ضعیف ہو چکا ہے۔ یہ تو بالکل عجیب و غریب بات ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ تم امر خدا پر تعجب کرتی ہو۔ تمھارے گھر والوں پر ہمیشہ سے رحمت و برکات خدا ہے اور پروردگار قابل حمد بھی ہے اور صاحب مجد بھی ہے۔

اس آیت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ رحمت و برکت کا تعلق زوجہ جناب ابراہیمؑ سے باعتبار زوجیت نہیں ہے ورنہ انھیں اس بات کا احساس ہوتا تو امر خدا میں ہرگز تعجب نہ کرتیں اور پروردگار کی گذشتہ تمام رحمتوں میں سے اسے بھی ایک رحمت شمار کر لیتیں۔ ان کا تعجب بتا رہا ہے کہ انھیں اس امر کا احساس نہیں تھا اور آیت میں جناب ابراہیمؑ کے گھرانے کی طرف اشارہ ہے جس کی ایک فرد باعتبار زوجیت جناب سارہ بھی ہو گئی

ہیں اور اس طرح رحمت و برکت میں شامل ہو گئی ہیں۔

اور اس توضیح سے اس امر کی تردید بھی ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں لفظ اہلبیت زوجہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ بھی نہیں ہے صراحت کا کیا ذکر ہے البتہ اس بات کی صراحت ضرور پائی جاتی ہے کہ جسے اہلبیت قرار دیا گیا ہے وہ رحمت و برکت الٰہی کا مرکز اور مصدر ہے اور اس طرح اہلبیت کرام کے "رحمة الله وبرکاته" کا جواز بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

- "ان الذین فتنوا المومنین والمومنات ثم لم یتوبوا فلهم عذاب جهنم ولهم عذاب الحریق۔ ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لهم جنات تجری من تحتها الانهار ذٰلك الفوز الکبیر۔ ان بطش ربك لشدید انه هو یبدیٔ ویعید وهو الغفور الودود ذو العرش المجید فعال لما یرید"۔ (بروج ۱۵)

جن لوگوں نے ایماندار مردوں اور عورتوں کو ستایا اور پھر توبہ نہیں کی ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لئے جلنے کا عذاب ہے ـــ بے شک جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے نیک اعمال کئے ان کے لئے وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ بے شک آپ کے پروردگار کی پکڑ بہت سخت ہوتی ہے۔ وہی پیدا کرنے والا اور دوبارہ ایجاد کرنے والا ہے۔ وہی بہت بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔ وہ صاحب عرش اور مجید ہے۔

ـــ مذکورہ بالا دو آیتوں میں پروردگار کو مجید کہا گیا ہے۔ پہلی آیت میں صاحب حمد ہونے کی بنا پر اور دوسری آیت میں صاحب عرش ہونے کی بنا پر۔

- "قٓ والقرآن المجید بل عجبوا ان جاءهم منذر منهم فقال الکٰفرون هٰذا شیٔ عجیب"۔ (قٓ ۱)

- "بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ"۔ (بروج ۲۱)

ـــ مذکورہ بالا دو آیات میں قرآن کریم کو مجید سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں قٓ کا حوالہ دیا گیا ہے جس کی عمومی تفسیر یہ ہے کہ جملہ مقطعات قرآن میں اس نکتہ

کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس قرآن کی اصل یہی حروف تہجی ہیں جن سے تمہارا کلام مرکب اور مرتب ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ تم مرتب کرتے ہو تو مہمل بھی قرار دے دیا جاتا ہے اور ہم مرتب کرتے ہیں تو درجۂ اعجاز تک پہونچ جاتا ہے۔

اور دوسری آیت میں اس کے لوح محفوظ میں ہونے کی بنا پر اسے مجید قرار دیا گیا ہے کہ اس کے الفاظ اور ظواہر تک رسائی ہو جائے تو ہو جائے لیکن اس کے حقائق تک رسائی ناممکن ہے کہ وہ بہت بلندیوں کی منزلوں پر ہیں اور محفوظ بھی ہیں کہ وہاں تک دست تاویل کی رسائی بھی نہیں ہے۔

اور اس طرح دونوں آیات میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی کہ قرآن مجید کی بزرگی اور اس کا مجد صرف اس کے ظاہر کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کی معنویت اور محفوظیت کی بنا پر ہے اور یہ اگرچہ دیکھنے میں حروف تہجی ہی سے مرکب ہوا ہے لیکن تمہارے کلمات جیسا نہیں ہے۔ اس کا ظاہر بہت سادہ ہے لیکن اس کا باطن حقائق و معارف اور فضائل و مناقب سے معمور ہے جس پر دنیا کے کسی کلام کا قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔

المجد فی الحدیث

روایات میں یہ لفظ مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

- وجد لی بجودك واعطف علیّ بمجدك۔ (دعائے کمیل)

پروردگار! مجھے اپنے جود و کرم سے عطا فرما اور مجھ پر اپنے مجد اور بزرگی سے مہربانی فرما۔

- سبحان من تعطف بالمجد وتکرم به۔ (دعائے سجدہ نماز جعفر طیار)

بے نیاز ہے وہ ذات جس نے اپنے مجد سے کرم اور مہربانی کا برتاؤ کیا ہے۔

- انیّٰ لخلیقتك کنه معرفة مجدك۔

مخلوقات کے بس میں کہاں ہے کہ تیری بزرگی کی حقیقت کی معرفت حاصل کر سکے۔

- اُثنی علیك ومن یبلغ غایة ثنائك وامد مجدك۔

پروردگار میں تیری ثنا کرتا ہوں مگر جانتا ہوں کہ کوئی تیری ثنا کی انتہا اور بزرگی کی حدوں کو نہیں پا سکتا ہے۔

- واسئلک بمجدک الذی کلمت بہ عبدک ورسولک موسیٰ بن عمران۔ سمات
- وبمجدک الذی تجلیت بہ لموسیٰ کلیمک فی طور سینا ——— سمات
- وبمجدک الذی ظھر لموسیٰ بن عمران علیٰ قبۃ الرمّان ـــ سمات

پروردگار! تیرے اس مجد کا واسطہ جس کے ذریعہ موسیٰ بن عمران سے کلام کیا۔ جس کے ذریعہ موسیٰ کو تجلّی کا دیدار ہوا۔ جس کا ظہور قبہ رمّان پر ہوا۔

- لک الحمد یا ذا الجود والمجد والعلیٰ۔ (مناجات امیرالمومنینؑ)

اے صاحب جود و مجد و بلندی ساری حمد صرف تیرے لئے ہے۔

ان روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بزرگی مصدر مہربانی ہے۔ بزرگی کی معرفت انسان کے امکان سے باہر ہے۔ بزرگی کی انتہا کا ادراک محال ہے۔ بزرگی کا جلوہ کوہ طور پر نظر آیا تھا جس کی تاب حضرت موسیٰ بھی نہ لا سکے اور بالآخر بیہوش ہو گئے ـــ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ چھوٹے سے ذہن بشر میں پروردگار کی بزرگی کا سما جانا محال ہے۔ چھوٹے آئینہ میں بڑی تصویر ضرور آ جاتی ہے لیکن چھوٹی ہو کر آتی ہے۔ اپنی بزرگی سمیت نہیں آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس تصویر کو اسی بڑے کا عکس کہا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ اس کی بزرگی کا ادراک کیا جاتا ہے۔

مالک کائنات نے اپنے مخصوص بندوں کو اپنے کمالات کا آئینہ اس لئے قرار دیا ہے کہ ان کے وجود اقدس میں اس کے کمالات کی تصویر دیکھی جا سکے اور اس کے ذریعہ اس کی معرفت حاصل کی جا سکے۔

خلاصۂ بحث!

مجد اور بزرگی صرف پروردگار کے لئے ہے۔ اس نے اپنی بزرگی سے اپنے قرآن کو مجید بنا کر لوح محفوظ میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس کی بزرگی کی بنیاد اس کا قابلِ حمد ہونا اور

صاحب عرش ہونا ہے۔ اب اگر وہ کسی کو بزرگ بنائے گا تو اسے حمد بھی عطا کرے گا اور عرش کی بلندی بھی عطا کرے گا۔ اس لئے اس نے اپنے حبیب کو محمدؐ نام بھی دے دیا اور عرش اعظم کی بلندی تک طلب بھی کر لیا۔

اس کے علاوہ قرآن کی بزرگی یہ ہے کہ وہ ظاہر کے اعتبار سے تمہارے کلمات جیسا ہے لیکن واقعاً تمہارا جیسا نہیں ہے۔ وہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے اور یہی شان مرسلِ اعظمؐ کی ہے کہ وہ بشر ہو کر بھی تم جیسے بشر نہیں ہیں اور ہر اعتبار سے خطا و معصیت اور سہو و نسیان سے محفوظ ہیں۔

اسی بنا پر پروردگار نے انھیں المجد قرار دیا ہے ـــ اور جس حسینؑ کو ان کی پشت پر جگہ دی ہے اور جس کے لئے ان کو ناقہ بنا دیا ہے اسے امجد بنا دیا ہے۔

(بسلسلہ مجلس ترحیم سرکار مولانا امجد حسین مرحوم طاب ثراہ۔ دریا آباد)

ذکرِ خدا اور اطمینان قلب

ـ انسان کی پریشانی کا راز اس کی ذاتی کمزوری اور اس پر بے سہارا ہونے کا احساس ہے۔

ـ بچہ دنیا میں آکر اسی لئے روتا ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں اپنے کو کمزور پاتا ہے اور تنہائی کا احساس رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ماں کا سہارا مل جاتا ہے تو خاموش اور مطمئن ہو جاتا ہے۔

ـ قدرت کا یہ سب سے بڑا کرم ہے کہ اس نے تنہا پیدا کیا مگر رشتوں کا سہارا دے کر بھیجا تاکہ احساس تنہائی کی بنا پر انسان دم نہ توڑ دے۔

ـ آدمؑ و حواؑ کو رشتوں سے بے نیاز بنا کر بھیجا تھا تو جنّت کی فضا میں رکھ دیا تاکہ دُنیا کی وحشت سے محفوظ رہیں۔

ـ بچہ کو ماں کا سہارا بھی آنسوؤں کے ذریعہ ملتا ہے۔ رونا فطری اضطراب کا فطری علاج ہے۔

ـ گریہ ظلم کے خلاف احتجاج میں بھی کام آتا ہے اور صاحب اختیار کی ہمدردی اور رحمت کے حصول میں بھی کام آتا ہے۔

ـ بچپن کا نقش مٹتا نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ساری زندگی یہ صورت حال برقرار رہتی ہے۔ انسان اپنی کمزوری کو دیکھتا ہے تو مضطرب ہو جاتا ہے اور کوئی سہارا مل جاتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے۔

انسان کی کیفیت ایک مور جیسی ہے کہ پَروں کو دیکھتا ہے تو اکڑ جاتا ہے اور پَیروں کو دیکھتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ پیر سامنے کی کمزوری ہے اور پَروں کا حُسن اوپر سے ملنے

والا سہارا۔

ـ دنیا کا ہر سہارا محدود ہے لہٰذا ہر سہارا وقتی سکون دینے کے بعد پھر اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ مصیبت سہارے کے امکانات کے اندر رہتی ہے تو اطمینان برقرار رہتا ہے اور مصیبت سہارے سے بالاتر ہو جاتی ہے تو دوبارہ اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔

ـ مذہب نے ایک ایسے سہارے کا حوالہ دیا ہے جس سے بالاتر کوئی طاقت اور مصیبت نہیں ہے لہٰذا اس کا دیا ہوا سکون کبھی اضطراب میں تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔

ـ اضطراب عام طور سے اوہام کی پیداوار ہوتا ہے اور اوہام کی کارفرمائی اسی وقت شروع ہوتی ہے جب زندگی کے دونوں خانے خالی ہو جاتے ہیں۔ نہ ذہن میں خیالِ خدا رہ جاتا ہے اور نہ دل میں یادِ خدا۔ خیالِ خدا اور یادِ خدا سے بڑا کوئی سہارا نہیں ہے۔ یہ اوہام کے طلسم کو بھی توڑ دیتا ہے اور علم و یقین کی لذّت سے بھی آشنا بنا دیتا ہے۔

ـ اسلامی وقائع و حوادث میں خوف کی کارفرمائی اسی طاقت کی کمزوری کا نتیجہ تھی۔ غار میں پیدا ہونے والا حزن۔ بدر کا شیطانی وسوسہ، احد میں شیطانی آواز کا اثر۔ احزاب میں کلیجوں کا منھ تک آجانا۔ خیبر میں فرار مسلسل ـ اور ایسے تمام آثار اسی وہم کی کارفرمائی کا نتیجہ تھے اور اس کا بنیادی سبب ذہن کا خیالِ خدا سے خالی ہونا تھا یا دل کا یادِ خدا سے خالی ہونا۔ اور اسی لئے سرکار دو عالمؐ نے بار بار مسلمانوں کو خدا یاد دلایا :

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا "

اس دعویٰ کا واضح ترین ہے۔

ـ واقعۂ کربلا سے بہتر شدّت مصائب میں اطمینان قلب کا کوئی مرقع نہیں ہے۔ جہاں مصائب کا مقابلہ یادِ خدا سے کیا جا رہا تھا اور یادِ خدا کے ہوتے ہوئے مصائب کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ دشمنوں میں جنگ کی تیاری تھی اور خیامِ حسینی میں تسبیح و تہلیل کی گونج ـ دشمن تیر چلّہ کمان میں جوڑ رہے تھے اور خیام حسینی میں علی اکبرؑ اذان دے رہے تھے۔ ظہر کے ہنگام اُدھر سے تیر برس رہے تھے اور اِدھر نمازِ ظہر ادا ہو رہی تھی۔ عصر کے ہنگام اُدھر قتل کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور اِدھر سجدۂ معبود مکمل کیا جا رہا تھا۔ شامِ غریباں کے سنّاٹے میں اُدھر مناظر

کی ہولناکی اور تاریکی کی وحشت تھی اور اِدھر خاک پہ عبادت الٰہی۔

ــ دُنیا کو اطمینان قلب درکار ہے تو یادِ کربلا ضروری ہے۔ کربلا سے غافل قوم دہشت زدہ ہو کر یہودیوں کے ہاتھ بِک سکتی ہے لیکن کربلائی ملّت اس ذلّت کو برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ یادِ کربلا کو بدعت قرار دینے والے افراد ہر طاقت سے مرعوب ہو سکتے ہیں لیکن کربلا کو دل سے لگانے والے افراد کسی طاقت کی کوئی پرواہ نہیں کر سکتے ہیں۔

جس کا چھ مہینہ کا بچہ تیر ستم کھا کر مُسکرا سکتا ہو اس قوم کو کون خوفزدہ کر سکتا ہے۔ اس قوم کا گریہ بھی ایک خاموش جہاد ہے اور ظلم کے خلاف تاریخی احتجاج ہے۔

معیارِ محبّتِ الٰہی

"قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ ویغفر لکم ذنوبکم واللّٰہ غفور رحیم"۔ (آل عمران ۳۱)

"پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ خدا کے چاہنے والے ہو تو میرا اتباع کرو۔ خدا تم سے محبت بھی کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بھی معاف کر دے گا کہ وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی ہے"۔

آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبت کا معیار اتباع ہے۔ اتباع کے بغیر دعوائے محبت قابل قبول نہیں ہے۔

اتباع پیغمبر کے دو اثرات ہیں۔ انسان محبوب خدا بھی ہو جاتا ہے اور اس کے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ بلکہ محبوبیت سبب بن جاتی ہے کہ انسان گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ دعوئ محبت خدا کا ہے اور معیار اطاعت خدا کے بجائے اتباع رسولؐ ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اطاعت الٰہی اور اتباعِ رسولؐ میں کوئی فرق نہیں ہے "من اطاع الرسول فقد اطاع اللّٰہ۔

اگر پروردگار اپنی محبت کا معیار اتباع رسولؐ کو قرار دے سکتا ہے تو رسولؐ کو بھی یہ حق دے سکتا ہے کہ اپنی محبّت کا معیار محبت اہلبیتؑ کو قرار دیدے" من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ"۔

اتباع رسولؐ کے معیار بنانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ پروردگار تک براہ راست رسائی ممکن نہیں ہے اور نبوت کا وسیلہ بہرحال ضروری ہے جس طرح کہ رسول تک رسائی کے لئے

دروازہ سے آنا ضروری ہے۔

محبّت کا معیار اتباع ہے ۔ تو جس کی محبت کا اعلان ہو جائے سمجھو وہ اتباعِ رسولؐ میں کامل ہے۔ خیبر میں اعلان ہوا کہ "علَم اس کو ملے گا جو خدا اور رسول کا محبوب ہوگا۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام کا علمبردار اتباعِ رسولؐ میں کامل و اکمل ہے۔

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ "خدا اسے دوست رکھتا ہے جو حسینؑ کو دوست رکھتا ہے"۔ اور یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ محبتِ حسینؑ بھی اتباعِ رسولؐ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ رسولؐ کی شریعت سے انحراف کرنے کے بعد محبت حسینؑ کا دعویٰ اس محبت پروردگار کے مانند ہے جس کا اتباع رسولؐ کے بغیر کوئی اعتبار نہیں ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جب قانون شریعت پیغمبرؐ کا اتباع کئے بغیر محبت خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور انسان نہ محبوب خدا بن سکتا ہے اور نہ اس کے گناہ معاف ہو سکتے ہیں تو محبت حسینؑ کس طرح گناہوں کو معاف کرا سکتی ہے۔

مومن اور یہودی کا بنیادی فرق یہ ہے کہ مومن کے دعوائے محبت کو محبت سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہودی کے بارے میں اعلان ہوا ہے" ان زعمتم أنكم أولياء لله من دون الناس" (اگر تمھارا خیال یہ ہے کہ تم تمام لوگوں میں اللہ کے چاہنے والے ہو) ۔ گویا یہ دعویٰ بھی صرف خیال ہے محبت نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا معیار تمنائے موت ہے۔

گویا محبت خدا کا معیار ہے اتباع رسولؐ ۔ اور گمان محبت کا معیار ہے تمنائے موت۔ تمنائے موت کے بعد یہ گمان حقیقت بنے گا۔ اس کے بعد اتباع رسولؐ کا مطالبہ شروع ہوگا۔

یہودی تمنائے موت نہ کریں گے کہ ان کا کردار خراب ہے ۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ کردار کا فساد نہ تمنائے موت کرنے دیتا ہے اور نہ اتباع رسولؐ کرنے دیتا ہے۔

یہودی تمنائے موت کے بجائے موت سے فرار کرتے ہیں جو اس امر کی علامت ہے کہ فرار کرنے والا تمنائے موت نہیں کر سکتا ہے اور تمنائے موت نہ کرنے والا ولی خدا نہیں ہو سکتا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ قرآن یہودیوں کے دوست خدا ہونے کی صریحی نفی کر رہا ہے اور مسلمان یہودیوں سے دوستی کے لئے بیچین نظر آرہے ہیں۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ یہودی موت سے ڈرنے والے اور موت سے فرار کرنے والے ہیں اور مسلمان یہودیوں کے خوف سے فرار کر رہے ہیں۔ انا للّٰہ . . . .

اتباع کے معنی کسی انسان کے نقش قدم پر چلنے کے ہیں۔ صرف نظریات سے اتفاق کے نہیں ہیں۔ اطاعت اور اتباع کا فرق یہ ہے کہ اطاعت کا دائرہ وسیع ہے۔ اس میں قومی اتفاق بھی شامل ہے لیکن اتباع کے لئے عملی پیروی ضروری ہے اور جب تک انسان نقش قدم پر نہیں چلتا ہے اسے اتباع کرنے والا نہیں کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں بعض مقامات پر اگر غیر انسان کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا مقصد اس کردار کا اتباع ہے جو صاحب کتاب میں پایا جاتا ہے ورنہ کتاب کے اتباع کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

کتاب کے اتباع کے لئے ضروری ہے کہ صاحب کتاب اس کے تعلیمات کا نمونہ پیش کرے اور انسان اس نمونہ پر عمل کرے ورنہ ہر شخص کتاب کے الفاظ سے ایک نیا کردار تیار کرے گا اور اسی کو اپنا دستور عمل اور طرز حیات بنا لے گا اور اپنے خیال میں اتباع کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ اتباع کے معیار محبت ہونے کا اعلان مرسل اعظمؐ کی طرف سے ہوتا تو شان رسالت کے خلاف ہو جاتا کہ بندہ میں اسقدر احساس شخصیت پیدا ہو جائے کہ اپنی پیروی کے بغیر محبت خدا کو بھی بیکار اور بے معنی بنا دے ۔ یہی وجہ ہے کہ پروردگار نے مسئلہ کا اعلان لفظ قُلْ کے ذریعہ کیا ہے تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس معیار کا رسولؐ سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ تو خود ہی صبح و شام اطاعت الٰہی میں مصروف رہتا ہے ۔ یہ ایک قانون پروردگار ہے جس پر عمل کرنا ہر بندۂ پروردگار کا فرض ہے ۔!

موعظہ امام صادقؑ

ایک شخص امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کی کہ فرزند رسولؐ! مجھے نصیحت فرمائیں۔ تو آپ نے فرمایا:

- جب پروردگار نے رزق کی ضمانت لے لی ہے تو ہر وقت اس کی فکر کیوں؟
- جب رزق مقرر ہو چکا ہے تو لالچ کیوں؟
- جب حساب برحق ہے تو جمع کرنے کا فائدہ کیا؟
- جب پروردگار کمی کا پورا کرنے والا ہے تو بخل کیوں؟
- جب جہنم کا عذاب برحق ہے تو گناہ کیوں؟
- جب موت برحق ہے تو خوشی کس بات کی ہے؟
- جب خدا کے سامنے پیشی برحق ہے تو مکّاری کس لئے؟
- جب صراط سے گذرنا لازمی ہے تو اکڑ کس بات کی؟
- جب ہر بات قضا و قدر پروردگار سے ہے تو رنج و الم کس بات کا؟
- جب دنیا فنا ہونے والی ہے تو اطمینان کس بات کا؟

(خصال صدوقؒ ۲/۴۵۰)

استنتاج:

ـ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس دور میں لوگوں کو نصیحت سُننے اور اُس پر عمل کرنے کا شوق تھا۔ آج تو ہر شخص اپنے کو نصیحت سے بالاتر سمجھتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات نصیحت کرنے والے ہی سے ناراض ہو جاتا ہے اور بیجا تعریف کرنے والے ہی کو اپنا دوست

اور مخلص تصور کرتا ہے۔ حالانکہ امیرالمومنینؑ کا ارشاد گرامی ہے: "من مدحک فقد ذبحک" (جس نے تمھاری بیجا تعریف کی اس نے گویا تمھیں ذبح کر دیا) اور اب اصلاح کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ـ انسانی زندگی میں جن جذبات کا ہونا ناگزیر ہے اور جن سے عام طور پر کوئی بشر خالی نہیں ہے۔ امام علیہ السلام نے ان کے صحیح مواقع کی طرف اشارہ فرما دیا ہے کہ اہتمام کا موقع رزق نہیں ہے عبادت ہے۔ لالچ کی منزل روزی نہیں ہے لوگوں کی ہدایت ہے۔ "حریص علیکم" ـــــ وغیرہ۔

ـ امامؑ نے اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ انسان کو ہر عمل سے پہلے اس کے انجام کا حساب لگا لینا چاہیئے اور پھر اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ جب انسان جانتا ہے کہ روز قیامت ایک ایک پیسہ کا حساب دینا ہے تو دولت جمع کرنے کا کیا فائدہ ہوگا۔ اس دولت و ثروت کا انجام حساب کی شدت اور سختی کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔

ـ امامؑ نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ دار دنیا میں اطمینان کا کوئی امکان نہیں ہے۔ سب سے کم افتاد یہ ہے کہ یہ دنیا ایک دن فنا ہو جانے والی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان آج مطمئن ہو کر بیٹھنے کا ارادہ کرے اور کل ہی کوچ کرنے کا اعلان ہو جائے تو ایسی صورت میں اطمینان کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اطمینان قلب کا خیال ہے تو ذکر خدا کو سہارا بنائے جو بہر حال اطمینان قلب فراہم کر سکتا ہے اور یہ اطمینان یہاں سے قیامت تک قائم رہ سکتا ہے۔

ـ امامؑ نے اس نکتہ کی بھی وضاحت کر دی کہ مکّاری اس شخص کو زیب دیتی ہے جس کا یہ احساس ہو کہ خدا کی نگاہوں سے چھپ سکتا ہے اور اکڑ اس کے لئے مناسب ہے جسے صراط سے گذرنے کا خیال نہ ہو ــ ورنہ اگر خدا کی نگرانی کا احساس ہے اور صراط سے گذرنا ہے۔ اور سامنے عذاب جہنم کا نقشہ ہے تو انسان نہ مکّاری کر سکتا ہے۔ نہ اکڑ سکتا ہے اور نہ معصیت کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے۔ یہ سب عیوب ایمان و عقیدہ کی کمزوری سے پیدا ہوتے ہیں اور پختہ ایمان ہر مشکل حیات کا بہترین اور عظیم ترین حل ہے۔!

اقسامِ گناہ اور دعائے کمیل

• اس دعائے مبارکہ میں مولائے کائناتؑ نے دس قسم کے واسطوں کا حوالہ دیا ہے اور اس کے بعد اصل مدعا کو پیش کیا ہے ۔ رحمت الٰہی، قوت پروردگار ۔ جبروت، عظمت، سلطنت، ذات اقدس، اسمارحسنیٰ، علم واسع اور نورانیت ذات مقدسہ ۔

• مدعا کے اظہار کے ساتھ پانچ قسم کے احسانات کا حوالہ دیا ہے ۔ وہ بُرائی جس پر پردہ ڈال دیا ۔ وہ مصیبت جسے ٹال دیا ۔ وہ لغزش جس سے بچالیا ۔ وہ ناگوار حالات جنھیں دفع کردیا ۔ اور وہ عمل خیر جس کا انسان اہل نہیں تھا لیکن اس کے نام سے مشہور ہوگیا ۔

• دُعا میں عذاب کے بھی مختلف درجات کا ذکر کیا گیا ہے : عذاب، فراق الٰہی، گرمیٔ آتشِ جہنم، عدم نظرِ رحمت پروردگار ۔

• آخر میں عذاب کے امکانات کی تخفیف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان حلم کا امیدوار ہو اور پھر عذاب میں باقی رہ جائے ۔ فضل وکرم کی امید رکھے اور آگ کی تکلیف برداشت کرے، پروردگار آواز سُنے، حال زار دیکھے اور پھر بھی جلاتا رہے ۔ بندہ کی صداقت نگاہ میں ہو اور اسے طبقات جہنم میں کروٹیں بدلوائی جائیں ۔ بندہ پروردگار کہہ کر فریاد کرے اور ملائکۂ جہنم اسے ڈانٹ دیں ۔ وہ فضل وکرم کا حوالہ دیتا رہے اور پھر عذاب میں پڑا رہ جائے ۔

• ان تمام امور کے ساتھ چھ قسم کے گناہوں کی مغفرت کی التماس کی گئی ہے جنکی تشریح امام جعفر صادقؑ نے اس انداز سے کی ہے :

وہ گناہ جو نعمتوں کو بدل دیتا ہے وہ زنا ہے ۔ اور وہ گناہ جو باعث ندامت ہوتا ہے وہ قتل ہے ۔ جو گناہ عذاب نازل کراتا ہے وہ ظلم ہے اور جس سے پردۂ دین چاک ہوجاتا ہے وہ

شراب خواری ہے ۔ رزق کو تنگ کردینے والا گناہ زنا ہے اور دعاؤں کو روک دینے والا گناہ ماں باپ کی نافرمانی اور ناراضگی ہے ۔

• امام زین العابدینؑ کا ارشاد ہے کہ دعاؤں کی راہ میں حائل ہونے والے گناہ نیت کی خرابی ۔ باطن کی خباثت، برادران ایمانی کے ساتھ منافقت، نمازوں کی تاخیر، صدقات وخیرات کا فقدان ۔ بدکلامی اور لغویات ہیں ۔

• دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ تین گناہ بارش کو بھی روک دیتے ہیں ۔ حکام کی فیصلوں میں ناانصافی ۔ جھوٹی گواہی اور سچی گواہی سے کنارہ کشی ۔

• رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ تین گناہوں کا عذاب آخرت سے پہلے دنیا ہی میں نازل ہوجاتا ہے ۔ ماں باپ کی نافرمانی ۔ لوگوں پر زیادتی ۔ احسانات کی ناشکری ۔

آثارِ گناہ

۱۔ • امام صادقؑ کا ارشاد ہے کہ جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہوجاتا ہے ۔ اس کے بعد توبہ کرلیتا ہے تو مٹ جاتا ہے ۔ اور مزید گناہ کرتا ہے تو اور سیاہ ہوجاتا ہے یہانتک کہ سارے دل کو گھیر لیتا ہے اور پھر کبھی نجات نہیں ملتی ہے ۔

• مولائے کائنات کا ارشاد ہے کہ گناہ زیادہ ہوتے ہیں تو دل سخت ہوجاتا ہے اور دل سخت ہوجاتا ہے تو آنسو خشک ہوجاتے ہیں ۔

۲۔ انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو نماز شب کی برکت سے محروم ہوجاتا ہے ۔ گناہ گوشت میں چھری سے زیادہ تیز اثر رکھتا ہے ۔ (امام صادقؑ)

۳۔ گناہ روزی کو تنگ کردیتا ہے ۔ (امام باقرؑ)

گناہ روزی سے محروم کردیتا ہے ۔ (امام صادقؑ)

۴۔ انسان جب کسی بلا میں مبتلا ہوتا ہے چاہے دردسر یا ٹھوکر ہی کیوں نہ ہو تو اس کا سبب خود اس کا عمل ہوتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ مالک اکثر خطاؤں کو معاف کردیتا ہے ۔ (رسول اکرمؐ)

• حکام جھوٹ بولتے ہیں تو بارش رُک جاتی ہے اور سلطان ظلم کرتا ہے تو حکومت کمزور

ہوجاتی ہے۔ زکوٰۃ روک لینے سے جانوروں کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ (امام رضاؑ)

عِلاج

صاحب میزان الحکمہ نے متعدد روایات کو جمع کر کے حسب امور کی نشاندہی کی ہے جن سے گناہوں کے آثار کے ختم ہوجانے کے امکانات ہیں:

دنیا میں بیماری یا تنگدستی۔ مختلف قسم کے امراض۔ رنج و غم۔ نیک اعمال۔ بہترین اخلاق۔ فریادی کی فریادرسی۔ ملائکہ کی طرف سے استغفار۔ کثرت سجود۔ حج و عُمرہ۔ نامۂ اعمال کا نیکیوں سے آغاز اور نیکیوں پر خاتمہ۔ موت۔ محمدؐ و آل محمدؐ پر صلوات۔

• تین چیزیں شرِ شیطان سے تحفّظ کا بہترین ذریعہ ہیں:

(۱) اجنبی عورت کے ساتھ تخلیہ نہ کرنا۔ (۲) بادشاہوں کے یہاں حاضری نہ دینا۔ (۳) کسی صاحبِ بدعت کی بدعت پر مدد نہ کرنا۔ (امیرالمومنینؑ)

سعی مشکور

• قرآن مجید کا کھُلا ہوا اعلان ہے کہ اس دنیا میں بیکار اور کاہل لوگوں کا کوئی حصّہ نہیں ہے "وان لیس للانسان الا ماسعیٰ" انسان کا حصّہ صرف اتنا ہی ہے جتنی اس کی سعی اور کوشش ہے۔ مجبور لوگوں کا آذوقہ ان کی مجبوری کی بنا پر دیا جاتا ہے اور وہ پروردگار کا حق ہے جو اپنے مجبور بندوں کو دلواتا ہے ورنہ مجبوری نتیجۂ عمل کا سبب نہیں ہوتی ہے۔ حدیث قدسی میں صاف اعلان ہوا ہے "المال مالی والفقراء عیالی"۔ مال میرا مال ہے اور فقرا میرے عیال ہیں۔ گویا فقرار کو اُن کا مال نہیں دیا جاتا ہے بلکہ خدا کا مال ہے جو خدا کی طرف سے ان مجبور افراد کو عطا کر دیا جاتا ہے۔

• جب انسان کا کل حصہ اس کا نتیجۂ عمل ہے تو جیسا عمل ہوگا ویسا ہی نتیجہ ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے "وان سعیہ سوف یُریٰ" انسان کی سعی عنقریب اس کے سامنے آنے والی ہے۔ دنیا میں اگر عمل کا نتیجہ محسوس نہیں کیا ہے تو آخرت میں بہرحال وہ نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔

• انسانی سعی کی دو قسمیں ہیں: تعمیری سعی اور تخریبی سعی۔

تعمیری سعی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "لسعیہا راضیہ" اہل جنّت اپنی سعی سے خوش ہوں گے۔ اس سعی کا ایک نمونہ عبادت کی راہ میں سعی ہے جس کی طرف سورۂ مبارکہ جمعہ میں اشارہ کیا گیا ہے "اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللّٰہ" جب جمعہ کے دن نماز کے لئے آواز دی جائے تو یادِ خدا کے لئے دوڑ پڑو۔ یہ تعمیری سعی ہے جس سے آخرت بنائی جاتی ہے اور اطمینان قلب کی دولت حاصل کی جاتی ہے۔

اس کے برخلاف تخریبی سعی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "اذا تولیٰ سعیٰ فی الارض

لیفسد فیھا واللہ لایحب الفساد" منافق کی شان یہ ہے کہ جب رسولؐ کی بزم سے باہر نکلتا ہے یا دنیا میں صاحب اختیار ہو جاتا ہے تو پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے حالانکہ اسے معلوم ہے کہ پروردگار فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔

• سعی کی ایک تقسیم یہ بھی ہے کہ کبھی سعی مطابق مقصد ہوتی ہے اور انسان جو ارادہ کرتا ہے اسی کے مطابق سعی کرتا ہے اور کبھی سعی مقصد سے بالکل اجنبی ہوتی ہے اور انسان جَو بو کر گندم کاٹنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید نے اس نکتہ کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے "من اراد الآخرۃ وسعیٰ لھا سعیھا وھو مومن فاولٰئک کان سعیھم مشکورا"۔ جو آخرت کا ارادہ کرے اور اسی کے مطابق سعی کرے، اس کی سعی مشکور اور مقبول قرار پاتی ہے۔ جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ صرف ارادۂ آخرت یا سعی آخرت کافی نہیں ہے بلکہ وہ سعی درکار ہے جو سعی آخرت کہے جانے کے قابل ہو ۔ ورنہ تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے "قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً الذین ضلّ سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً"۔

"پیغمبرؐ! آپ کہہ دیں کہ کیا ہم تمھیں ایسے لوگوں کے بارے میں خبر دیں جن کے اعمال انتہائی خسارہ میں ہیں اور ان کی سعی زندگانی دنیا میں راہ سے بے راہ ہو گئی ہے اور وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ بہترین اعمال انجام دے رہے ہیں"۔

آیت کا صاف اشارہ ہے کہ جاہل کی سعی کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اس کے برباد ہونے میں کوئی کسر نہیں ہے۔ اس کے بعد صاحب علم و معرفت کی سعی بھی اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک مرضیٔ پروردگار کے مطابق نہ ہو۔

• آیت کریمہ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ صرف عمل اور سعی معیار نہیں ہے۔ سعی کا اسی راہ میں ہونا ضروری ہے جس کا قصد کیا ہے، ورنہ کوشش راہ سے بے راہ ہو گئی اور دوسری راہ پر لگ گئی تو انسان صرف اس خوش فہمی میں رہ جائے گا کہ منزل کی طرف قدم آگے بڑھا رہا ہے اور ہر قدم پر منزل سے دور تر ہو جائے گا۔

• سعی کے ان اقسام و احوال کو دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سعی کے مشکور و مقبول

ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ سعی تعمیری ہو، تخریبی نہ ہو۔ سعی مقصد کے مطابق ہو، مقصد سے مختلف نہ ہو۔ سعی کرنے والا صاحب ایمان ہو منافق نہ ہو۔ سعی کرنے والا باخبر ہو خوش فہمی کا شکار نہ ہو۔ اس کے بغیر سعی مشکور نہیں ہو سکتی ہے۔

• ان تمام مقدمات سے آل محمدؐ کی سعی کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سب کی سعی کے بارے میں احتمال ہے کہ انشاء اللہ مقبول ہو گی اور آل محمدؐ کی سعی کے بارے میں خود پروردگار کا اعلان ہے "ان ھٰذا کان لکم جزاءً وکان سعیکم مشکوراً"۔ جنت و حریر کا جزاء عمل بن جانا بہترین علامت ہے کہ انسان کی سعی مقبول ہو گئی ہے اور اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ پروردگار نے اس کا اعلان ایک مکمل سورہ میں کر دیا ہے اور اسے قیامت تک کے لئے سند بنا دیا ہے۔!

خوف و رجاء

دین اسلام نے صاحب ایمان کی یہ علامت قرار دی ہے کہ اس کے دل میں عذاب الٰہی کا خوف بھی ہو اور رحمت الٰہی کی امید بھی ہو۔ انسان خدا سے بے پرواہ ہو جائے تو بدترین مجرم ہو سکتا ہے۔ اور امید رحمت سے مایوس ہو جائے تو بدترین کافر ہو سکتا ہے۔ زندگی کا کمال یہ ہے کہ اس میں عذاب کا ایمان بھی رہے اور رحمت کا ایمان بھی رہے اور کوئی ایمان دوسرے پر اثر انداز نہ ہونے پائے اور توازن ختم نہ ہونے پائے۔

• سورۂ مبارکہ حمد اس عقیدہ کی بہترین مثال ہے جہاں الحمد للہ رب العٰلمین ہ الرحمٰن الرحیم ہ "امید" کی بہترین دعوت ہے اور مالک یوم الدین ہ "خوف" کا بہترین محرک۔ ایاک نعبد "خوف کا محرک" ہے اور ایاک نستعین ہ "رجار کا داعی"۔ اھدنا الصراط المستقیم ہ صراط الذین انعمت علیھم "رجار کا مظہر" ہے اور غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ہ "خوف کا نمونہ"۔

• اسلام نے سورۂ حمد کو مختلف خصوصیات سے ممتاز بنایا ہے:

۱۔ سورۂ حمد پورے قرآن کے مقابلہ میں ایک حیثیت رکھتا ہے "لقد آتینٰک سبعًا من المثانی والقرآن العظیم"۔

۲۔ کوئی نماز سورۂ حمد کے بغیر نہیں ہو سکتی ہے۔

۳۔ سورۂ حمد کی سات مرتبہ تلاوت مریض کو شفایاب بلکہ مُردہ کو زندہ بنا سکتی ہے بشرطیکہ تلاوت کرنے والے کی زبان کسی حرف غلط سے آشنا نہ ہو۔

اور یہ تمام امور خوف و رجار کی اہمیت کے اثبات کے لئے کافی ہیں کہ گویا سارا قرآن

فلسفہ خوف و رجار ہے۔ ساری نماز کا فلسفہ یہی خوف و رجار ہے اور روح کی شفا یا قلب کی زندگی اسی خوف و رجار پر موقوف ہے۔

• خوف و رجار کی اہمیت کے پیش نظر اعلان کیا گیا ہے "الفقیہ کل الفقیہ من لم یقنط الناس من رحمۃ اللہ ولم یومنھم من عذاب اللہ"۔ مکمل فقیہ وہی ہے جو لوگوں کو رحمت خدا سے مایوس بھی نہ کرے اور عذاب خدا کی طرف سے محفوظ اور مطمئن بھی نہ بنا دے۔ گویا فقہ اسلامی کا دار و مدار بھی خوف و رجار پر ہے۔

• "خوف" ـ اس نفسیاتی تکلیف کا نام ہے جو مستقبل کے ناخوشگوار حالات کے تصور سے پیدا ہوتی ہے جیسے خوف مرض۔ خوف حوادث۔ خوف جہنم۔ خوف عذاب وغیرہ۔ اسکے علاوہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو تکلیف کے احساس سے نہیں بلکہ عظمت و ہیبت و جلالت کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور خشیت کہا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں قرآن حکیم نے اعلان کیا ہے "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" (تمام بندوں میں خشیتِ خدا رکھنے والے صرف اہلِ علم ہوتے ہیں) کہ ان کا علم انھیں ہیبت و جلال الٰہی سے آشنا بنا دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کے دل میں ایک مخصوص قسم کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔

• بعض روایات میں خوف کی پانچ قسمیں بیان کی گئیں ہیں:

(۱) خوف۔ (۲) خشیت۔ (۳) وجل۔ (۴) رہبہ۔ (۵) ہیبت

خوف ـ جو ہر شخص میں عذاب کے تصور سے پیدا ہوتا ہے "یخافون یومًا کان شرّہ مستطیرا ـ یخافون سوء الحساب ـ یخافون عذابہ ـ یخافون العذاب الالیم"۔

خشیہ ـ جس کا تعلق اہل علم سے ہے اور یہ کمال تصور ہیبت و عظمت سے پیدا ہوتا ہے "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء ـ تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم ـ ان منھا لما یھبط من خشیۃ اللہ ـ ان الذین ھم من خشیۃ ربھم مشفقون"۔

وجل ـ جس کا تعلق بارگاہِ الٰہی میں خضوع و خشوع رکھنے والے افراد سے ہے "انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم" (صاحبانِ ایمان وہ ہیں جن کے سامنے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں) گویا ان کے دل پر خشوع و خضوع کا پہرہ ہے

صرف ادنیٰ توجہ کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد دل کا لرزنا کوئی بعید امر نہیں ہے۔

رہبہ۔ اس کا تعلق عبادت گذاروں سے ہے "واوفو بعھدی اوف بعھدکم وایای فارھبون" (بقرہ۔ ۴۰) ۔ "انھم کانوا یسارعون فی الخیرات ویدعون ربھم رغبا ورھبا" (انبیاء ۹۰) ۔ "وفی نسختھا ھدی ورحمۃ للذین ھم لربھم یرھبون" (اعراف ۱۵۴)

ہیبت۔ اس کا تعلق اہلِ معرفت سے ہے۔ جس کی طرف امام سجّادؑ کی مناجات میں اشارہ کیا گیا ہے۔

• انبیاء و مرسلین اور ائمہ طاہرینؑ ان تمام اقسام کے جامع تھے۔ اس لئے روایات میں نقل کیا گیا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کی آہ و بکا کی آواز ایک میل سے سُنی جاتی تھی۔ سرکارِ دو عالمؐ کے سینہ مبارک سے پانی کے جوش جیسی آواز محسوس کی جاتی تھی۔ مولائے کائناتؑ وضو شروع کرتے تھے تو چہرہ کا رنگ بدل جاتا تھا۔ امام حسنؑ کے سامنے بارگاہ احدیت میں پیشی کا ذکر آتا تھا تو بیہوش ہو جاتے تھے۔ امام سجّادؑ دعائے ابوحمزہ میں فرماتے ہیں کہ انسان کس طرح نہ روئے گا جب کہ مستقبل کا بھیانک چہرہ اس کی نگاہ کے سامنے ہے اور موت کے مراحل میں سوائے بیکسی اور بےبسی کے کچھ نہیں ہے۔

مزاج پُرسی (کَیفَ اَصبَحتَ؟)

دنیا کے ہر معاشرہ میں اس قسم کے اخلاقیات پائے جاتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے سے ملاقات کر کے خیریت دریافت کرتا ہے اور صورت حال کے مطابق جواب دے دیتا ہے۔ عام طور سے سوال و جواب کی نوعیت صرف رسمی ہوتی ہے اور کبھی کبھی گفتگو میں سنجیدگی ہوتی ہے تو مصائب دنیا کا رونا رویا جاتا ہے اور کوئی انسان ان حقائق کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا ہے جن سے انسان کے واقعی مزاج کی تشکیل ہوتی ہے اور جن کی روشنی ہی میں مزاج کے بارے میں صحیح جواب دیا جا سکتا ہے۔

ائمہ معصومینؑ کی زندگی میں ایک باب ہے "کیف اصبحت؟ جہاں لوگوں نے فرزندِ رسولؐ سے مزاج دریافت کیا ہے اور امامؑ نے جواب کے ذریعہ انتہائی بلیغ موعظہ فرمایا ہے کہ شاید کسی واعظ اور خطیب کی دو چار گھنٹے کی تقریر اس قدر اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے جس قدر موثر وہ چند فقرات ہیں جو مزاج پُرسی کے جواب میں ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ ان جوابات کا امامؑ کی ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک عام صورت حال ہے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ ہر انسان ایسے مواقع پر اپنے حالات کا جائزہ لے سکے اور انھیں کلمات کی روشنی میں اپنے کردار کی تشکیل کر سکے۔

• امام سجادؑ سے کسی نے سوال کیا فرزندِ رسولؐ! آپ نے کس عالم میں صبح کی؟ فرمایا اس عالم میں کہ آٹھ طرف سے مطالبات میں گھرا ہوا ہوں۔ اللہ فرائض کا مطالبہ کر رہا ہے۔ پیغمبرؐ سنت کا تقاضا کر رہے ہیں۔ عیال نفقہ چاہتے ہیں۔ نفس خواہشات کا تقاضا کر رہا ہے۔ شیطان معصیت کا مطالبہ کر رہا ہے۔ کاتبِ اعمال فرشتے صدق نیت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ملک الموت روح چاہتے ہیں اور قبر جسم کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ایسے حالات میں انسان کی صبح کیسی ہو سکتی ہے؟

• امام حسینؑ سے دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ فی الحال صورت حال یہ ہے کہ اوپر خدا ہے۔ سامنے جہنم ہے۔ موت مطالبہ کر رہی ہے۔ حساب گھیرے ہوئے ہے اور انسان اپنے اعمال میں گرفتار ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں صبح کیسی ہوگی۔

• مولائے کائنات سے یہ سوال کیا گیا۔ تو فرمایا کہ اس کی صبح کیسی ہوگی جس کے سر پر دو فرشتے مستقل مسلط ہیں۔ غلطیاں نامۂ اعمال میں لکھی جا رہی ہیں اور اگر پروردگار رحم نہ کرے تو انسان کا انجام جہنم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

• جناب فاطمہ زہراؑ سے یہ سوال کیا گیا تو فرمایا کہ میری صبح اس عالم میں ہوتی ہے کہ تمھاری دنیا سے بیزار۔ تمھارے مُردوں سے ناراض اور کرب و الم کے درمیان ہوں۔ نبیؐ کا سایہ سر سے اُٹھ چکا ہے اور وصی رسولؐ پر مسلسل ظلم ہو رہا ہے۔

• منہال نے امام زین العابدینؑ سے خیریت دریافت کرلی تو فرمایا بڑے افسوس کی بات ہے کہ انسان شیعوں میں شمار ہوتا ہو اور اپنے امامؑ کے حالات سے باخبر نہ ہو۔ سنو! میں نے اسی طرح صبح کی ہے جس طرح بنی اسرائیل فرعون کے دور میں کرتے تھے کہ ان کے مرد قتل کردئے جاتے تھے اور عورتوں کو لاوارث بنا کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یا جس طرح پیغمبرؐ کے بعد مولائے کائناتؑ نے صبح کی ہے کہ کائنات کا افضل ترین انسان اور اسے برسرِ منبر گالیاں دی جائیں۔

• مسیّب کا بیان ہے کہ امیرالمومنینؑ بیت الشرف سے برآمد ہوئے تو راستہ میں سلمان سے ملاقات ہوگئی۔ فرمایا سلمان! کیسی صبح ہوئی؟ عرض کی کہ حضور! چار طرح کے غم میں گرفتار ہوں، عیال روٹی چاہتے ہیں۔ پروردگار عبادت چاہتا ہے۔ شیطان معصیت کا تقاضا کر رہا ہے اور ملک الموت روح کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

فرمایا سلمان مبارک ہو۔ اس انداز فکر پر پروردگار عالم نے بڑے درجات رکھے ہیں۔ میں خود ایک دن رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھوں نے مزاج پرسی کی تو

میں نے جواب دیا کہ میرے پاس پانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور میرے فرزند حسنؑ و حسینؑ کو غذا درکار ہے۔ فرمایا یا علیؑ! یاد رکھو عیال کے بارے میں فکرمند رہنا جہنم سے نجات کا ذریعہ ہے اور اللہ کی اطاعت عذاب سے بچنے کا وسیلہ ہے۔ اطاعت پر صبر کرنا ایک جہاد بلکہ ۶۰ سال کی عبادت سے افضل ہے اور موت کی فکر گناہوں کا کفارہ ہے۔

یا علیؑ! رزق پروردگار نے تقسیم کر دیا ہے اور انسان کا فکرمند ہونا نہ کوئی فائدہ پہونچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ لیکن اس کے باوجود پروردگار نے ہر غم پر ایک اجر رکھا ہے اور خصوصیت کے ساتھ غم و ہم کا تعلق عیال و اطفال سے ہو تو اس کا اجر بھی سب سے زیادہ ہے۔

مذکورہ بالا تمام روایات سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو بہترین حالات میں بھی ان حقائق سے غافل نہیں ہونا چاہیئے اور زندگی قصر شاہی میں گذرے یا کاخِ جمہوری میں — یہ مطالبات بہرحال باقی رہیں گے اور ان کے جوابات کا بہرحال انتظام کرنا ہے۔

تذکّر

انسان فطری طور پر سہو و نسیان کا مُرکّب واقع ہوا ہے لہذا اس کی زندگی کے لئے یاد دہانی اہم ترین فریضہ ہے۔

انسان تذکّر اور یاد دہانی سے محروم ہو جائے تو اس کی زندگی مستقل طور پر محرومی اور مایوسی کا شکار ہو جائے۔

تذکّر ایک اہم ترین فریضہ ہے جو انسانیت کے ناطے ہر انسان پر عائد ہوتا ہے اور ہر برادر ایمانی کا فرض ہے کہ دوسرے برادر ایمانی کو ان تمام امور کی یاد دہانی کراتا رہے جن کا یاد رکھنا فرض ہے یا جن کی یاد سے زندگی کا کوئی اہم ترین مسئلہ وابستہ ہے۔

دین اسلام نے انبیاء کرامؑ کے فرائض میں ایک فریضہ یاد دہانی کا بھی قرار دیا ہے "ذکّر فان الذکریٰ تنفع المومنین" پیغمبرؐ! آپ یاد دہانی کراتے رہیں کہ یاد دہانی صاحبانِ ایمان کے لئے مفید اور منفعت بخش ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن چیزوں کی یاد دہانی کرائی جائے اور کن امور کی یاد دہانی صاحبان ایمان کے لئے منفعت بخش اور فائدہ مند ہو سکتی ہے؟

اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ مدرسہ میں پڑھنے والا طفل مکتب بھی اس حقیقت سے باخبر ہوتا ہے کہ ان مسائل کا یاد رکھنا بہر حال ضروری ہے جن کے امتحان میں آجانے کا احتمال ہو اور جن کے بارے میں یہ خیال ہو کہ مقام امتحان میں ان کے بارے میں سوال کیا جا سکتا ہے۔

اب انسان کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کن چیزوں کو یاد رکھا جائے۔ اس کا مسئلہ صرف یہ ہے

کہ کن کن چیزوں کے امتحان میں آنے کا احتمال ہے اور کن چیزوں کے بارے میں کل سوال کیا جا سکتا ہے۔

اسلام نے تلقین کے ذیل میں ان تمام سوالات کا اعلان کر دیا ہے جن کے بارے میں کل سوال ہونے والا ہے اور جن کے امتحان میں آنے کا امکان نہیں بلکہ یقین ہے اور وہ سوالات پانچ ہیں:

رب۔ قبلہ۔ کتاب۔ نبی۔ امام

دین کے بارے میں ایک اجمال ہے جس کی تفصیل انھیں پانچ امور میں مضمر ہیں کہ اسلام ان پانچ حقائق کے علاوہ کوئی اور شے نہیں ہے۔

اسبابِ تذکّر

دین اسلام نے ایک طرف ان تمام مسائل کو یاد رکھنے کا الگ الگ انتظام کیا اور اس کے بعد ایک جامع عمل مرتب کر دیا جو تن تنہا تمام حقائق کی یاد دہانی کراتا رہے اور جس کی پابندی کے بعد مذکورہ حقائق سے غفلت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انفرادی طور پر جن وسائل کو الگ الگ اختیار کیا گیا ہے، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

یادِ خدا

اسلام نے پہلا قانون یہ بنایا کہ دنیا کا ہر اہم کام بسم اللہ سے شروع کیا جائے اور یہ واضح کر دیا کہ بسم اللہ کے بغیر شروع ہونے والا عمل کبھی مکمل نہیں ہو سکتا ہے تاکہ انسان کسی موقع پر بھی یادِ خدا سے غافل نہ ہو سکے۔ دستر خوان پر جب نعمتوں کا ہجوم انسان کی نگاہوں کو اپنی طرف جذب کر رہا ہو اور ہوش اڑے جا رہے ہوں وہاں بھی بسم اللہ ضروری ہے اور عمل مقاربت جہاں خواہشات کا ہیجان اور طوفان ہوتا ہے اور انسان اپنے ہوش و حواس گم کر چکا ہوتا ہے وہاں بھی بسم اللہ کا خیال ضروری ہے تاکہ انسان حساس ترین مواقع پر بھی یادِ خدا سے غافل نہ ہو سکے۔

بسم اللہ کے علاوہ یاد خدا کے دیگر اسالیب بھی ہیں جن کا اندازہ بسم اللہ سے کیا جاسکتا ہے کہ آغاز کار میں یاد خدا بسم اللہ ہے اور انجام کار میں الحمد للہ۔ چیز پسند آجائے تو سبحان اللہ اور ہاتھ سے نکل جائے تو انا للہ۔ کوئی بھی حالت ہو یاد خدا کا رہنا ضروری ہے اور اس کے لئے کسی نہ کسی اسلوب کو بہر حال اختیار کرنا ہے۔

یاد قبلہ

نماز میں قبلہ کی شرط۔ ذبیحہ میں قبلہ کا خیال۔ ہر نشست میں رو بقبلہ ہونے کی تاکید۔ سونے میں قبلہ کا لحاظ اور بول و براز کے موقع پر استقبال واستدبار کی حرمت قبلہ وکعبہ کی یاد دہانی کے لئے بہترین وسائل ہیں۔

قرآن

عام حالات میں تلاوت کی تاکید۔ نماز میں سورۂ فاتحہ کی شرط۔ مُردہ کے ایصال ثواب کے لئے تلاوت قرآن۔ دفع بلا کے لئے آیات حفظ اور شفا وصحت کے لئے آیات شفا کی تلاوت یاد خدا کا بہترین ذریعہ ہیں۔

رسالت

نبوت ورسالت کی یاد کو باقی رکھنے کا بنیادی ذریعہ کلمہ ہے جس کے بغیر انسان مسلمان نہیں ہوسکتا ہے اور پھر اس کے بعد ہر نماز سے پہلے اذان واقامت میں شہادت رسالت کا تذکرہ اور آخری تشہد میں سرکار دو عالمؐ کی رسالت کی گواہی یاد رسالت کا بہترین ذریعہ ہیں۔

امامت

اس کی یاد دہانی کے لئے کلمۂ ایمان، اذان واقامت کے ذیل میں شہادت ولایت۔ صلوات اور بقائے مذہب بہترین وسائل ہیں جن کے بغیر کوئی ایمانی کام انجام نہیں پاسکتا ہے۔

عمل جامع

ان تمام انفرادی اسباب کے علاوہ ایک جامع عمل ہے جس کے ذریعہ حقائق کو یاد رکھا جاسکتا ہے اور اس کا نام ہے نماز۔

نماز میں ذکر خدا بھی ہے اور استقبال قبلہ بھی۔ نماز میں ذکر رسالت بھی ہے اور صلوات کے ذریعہ ذکر ولایت بھی۔ "من لم یصل علیکم لاصلوٰۃ لہ" آل محمدؐ! جو تم پر صلوات نہ پڑھے اس کی نماز نماز نہیں ہے۔ (امام شافعی)

نماز میں سورۂ فاتحہ کی شرط ذکر کتاب ہے اور نماز میں صراط مستقیم کی دعا ذکر دین اسلام۔

رب کریم تمام مومنین کو ان حقائق کے یاد رکھنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

دُنیا

دنیا کی دنائت اور پستی کے لئے اس کا نام ہی کیا کم تھا کہ اس کے حالات اور انقلابات نے اس کی حقیقت کو مزید واضح کر دیا۔

دنیا اور اس کی بے ثباتی کے بارے میں بیشمار اقوال پائے جاتے ہیں۔ اور قرآن مجید سے لے کر مفکرینِ عالم تک سب نے اس کی بے ثباتی اور بیوفائی کا تذکرہ کیا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ یہ جس قدر بے وفا ہے لوگ اسی قدر اس کے وفادار ہیں' اور یہ جس قدر لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرتی ہے لوگ اسی قدر اس کے دیوانے ہوجاتے ہیں۔

مولائے کائنات نے حقیقت دنیا کے بارے میں متعدد انداز سے توجہ دلائی ہے اور انسان کو اس کے خطرات سے باخبر کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکا اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا دیوانہ بنا رہا۔

آپ کے حسب ذیل ارشادات اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں بشرطیکہ انسان قلب سلیم اور عقل مستقیم کا مالک ہو ورنہ دیوانہ مزید دیوانہ بن سکتا ہے۔

• دنیا کی مثال سانپ جیسی ہے کہ باہر سے اس کا جسم انتہائی نرم اور لطیف ہوتا ہے لیکن اندر زہر قاتل کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عشق انھیں دلوں میں پیدا ہوسکتا ہے جو صرف ظاہر پر قربان ہونے والے ہیں ورنہ جنھیں حقائق کا ادراک ہوگیا ہے وہ کسی قیمت پر اس کی طرف توجہ کرنے والے نہیں ہیں۔

• دنیا ایک ڈھلتا ہوا سایہ ہے۔ سایہ میں انسان کو سکون ضرور ملتا ہے لیکن سایہ کو کبھی دوام نہیں ہوتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں اپنی بساط کو سمیٹ لیتا ہے جب مسافر پھر کسی

دوسرے سکون کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہوجاتا ہے۔

سایہ کی مثال سے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ سایہ کو جب تک انسان تلاش کرتا رہتا ہے اور اسے اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے۔ وہ آگے ہی بڑھتا جاتا ہے ہاتھ نہیں آتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب انسان اس کی طرف سے منھ پھیر کر دوسرے رُخ پر چلنے لگتا ہے تو خود بخود پیچھے پیچھے آنے لگتا ہے۔

دنیا کا حال ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جن لوگوں نے اس کی خاطر دوڑ دھوپ کی اور ساری دنیا برباد کر دی۔ انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ کسی کو دریا میں ڈبو دیا کسی کو زمین دھنسا دیا اور کسی کو نذرِ آتش کر دیا لیکن جن لوگوں نے اس سے منھ موڑ کر بے نیازانہ زندگی گذاری ہے اُن کے گُن آج بھی گا رہی ہے اور ان کی عظمت کا کلمہ پڑھ رہی ہے۔

• دنیا دھوکہ باز بھی ہے اور نقصان دہ بھی۔ دنیا پلٹنے والی بھی ہے اور زوال پذیر بھی۔ دنیا ختم ہونے والی بھی ہے اور فنا ہونے والی بھی۔ دنیا کھا جانے والی بھی ہے اور تباہ کُن بھی۔

دنیا کے حالات کا صحیح جائزہ لیا جائے تو مولائے کائناتؑ کے ان کلمات کی بلاغت کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے اور یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اس نے کس کس طرح اپنے ان صفات و کمالات کا اظہار کیا ہے اور انسان کس طرح آنکھ بند کر کے دھوکہ کھاتا رہا ہے۔

• قرآن مجید نے حیاتِ دنیا کی تعریف اس انداز سے کی ہے :

"یاد رکھو زندگانی دنیا لعب و لہو۔ زینت۔ باہمی مفاخرت اور مال و اولاد کی فکر کثرت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کی مثال اس بارش کی ہے جس کی پیداوار کاشتکار کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ زرد ہوجاتی ہے اور آخر میں لکڑی کا ڈھیر ہوجاتی ہے اور پھر آخرت کا عذاب شدید ہی باقی رہ جاتا ہے۔" (الحدید - ۲۰)

شیخ بہائیؒ نے اس آیت کریمہ کی نہایت درجہ حسین تفسیر و تشریح کی ہے کہ یہ انسانی زندگی کے ارتقار اور تغیّر و تحوّل کی بہترین تصویر کشی ہے۔ انسان جب بچہ ہوتا ہے تو

اس کی ساری دلچسپی کھیل کود سے ہوتی ہے۔ جب بالغ ہو جاتا ہے تو دل لبھانے والی اور غافل کر دینے والی چیزوں سے دل لگاتا ہے۔ کمال شباب کی منزل میں اس کی تمامتر توجہ زینت و آرائش پر ہوتی ہے۔ اور آگے بڑھتا ہے تو پرانے کارناموں اور آباء واجداد کے کمالات پر تفاخر کرتا ہے اور جب بالکل ضعیف ہو جاتا ہے تو صرف اموال اور اولاد و ذریت کی کثرت کا خواہاں رہ جاتا ہے۔

گویا ہر عمر کا انسان اس دنیا سے وہی کام لیتا ہے جو اس کی عمر کے شایان شان ہے اور یہ اسقدر مکار ہے کہ ہر ایک کے سامنے اپنے کو کار آمد اور سکون بخش بنا کر پیش کر دیتی ہے۔ بچہ اسے اپنا کھلونا سمجھتا ہے اور بالغ سرمستیوں کا سرچشمہ۔ جوانی میں اس کی زینتیں نظر آتی ہیں اور ادھیڑ عمر میں یہ وسیلہ تفاخر بن جاتی ہے۔ ضعیفی میں اس کا مصرف صرف مال و اولاد کی کثرت رہ جاتا ہے اور بس!

انسان کا فرض ہے کہ اس قدر زود ہلاک شے سے ہوشیار رہے اور اپنے کو عذاب آخرت سے بچانے کی فکر کرے۔

• دنیا کی حقیقت پہچاننے کا ایک بہترین ذریعہ یہ ہے کہ انسان اپنی نگاہوں کو بلند کرے اور بلند ترین منزلوں سے نگاہ کرے۔ زمین پر رہ کر ہر دس بیس منزلہ عمارت اونچی دکھائی دیتی ہے لیکن ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے بعد وہی عمارت مٹی کا گھروندہ ہو جاتی ہے اور اس کی ساری بلندی پستیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دیہات کا رہنے والا شہر میں وارد ہوتا ہے تو اسے ہر عمارت عظیم نظر آتی ہے۔ لیکن شہر کا رہنے والا جب دیہات میں جاتا ہے تو اسے بلند ترین عمارت بھی پست اور معمولی دکھائی دیتی ہے۔

اسلام کا منشا یہ ہے کہ انسان اپنی نگاہوں کو بلند کرے۔ اپنے درجات کو رفیع بنائے تاکہ بلندیوں سے اس دنیا پر نظر کرے اور اس کی حقیقت اور پستی کو پہچان لے۔ اس نکتہ کی تفہیم کے لئے اس نے سب سے پہلے توحید کا عقیدہ پیدا کرایا ہے۔ جہاں عظمت صرف ایک ذات واجب کے لئے ہے اور اس کے جلال و جمال کو پہچان لینے والے کیلئے

ساری دنیا ایک ذرہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔

• مولائے کائناتؑ کے دنیا کو طلاق دیدینے کا مفہوم یہی تھا کہ انھوں نے اس دنیا پر ان بلندیوں سے نگاہ ڈالی تھی جہاں خزانے مٹی کے ڈھیر نظر آرہے تھے اور اقتدار بچوں کا کھلونا۔ پہاڑ مٹی کے تودے تھے اور زر و جواہر پتھر کی بدلی ہوئی شکلیں۔ سونا چاندی جمادات کے ٹکڑے تھے اور تاج شاہی پتھروں کے سجانے کی منزل۔

ظاہر ہے کہ اتنا عظیم ادراک و عرفان رکھنے والا انسان طلاق نہ دے گا تو کیا رشتۂ نکاح و محبت پیدا کرے گا۔؟ کاش اہل دنیا نے اس درس معرفت سے استفادہ کیا ہوتا اور اس دنیا کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہو جاتے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

شباب

انسانی زندگی کے تین دور ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کو کمسنی اور بچپنا کہا جاتا ہے۔ درمیانی زمانہ شباب اور جوانی کا ہوتا ہے اور آخری دور ضعیفی اور بڑھاپے کا ہوتا ہے جس سے نجات موت ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے ورنہ اس کے علاوہ کوئی نجات دلانے والا نہیں ہوتا ہے۔

بچپنے کا زمانہ ناتجربہ کاری اور ناطاقتی کا زمانہ ہوتا ہے اور ضعیفی میں انسان پھر پلٹ کر ابتدائی منزل کی طرف آجاتا ہے "ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق" صرف ایک شباب اور جوانی کا زمانہ ہوتا ہے جب انسان واقعاً کام کرنے کے لائق ہوتا ہے اور اس کے پاس طاقت اور تجربہ دونوں کا ایک ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے۔

• ۔ شباب کی تمثیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ انسان کسی پہاڑ کے پاس چلا جائے تو اس کے سامنے تین منزلیں ہوتی ہیں: اِس پار کا دامن کوہ۔ اُس پار کا دامن کوہ ۔ اور بلندیٔ کوہ۔ ظاہر ہے کہ اِس پار یا اُس پار رہنے والے کو نہ دوسری طرف کی خبر ہوتی ہے، نہ بلندیٔ کوہ کے بارے میں کچھ جانتا ہے کہ وہاں کا حال کیا ہے۔ لیکن جب وہ بلندی کی منزل پر پہونچ جاتا ہے تو اُس کی نظر میں بلندی کا حال احوال بھی ہوتا ہے اور وہ اِدھر اُدھر کے حالات سے بھی باخبر ہوتا ہے۔

انسانی زندگی کا نقشہ بالکل ایسا ہی ہے۔ کمسنی اور ضعیفی اِدھر اُدھر کے دامن کوہ ہیں۔ اور پہاڑ کی بلندی عالم شباب ہے جہاں انسان ہوش وخبر کی آخری منزلوں پر ہوتا ہے اور اسے زندگی کے ہر مرحلہ کی خبر ہوتی ہے۔ بچپنے کا تجربہ دیکھ چکا ہے۔ شباب کی منزلوں سے گذر رہا ہے

اور ضعیفی کے خطرات کو دور سے دیکھ رہا ہے۔ ایسے عالم کو کمال خبر واطلاع کہا جائے تو بات معقول بھی ہے لیکن افسوس کہ اسے "جوانی دیوانی" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ شباب کی انتہائی توہین ہے جسے کوئی صاحب عقل وغیرت برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

• ۔ شباب کی اسی اہمیت کے پیش نظر سرکار دو عالمؐ نے فرمایا تھا کہ انسان کا کوئی فیصلہ روز قیامت اس وقت تک نہ ہوگا جب تک دو باتوں کے بارے میں سوال نہ کر لیا جائے۔ زندگی کو کہاں گذارا ہے اور شباب کو کہاں صرف کیا ہے۔ اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے شباب کو پوری زندگی کے مقابلہ میں قرار دیا ہے حالانکہ وہ عمر اور زندگی ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ بات اس کی اہمیت کے علاوہ کسی اور بنیاد پر نہیں ہو سکتی ہے۔

• اہل دنیا خود بھی شباب کی اہمیت کے قائل ہیں اور جانتے ہیں کہ زندگی کے بیشمار کام شباب کے علاوہ کوئی انجام نہیں دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدود مملکت کے تحفظ کا کام جوانوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔ زراعت میں جوان کا خون کام کرتا ہے۔ زندگی کو فروغ دینے میں شباب ہی کام آتا ہے اور حسن وجمال کی ساری دنیا شباب ہی کے طفیل میں آباد ہے۔

• شریعت اسلام نے اپنے احکام کا مرکز شباب ہی قرار دیا ہے کہ جب تک انسان شباب کی منزل میں قدم نہیں رکھتا ہے، اُس وقت تک شرعی خطاب کے قابل نہیں ہوتا ہے اور نہ کوئی حکم اس سے متعلق کیا جاتا ہے۔ شباب کی سرحد میں قدم رکھتے ہی سارے قوانین اس کے حوالے کر دئے جاتے ہیں اور وہ تمام واجبات اور محرمات کا ذمہ دار قرار پا جاتا ہے۔ ضعیفی آنے کے بعد پھر احکام ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگتے ہیں اور ایک دن انسان خود بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

• ۔ شباب کی عظمت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسلام نے عورتوں کے احکام نو برس میں رکھے ہیں، اور مردوں کے احکام پندرہ برس میں کہ عورت کی زندگی میں شباب کی منزل پہلے آتی ہے اور مرد کی زندگی میں بعد میں۔ یہ ایک انتہائی جاہلانہ تصوّر ہے کہ انسان عورت کے حق میں نو برس کی عمر میں واجبات اور محرمات کو دیکھ کر اسے بے رحمی کی علامت قرار دیتا ہے اور اس سے احکام کو ساقط کرا دینا چاہتا ہے۔ حالانکہ حقیقت امر یہ ہے کہ احکام الٰہی کوئی مصیبت کا پہاڑ

نہیں ہیں۔ یہ انسان کی ذمہ دارانہ زندگی کا اعلان ہے کہ اب انسان احکام الٰہی کا بار اٹھانے کے قابل ہو گیا ہے اور یہ عورت کی خوش قسمتی یا اس کا سرمایۂ افتخار ہے کہ پروردگار عالم نے اسے مردوں سے پہلے قابل خطاب قرار دیا ہے اور اس کے نازک ہاتھوں میں اپنے دین کی ساری سنگین امانتوں کو رکھ دیا ہے۔

• جوانی کو دیوانی قرار دئے جانے کا ایک سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انسان بے پناہ طاقت رکھنے کی بنا پر ہر غلط اقدام کر سکتا ہے اور اسے کوئی نا طاقتی روکنے والی نہیں ہے لیکن یہ درحقیقت شباب کی دیوانگی نہیں ہے۔ یہ انسان کی دیوانگی یا عقل کی کمزوری ہے۔ ایک دیوانہ تیز چاقو سے کسی کا گلا کاٹ دے تو چاقو کی تیزی کو عیب نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ انسان کا عیب ہے جسے چاقو کے سر ڈال دینا چاہتا ہے۔

• اسلام نے ان خطرات کا علاج علم و معرفت اور ایمان و تقویٰ سے کیا ہے اور جب انسان ان زیورات سے آراستہ ہو گیا ہے تو اسے عظیم ترین ذمہ داری سپرد کر دی ہے۔ اسامہ بن زید کو سرداری لشکر کا عہدہ اس وقت سپرد کیا گیا جب ان کی عمر صرف ۱۸ سال کی تھی اور ان سے بڑے بڑے صحابہ کرام موجود تھے کہ اسلام سن و سال کا حامی نہیں ہے۔ علم و معرفت اور ایمان و عقیدہ کا حامی ہے۔

• ۔ شباب کے بارے میں یہ مثل مشہور ہے کہ "جوانی چلی جاتی ہے تو آتی نہیں ہے اور ضعیفی آجاتی ہے تو جاتی نہیں ہے"۔ اسلام نے اس تصور کو بھی غلط ثابت کر دیا اور عقیدہ کو اس قدر طاقت عطا کر دی کہ اس کے طفیل میں جوانی واپس بھی آجاتی ہے اور باقی بھی رہ جاتی ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے ایک ضعیفہ کے سامنے فرما دیا کہ بوڑھے جنت میں نہیں جائیں گے تو غریب پریشان ہو کر بلالؓ کے پاس آئی۔ بلال نے سفارش کرنا چاہی تو سرکار نے فرمایا کہ کالے لوگ بھی نہیں جائیں گے ۔۔۔ اور آخر میں یہ انکشاف فرمایا کہ اہل جنت کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہو جائے گی اور ان کی ضعیفی جوانی میں تبدیل ہو جائے گی۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ مومن کے یہاں ضعیفی تو جا سکتی ہے لیکن جوانی نہیں جا سکتی ہے۔

• ۔ تاریخ میں حبابہ والبیہ جیسی متعدد خواتین ہیں جن کی جوانی معصومینؑ کے اشارہ ں

سے واپس آئی ہے۔ یہ سلسلہ زلیخا سے شروع ہوا ہے اور ام غانم تک جاری رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس فہرست میں کسی مرد کا نام نہیں ہے اور یہ خوش قسمتی صرف عورتوں کے حصہ میں آئی ہے۔

• ۔ ان واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر امامت دوسروں کی جوانی کو واپس بلا سکتی ہے تو اپنی جوانی کو روک بھی سکتی ہے اور اس کے بعد کوئی جائے تعجب نہیں ہے کہ زمانہ کا امام سیکڑوں سال گذر جانے کے بعد بھی ۴۰ سال کا جوان نظر آئے اور اس کی زندگی پر سرد و گرم زمانہ کا اثر نہ ہو۔

ضرورت ہے کہ ایمانی معاشرہ اپنے حوصلوں کو جوان رکھے اور زندگی کے عظیم ترین مراحل و معاملات میں جوانوں کو آگے بڑھائے اور صدر اسلام کی "بوڑھی روش" کو نظر انداز کرے۔ "شیئان لا یعرف فضلهما الا من فقدهما الشباب والعافیة" (دو چیزوں کی قدر وہی پہچانتا ہے جو انھیں کھو بیٹھتا ہے، شباب اور عافیت)۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

روزی اور زندگی

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کی روزی اور زندگی میں ایک بڑا گہرا اور بنیادی رابطہ پایا جاتا ہے۔ روزی قوام زندگی ہے اور روزی کے بغیر زندگی کا تصور ایک عقلی امکان ہے جس کے منزل وقوع تک پہونچنے کے امکانات بہت ضعیف ہیں۔

قرآن مجید نے بھی اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف مقامات پر روزی اور زندگی کے مسئلہ کو ملا کر پیش کیا ہے۔ سورۂ مبارکہ لقمان کی آخری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"وماتدری نفس ماذا تکسب غدا وماتدری نفس بأی ارض تموت۔"

"کسی شخص کو نہیں معلوم ہے کہ وہ کل کیا کمائے گا اور کسی نفس کو نہیں معلوم ہے کہ اسے کہاں موت آجائے گی۔"

اس نے ایک مقام پر موت کو حتمی قرار دیا ہے "کل نفس ذائقة الموت" تو دوسرے مقام پر روزی کو یقینی قرار دیا ہے "مامن دابة فی الارض الاعلی اللّٰہ رزقھا"۔

مولائے کائناتؑ نے بھی رزق کے مسئلہ کو سمجھانے کے لئے موت کو ذریعہ قرار دیا ہے کہ اگر تمھارا خیال یہ ہے کہ کمرہ کے اندر بند ہو کر دروازہ کے مقفل کر لینے والے تک رزق نہیں پہونچ سکتا ہے تو پھر موت بھی نہیں پہونچ سکتی ہے کہ دونوں کام دو فرشتوں کے حوالے کر دئے گئے ہیں۔ ایک کا کام ہے روزی پہونچانا اور دوسرے کا کام ہے روح قبض کرنا۔ اگر دروازہ مقفل ہو جانے کی بنا پر ایک فرشتہ کا داخلہ ممکن

نہیں ہے تو پھر دوسرے کا داخلہ بھی ممکن نہیں ہے۔

روزی اور زندگی کے اسی تلازم کا نتیجہ ہے کہ انسان کے ذہن پر ہمیشہ یہ دونوں خوف مسلّط رہتے ہیں۔ کبھی انسان موت کے خوف کی بنا پر غلط کام انجام دیتا ہے اور کبھی روزی کے خوف کی بنا پر۔

میدان جنگ سے فرار کرنے والوں کے ذہنوں پر موت کا خوف مسلّط رہتا ہے اور میدان زندگی میں بے شمار حرام کرنے والوں کے پاس روزی کا بہانہ رہتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں بھی جب کسی حکومت جور کے خلاف اقدام کرنے کا ذکر آتا ہے تو ہر شخص کو اپنی زندگی پیاری ہو جاتی ہے اور اس کی نگاہ کے سامنے فرشتۂ موت گردش کرنے لگتا ہے اور جب علم دین کے حاصل کرنے کا سوال اٹھتا ہے تو مستقبل کی تاریکی میں روزی روٹی کی شکل دھندلی ہو جاتی ہے۔

دین اسلام نے ان دونوں مسائل کو ایک شہید راہ خدا کی قربانی اور اسکے اجر و ثواب کے ذیل میں حل کر دیا۔ "خبردار ہماری راہ کے شہیدوں کو مُردہ تصوّر نہ کرنا۔ یہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں رزق پا رہے ہیں۔"

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا کہ دنیا والوں کے اختیار میں نہ رزق ہے اور نہ زندگی۔ وہ اگر قتل بھی کر دیں تو پروردگار نئی زندگی دے سکتا ہے اور وہ اگر زندگی کا راستہ بھی بند کر دیں تو رزق کا راستہ بند نہیں ہو سکتا ہے۔ بات صرف اعتبار کی ہے اور اس کا پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔

قرآن کریم نے اپنے نیک بندوں کو وقت آخر نفس مطمئنہ کہہ کر خدا کی بارگاہ میں آنے کی دعوت دی ہے تاکہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ افراد کسی طرح کی غلط فہمی اور تشکیک کا شکار نہیں ہے۔ ان کا نفس ہر اعتبار سے مطمئن ہے۔ انھیں کوئی ابلیس نہ زندگی کے شبہ میں مبتلا کر سکتا ہے اور نہ رزق کے شبہ میں۔

نفس مطمئنہ کتنا بڑا کمال ہے جو راہ خدا میں قربانی دینے والا حاصل کر لیتا ہے۔

اس کا اندازہ قرآن مجید کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ جب خلیل خدا نے مُردوں کو زندہ کرنے کے منظر کے دیکھنے کی خواہش کی اور پروردگار نے فرمایا کہ "کیا تمھیں ہماری قدرت پر اعتبار نہیں ہے؟"۔ تو خلیل اللہ نے عرض کی کہ "خدایا! ایمان تو ہے" ولٰکن لیطمئن قلبی" میں اطمینان قلب چاہتا ہوں۔

گویا اطمینان قلب اتنا عظیم مرتبہ ہے جس کی خلیل خدا آرزو کرتا ہے اور شہیدِ راہِ خدا اس منزل کو حاصل کر لیتا ہے اور بات بالکل واضح بھی ہے کہ اطمینان کی آرزو وہاں ہوتی ہے جہاں دوسرے مُردہ کے زندہ ہونے کا یقین مطلوب ہوتا ہے اور اطمینان کا حصول وہاں ہوتا ہے جہاں شہادت کے بعد اپنی زندگی کے دوبارہ حصول کا یقین ہوتا ہے۔

ــــ نفس مطمئنہ کی عظمت کے ادراک کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ علماء نفس کے قول کے مطابق نفس کا پست ترین درجہ "نفس امّارہ" ہے جہاں نفس انسان کو ہر طرح کی بُرائی کا حکم دیتا ہے اور اسے مستقل طور پر گمراہ کرنے پر لگا رہتا ہے۔ اس سے بالاتر مرتبہ "نفس لوّامہ" کا ہے جہاں نفس بُرائیوں کا حکم دینے کے بجائے بُرائیوں پر ملامت کرتا ہے اور اسے خیر و شر کا مکمّل احساس دلاتا رہتا ہے۔

"نفس مطمئنہ" کا مرتبہ ان دونوں سے بالاتر ہے جہاں صرف ملامت نہیں ہوتی ہے بلکہ بُرائی کا مکمل ادراک بھی ہوتا ہے اور مکمل اجتناب بھی کہ انسان انجام سے مکمّل طور پر مطمئن ہوتا ہے اور اسی کی روشنی میں قدم اٹھاتا ہے۔

جناب یوسفؑ زلیخا کے مکر و فریب سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل گئے اور اپنے دامن عصمت کو کسی اعتبار سے داغدار نہیں ہونے دیا لیکن اسے اپنے نفس کا کمال نہیں قرار دیا بلکہ فرمایا "وما ابرئ نفسی ان النفس لامّارة بالسوء الا ما رحم ربّی" میں اپنے نفس کو بھی مستثنیٰ نہیں کرتا ہوں۔ نفس کا کام ہی بُرائیوں کا حکم دینا ہے جبتک رحمت پروردگار شامل حال نہ ہو جائے ــــ گویا جناب یوسفؑ کا اپنی عصمت کو بچا لینا ان کی عصمت کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ پروردگار کی رحمت کا کرشمہ ہے۔

نفس کے بارے میں جب جناب یوسفؑ جیسا پاکیزہ کردار انسان اس طرح کا بیان دے تب اندازہ ہوتا ہے کہ نفس مطمئنہ کس عظیم ترین منزل کا نام ہے اور اللہ کی راہ میں قربانی دینے والے کس منزل کمال پر فائز ہوتے ہیں۔ یوسفؑ اپنے کردار کو بچا لیتے ہیں ــــ اور شہیدِ راہِ خدا وہب۔ زہیر اور حُر کو کردار کے راستہ پر کھینچ لیتا ہے۔

ــــ نفس مطمئنہ کی قربانی کا پہلا انعام حیات جاودانی اور رزق صحت و عافیت ہے کہ سرہائے شہداء کربلا سے شام تک لے جائے جائیں اور اجسام مقدسہ جلتی ریت پر دھوپ میں پڑے رہیں اور کسی طرح کی خرابی نہ پیدا ہونے پائے بلکہ مشک و عنبر جیسی خوشبو کا احساس کیا جائے۔ یہ زندگانی نہیں ہے تو اور کیا ہے اور زندگی کا اس سے بالاتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

زہد

زہد انسانی زندگی کی بہترین صفت ہے جسے مختلف حلقوں میں مختلف نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس کی عظمت و اہمیت سے باخبر ہیں اور اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بعض اس کی عظمت و اہمیت سے بے خبر ہیں اور اسے استہزاء اور تمسخر کا موضوع خیال کرتے ہیں۔

میرے خیال میں یہ اختلافِ ردِعمل اختلافِ نظریات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اختلافِ مفہوم کا نتیجہ ہے۔ جس نے زہد کو جیسا سمجھا اور جس انداز سے اس کی تفسیر کی اس کے یہاں ویسا ہی ردِعمل پیدا ہوا۔

زہد کو ترک دنیا اور ترک لذّات سے تعبیر کرنے والوں نے اس کا مذاق اڑایا اور اسے زندگی کو موت میں تبدیل کر دینے کے مرادف قرار دے دیا لیکن زہد کی حقیقت سے آشنا افراد نے اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور انسانی زندگی کا سب سے بڑا کمال قرار دیا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے آیات و روایات کی روشنی میں زہد کے معنی کا تعین کیا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ اس کی حیثیت کیا ہے اور وہ انسانی زندگی میں موت کی علامت ہے یا حقیقی زندگی کی علامت ہے۔

۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے "تاکہ تم جو چیز ہاتھ سے نکل گئی ہے اس کا افسوس نہ کرو اور جو چیز ہاتھ آگئی ہے اس پر مغرور نہ ہو جاؤ۔ (سورۂ حدید)

روایات میں اس فقرہ کو زہد کی تفسیر قرار دیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ زہد ترک دنیا نہیں ہے بلکہ حصول دنیا پر ترک غرور و استکبار ہے اور یہ انسانی زندگی کی عظیم ترین صفت ہے۔

۔ حضور اکرمؐ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر عثمان بن مظعون نے دن دن بھر روزہ اور رات رات بھر نماز کا عمل شروع کر دیا اور گھر بار کی طرف سے غافل ہو گئے تو ان کی زوجہ نے سرکار دو عالمؐ سے اس صورت حال کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا "خبردار! مجھے اللہ نے

رہبانیت کا پیغامبر نہیں بنایا ہے بلکہ نہایت درجہ آسان اور مہربان شریعت کا حامل قرار دیا ہے"۔

۔ مولائے کائناتؑ کا ارشاد ہے" دنیا میں انسانوں کی تین قسمیں ہیں زاہد۔ صابر۔ راغب ۔ زاہد وہ ہے جو نہ متکبر ہوتا ہے اور نہ مایوس۔ مل جائے تو مغرور نہیں ہوتا ہے اور نہ ملے تو مایوس نہیں ہوتا ہے"۔

۔ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں" زہد یہ ہے کہ امیدیں کم ہوں۔ نعمتوں کا شکریہ ادا کیا جائے اور محرمات سے پرہیز کیا جائے"۔

۔ سفینۃ البحار میں حضرت عیسیٰ بن مریم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ "میرے حوارئین! میری غذا وہ گھاس ہے جو زمین سے اُگتی ہے اور میرا مشروب فرات کا پانی ہے۔ میرا پیالہ میرا چلو ہے اور میرا چراغ میرا چاند۔ میرا فرش خاک ہے اور میرا لباس بال۔ نہ کوئی فرزند ہے جس کے مرنے کا خیال ہو۔ نہ کوئی عورت جس کا حزن و ملال ہو۔ نہ کوئی گھر ہے جس کے گر جانے کا خطرہ ہو اور نہ کوئی مال ہے جس کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ بتاؤ مجھ سے بڑا غنی اور بے نیاز کون ہے"۔

۔ انبیاء کرامؑ کی سیرت میں یہ بار بار نقل کیا گیا ہے کہ سب کا لباس بال کا تھا تو سب کی غذا نانِ جَو تھی۔ حد یہ ہے کہ جناب سلیمان کی غذا بھی نانِ جَو تھی اور رات کو رات بھر مصلّے پر کھڑے ہو کر صبح کر دیا کرتے تھے۔

۔ خود امیر المومنینؑ اپنی چادر کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس میں اسقدر پیوند لگوائے ہیں کہ اب رفوگر کو دیتے ہوئے شرم آتی ہے۔

ان تمام باتوں کا مقصد یہ تھا کہ انسان گذرگاہ کو گذرگاہ ہی سمجھے اور منزل نہ سمجھ لے۔

ایک شخص نے امیر المومنینؑ کے گھر کی بے سروسامانی دیکھ کر افسوس کیا کہ اب تو بیت المال آپ کے قبضہ میں ہے۔ اب تو کچھ سامان فراہم کر لیں؟

فرمایا، میرے پاس سامان بہت ہے۔ لیکن میں نے سب اس گھر میں رکھوا دیا ہے جہاں رہنا ہے۔ اس گھر میں رکھنے سے کیا فائدہ ہے جہاں سے کل چلا جانا ہے۔

یہ تمام باتیں اپنے مقام پر ہیں لیکن زہد کی حقیقی ترین اور واضح ترین تعریف وہی ہے

جو مولائے کائناتؑ نے دو لفظوں میں بیان فرمائی ہے اور اپنے پورے کردار میں اسکی وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں " زہد یہ نہیں ہے کہ تم کسی شے کے مالک نہ ہو۔ زہد یہ ہے کہ کوئی شے تمہاری مالک نہ بننے پائے"۔ یعنی بہترین انسان وہ ہے جو کروڑوں کا سرمایہ رکھ کر سرمایہ کو اپنے اشاروں پر چلائے نہ کہ صاحبِ دولت خود دولت کے اشاروں پر چلنے لگے۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد کرسی کو اپنا تابع رکھے نہ کہ اپنی زندگی کو کرسی کا پابند بنا دے۔ بہترین مکان میں رہے لیکن مکان پر اس کے کردار کی چھاپ ہو۔ اس کی زندگی پر محل۔ حویلی۔ بلڈنگ اور قصرِ شاہی کی چھاپ نہ ہو۔ اتنی جرأت کردار پیدا کر لے تو انسان کو ہر مال دنیا سے بہرہ مند ہونے کا حق ہے اور ایسی جرأت کردار نہ ہو تو نانِ خشک پر گذارا کر لینا ہی بہتر ہے۔ مبادا کہ مال دنیا مآل کی بربادی کا سبب بن جائے۔

۔ مولائے کائناتؑ اور ائمہ طاہرین کی زندگیاں اسی زہد کا نمونہ تھیں۔ وہ کوفہ میں حکومت کریں یا شام کے زندان میں رہیں۔ بغداد کے قید خانہ کی زندگی گذاریں یا خراسان کے ولیعہد ہو جائیں حالات ان کے کردار میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتے اور نہ دنیا ان کے کردار پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

۔ زہد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انسان کے قبضہ میں مال دنیا رہے لیکن انسان کے دل میں حُبِّ مال نہ رہے۔ انسان دنیا کا صاحب اقتدار ہو لیکن دنیا وسیلۂ حیات ہو، مقصدِ زندگی نہ ہو۔ ساری دنیا قبضہ میں آجائے تو غرور نہ پیدا ہو بلکہ ابو تراب ہی رہے اور ساری دنیا منحرف ہو جائے تو کسی طرح کے صدمہ کا شکار نہ ہو بلکہ نفس مطمئن ہی رہے۔

۔ پیغمبر اسلامؐ کا یہ زہد کائنات سے بالاتر ہے کہ ۹ ازواج کے درمیان رہے لیکن یہ سارا مجمع مل کر نماز شب سے غافل نہ بنا سکا اور تا حیات نماز شب کو بطور واجب انجام دیتے رہے جب کہ عام طور سے ایک زوجہ کا منھ دیکھ کر انسان کی نماز صبح تک خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔!

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

سیادت

مثل مشہور ہے کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی ہیں۔ یہ کائنات ایک ہی پروردگار کی بنائی ہوئی ہے لیکن اس کی صنعت کسی مشین کی کاریگری نہیں ہے کہ تمام مصنوعات ایک ہی شکل، ایک ہی انداز اور ایک ہی قدر و قیمت کی ہوں۔ اس کی خالقیت حکمت و عدالت و مصلحت کا مرقع ہے لہٰذا اس کی تمام مخلوقات میں کمال حکمت و عدالت کو تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن یکسانیت اور یکرنگی کو تلاش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اس کائنات کو ایک "گلدستۂ صد رنگ" بنایا ہے اور ہر رنگ میں اپنی حکمت و مصلحت کا جلوہ نمایاں کر دیا ہے۔

کائنات کی اس رنگا رنگ محفل میں بلند ترین اشیاء کا وجود بھی پایا جاتا ہے اور پست ترین اشیاء کا بھی۔ پست ترین کو بلند ترین کے مقابلہ میں پست ترین کہا جاتا ہے ورنہ اپنے مقام پر وہ بھی صنعت صانع کا ایک بہترین مرقع ہے۔

پتھر جواہرات کے مقابلہ میں بے قیمت ہو سکتا ہے لیکن ذاتی طور پر وہ کائنات کی ایک عظیم ترین ضرورت ہے۔ یہ سر بفلک پہاڑ نہ ہوتے تو زمین اپنی جگہ سے کھسک جاتی اور جواہرات کا وجود بھی قائم نہ رہ سکتا۔

پانی سونے کے مقابلہ میں ارزاں ہے لیکن اپنے مقام پر قوام حیات ہے کہ سونے کے بغیر سارا معاشرہ زندہ رہ سکتا ہے اور پانی کے بغیر ایک فرد کی بقا بھی ممکن نہیں ہے۔ ساری کائنات کے تفاضل کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ عالم انسانیت میں بھی تمام افراد ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان بھی تفاوت اور تفاضل پایا جاتا ہے۔ بعض افراد انتہائی بلند منزل کے مالک ہیں اور بعض انتہائی پست کردار کے حامل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دیگر مخلوقات

کی پستی اور بلندی کا تعلق تخلیق اور اس کی مصلحتوں سے ہے۔ لیکن انسان کی پستی اور بلندی میں کردار کا عنصر بھی شامل ہے جس نے اسے بلند یا پست بنا دیا ہے۔

قومی یا مذہبی کردار کی یہ بلندی ہی ایک وقت میں انسان کو سیادت اور سرداری کی منزل تک پہونچا دیتی ہے اور انسان اپنی قوم یا قبیلہ میں سرداری کا شرف حاصل کر لیتا ہے۔

علمائے تاریخ نے سیادت کی تاریخ میں جو فہرست مرتب کی ہے اس میں تمام مخلوقات میں سرداری، سیادت، افضلیت کا شرف حسب ذیل مخلوقات کو حاصل ہے۔

● ۔ اشجار میں سید الاشجار ۔ سدر کا درخت ہے جو مرنے کے بعد بھی کام آتا ہے۔

● ۔ جبال میں سید الجبال ۔ طور ہے۔ جسے جناب موسیٰؑ کی کلیمیت کی منزل بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

● ۔ ایام میں سید الایام ۔ روز جمعہ ہے جسے مختلف اعتبارات سے فضیلت حاصل ہے اور اسی میں مصلح عالم کے ظہور کی توقع پائی جاتی ہے۔

● ۔ مہینوں میں سید الشہور ۔ اشہر حُرُم ہیں جن میں جدال و قتال کو حرام کر کے انھیں صلح و سلامتی اور امن و آشتی کا مہینہ بنا دیا گیا ہے۔

● ۔ ملک حبش کے افراد میں سید الحبشہ ۔ جناب بلال تھے جنھوں نے اسلام میں ایک بلند درجہ حاصل کر لیا تھا اور سرکار دو عالمؐ نے انھیں اسلام کا پہلا موذن بنا دیا تھا۔

● ۔ ملک روم کے افراد میں سید الروم ۔ صہیب رومی تھے جنھیں مسلمان خلیفہ بنانے کے آرزومند تھے۔

● ۔ فارس کے افراد میں سید الفُرس ۔ جناب سلمان تھے جنھیں سرکار دو عالمؐ نے اپنے اہلبیتؑ میں شامل کر لیا تھا۔

● ۔ عرب میں سید العرب ۔ سرکار دو عالمؐ کو کہا جاتا تھا جو سید کائنات بھی تھے۔

● ۔ کلمات میں سید الکلام ہونے کا شرف ۔ قرآن مجید کو حاصل ہے جس کا جواب نہ ممکن ہو سکا ہے اور نہ ممکن ہو سکے گا۔

● ۔ قرآن مجید کے اندر سیادت کا شرف ۔ سورۂ بقرہ کو حاصل ہے جو قرآن مجید کا

سب سے بڑا سورہ ہے اور جس میں بیشتر احکام اسلامی بیان کئے گئے ہیں۔

● ۔ سورۂ بقرہ کے اندر سیادت کا درجہ آیۃ الکرسی کو حاصل ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں پچاس کلمات ہیں اور ہر کلمہ میں پچاس برکات ہیں۔

اسلام کی تاریخ کردار میں سید البشر ہونے کا شرف سرکار دو عالمؐ کو حاصل ہے۔ سید اولاد آدم مولائے کائناتؑ کو کہا گیا ہے۔ سیدۃ نساء العالمین جناب فاطمہؑ ہیں اور سیدا شباب اہل الجنۃ ان کے دونوں فرزند ہیں۔ اس کے علاوہ روایات میں امام حسینؑ کو سید الشہداء اور شہدائے کربلا کو دیگر شہدائے اسلام کے مقابلہ میں سادات شہداء کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس گھرانہ میں ہر شخص ایک مخصوص شرف سیادت کا حامل ہو۔ اس کی نسل کو سادات نہ کہا جائے گا تو کس کی نسل اور ذریت کو سیادت کا شرف حاصل ہوگا کہ سید البطحاءؑ ہونے کے اعتبار سے ہاشم کی اولاد کو سادات کا لقب دیا جاتا ہے اور سیدۃ نساء العالمین ہونے کے اعتبار سے جناب فاطمہؑ کی اولاد کو سادات کرام کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ سارا شرف سیادت آثار کردار کا نتیجہ ہے ورنہ تمام سادات کرام کردار کے اعتبار سے سادات کہے جانے کے حقدار نہیں ہیں۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

پردہ

پردہ انسانی زندگی کا ایک فطری تقاضا ہے جو ہر باشعور انسان کی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی صاحب عقل وشعور انسان ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی جہت سے پردہ کا قائل نہ ہو۔

کون ایسا صاحب دولت ہے جو اپنی دولت کو منظر عام پر لاکر رکھ دیتا ہو۔

کون ایسا مالک جواہرات ہے جو جواہرات کو سڑک پر لاکر بکھیر دیتا ہو۔

کون ایسا صاحب خانہ ہے جس کے گھر کے در و دیوار پر پردہ نہ ہو ــــ اور کون ایسا صاحب ذوق ہے جو پردہ کو وجہ زینت و آرائش تصور نہ کرتا ہو۔

پردہ صرف عورت کی زندگی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ مردوں کے ساتھ بھی ہے ورنہ سارے مرد سڑک پر برہنہ گھومتے نظر آتے اور پورا معاشرہ ایک "نیوڈ پارک" ہو کر رہ جاتا۔

دنیا میں پردہ کا جو جتنا بڑا مخالف ہے اس کے گھر میں پردہ کی اتنی ہی بھرمار ہے۔ حد یہ ہے کہ اسرار بھی پردہ میں رہتے ہیں اور حسابات بھی۔ دنیا کی بقا اسی پردہ داری میں ہے ورنہ اگر پیدا کرنے والا ہی پردہ داری کا مخالف ہو جاتا اور ہر ایک کے راز۔ ہر ایک کے عیب۔ ہر ایک کے قلبی کیفیات کو بے نقاب کر دیتا تو معاشرہ ایک دن زندہ نہ رہ جاتا اور کوئی شخص کسی کی شکل دیکھنے کا روادار نہ ہوتا۔ یہ مالک کی پردہ داری ہی ہے کہ کوئی کسی کے دل کے حالات سے باخبر نہیں ہے اور معاشرہ انتہائی سکون و آرام کے ساتھ چل رہا ہے۔

ــ اسلام نے انھیں حالات کو دیکھ کر اور انھیں فطری تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر پردہ کا حکم دیا تو اس کے حدود بھی معین کر دئے اور اس طرح معین کر دئے کہ ان میں کسی طرح کا ابہام

بھی نہ رہ جائے اور جسم کے جو حصے کھل جائیں، ان سے کوئی فساد بھی نہ پیدا ہونے پائے۔

اسلام نے پردہ کے حدود کو معین کرنے میں انسانی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور بے پردگی کے خطرات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ وہ نہ یہ چاہتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی آدھی آبادی معطل ہو جائے یا معاشرہ کا ایک پہیہ بالکل جام ہو جائے اور نہ یہ چاہتا ہے کہ ضرورت اور خواہش کا فرق مٹ جائے اور ضروریات کے نام پر خواہشات کو رواج دے دیا جائے۔ اس نے اپنے پردہ میں دو باتوں کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھا ہے:

۱۔ پردہ سے آزادی صرف ضرورت کے حدود میں دی جائے۔ زینت و آرائش کو اس سے بالکل الگ رکھا جائے۔ چنانچہ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ عورت کو اپنا چہرہ اور کلائی تک دونوں ہاتھ کھولنے کا حق ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا کوئی کام انجام نہیں دے سکتی۔ لیکن اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ چہرہ یا ہاتھ پر کسی طرح کی زینت و آرائش نہ ہو، کیونکہ زینت و آرائش زندگی کے ضروریات میں شامل نہیں ہیں۔ یہ خواہشات کا شعبہ ہے جسے معاشرہ کے درمیان آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ آخر اسی چہرہ اور ہاتھ کے کھل جانے سے مرد دنیا کے سارے کام انجام دیتا ہے یا نہیں۔؟ تو پھر عورت ہی کے کاروبار میں آرائش اور میک اپ کیوں شامل کیا جائے۔ میک اپ عورت کے کام کی رفتار بڑھانے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ مردوں کے کام کی رفتار کم کرنے کا ذریعہ ہے جس کا تجربہ تمام آزاد معاشروں میں ہو چکا ہے اور برابر ہو رہا ہے۔

۲۔ پردہ کو نظر انداز کرتے وقت عورت کو معاشرہ کے حالات پر بھی نظر رکھنی چاہئے، مبادا کہ معاشرہ ہوسناکی کا شکار ہو جائے اور بے پردگی عورت کے لئے وبال جان بن جائے۔ بلکہ پورے معاشرہ کے امن و سکون کے لئے خطرہ بن جائے جس کا تجربہ یورپ اور امریکہ کے معاشرہ میں کیا جا چکا ہے اور کبھی کبھی مسلمان ملکوں کے اخبارات میں بھی ایسی خبریں چھپ جاتی ہیں کہ دریا کنارے عورت کو نیم برہنہ دیکھ کر مرد اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اور اس نے بدترین فعل انجام دے دیا اور عدالت میں صاف صاف کہہ دیا کہ قصور میرا نہیں ہے۔ قصور اس برہنگی کا ہے ورنہ میری جگہ مجسٹریٹ صاحب بھی ہوتے اور ان میں زندگی کی حرارت اور جوانی کا جوش ہوتا تو

اسی طرح کے عمل کا ارتکاب کرتے۔

ـ بے پردگی فطری عمل نہیں ہے لیکن بے پردہ اور برہنہ عورت کو دیکھ کر اعصاب میں تشنج اور اعضاء میں حرکت پیدا ہو جانا فطری عمل ہے جس کی طرف ہر صاحب ہوش کو متوجہ رہنا چاہیئے۔

ـ پردہ کے بارے میں ایک تصور یہ بھی ہے کہ پردہ دار عورت دنیا کا کاروبار نہیں کر سکتی ہے اور وہ ایک عضو معطل ہو کر رہ جاتی ہے؟ ـ یہ بات اوّلاً تو اسلامی پردہ سے الگ ایک شے ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ ہی ایک پردہ دار خاتون کی تجارت سے شروع ہوئی ہے لہذا اسلام اس بات کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہے کہ پردہ دار عورت کاروبار نہیں کر سکتی ہے۔ عورت باعزت رہ کر کوئی بھی کاروبار کر سکتی ہے۔ اسلام اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتا ہے۔ البتہ اسلام اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا ہے کہ مال کے کاروبار کو وسیلہ بنا کر عزت و آبرو کا کاروبار شروع کر دیا جائے۔ جس طرح آجکل بعض مسلمان ملکوں میں دیکھا جا رہا ہے کہ روس سے آزاد ہونے والی جمہوریتوں کی عورتیں تجارت کو بہانہ بنا کر مسلمان ملکوں میں سامان لے کر آجاتی ہیں اور اس کے بعد پھر اپنے جسم کی کھُلم کھُلا تجارت شروع کر دیتی ہیں اور یہ سب بے پردگی کے وسیلہ سے ہو رہا ہے۔ ورنہ اگر اسلامی حجاب کی رعایت کی جاتی تو ہرگز یہ بدترین صورت حال دیکھنے میں نہ آتی۔

ـ معاشرہ میں پردہ کی بات تو الگ ہے۔ وہ تو عقل و فطرت سلیم کا تقاضا ہے۔ اسلام نے تو اس وقت بھی پردہ کا خیال رکھا ہے جب عورت تنہائی میں۔ بند کمرہ میں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑی ہوتی ہے اور نماز ادا کرنا چاہتی ہے اور اسلام اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ مکمل حجاب کے ساتھ مصلّیٰ پر آئے اور ہرگز کوئی جسم کا غیر ضروری حصہ کھُلنے نہ پائے تاکہ عورت کو یہ احساس پیدا ہو کہ پردہ صرف خطرات سے بچانے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ عزّت و کرامت و شرافت و حشمت میں اضافہ کا ذریعہ بھی ہے اور پروردگار اس پردہ کے ذریعہ اسے عظمت ہی دینا چاہتا ہے۔ اسکی عزّت و عظمت کو کم نہیں کرنا چاہتا ہے۔

ـ یہ اسلام کی انتہائی متوازن تعلیم ہے کہ اس نے پروردگار کے سامنے آنے والی عورت

کو سراپا حجاب بنا دیا اور شوہر کے سامنے آنے والی عورت کو سراپا تسلیم بنا دیا تاکہ عورت کو یہ احساس رہے کہ اسلام کا حکم حجاب اس کی زندگی کی رعنائیوں کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ البتہ وہ ان رعنائیوں میں خیانت کی اجازت نہیں دیتا ہے بلکہ جس کا مال ہے اسی کے حوالہ کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کے حکم حجاب کے جزئیات پر نظر کی جائے تو اس کے قانون کی حکمت و ہمہ گیری کا مکمل اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ـ اگر اسلام تنہائی میں پیشِ پروردگار حاضر ہونے کے لئے عورت کو با حجاب بنانا چاہتا ہے تو وہ کس طرح راضی ہو سکتا ہے کہ عورت مسجد۔ امام بارگاہ یا مجالس عزا میں بے حجاب ہو کر شرکت کرے اور اپنی عظمت و کرامت کو تباہ و برباد کر دے بلکہ محلہ والوں کو عزاداری کو بھی وسیلہ بے حجابی خیال کرنے کا موقع دیدے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

حجاب کی ادبی حیثیت

ادبی دنیا میں حجاب کے بارے میں دو طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں:

۱۔ بعض شعراء نے اسے عورت کے حُسن کا اضافہ قرار دیا ہے کہ حجاب عورت کو باوقار اور باعزّت وعظمت بنا دیتا ہے۔ پردہ دار خاتون کا احترام انسان کے دل میں بے پردہ خاتون سے یقیناً زیادہ ہوتا ہے۔ پردہ عورت کے حُسن کی طرف سے حُسن ظن کا باعث ہوتا ہے اور پردہ ماورا حجاب حُسن کی جستجو کو دوبالا کر دیتا ہے۔

۲۔ لیکن بعض شعراء نے اس کے برخلاف اپنے محبوب کو سر عام تماشا بنانا ہی پسند کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ اس قدر حسین صنعت الٰہی کے حسن کا تقاضا یہ ہے کہ اسے منظر عام پر لایا جائے۔ یہ عورت کے ساتھ ظلم عظیم ہے کہ بدصورت مردوں کو آزاد بنا کر معاشرہ میں لایا جائے اور حسین وجمیل چہروں کو نقاب کے اندر بند کر دیا جائے یا انھیں چادر کی چار دیواری میں محبوس کر دیا جائے۔

ان تمام شاعرانہ بحثوں سے قطع نظر جب ادبی دنیا میں عورت کی حیثیت پر نظر کی جاتی ہے تو اس مسئلہ کا خود بخود فیصلہ ہو جاتا ہے کہ عورت کے حق میں حجاب اور پردہ زیادہ مناسب ہے یا اس کا بے حجاب ہونا ہی سماج اور معاشرہ کے لئے بہترین عمل ہے۔

ادبی دنیا میں عورت کے نمایاں اجزاء بدن کا یوں تجزیہ کیا گیا ہے کہ اس کی آنکھوں کو جادو قرار دیا گیا ہے اور اس کی زلفوں کو جال یا زنجیر سے تعبیر کیا گیا ہے:

زُلف کا عکس لیا چشمِ تمنائی نے
جال خود اوڑھ لیا آہوئے صحرائی نے

عورت کے رخسار کو شعرائے کرام نے مصحف سے تعبیر کیا ہے اور مصحف عارض

اس کے لئے ایک محاورہ ہو گیا ہے۔

اگر یہ تعبیرات صحیح ہیں اور ان کے پیچھے کوئی فکر اور شعور کام کر رہا ہے تو ہر صاحب عقل اس حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے کہ جادوگر کو معاشرہ سے الگ رہنا چاہیئے۔ ورنہ کسی وقت بھی معاشرہ "سحر زدہ" ہو سکتا ہے۔ جادو سے بچنے کا منتر ہر ایک کو نہیں آتا ہے۔ اگرچہ پروردگار نے انسان پر یہ کرم کیا ہے کہ نگاہوں کو ٹکراؤ سے بچانے کے لئے دونوں طرف پلکوں کی دیواریں اٹھا دی ہیں تاکہ "یاجوج وماجوج" آبادی کے اندر فساد نہ پھیلا سکیں۔ لیکن انسان کی نفسیاتی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ وہ عورت کے جادو کو دیکھنے کے بعد اسقدر بیخود ہو جاتا ہے کہ پلکوں کو بند کرنا بھی بھول جاتا ہے۔

ایسے ہی خطرات کے پیش نظر دین اسلام نے حجاب کا حکم دیا تھا تاکہ سماج کو اس مہلک صورت حال سے بچایا جا سکے جہاں انسان اپنی قوت ارادی سے محروم ہو جائے اور ایک "سحر زدہ" آدمی کی طرح دوسروں کے اشاروں پر کام کرنے لگے۔

یہی حال زنجیر اور جال کا ہے کہ اسے پوشیدہ نہ رکھا جائے تو کوئی شخص بھی اس میں گرفتار ہو سکتا ہے اور اس طرح اپنی حیثیت اور شخصیت سے محروم ہو سکتا ہے۔

مصحف کے لئے اگرچہ غلاف سے باہر رہنا کوئی عیب نہیں ہے اور اسے پردہ سے آزاد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تلاوت کے آداب میں طہارت شامل ہے۔ جب تک انسان کی نظر میں پاکیزگی نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک اسے مصحف پر نظر کرنے یا اس کی تلاوت کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور مس کرنے کے لئے تو صاف اور واضح اعلان ہے کہ مصحف کو "مُطہّرون" کے علاوہ کوئی مس نہیں کر سکتا ہے اسی لئے اسلام نے رشتۂ ازدواج رکھا ہے جو انسان کو خاطر خواہ طہارت نفس عطا کر کے مصحف کو مس کرنے کا جواز بھی عطا کر دیتا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ لوگ لفظی دنیا میں حسین ترین تعبیرات ڈھونڈھ کر لے آتے ہیں اور عملی دنیا میں اپنے ہی فلسفہ سے غافل ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کے اوہام وخرافات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عورت کے وجود کو اس قدر تقدّس بخشا گیا ہے تو اس کے تقدس کا احترام بھی ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے رخساروں کو مصحف سے تعبیر کیا جائے اور اسے

"کوڑہ دانوں" کے حوالے کردیا جائے اور اس پر کبھی کافرانہ نگاہیں پڑیں اور کبھی منافقانہ نظریں۔

حجاب عورت کی زندگی کا مقدس ترین پہلو ہے جس سے بدکاری اور فحاشی کو رد کیا جاسکتا ہے اور اس سے زندگی کے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

اسلام کا مقصد عورت کے وجود کی بیکاری نہیں ہے۔ اس کا مقصد بدکاری سے اس کا تحفظ ہے اور دور سے اس کی عظمت و حشمت کا اعلان ہے تاکہ کسی بیمار دل میں طمع نہ پیدا ہونے پائے اور یہ طمع عملی دنیا میں آکر معاشرہ کو تباہ و برباد نہ کرنے پائے۔

مومن اور مصائبِ دنیا

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خاصانِ خدا کو دنیا کے تمام مصائب سے محفوظ اور ہمہ وقت خدا کی امان اور پناہ میں رہنا چاہیئے اور ساری آفات و بلیات کا رخ کفار و مشرکین کی طرف ہونا چاہیئے۔ لیکن اسلامی روایات نے صاف واضح کردیا ہے کہ پروردگار انسان کا امتحان بقدرِ درجات لیتا ہے اور انسان کو درجات بقدرِ امتحان دیتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو منصب امامت کا ذمہ دار اس وقت تک نہیں بنایا جبتک امتحان خلت میں مکمل کامیابی حاصل نہیں کرلی اور ہر محاذ زندگی کو صبر و سکون اور شکر و تحمل کے ساتھ طے نہیں کرلیا۔

مومن کی زندگی میں مصائب عطیۂ پروردگار اور دلیل عظمت ہیں اور انھیں مصائب پر صبر کرکے انسان اس قابل ہوتا ہے کہ پروردگار اس کے ساتھ ہوجائے اور وہ ساری دنیا کی امداد سے بے نیاز ہوجائے۔

مومن اور مصائب کے رابطہ کے بارے میں درج ذیل روایات قابل توجہ ہیں:

- "لایزال الهمّ والغم بالمومن حتی لایدع له ذنبًا"۔ مومن کے ساتھ ہم و غم اس وقت تک رہتے ہیں جب تک اس کے گناہوں کا خاتمہ نہ ہوجائے۔
- "کلما ازداد العبد ایمانا ازداد ضیقًا فی معیشته"۔ (امام صادقؑ) جس قدر انسان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اس کی معیشت کی تنگیاں بڑھتی جاتی ہیں۔
- "انما یبتلی المومن فی الدنیا علیٰ قدر دینه"۔ (امام باقرؑ) مومن کے مصائب کی مقدار اس کے ایمان کی مقدار سے طے ہوتی ہے۔

• "المومن لایمضی علیہ اربعون لیلۃ الا وعرض لہ امر یحزنہ یذکّر بہ۔"
(امام صادقؑ)

جب بھی مومن پر چالیسؔ روز گذر جاتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی رنج میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ خدا کو یاد کر سکے۔

• "ان المومن لوکان فی جحر ضب لسلّط اللہ علیہ من یوذیہ"۔ مومن جانور کے سوراخ میں بھی ہو تو اس پر کوئی نہ کوئی اذیّت دینے والا ضرور مسلّط ہو جائے گا۔

• "ان اللہ لیتعاھد عبدہ المومن بالبلاء کما یتعاھد ھٰذا الطبیب المریض بالدواء"
پروردگار بندۂ مومن کو بلاؤں میں اسی طرح مبتلا کرتا ہے جس طرح طبیب مریض کا علاج دواؤں کے ذریعہ کرتا ہے۔

• "ان اللہ اذا احب عبداً ابتلاہ لیسمع تضرّعہ"۔ پروردگار جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ اس کی آواز گریہ وزاری سُن سکے۔

• "ان اللہ یقول وعزتی وجلالی لا اخرج عبداً من الدنیا وانا ارید ان ارحمہ حتی استوفی منہ کل خطیئتہ عملھا اما بسقم فی جسدہ او بضیق فی رزقہ واما بخوف فی دنیاہ فان بقیت علیہ بقیۃ شددت علیہ عند الموت حتی یاتی ولا ذنب علیہ فادخلہ الجنۃ"۔ (مرسل اعظمؐ)

پروردگار عالم کا ارشاد ہے کہ میری عزت وجلال کی قسم کہ میں کسی بندۂ مومن پر مہربانی کرتا ہوں تو اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھاتا ہوں جب تک تمام گناہوں کا حساب نہ کر دوں چاہے اس کے جسم میں بیماری پیدا ہو جائے یا رزق میں تنگی ہو جائے یا دنیا میں کسی خوف میں مبتلا ہو جائے۔ اس کے بعد بھی کوئی چیز باقی رہ جائے گی تو موت کی سختی میں مبتلا ہوگا تاکہ کوئی گناہ باقی نہ رہ جائے اور سیدھے جنت میں داخل ہو جائے۔

• "اذا اراد اللہ بعبد خیراً فاذنب ذنباً اتبعہ بنقمۃ وذکرہ الاستغفار"۔
پروردگار جب کسی بندہ کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اور وہ گناہگار ہو جاتا ہے تو پروردگار اسے کسی پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ اسے استغفار یاد آجائے اور وہ اس کی طرف

متوجہ ہو جائے۔

• "ملعون کل مال لایزکیٰ، ملعون کل جسد لایزکیٰ ولو فی اربعین یوم مرۃ۔ فقیل یا رسول اللہ اما زکوٰۃ المال فقد عرفناھا فما زکوٰۃ الاجساد فقال لھم ان تصاب بآفۃ"۔

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ نہ نکالی جائے وہ مال بھی ملعون ہے اور جس بدن کی زکوٰۃ نہ ادا کی جائے وہ بدن بھی ملعون ہے ـــــ سوال کیا گیا کہ زکوٰۃ مال کا مفہوم تو واضح ہے یہ زکوٰۃ بدن کیا ہے؟ ـــــ فرمایا کہ بدن کی زکوٰۃ آفتوں میں مبتلا ہونا ہے۔

"من صفت لہ دنیاہ فاتھموہ فی دینہ"۔ جس کی دنیا مصائب اور مشکلات سے پاک وصاف ہو اس کا دین مشکوک ہو جاتا ہے۔

• "مرارۃ الدنیا حلاوۃ الآخرۃ وحلاوۃ الدنیا مرارۃ الآخرۃ"۔
دنیا کی تلخی آخرت کی شیرینی ہے اور دنیا کی شیرینی آخرت کی تلخی ہے۔
(التکامل فی الاسلام جلد سوم)

استنتاج:

مذکورہ بالا روایات سے حسب ذیل امور کا استفادہ ہوتا ہے:

ــ مصیبت یاد پروردگار کا بہترین ذریعہ ہے اور یاد پروردگار اہم ترین شے ہونے کے اعتبار سے اس مصیبت کو بھی محبوب ترین بنا دیتی ہے جس کے ذریعہ یاد پروردگار حاصل ہوتی ہے۔

ــ مصیبت انسان کو صبر کی دعوت دیتی ہے اور صبر انسان کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ معیت پروردگار کا مستحق ہو جائے اور جس کے ساتھ پروردگار ہو جاتا ہے اس سے زیادہ عظیم تر کوئی انسان نہیں ہوتا ہے۔

ــ مصیبت تضرّع وزاری کا ذریعہ ہے اور تضرّع وزاری مومن کا وہ بہترین وسیلہ

ہے جو پروردگار کی نگاہِ کرم کو جذب کرلیتا ہے۔

۔ مصیبت انسان کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اور انسان کو بلا حساب جنت تک پہونچا دیتی ہے اور اس سے بالاتر کوئی شرف نہیں ہے جو انسان کو بے حساب جنت میں داخل کردے۔

۔ دنیا میں راحت طلبی کا خیال آخرت سے غفلت کا نتیجہ ہے اور آخرت سے غفلت انسان کو ہزاروں مصائب میں مبتلا کردیتی ہے لہٰذا انسان کے لئے اولیٰ اور افضل یہی ہے کہ مصائب دنیا کا مقابلہ کرے اور ہر طرح کی اخروی مصیبت سے نجات حاصل کرلے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

اِنّ اللّٰہ اشتریٰ من المومنین انفُسہم واَموالہم

• انسان ہر دور اور ہر معاشرہ میں بکتا رہا ہے اور اس نے مختلف انداز سے اپنی حیثیت کی تجارت کی ہے۔ صنعت کے نام پر ہنر بیچا ہے۔ ملازمت کے نام پر علم بیچا ہے۔ اُجرت کے نام پر توانائی بیچی ہے۔ اقتدار کے نام پر عزّت بیچی ہے۔ حکومت کے نام پر ایمان بیچا ہے اور ہر شخص نے حسب حیثیت اپنی قیمت لگائی ہے۔

• علم و ہنر کا خدمت خلق کے لئے صَرف ہونے کے بجائے مخصوص انسانوں کے لئے وقف ہوجانا اور تنخواہ پر کام کرنا علم و ہنر کی تجارت ہی ہے۔ ملازمت تو صرف ایک مقدس نام ہے۔

• الناس علیٰ دین ملوکہم کا مقصد ہی یہ ہے کہ سارا معاشرہ ملوکیت اور اقتدار کے ہاتھوں بِک جاتا ہے اور صاحبان اقتدار جس طرح چاہتے ہیں اسے استعمال کرتے ہیں۔

• ہمارے ملکوں کے مسلمانوں نے انگریزوں کی خوشنودی کے ہاتھوں اپنی شکل و صورت اور اپنا حلیہ و لباس تک فروخت کردیا۔

• آج ملک سے نہیں ہے لیکن بکنے والے موجود ہیں اور سستے داموں پر بِک رہے ہیں۔ دفتر کے اوقات میں نماز ترک کردینا تنخواہ کے ہاتھوں بندگی کی تجارت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

• دوست احباب کی مروّت میں حرام کام انجام دینا یا سوسائٹی میں رہنے کے لئے ڈاڑھی منڈا دینا صحبت اور معاشرہ کے ہاتھوں اصول کی تجارت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

• انسان ایمان سے خالی ہوجاتا ہے تو جمادات سے لے کر سماوات تک ہر قیمت پر بک جاتا ہے۔ کوئی جواہرات جیسے جمادات کے ہاتھوں بکتا ہے اور کوئی ستاروں اور سماوات کے ہاتھوں۔ یہ صرف صاحب ایمان ہے جو اپنی قدر و قیمت پہچانتا ہے اور دنیا کی کسی دولت یا طاقت

کے ہاتھوں بکنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔

• امیرالمومنینؑ کا یہ ارشاد گرامی کہ "اگر مجھے ساتوں اقلیموں کی بادشاہت دیدی جائے اور مجھ سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ میں ایک چیونٹی پر ظلم کروں اور اس کے منھ سے وہ دانہ یا چھلکا چھین لوں جو اس نے اپنی غذا کے لئے فراہم کیا ہے تو یہ میرے امکان سے باہر ہے"۔ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان اقالیم سبعہ کے عوض بھی نہیں بیچا جا سکتا ہے اور انسان کو اپنے جوہر کردار کی قدر و قیمت کا خود اندازہ کرنا چاہیئے۔

• دینی حلقوں میں حقوق شرعیہ کی غلط تقسیم۔ اوقاف پر بیجا تصرّف، عہدوں کی نامناسب تقسیم، ہر مسئلہ میں تعلقات کی بالاتری، مدارس پر خاندانی قبضے، مساجد پر پارٹیوں کا تسلّط، انجمنوں کی صبح و شام پیداوار، مجالس و محافل میں کلمات تحسین کا نامناسب استعمال وہ امور ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ انسان کتنی قیمتوں پر ایمان و کردار کو فروخت کرسکتا ہے۔ وہ بدنصیب پھر بہتر تھا جس نے اپنے نفس و ایمان کی قیمت ملک رے کی گورنری قرار دی تھی۔ یہ صاحب ایمان تو بالکل بدقسمت ہے کہ ایمان و کردار فروخت بھی کرتا ہے اور قیمت بھی حسب حیثیت حاصل نہیں کر پاتا ہے۔

• سہم مبارک امامؑ پر گذارہ کرنے والے طلاب کی تعلیم میں کوتاہی۔ سہم سادات حاصل کرنے والوں کا ضرورت سے زیادہ صَرف۔ فطرہ کا ناجائز اسٹاک کرنے والے شرعی اموال کو مختلف حیلوں سے حاصل کرنے والے۔ شرعی رقوم کو ذاتی امور پر بے تحاشہ خرچ کرنے والے سب ایمان و کردار کے تاجر ہیں اور اپنے کو سستے داموں پر فروخت کر رہے ہیں۔

• رب کریم نے انسان کو متوجہ کیا کہ تجارت تیری فطرت ہے۔ تو مفادات کے مقابلہ میں اپنے کو ضرور فروخت کرے گا لیکن تقاضائے عقل و ہوش یہ ہے کہ دو باتوں کا خیال رکھنا کس کے ہاتھ بکنا ہے اور کس قیمت پر بکنا ہے ۔ اس کے بعد خود ہی وضاحت بھی کردی کہ ہم نے صاحبان ایمان سے جان و مال کو خرید کر اس کے عوض جنت دیدی ہے تاکہ صاحب ایمان کبھی تجارت کا ارادہ کرے تو یہ نکتہ نظر میں رکھے کہ اس کے پاس ایک کائنات سے بالاتر خریدار موجود ہے اور وہ اسے قیمت میں جنّت دینے کے لئے تیار

ہے تو اب یہ انتہائی بے عقلی ہے کہ جسے جنّت جیسی قیمت مل رہی ہو وہ اپنے کو مال دنیا کے عوض بیچ ڈالے۔

• ابن سعد ملعون اور حضرت حُر کا بنیادی فرق یہی تھا کہ دونوں کے سامنے دنیا بھی آئی اور جنت بھی۔ ابن سعد نے ملک دنیا کو مقدم کر کے جنت کو نظرانداز کردیا اور حُرؑ نے جنت کو اختیار کر کے سرداری لشکر کو ٹھوکر ماردی تاکہ قیامت تک آنے والی نسلیں حریت کا راستہ دریافت کرلیں اور اب پھر کوئی ابن سعد نہ پیدا ہونے پائے۔

• صاحبان ایمان کا نفس کمزور تھا تو اس کی قیمت جنت قرار پائی جو خود بھی ایک مخلوق خدا ہے۔ لیکن جس کا نفس "کل ایمان" کا مرکز تھا اس نے جنّت کو بھی اپنی قیمت نہیں قرار دیا بلکہ اپنے کو مرضی الٰہی کے عوض فروخت کیا جو جنّت سے کہیں زیادہ بلند تر قیمت ہے اور جنت کی بھی کل حیثیت یہی ہے کہ وہ مرضی الٰہی کی ایک مصداق ہے ورنہ حور و غلمان میں کیا رکھا ہے۔

• آل محمدؐ کا انداز تجارت یہ تھا کہ جو کچھ دیا سب خدا کے ہاتھ میں دیا جس سے بہتر کوئی خریدار نہیں تھا۔ حد یہ ہے کہ روٹیاں بھی سائل کے نام پر نہیں دی ہیں۔ رضائے الٰہی کے نام پر دی ہیں "انما نطعمکم لوجه الله"۔ اسی لئے پروردگار نے روٹیوں کے بدلے سورہ دے دیا اور سعی کو مشکور قرار دے دیا۔

انسان اور ایمان

والعصر۔ ان الانسان لفی خسر۔ الا الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت۔ وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

قسم ہے عصر کی، تمام انسان خسارہ اور گھاٹے میں ہیں، علاوہ ان افراد کے جو صاحبِ ایمان ہیں۔ نیک اعمال کئے ہیں اور حق و صبر کی وصیت و نصیحت کی ہے۔

۔ آیات شریفہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خسارہ اور فائدہ کے دو الگ الگ موضوعات ہیں۔ خسارہ کا موضوع ہے انسان اور فائدہ کا موضوع ہے ایمان و کردار۔ انسان جب تک صرف انسان رہے گا خسارہ میں رہے گا اور جب صاحب ایمان و کردار ہو جائے گا تو خسارہ سے محفوظ ہو جائے گا۔

انسانیت کے نام پر ناز کرنے والے اور تمام انسانوں (مسلمان۔ کافر۔ عادل۔ فاسق۔ عالم۔ جاہل) کو برابر قرار دینے والے اس اعلان قرآنی سے عبرت حاصل کریں کہ قرآن مجید نے انسانیت کو شرف نہیں قرار دیا ہے بلکہ ایمان و کردار کو شرف قرار دیا ہے اور اس کا راز بھی یہ ہے کہ انسانیت انسان کا اختیاری عمل نہیں ہے لہٰذا اس میں اس کا کوئی دخل بھی نہیں ہے۔ یہ مالک کی ایک عنایت ہے جس پر شکریہ تو ادا کیا جا سکتا ہے لیکن فخر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فخر کا مقام اس کے بعد آتا ہے جہاں سے انسان کے اختیاری معاملات ایمان اور کردار کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور انسان اپنی محنت اور ریاضت سے اپنے مقام کا تعین کرتا ہے۔

۔ آیات شریفہ میں دوسرا اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ ہر زمانہ اس امر کا گواہ ہے کہ ہمیشہ خسارہ والوں کی کثرت رہی ہے اور اس سے نجات پانے والے اقلیت میں رہے ہیں

ایسا نہ ہوتا تو فائدہ والوں کی اکثریت کا ذکر کر کے خسارہ والوں کا استثنار کیا جاتا لیکن آیت کا لہجہ اس کے بالکل برعکس ہے اور اس میں فائدہ والوں کا استثنار کیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اکثریت خسارہ والوں کی ہے اور اس میں سے ایک اقلیت ایمان و کردار والوں کی ہے جس نے اپنے کو اس خسارہ سے بچا لیا ہے۔

۔ زمانہ کو گواہ بنا کر اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تک یہ دنیا عصر اور زمانہ کے نظام کے تحت چلتی رہے گی۔ اس کا نقشہ یہی رہے گا کہ فائدہ والے اقلیت میں رہیں گے اور خسارہ والوں کی اکثریت رہے گی۔ ہاں اگر نظام عصر کے بجائے صاحب العصر کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو نسبت اُلٹ بھی سکتی ہے اور زمانہ ظلم و جور کے بجائے عدل و انصاف سے معمور ہو سکتا ہے۔

۔ خسارہ سے استثنار کرنے کے لئے قرآن حکیم نے چار مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے، ۱۔ ایمان، ۲۔ عمل صالح، ۳۔ حق کی وصیت، ۴۔ صبر کی نصیحت ۔ اور شاید اس کا راز یہ ہے کہ انسان کو نفس و روح کے اعتبار سے صاحب ایمان ہونا چاہیئے اور جسم و جسمانیات کے اعتبار سے صاحب عمل و کردار۔ معاشرہ کی اصلاح کے لئے حق کی وصیت کرنی چاہیئے اور حق کی راہ پر استقامت کے لئے ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنی چاہیئے۔

اس نکتہ کی مزید وضاحت یہ ہے کہ فائدہ اور خسارہ کسی نہ کسی معاملہ سے متعلق ہوتا ہے جب تک انسانی زندگی میں کوئی معاملہ فرض نہ کیا جائے گا فائدہ اور نقصان کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔ قرآن حکیم نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسانی زندگی سراپا معاملہ اور تجارت ہے۔ اس کا کل سرمایہ جو اپنے ساتھ لے کر آیا ہے اس کی روح اور اس کا جسم ہے، اس کے بعد اس کی زندگی سے وہ تعلقات وابستہ رہتے ہیں جو پیدائش کے ساتھ اس کے ساتھ لگ جاتے ہیں کہ وہ ماں باپ کا فرزند ہوتا ہے اور بھائیوں بہنوں کا بھائی۔ معاشرہ کی ایک فرد ہوتا ہے اور سماج کا ایک رکن۔ ملک کا ایک باشندہ ہوتا ہے اور تعلقات کا ایک قیدی ۔ لہٰذا اس پر جس طرح اس کے روح اور اس کے جسم کی ذمہ داری ہے اُسی طرح اس کے ان تعلقات اور روابط کی بھی ذمہ داری ہے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے

کا ایک ہی راستہ ہے کہ روح کے واسطے غذائے ایمان فراہم کردے۔ جسم کو عمل صالح کی دولت دیدے۔ تعلقات عامہ والوں کو حق اور صبر کی وصیت ونصیحت کردے تاکہ جملہ حقوق ادا ہوجائیں اور ہر سودا فائدہ کا ذریعہ بن جائے ورنہ انسان پیدائشی طور پر مال کا تاجر نہیں ہوتا ہے کہ اسکے فائدہ اور نقصان کا فیصلہ مالیات کے اعتبار سے کیا جائے۔ مالیات کے اعتبار سے تو وہ بالکل خالی ہاتھ پیدا ہوتا ہے اور پھر خالی ہاتھ ہی چلا جاتا ہے۔ دنیا سے اگر کوئی دولت لیکر اپنے ساتھ لے جاتا ہے تو وہ اس کا ایمان اور کردار ہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شے کام آنے والی نہیں ہے۔

— یہ نکتہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ قرآن مجید نے خسارہ سے بچنے کا ذریعہ اسلام کو نہیں قرار دیا ہے بلکہ ایمان کو قرار دیا ہے اور اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اسلام کا تعلق روح سے نہیں ہے بلکہ درحقیقت جسم ہی سے ہے۔ انسان جب تک زبان سے حقائق کا اقرار کرتا ہے اسے مسلمان کہا جاتا ہے اور جب یہ اقرار روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے تب صاحب ایمان کہا جاتا ہے۔ خسارہ سے بچنے کا ذریعہ صرف جسم نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے روح ہے کہ جو جسم کے لئے محرک اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے بغیر جسم کی کسی حرکت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

— ایمان کے بنیاد نجات بننے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو دل کی گہرائیوں سے حقائق کا اقرار کرنا پڑے گا اور ان تمام تقاضوں پر عمل کرنا ہوگا جو ایمان حقیقی کے تقاضے ہیں اور جن کے بغیر ایمان، ایمان کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

عمل صالح درحقیقت ایمان کے تقاضوں ہی کا اظہار ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلام نے صرف اظہار کو کافی نہیں سمجھا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں عقیدہ کو لازم اور ضروری قرار دیا ہے کہ تنہا عمل صالح کسی وقت بھی اپنی اصالت اور معنویت سے محروم ہوسکتا ہے اور اس کی فعال طاقت کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ البتہ اگر اس کی پُشت پر روحانی عقیدہ کی طاقت موجود ہے تو اس کا نشاط کسی وقت بھی کمزور نہیں ہوسکتا ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اسکی حرکت وفعالیت میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

— انسان اور ایمان کے فرق کو سمجھنے کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ انسان کی دنیا الگ ہے اور ایمان کی دنیا الگ۔ انسان ایک عمر تک بچہ رہتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہوجاتا ہے اور آخر میں مرجاتا ہے۔ لیکن ایمان ایسا نہیں ہے۔ وہ بچپنے میں جوان بھی ہوسکتا ہے اور جوانی میں بوڑھا بھی۔ وہ زندگی میں مُردہ بھی ہوسکتا ہے اور مرنے کے بعد زندہ بھی۔

انسان صحتمند بھی ہوتا ہے اور بیمار بھی۔ امیر بھی ہوتا ہے اور فقیر بھی۔ عورت بھی ہوتا ہے اور مرد بھی — لیکن ایمان کی دنیا اس سے بالکل الگ ہے۔ ایمان صحت کے عالم میں بیمار بھی ہوسکتا ہے اور بیماری کے عالم میں صحتمند بھی۔ وہ امیر کے گھر فقیر بھی ہوسکتا ہے اور فقیر کے گھر امیر بھی۔ وہ عورت کے پاس مردانہ حوصلہ کا مالک بھی ہوسکتا ہے اور مرد کے پاس زنانہ کمزوریوں کا حامل بھی۔ جس کی مثالیں تاریخ اسلام میں بکثرت موجود ہیں۔ یہاں بچہ کو تصدیق رسالت کرتے دیکھا ہے اور بوڑھے کو رسالت میں شک کرتے۔ عورت کو ساری دولت لگاتے دیکھا ہے اور مرد کو میدان سے بھاگتے ہوئے۔ بیمار کو روزوں کی نذر کرتے دیکھا ہے اور صحتمند کو میدان عمل سے فرار کرتے ہوئے۔ ایسے حالات میں ایمان ہی فائدہ کی دلیل بن سکتا ہے انسان ہونا نہیں۔ انسان تو اس وقت تک خسارہ میں رہے گا جبتک صاحب ایمان وکردار نہ ہوجائے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

انسان اور شیطان

(۱)

قرآن مجید میں مختلف اشکال و الفاظ کے ساتھ انسان کا تذکرہ تقریباً ۹۰ مقامات پر ہوا ہے اور شیطان کا تذکرہ ۸۸ مقامات پر ہوا ہے۔ بلکہ اگر انسان کے تذکرہ میں لفظ انسی اور اُناسی کو الگ کر دیا جائے تو حساب بالکل برابر ہو جاتا ہے اور "من الجنّة والناس" کے کاروبار میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا ہے۔

۔ انسان اور شیطان کا سابقہ بہت پُرانا ہے۔ جس دن سے انسان کی خلقت کا اعلان ہوا ہے اسی دن سے شیطان نے اپنی مخالفت اور بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ پہلے اس کی مادۂ تخلیق کا مذاق اُڑایا کہ مٹی سے بننے والی مخلوق کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے خاک کو خاک میں مل جانا چاہیئے اسے قابل سجدہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ پھر اس کی کمسنی کا استہزا کیا کہ ایسا انسان جو ہمارے سامنے پیدا ہوا ہے اور ابھی اس کا کوئی کمال سامنے نہیں آیا ہے یہ خلافت الٰہیہ کا حقدار کس طرح ہو سکتا ہے اور اس طرح کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ اپنی مخالفت کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے اولادِ آدمؑ کو متنبہ کر دیا کہ یہ تمہارا کھُلا ہوا دشمن ہے۔ تم آدمؑ کی اولاد ہو اور یہ آدمؑ ہی کا دشمن ہے تو تمہاری کیا اوقات ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اَلَم اعهد اليكم يا بنى آدم ان لا تعبدوا الشيطٰن..." (اولادِ آدمؑ! کیا ہم نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا ہے کہ خبردار شیطان کی بندگی نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور ہماری عبادت کرتے رہنا کہ یہی صراط مستقیم ہے۔)

اس ایک اعلان سے مالک کائنات نے تین حقائق کا اعلان کر دیا:

۱۔ شیطان تمہارے بابا آدمؑ کا دشمن ہے لہٰذا تمہیں اسے اپنا دشمن قرار دینا چاہیئے اس لئے کہ لائق اولاد باپ کے دشمن کو اپنا دشمن قرار دیتی ہے اور تم آدمؑ ہی کی اولاد ہو۔ اس نکتے سے اس حقیقت کا بھی اشارہ مل جاتا ہے کہ اگر پیغمبر اسلامؐ نے اپنے کو اور علیؑ کو امت کا باپ قرار دیا ہے تو امت کا فرض ہے کہ دونوں کے دشمن کو اپنا دشمن تصور کرے اور پھر اس سے ہوشیار رہے۔

۲۔ صراط مستقیم بے عملی کا نام نہیں ہے بلکہ صراط مستقیم سراپا عمل ہے جہاں مسلسل عبادت پروردگار کرتے رہنا ہے اور ایک آن کے لئے بھی غافل نہیں ہونا ہے۔

۳۔ صراط مستقیم صرف رحمان سے تولا کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں شیطان سے بیزاری بھی ضروری ہے اور یہ بیزاری اُس تولا پر متقدم ہے کہ انسان پہلے شیطان کی عبادت سے کنارہ کشی کرے اُسکے بعد عبادت رحمان کرے ورنہ اس کے بغیر صراط مستقم کا ملنا ممکن نہیں ہے۔

تعارف شیطان

شیطان کے بارے میں حسب ذیل امور تمام عالم انسانیت پر واضح ہیں اور سب ان امور کا اقرار بھی رکھتے ہیں:

ا۔ شیطان ایک ہے مگر گمراہ کرنے کے لئے ہر جگہ پہونچ جاتا ہے۔

ب۔ شیطان غائب ہے مگر گمراہ کرتا رہتا ہے اور اسے مبین کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ج۔ شیطان عمر میں انسان سے یقیناً بڑا ہے اور اسے سن و سال کی برتری حاصل ہے۔

د۔ شیطان فطری اعتبار سے آگ سے بنا ہے لہٰذا اس کی "شعلہ مزاجی" سے کوئی شے بعید نہیں ہے اور وہ کسی گھر میں بھی آگ لگا سکتا ہے۔

ہ۔ شیطان کی جماعت انسانی گروہ کے مقابلہ میں یقیناً اکثریت میں ہے لیکن اس کے باوجود اسے حق نہیں تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ اسے ملعون قرار دیا جاتا ہے۔

و۔ شیطان اپنی اوقات کے اعتبار سے جنات میں تھا لیکن کوئی صورت نکال کر ملائکہ کی بزم میں پہونچ گیا اور اس بزم کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملعون ہو گیا۔

ز۔ شیطان ابھی تک زندہ موجود ہے لیکن کوئی اس کے بارے میں یہ سوچنے کیلئے تیار نہیں ہے کہ اب اس پر لعنت بند کردی جائے شائد اُس نے توبہ کرلی ہو بلکہ پورا عالم اسلام اُسی ہزارہا سالہ داستان کو دُہرائے جا رہا ہے اور برابر لعنت کئے جا رہا ہے۔

ح۔ شیطان بزم ملائکہ میں اس وقت تک نہیں پہچانا گیا جب تک زبان نہیں کھولی اور جب عظمت آدمؑ کے خلاف آواز بلند کی تو اس کی شیطنت پہچان لی گئی اور اسے بطور سزا مردود قرار دے دیا گیا۔

شیطانی نظریات

ا۔ شیطان توحید خالص کا نقیب ہے اور اس کا نظریہ یہ ہے کہ عبادت اور سجدہ صرف پروردگار کے لئے ہے اس کے بعد پروردگار بھی کسی کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیدے تو وہ حکم قابل قبول نہیں ہے اور ایک اصلی موحد کو اس کا انکار کر دینا چاہیئے۔

ب۔ کسی ذات کو ماننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی بات کو بھی مان لیا جائے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ پروردگار کی ذات کا اقرار کیا جائے۔ اس کی بات کا تسلیم کرنا شرط ایمان نہیں ہے۔

ج۔ عدل الٰہی کا اقرار کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ صرف توحید کا اقرار کافی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے توحید کا اقرار کر لیا لیکن عدل کے مرحلہ پر صاف کہہ دیا کہ آگ سے بننے والے کو خاک کے پُتلے کے سامنے جُھکا دینا خلاف عدل و انصاف ہے اور میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا ہوں۔

د۔ فضیلت کا فیصلہ پروردگار نہیں کرے گا بلکہ مخلوق کو خود بھی یہ طے کرنے کا حق ہے کہ کون افضل ہے اور کون غیر افضل۔

ھ۔ فضیلت کا معیار بھی ایمان و کردار کو نہیں ہونا چاہیئے بلکہ مادۂ تخلیق کو ہونا چاہیئے کہ اگر خاک سے بنا ہے تو یقیناً پست رہے گا اور اگر آگ سے بنا ہے تو یقیناً بلند رہے گا۔ عربستان کی مٹی کا اثر اور ہوگا اور غیر عرب کی خاک کا اثر اور۔ ایمان کے دس درجے بھی خاک کی تاثیر

کو نہیں بدل سکتے ہیں۔

د۔ ہوشیاری کا تقاضا یہ ہے کہ آخری دم تک پروردگار کی عظمت کا اقرار کیا جائے لیکن اس کے بنائے ہوئے خلیفہ اور حاکم کو تسلیم نہ کیا جائے۔

ز۔ مخالفت کے لئے صرف مقابل کا خطاکار یا گنہگار ہونا شرط نہیں ہے۔ ہر شخص کو اپنے مصالح پر نظر رکھنی چاہیئے اور مصلحت خطرہ میں پڑ جائے تو مخالفت کا اعلان کر دینا چاہیئے۔

ح۔ اپنے کاروبار میں کوئی مروّت نہ کرنی چاہیئے بلکہ جس طرح ممکن ہو عمل کو جاری رکھنا چاہیئے۔ کوئی انسان عقائد میں گمراہ ہو جائے تو اسے اعمال میں نہ چھوڑا جائے بلکہ مزید مصروف بنا دیا جائے۔ اور کوئی فرزند آدمؑ عقائد میں گمراہ نہ ہو سکے تو خاموش نہیں بیٹھنا چاہیئے اسے فروع دین اور اعمال کی منزل میں گمراہ کرنا چاہیئے۔

ط۔ اگر کسی بڑی محفل سے نکال دئے جاؤ تو خبردار شرمندہ ہو کر نہ بیٹھ جانا بلکہ مزید آزادی کے ساتھ کام شروع کر دینا اور اس راہ میں عظمت پروردگار کی بھی پرواہ نہ کرنا۔

ی۔ اپنی انانیت کا تحفظ بہرحال ضروری ہے اور اس پر کسی طرح آنچ نہیں آنی چاہیئے۔ پروردگار بھی کسی کے سامنے سر جُھکانے کا حکم دے تو صاف انکار کر دینا چاہیئے اور اپنی انانیت کا تحفظ کرنا چاہیئے۔

کاش امت اسلامیہ اس داستان سے عبرت حاصل کر سکے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

انسان اور شیطان
(۲)

"ألم اعهد اليكم يابني آدم ان لا تعبد والشيطان انه لكم عدو مبين وان اعبدوني هٰذا صراط مستقيم"۔

• صراط مستقیم کی علامت یہ ہے کہ شیطان سے عداوت ہو اور رحمٰن کی عبادت۔ دونوں کو جمع کرلینا بھی صراط مستقیم نہیں ہے اور دونوں سے نیوٹرل ہو جانا بھی صراط مستقیم نہیں ہے۔ صراط مستقیم کے لئے تولّائے رحمٰن بھی ضروری ہے اور برائت از شیطان بھی۔

• شیطان کی منزل "یوسوس فی صدور الناس"۔ رحمٰن کی منزل "قلب المومن عرش الرحمٰن"۔ اگر اندر رحمٰن کا گھر بن گیا تو باہر کا حملہ کامیاب نہ ہوگا۔

• شیطان کے بارے میں عقائد، ۱ ایک ہے مگر ہر جگہ ہے، ۲ غائب ہے مگر کام کر رہا ہے، ۳ عمر میں سب سے بڑا ہے مگر گمراہ ہے، ۴ اکثریت کا مالک ہے مگر ملعون ہے، ۵ شیطان نہیں تھا مگر انکار خلافت آدمؑ سے شیطان بن گیا، ۶ عدل الٰہی کا اقرار نہیں کیا تو مردود قرار پا گیا، ۷ جرم چند لمحوں کا تھا لیکن سزا ابدی ہے، ۸ جُرم خدا کا کیا لیکن لعنت بندے بھی کرتے ہیں، ۹ دشمن آدمؑ کا تھا لیکن اولاد آدمؑ کا بھی دشمن قرار پا گیا، ۱۰ خدا کا مخلص تھا لیکن جس کو سجدہ کرانا چاہا اسے سجدہ نہ کیا تو توحید خالص بھی کام نہ آئی۔

• دشمن آدمؑ کا اولاد آدمؑ کا دشمن قرار پانا دلیل ہے کہ باپ کے دشمن کو دشمن سمجھنا دلیل [illegible] ہے۔ انا وعلیؑ ابوا هٰذه الامة۔ اب دشمن نبیؐ بھی دشمن امت ہے اور دشمن علیؑ بھی۔

• شیطان نے آدمؑ سے انتقام کے بارے میں کہا کہ "لاحتنكن ذريته" میں ان کی اولاد کا گلا دبا دوں گا۔ گویا اولاد سے بدلہ لینا دلیل شیطنت ہے۔

• شیطان کی داستان سب سے پرانی داستان ہے لیکن اس کا تذکرہ ضروری ہے اور

ہر قدم پر لاحول پڑھنا بھی ضروری ہے کہ وہ لفظ ضالین میں بھی گمراہ کر سکتا ہے۔

• شیطان کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بعض اولاد آدمؑ سے بھی آدمؑ کے گنہگار ہونے کا اقرار لے لیا۔ اب یا ابلیس فاتح ہے یا یہ اولاد، اولاد آدمؑ نہیں ہے۔

• آدمؑ کا جنت سے نکل کر دنیا میں آنا فریضہ تھا "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" ابلیس نے حماقت کر کے یہ الزام اپنے سر لے لیا اور اسے اپنا کارنامہ بنا کر ملعون قرار پا گیا۔

• اگر آدمؑ کو گناہگار تسلیم کر لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ بربنائے گناہ جنت سے نکال دیئے گئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گناہ پر خلیفۃ اللہ جنت سے نکل سکتا ہے تو خلیفۃ المسلمین کے گناہ کے بعد جنت میں جانے کا کیا سوال ہے۔

• شیطان نے اپنے خیال میں آدمؑ کو گمراہ کر لیا مگر پھر بھی یہ کہتا رہا کہ عباد مخلصین کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں آدمؑ سے بالاتر عباد مخلصین بھی تھے جن کی گمراہی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

• شیطان کا دوسرا کارنامہ فرزند آدمؑ قابیل کی گمراہی تھا جہاں "بڑا بھائی" چھوٹے بھائی کا قاتل بن گیا اور حسد نے اپنا کام کر دیا۔ نہ مقدس رشتہ کام آیا نہ مقدس ماحول۔

• قابیل نے قتل کے بعد دفن کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور غراب نے دفن کی تعلیم دی۔ گویا کل کا قاتل فرزند نبیؑ کو بھی دفن کرنے کے لئے فکر مند تھا۔

• جناب آدمؑ نے اس حادثہ کے بعد ہابیل پر گریہ کیا اور قابیل پر لعنت کی، تاکہ مظلوم پر گریہ اور قاتل پر لعنت دلیل آدمیت بن جائے۔

• قابیل کے بعد شیطان نے جناب ابراہیمؑ کا رُخ کیا اور منیٰ کے قریب ابراہیمؑ۔ اسماعیلؑ اور ہاجرہ سب کو گمراہ کرنا چاہا لیکن ملعون قرار پایا اور رمی جمرات ابدی سزا بن گئی۔

• جناب یوسفؑ کے لئے زلیخا (عورت) کو ذریعہ بنایا لیکن کامیاب نہ ہو سکا کہ عباد صالحین گمراہ نہیں ہوتے ہیں اور یہی دلیل ہے کہ جناب آدمؑ گمراہ نہیں ہوئے۔

• شیطان کا ایک حربہ عقائد میں تشکیک ہے کہ جو خدا نظر نہ آئے اس کا وجود کیسے تسلیم کیا جائے؟ ایک خدا دو جہان کا مالک کیسے ہوگا؟ ۳۶۰ خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کثرت سے قلت کا سفر ہے

جو قرین عقل نہیں ہے۔ خدا صامت ہو تو بہتر ہے تاکہ اس کی مرضی کی تفسیر ہو سکے۔ خدا اپنا بنایا ہوا ہو تو مناسب ہے تاکہ اپنی مرضی کا تابع رہے۔

• نبوت میں شبہ پیدا کیا کہ وہ ہمیں جیسا بشر ہوتا ہے۔ وہ اُمّی اور ان پڑھ ہوتا ہے اس سے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔ اسے دنیا کے مسائل کا علم نہیں ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اولاد کی محبّت میں بہک بھی سکتا ہے۔

• امامت میں شبہ پیدا کیا کہ اسے ایک خاندان کی میراث نہیں ہونا چاہیئے۔ ساری امت کو حق ملنا چاہیئے۔ پیغمبرؐ نے اپنے خاندان کو امت پر مسلّط کر دیا ہے۔ امامت کے معیار کو حسب حالات بدلتا رہنا چاہیئے۔

• قیامت میں شبہ پیدا کیا کہ اگر مرنے کے بعد کچھ نہ نکلا تو ساری محنت برباد۔ معاد جسمانی و روحانی کی بحث اٹھا دی۔ آنکل دماکول کا جھگڑا پیدا کر دیا۔

• اعمال میں قیاس و استحسان کو داخل کر کے احکام کی شکل مسخ کر دی۔ شریعت کو نامکمل قرار دے دیا۔

• میدان جہاد میں کبھی مسلمانوں کے حوصلے پست کئے اور کبھی قَدْ قُتِلَ محمدؐ کی آواز بلند کر کے لشکر اسلام کو فرار پر آمادہ کر دیا اور پھر مال غنیمت کے بارے میں رسولؐ کو بھی غیر معتبر بنا دیا۔

• صلح کی منزل میں پیغمبرؐ کو پست ہمّت اور بزدل بنا کر رسالت میں شک پیدا کرا دیا۔

• وقت آخر پیغمبرؐ قرآن کو کافی بنا کر امت کو پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت پر آمادہ کر دیا اور صاحب وحی والہام کو صاحب مرض و ہذیان قرار دے دیا۔ انا للہ . . .

مُردہ پرستی

مسلمانوں کی زندگی پر ایک طنز یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ قوم مُردہ پرست ہے۔ زندوں کی قدر نہیں کرتی ہے لیکن جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کے احترام کے ہزار راستہ نکال لیتی ہے۔

اس طنز کا سرسری جواب یہ دے دیا جاتا ہے کہ احترام کا نام پرستش نہیں ہے۔ مسلمان مرنے کے بعد بھی انسان کا احترام کرتا ہے اور احترام کو زندگی کی حدوں کیساتھ محدود نہیں کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ وہ مُردوں کی پرستش کرتا ہے، یا انھیں اپنا خدا تصور کرتا ہے۔ اسلام میں خدائی کے تصوّر میں حیات ایک جزء لازم کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے نزدیک نہ زندگی کے بغیر کوئی خدا ہو سکتا ہے اور نہ پرستش کے قابل ہو سکتا ہے۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ یہ جواب صرف اس لفظ کا ہے جو اعتراض یا طنز کے موقع پر استعمال کیا گیا ہے ورنہ مسئلہ کی گہرائی پر غور کیا جائے تو دنیا کی ہر قوم اور بالخصوص مسلمان قوم سب میں یہ کمزوری مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے کہ مُردوں کا احترام زیادہ ہوتا ہے اور زندوں کا احترام کم۔ اسلام یہ چاہتا تھا کہ زندگی کے خاتمہ کے ساتھ احترام کا سلسلہ ختم نہ ہونے پائے نہ یہ کہ زندگی کے خاتمہ کے ساتھ احترام کا سلسلہ شروع ہو اور صورت حال کچھ ایسی ہی ہو گئی ہے کہ زندگی قابل احترام نہیں رہ گئی ہے اور موت ہی بنیاد احترام بن گئی ہے۔

آپ سڑک پر چادر بچھا کر مُردہ کے کفن کے لئے چندہ کریں تو ہر راہگیر کچھ نہ کچھ دینے کے لئے تیار ہو جائے گا لیکن ایک مریض کی دوا کے لئے چندہ مانگیں تو ہر آدمی جان بچانے کی

فکر کرتا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک زندہ کی زندگی اس قدر عزیز نہیں ہے جتقدر عزیز ایک مُردہ کی تدفین ہے۔

اس مقام پر یہ خیال نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں تجہیز و تکفین ایک فریضہ ہے لہذا ہر انسان اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اس کا کوئی تعلق مُردہ پرستی سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ جس اسلام میں مُردہ کی تجہیز و تکفین ایک فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے، اسی اسلام میں زندہ کی جان بچانا بھی واجب ہے اور اسلام نے ہر مسلمان کی ذمہ داری قرار دی ہے کہ اگر کوئی شخص ہلاک ہو رہا ہے تو اس کی زندگی کا تحفظ کرے چاہے جس طرح ممکن ہو۔

شاعر نے اسی صورت حال کے بارے میں فریاد کی تھی :

عجیب طرزِ کرم ہے یہ اہلِ دنیا کا
کفن تو دیتے ہیں لیکن دوا نہیں دیتے

مسئلہ فقط حیات و موت تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جس کو دین و عقل نے بنیاد حیات قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ معاشرہ میں یہی برتاؤ ہوتا ہے اور اس کی وہ حیثیت نہیں رہ جاتی ہے جو حیثیت موت سے متعلق مسائل کی ہے۔

مثال کے طور پر دین اسلام نے علم و معرفت کو بنیاد حیات قرار دیا ہے "لتنذر من کان حیا" حیات و موت کا دارومدار علم و معرفت پر ہے اور علم و معرفت کے بغیر زندگی ہلاکت کہے جانے کے قابل ہے۔

لیکن صورت حال یہ ہے کہ ایک مُردہ کے لئے مجسمہ نصب کرنے۔ سڑک بنانے۔ قبر پر پھول چڑھانے کے واسطے بے حساب سرمایہ نکل آتا ہے لیکن علمی ادارہ، مدرسہ قائم کرنے کے لئے رقم کا نکلنا بھرے گھر سے جنازہ نکلنے کے مرادف تصور کیا جاتا ہے۔

کیا اس کا راز یہ نہیں ہے کہ معاشرہ میں علم بے قدر و قیمت ہو گیا ہے اور اس کی بنیادی حیثیت و افادیت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

علم کی بیکسی یہ ہے کہ اسے مولائے کائناتؑ نے دس دلائل سے مال سے بہتر قرار دیا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ مال مُردہ شے ہے اور مُردوں سے تعلق بھی رکھتا ہے۔ علم زندگی ہے اور زندوں ہی کے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود پورے معاشرہ میں مال کی قدر و قیمت علم سے کہیں زیادہ ہے۔

• ایک شخص کو ایک روپیہ دیدیجئے ہر چوراہہ پر سلام کرے گا۔ لیکن ایک مسئلہ بتا دیجئے کوئی قدر نہ کرے گا۔

• ایک شخص کو ایک پیالی چائے پلا دیجئے ہر جگہ تعریف کرے گا۔ لیکن ایک قانون شریعت سمجھا دیجئے تو شاید ہی آپ کو قابل ذکر تصور کرے۔

• دسترخوان بچھا کر طرح طرح کی غذائیں حاضر کر دینے والے کا احسان سب مانتے ہیں۔ لیکن اس کے مرحومین کے لئے فاتحہ پڑھ دینے والوں کا احسان کوئی نہیں مانتا ہے۔ حالانکہ غذا تھوڑی دیر میں فنا ہو جائے گی اور سورۂ فاتحہ روز قیامت تک کام آئے گا۔

• صاحبانِ مال کے احترام پر صاحبان علم کو بھی مجبور کیا جاتا ہے اور صاحبانِ علم کے احترام پر صاحبانِ مال کو مجبور کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

• صاحبانِ مال کا عام تصور یہ ہے کہ وہ اپنے مال کے زور پر صاحبانِ علم و فضل کو خرید سکتے ہیں یا ان سے کام لے سکتے ہیں اور صاحبانِ علم انھیں نہیں خرید سکتے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ معاشرہ کے ذہن میں مال کی قدر و قیمت زیادہ ہے علم کی وہ قدر و قیمت نہیں ہے۔

• تاریخ اسلام میں بھی یہی منظر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب مال کا سیلاب اُمڈا تو بڑے بڑے صاحبانِ ایمان بہہ گئے۔ لیکن جب منبر کوفہ سے اعلان ہوا کہ میری ذات سے علم کا سیلاب جاری ہوتا ہے تو چار افراد بھی اس سیلاب کے ساتھ چلنے یا اس کے آبِ شیریں سے استفادہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

مال کی یہی قدر و قیمت اور علم کی یہی ناقدری و بیکسی ہے جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا ہے اور انسانی معاشرہ کو ذلت کے راستہ پر لگا دیا ہے۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ کسی معاشرہ میں ایک معلم کی وہ خدمت نہیں کی جاتی ہے جو ایک مغنّی یا رقاصہ

کی ہوتی ہے۔

کرکٹ کے کھلاڑی میدان جیت کر ملک میں واپس آتے ہیں تو مسلمان ملکوں کے سربراہ ایرپورٹ پر استقبال کے لئے جاتے ہیں اور اعلیٰ تعلیمافتہ انسان ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر ملک واپس آتا ہے تو صدر مملکت کا نوکر بھی استقبال کے لئے نہیں جاتا ہے۔

کیا علم کی اس سے زیادہ کوئی توہین ہوسکتی ہے کہ اسے کھیل تماشہ کے برابر بھی درجہ نہ دیا جائے اور اسے معاشرہ کا سب سے زیادہ بے قیمت کام قرار دیدیا جائے، جب کہ علم اساسِ حیات وبنیادِ زندگی ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی شے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

زندگی کی اس قدر ناقدری کو مُردہ پرستی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے اور تاریخ اسلام نے تو مُردہ پرستی کی حد کردی تھی جب جاہل مطلق افراد کو ان افراد پر مقدم کردیا گیا جنھیں بابِ مدینۂ علم اور معلم انسانیت قرار دیا گیا تھا۔

والسّلام من اتبع الہدیٰ

حصۂ سوم

اعمال واحکام

فلسفۂ اسلام

• کسی بھی قانون کی عظمت واہمیت کا فیصلہ کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے کہ یہ قانون کس نے بنایا؟ اس کی بنیادیں کیا ہیں؟ اس کا لانے والا اور پہونچانے والا کون ہے؟ اور اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا انجام کیا ہے؟

ان سوالات کے جوابات معلوم کرنے سے پہلے نہ قانون کی کوئی اہمیت ہے اور نہ اس پر عمل کرنے کی کوئی حیثیت ہے۔ قانون ایک فرضی نظام ہے اور عمل بے تحریک کی حرکت ہے۔

اسلام نے اسی نکتہ کے پیش نظر اپنے احکام پیش کرنے سے پہلے اصول دین و مذہب کی دعوت دی کہ اصول دین ہی درحقیقت ان سوالات کے جوابات ہیں اور اصول دین ہی سے نظام کی برتری اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسلام کا عقیدۂ توحید اس سوال کا جواب ہے کہ اس نظام کا بنانے والا کون ہے۔ اس کا عقیدۂ عدالت اس امر کی وضاحت ہے کہ اس قانون کی بنیاد کیا ہے۔ اسکا عقیدۂ نبوت وامامت قانون کے لانے اور پہونچانے والے کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کا عقیدۂ قیامت اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے نتائج کا اعلان کرتا ہے۔

• اسلام کے نظام کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ اس کے دونوں رُخ مکمل ہیں۔ اس میں عبد ومعبود کے تعلقات کا بھی ذکر ہے اور بندوں کے باہمی تعلقات کا بھی تذکرہ ہے۔ عبد ومعبود کے تعلقات کو استوار اور مستحکم بنانے کے لئے عبادت کا نظام ہے اور بندوں کے باہمی مسائل کو متوازن قرار دینے کے لئے معاملات کا نظام ہے۔ اسلام میں نہ عبادات بلا معاملات کی کوئی حیثیت ہے اور نہ معاملات بلا عبادات کی۔ یہ اور بات ہے کہ عبادت

عبد و معبود کا رشتہ ہے جس سے انسان نہ روز اوّل سے بے نیاز ہے اور نہ کبھی بے نیاز ہو سکے
ہے، لہٰذا اسلام کے معاملات کی بنیاد بھی یہی عبادات ہیں اور اس نے اپنے معاملات
مسائل کو عبادات ہی کے ذریعہ حل کیا ہے تاکہ قانون کو بنیادی جواز بھی حاصل رہے اور اس
اندر عملدر آمد کا ذہنی اور قلبی محرک بھی رہے کہ داخلی محرک کے بغیر کوئی نظام دیر تک نہیں چل سکتا
ہے اور ایک نہ ایک دن موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔

●۔ اس تمہید کے پیش نظر اسلام کے ہر قانون کے فلسفہ کو اس کی بنیادوں میں تلاش
کرنا ہوگا اور ان بنیادوں سے ہٹ کر اس کے کسی قانون کا کوئی فلسفہ نہیں ہے۔

اسلام نے اپنے احکام کا آغاز طہارت سے کیا ہے اور فقہ اسلامی کا پہلا باب "کتاب الطہارۃ"
ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام طہارت اور پاکیزگی کا دین ہے اور اس میں کسی طرح
کی نجاست اور خباثت کی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام نے طہارت کو بھی دو حصّوں پر تقسیم کر دیا ہے: طہارت ظاہری اور طہارت باطنی۔
طہارت ظاہری کے لئے پانی۔ مٹی۔ آفتاب وغیرہ کی تخلیق ہوئی ہے اور طہارت باطنی
کے لئے صفات، کمالات، تعلیمات، ہدایات اور اصول و قوانین کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔

●۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلام نے جن چیزوں کو مطہرات میں شمار کیا ہے ان سب
کا وجود نجاسات کے وجود سے پہلے ہے۔ دنیا میں پیشاب، پائخانہ۔ منی۔ مردار۔ شراب۔ کتا۔
سور کا وجود نہیں ہوا تھا لیکن پانی۔ مٹی اور آفتاب کا وجود تھا جو اس بات کی علامت ہے
کہ اس کے نظام میں مطہرات کا وجود پہلے ہے اور نجاسات کا وجود بعد میں۔ تو جس خالق نے
ظاہری طہارت میں یہ اہتمام کیا ہے وہ باطنی طہارت کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے؟ چنانچہ
اس نے باطنی خباثتوں کے وجود سے پہلے ان مقدس انوار کو پیدا کر دیا جو خود مرکز تطہیر نفس
اور تطہیر کائنات کا ذریعہ تھے۔

●۔ اس مقام پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے تطہیر لباس و بدن پر اتنا
زور کیوں دیا ہے اور براہ راست تطہیر نفس پر زور کیوں نہیں دیا ہے؟ لیکن اس کا جواب واضح
ہے کہ جب تک طہارت ظاہر کی اہمیت کا احساس نہیں کرے گا طہارت نفس کا احساس

نہیں کر سکتا ہے۔ ظاہری حصہ نظر آتا ہے اور باطن نظر نہیں آتا ہے تو جب نظر آنے والے
حصہ کی طہارت کا احساس نہ ہوگا تو نگاہ سے اوجھل عنصر کی طہارت کا احساس کسطرح پیدا ہوگا؟

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنی پاکیزگی نفس کا اعلان کرنا چاہتے ہیں وہ عام طور سے صاف شفاف
لباس زیب تن کرتے ہیں اور اسی ظاہر کی صفائی سے باطن کی طہارت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ اس
کے علاوہ اسلام اس نکتہ پر بھی نگاہ رکھتا ہے کہ تحفظ کا انتظام دور سے ہونا چاہیئے۔ لال سگنل
سے پہلے زرد سگنل نہ ہوگا تو اچانک گاڑی نہ رک سکے گی اور ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ ایکسیڈنٹ کی
روک تھام کے لئے بہت دور سے انتظام کرنا پڑتا ہے۔

طہارت نفس کا مرحلہ انتہائی اہم اور سنگین ہے۔ اس کا اچانک مطالبہ ممکن نہیں ہے لہٰذا
اس نے دور سے انتظام کرنے کیلئے پہلے طہارت لباس و بدن پر زور دیا تاکہ انسان کی زندگی
میں طہارت کی اہمیت کا شعور پیدا ہو۔ اس کے بعد انسان خود ہی سوچے گا کہ جب چند لمحوں کے بعد
اتر جانیوالے لباس کی طہارت کی اسقدر اہمیت ہے تو نفس کی طہارت کی کیا اہمیت ہوگی اور جب
خاک میں مل جانیوالے کی طہارت کا اسقدر زور ہے تو ہمیشہ رہنے والے نفس کی طہارت کا کسقدر زور ہونا چاہیئے۔

● طہارت اور نجاست کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ طہارت کو تمام اشیاء کی
اصل بنایا گیا۔ نجاست تو ایک طاری ہونے والی کیفیت ہے اور جن چیزوں کو ذاتی طور پر
نجس بنایا گیا ہے ان کی نجاست کا بھی ایک سبب ہے کہ ان کی وجہ سے انسان کی صحت خطرہ
میں پڑ جاتی ہے یا بعض اوقات زندگی ہی خطرہ میں پڑ جاتی ہے یا کبھی کبھی عقل و شعور یا عزّت
و آبرو کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے ورنہ اگر یہ خطرات نہ ہوتے تو اسلام ہر شے کو طہارت کے رُخ
سے دیکھنا چاہتا تھا اور اس نے تمام اشیاء کی اصل طہارت کو قرار دیا ہے۔

پیشاب، پائخانہ اور منی کی نجاست کا سبب یہ ہے کہ ان سے انسانی صحت و سلامتی
کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور شراب کی نجاست کی بنیاد عقل کا زوال ہے۔ کفر کو اس کے ایمانی
خطرہ کی بنا پر نجس قرار دیا گیا ہے کہ کفر کی بیباک معاشرت انسان کے دل میں مروت پیدا کر سکتی
ہے اور باطل سے مروت کسی وقت بھی حق و حقیقت کی راہ میں نقصان دہ ہو سکتی ہے۔
مومن کی شناخت "اشداء علی الکفار" ہے اور اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے کافر

کے تر بدن سے بھی اجتناب ضروری ہے۔ مبادا کہ کفر کے جراثیم مسلمان کے بدن کی طرف منتقل ہو جائیں اور اس کی حیات ایمانی خطرہ میں پڑ جائے۔

•۔ یوں تو اسلام نے تمام چیزوں کی اصل طہارت کو قرار دیا ہے لیکن بعض اشیاء میں اس قدر زور طہارت پایا جاتا ہے کہ وہ دوسری چیزوں کو پاک بھی کر سکتی ہیں۔ یعنی طاہر بھی ہیں اور مطہر بھی اور یہ شرف سب سے پہلے پانی کو دیا گیا ہے کہ وہی اصل کائنات ہے اور اسی سے زمین و آسمان کے طبقات کی تخلیق ہوئی ہے ۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ جسے تخلیق کائنات کی بنیاد قرار دیا جائے اسے طاہر بھی ہونا چاہیئے اور مطہر بھی اور اس کی طہارت کا اہتمام پروردگار کی طرف سے ہونا چاہیئے۔

•۔ طہارت کے بعد اسلام میں دوسرا بنیادی مسئلہ نماز کا ہے جس کا فلسفہ صدیقہ طاہرہ جناب فاطمہ زہراؑ نے خطبہ فدک میں ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ پروردگار نے نماز کو تکبر سے پاک کرنے کے لئے واجب قرار دیا ہے کہ انسان اس کی بارگاہ میں سر جھکانے میں شرم محسوس نہ کرے جو اس سے بالاتر ہے اور جس نے اسے وجود و حیات کی نعمتوں سے سرفراز فرما کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔

نماز میں قیام و قعود ہر حال میں اطاعت الٰہی کا اشارہ ہے اور رکوع و سجود اس کی بارگاہ میں خضوع و خشوع کا اعلان ہے۔ رکوع و سجود کا غیر خدا کے لئے حرام ہونا اعلان ہے کہ اس کے علاوہ کوئی سر جھکانے کے قابل نہیں ہے۔ وہ جہاں حکم دیدے یہ سر وہیں جھک جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بارگاہ انسانیت کے سر نیاز جھکانے کے قابل نہیں ہے۔

اذان دعوت الی اللہ کی اہمیت کا اعلان ہے اور بلال کا موذن بن جانا اسلام کے فلسفہ مساوات و مواخات کا اظہار ہے۔

•۔ روزہ انسانی زندگی میں قوت صبر و تحمّل کی تربیت ہے اور صبر و تحمّل کے بغیر دنیا کا کوئی مرحلہ سر نہیں ہو سکتا ہے۔ صبر و تحمّل ہی ہے جو دنیا میں جہاد کی طاقت عطا کرتا ہے اور آخرت میں جہنم سے بچاؤ کا بندوبست کرتا ہے۔ اسی لئے روزہ کو جہنم کی سپر قرار دیا گیا ہے۔

صبر اسلام کی نگاہ میں نصف ایمان ہے لہٰذا روزہ انسان کو نصف ایمان کے مرحلہ تک پہونچا دیتا ہے۔ اب اگر نماز نے سجدۂ شکر کا خوگر بنا دیا ہے تو ایمان کے دونوں حصّے مکمل ہو جائیں گے

اور انسان ایمان کامل کے درجہ پر فائز ہو جائے گا۔

•۔ حج بیت اللہ کا فلسفہ لباس احرام کی سادگی۔ محرمات احرام کی حرمت۔ خانۂ خدا کی محوریت و مرکزیت۔ عرفات و مشعر کی عبادت، میدان منیٰ کی قربانی اور جمرات کی رمی سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ پروردگار انسان کو ایک سادہ زندگی دینا چاہتا ہے۔ وہ ہر طرح کی لذّت پر کنٹرول کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کی نگاہ میں مسلمان کی زندگی کا محور و مرکز خانۂ خدا کو ہونا چاہیئے اور اس کی راہ میں کسی طرح کی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے اور نہ کسی شیطان رجیم کی کوئی پرواہ کرنا چاہیئے۔

حج بیت اللہ میں اگر قربانی جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی یادگار ہے تو سعی جناب ہاجرہؑ کی یادگار ہے۔ گویا اسلام اخلاص کی راہ میں صنفی تفرقہ کو بھی ختم کر دینا چاہتا ہے کہ کسی عورت نے بھی اخلاص سے کوئی کام انجام دیا ہے تو اسے بھی باقی رہنا چاہیئے اور اس کے نقش قدم پر مردوں کو بھی چلنا چاہیئے۔

•۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر معاشرہ اور مذہب دونوں سے ہمدردی کی علامت ہے کہ مسلمان نہ اپنے مذہب کی بربادی کو برداشت کر سکتا ہے اور نہ اپنے معاشرہ کی تباہی پر خاموش رہ سکتا ہے۔ اس کا کھلا ہوا اصول یہ ہے کہ جب مذہب پر آنچ آنے لگے یا معاشرہ تباہی کے گھاٹ اترنے لگے تو خبردار خاموش نہ بیٹھنا بلکہ میدان عمل میں اتر آنا اور اپنے آخری امکان تک نیکیوں کے رواج اور برائیوں کی روک تھام کی کوشش کرنا۔ اس سے تمہارے ذوق ایمانی کا بھی اندازہ ہوگا اور اسلام کے احکام کو بقا کی ضمانت بھی مل جائے گی۔

•۔ تولّا و تبرّا نیکیوں سے محبت کے ساتھ نیک افراد سے محبت کا اعلان ہے اور اس حقیقت کا اظہار ہے کہ نیک انسانوں سے ہٹ کر نیکی سے محبّت کرنے کا کوئی تصوّر نہیں ہے اور انسان واقعاً نیکی کا طلبگار اور طرفدار ہے تو اسے ان افراد سے بہرحال محبّت کرنا ہوگی جنھوں نے نیکیوں کو اپنی زندگی کے ذریعہ زندہ رکھا ہے اور مجسم بنا کر زندہ رکھا ہے اور اس کے نتیجہ میں ان تمام افراد سے نفرت کرنا ہوگی جنھوں نے برائی اختیار کر کے لوگوں کی برائی کا راستہ کھولا ہے اور انھیں برائی کی باقاعدہ عملی دعوت دی ہے۔

تولّا اور تبرّا عبادت ہونے کے اعتبار سے سنجیدگی کا بھی طلبگار ہے اور اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ اس کا انجام دینا بھی مرضئ خدا کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ تولّا انھیں افراد سے ہو سکتا ہے جن کے تولّا سے پروردگار راضی ہے اور تبرّا انھیں افراد سے جائز ہے جنھیں پروردگار نے قابل نفرت قرار دیدیا ہے۔ اس کے علاوہ تولّا و تبرّا کا کوئی معیار نہیں ہے۔

•۔ اسلام کے مالیاتی نظام میں زکوٰۃ و خمس صرف غربت و افلاس کا علاج نہیں ہیں بلکہ ان سے معاشرہ کے تمام مشکلات کو حل کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر زکوٰۃ صرف فقراء و مساکین کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس میں غربت زدہ مسافر، مذہب کے کام آنے والے کافر۔ مذہبی اداروں میں کام کرنے والے ملازم۔ بار قرض کے تلے دبے ہوئے افراد اور ایسے سیکڑوں افراد کے مسائل کا حل ہے۔

اسلام کا منشاء یہ ہے کہ انسانی زندگی کا معیار بلند ہو اور سطح زندگی ایسی ہو جس کا انتظام ہر فرد معاشرہ کے لئے کیا جائے اور اس انتظام سے کوئی ایک فرد بھی محروم نہ رہ جائے۔

زکوٰۃ معیار زندگی بلند کرنے کا ذریعہ ہے اور خمس معاشرہ کے تمام مشکلات کا حل ہے۔ زکوٰۃ و خمس کے نظام میں اسراف اور فضول خرچی کی گنجائش نہیں ہے ورنہ اسلام اس مال کے خمس و زکوٰۃ کا بھی مطالبہ کرے گا جو بطور اسراف خرچ کر دیا گیا ہے اور اس فضول خرچی کو ابداً اسلام قبول نہ کرے گا۔

امیر المومنینؑ نے اسی نکتہ کے پیش نظر حکومت پاتے ہی اعلان کر دیا تھا کہ۔ میری حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ جن احکام کو پامال کر دیا گیا ہے ان کا احیاء کیا جائے اور جو مال غاصبانہ طریقہ سے لُٹ گیا ہے، اُسے واپس دلایا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس راہ میں مخالفت یقینی ہے لیکن آپ نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اپنی پالیسی کا واضح لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اسلام پروردگار کا دین ہے مروت اور رواداری کا مذہب نہیں ہے۔

رب کریم تمام امت اسلامیہ کو اسلامی احکام کی مصلحتوں کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے۔!

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

امتیازات قانون اسلام

اسلامی قوانین میں بے شمار امتیازات و خصوصیات پائے جاتے ہیں کہ جن کا شمار کرنا انسانی امکان سے بالاتر امر ہے لیکن ذیل میں صرف پانچ بنیادی مسائل کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ تفاصیل کے لئے دفتر اور صحیفوں کے صحیفے درکار ہیں۔

۱۔ نظام تربیت

اسلام نے انسانی تربیت پر جس قدر زور دیا ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی قانون میں نہیں ہے اور اسلام نے تربیت کے لئے جتنی دور سے انتظام کیا ہے اس کا ادراک عام انسانی عقلوں سے بالاتر ہے۔

دنیا میں تربیت کا تصور یہ ہوتا ہے کہ بچہ جب بات سمجھنے کے قابل ہو جائے تو اسے نیک و بد سے باخبر کر دیا جائے اور وہ ذاتی طور پر عمل کرنے کے لائق نہ ہو تو اس سے جبراً نیکیوں پر عمل کرایا جائے تاکہ مستقبل میں نیکیوں کا خوگر ہو جائے اور برائیوں سے پرہیز اس کی فطرت ثانیہ میں شامل ہو جائے۔

لیکن اسلام نے اس مسئلہ پر زیادہ گہری نظر سے توجہ دی ہے اور اس کا اہتمام بہت دور سے کیا ہے کہ ابتدائی مراحل میں غفلت بعد کی منزلوں میں مسئلہ کو ناقابل حل بنا دیتی ہے۔

اسلام کے اس دقیق ترین فلسفہ کی چند صورتیں یہ ہیں:

ا۔ اسلام نے روز اوّل عقد کے بارے میں صحتمند قوانین وضع کئے کہ بدکاری سے پیدا ہونے والا بچّہ جسمانی طور پر صحتمند تو ہو سکتا ہے لیکن روحانی اور فکری طور پر صحتمند نہیں

تولّا اور تبرّا عبادت ہونے کے اعتبار سے سنجیدگی کا بھی طلبگار ہے اور اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ اس کا انجام دینا بھی مرضئ خدا کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ تولّا انھیں افراد سے ہو سکتا ہے جن کے تولّا سے پروردگار راضی ہے اور تبرّا انھیں افراد سے جائز ہے جنھیں پروردگار نے قابل نفرت قرار دیدیا ہے۔ اس کے علاوہ تولّا و تبرّا کا کوئی معیار نہیں ہے۔

●۔ اسلام کے مالیاتی نظام میں زکوٰۃ وخمس صرف غربت وافلاس کا علاج نہیں ہیں بلکہ ان سے معاشرہ کے تمام مشکلات کو حل کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر زکوٰۃ صرف فقرار و مساکین کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس میں غربت زدہ مسافر، مذہب کے کام آنے والے کافر۔ مذہبی اداروں میں کام کرنے والے ملازم۔ بار قرض کے تلے دبے ہوئے افراد اور ایسے سیکڑوں افراد کے مسائل کا حل ہے۔

اسلام کا منشار یہ ہے کہ انسانی زندگی کا معیار بلند ہو اور سطح زندگی ایسی ہو جس کا انتظام ہر فرد معاشرہ کے لئے کیا جائے اور اس انتظام سے کوئی ایک فرد بھی محروم نہ رہ جائے۔

زکوٰۃ معیار زندگی بلند کرنے کا ذریعہ ہے اور خمس معاشرہ کے تمام مشکلات کا حل ہے۔ زکوٰۃ وخمس کے نظام میں اسراف اور فضول خرچی کی گنجائش نہیں ہے ورنہ اسلام اس مال کے خمس و زکوٰۃ کا بھی مطالبہ کرے گا جو بطور اسراف خرچ کر دیا گیا ہے اور اس فضول خرچی کو ابدًا اسلام قبول نہ کرے گا۔

امیرالمومنینؑ نے اسی نکتہ کے پیش نظر حکومت پاتے ہی اعلان کر دیا تھا کہ۔ میری حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ جن احکام کو پامال کر دیا گیا ہے ان کا احیار کیا جائے اور جو مال غاصبانہ طریقہ سے لُٹ گیا ہے، اُسے واپس دلایا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس راہ میں مخالفت یقینی ہے لیکن آپ نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اپنی پالیسی کا واضح لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اسلام پروردگار کا دین ہے مروت اور رواداری کا مذہب نہیں ہے۔

رب کریم تمام امت اسلامیہ کو اسلامی احکام کی مصلحتوں کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اوران پر عمل کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے۔!

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

امتیازات قانون اسلام

اسلامی قوانین میں بے شمار امتیازات وخصوصیات پائے جاتے ہیں کہ جن کا شمار کرنا انسانی امکان سے بالاتر امر ہے لیکن ذیل میں صرف پانچ بنیادی مسائل کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ تفاصیل کے لئے دفتر کے دفتر اور صحیفوں کے صحیفے درکار ہیں۔

۱۔ نظام تربیت

اسلام نے انسانی تربیت پر جس قدر زور دیا ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی قانون میں نہیں ہے اور اسلام نے تربیت کے لئے جتنی دور سے انتظام کیا ہے اس کا ادراک عام انسانی عقلوں سے بالاتر ہے۔

دنیا میں تربیت کا تصور یہ ہوتا ہے کہ بچہ جب بات سمجھنے کے قابل ہو جائے تو اسے نیک و بد سے باخبر کر دیا جائے اور وہ ذاتی طور پر عمل کرنے کے لائق نہ ہو تو اس سے جبرًا نیکیوں پر عمل کرایا جائے تاکہ مستقبل میں نیکیوں کا خوگر ہو جائے اور بُرائیوں سے پرہیز اس کی فطرت ثانیہ میں شامل ہو جائے۔

لیکن اسلام نے اس مسئلہ پر زیادہ گہری نظر سے توجہ دی ہے اور اس کا اہتمام بہت دور سے کیا ہے کہ ابتدائی مراحل میں غفلت بعد کی منزلوں میں مسئلہ کو ناقابل حل بنا دیتی ہے۔

اسلام کے اس دقیق ترین فلسفہ کی چند صورتیں یہ ہیں:

۱۔ اسلام نے روز اوّل عقد کے بارے میں صحتمند قوانین وضع کئے کہ بدکاری سے پیدا ہونے والا بچّہ جسمانی طور پر صحتمند تو ہو سکتا ہے لیکن روحانی اور فکری طور پر صحتمند نہیں

ہوسکتا ہے۔

اس میں پہلا عیب یہ ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد میں فریقین کی طرف سے صرف جذباتیت ہوتی ہے اور کسی طرح کی اپنائیت یا ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا ہے اور یہ بات بچہ کی فطرت کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔

ب۔ زنا سے پیدا ہونے والا ماں باپ کی فکری ہم آہنگی سے بھی محروم رہتا ہے۔ اس عمل میں نہ دونوں کے عقائد کا کوئی بھروسہ ہوتا ہے نہ خیالات و افکار کا۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسے ماحول میں تشکیل پانے والا بچہ ایک ذہنی ناہمواری کا شکار رہے گا اور اس کے اثرات بہت بعد میں ظاہر ہوں گے۔

ج۔ زناکاری میں عام طور سے انسان سماج یا مذہب کی طرف سے دہشت زدہ رہتا ہے اور دہشت کے ماحول میں پیدا ہونے والا بچہ کبھی ذہنی طور پر اس دہشت سے نجات نہیں حاصل کرسکتا ہے۔ چاہے اسے کتنا ہی پرسکون ماحول کیوں نہ نصیب ہو جائے۔

د۔ اسلام نے عقد میں بھی مذہبی تناسب کا خیال رکھا ہے کہ فریقین میں خدا یا رسول یا رہبران دین میں اتفاق رائے ہو تاکہ بچہ مکمل طور پر ذہنی انتشار کا شکار نہ ہو جائے اور اس کے مقدر میں کوئی نقطۂ اتحاد رہے ورنہ مختلف عقائد والے ماں باپ کی تربیت بچہ کو ہر طرح کے فیصلہ کی قوت سے محروم کر دے گی اور وہ ہر مسئلہ میں کبھی اِدھر والوں کا ساتھ دے گا اور کبھی اُدھر والوں کا۔

ھ۔ عقد کے بعد اسلام نے دودھ کے مسئلہ پر زور دیا ہے کہ بچہ کو اسی خون سے پیدا ہونے والا دودھ دیا جائے جس خون سے وہ خود بنا ہے تاکہ دونوں کے اثرات میں ہم آہنگی ہو اور بچّہ کی زندگی مختلف قسم کے اثرات سے محفوظ رہے۔

اس کے بعد اگر ماں کا دودھ ممکن نہیں ہے تو کسی شریف عورت کا دودھ دیا جائے تاکہ فطرت میں شریفانہ اثرات رہیں ورنہ بکری کا دودھ مزاج میں "بزدلی" پیدا کر دے گا اور سور کا دودھ بچہ کو بے حیا بنا دے گا۔

و۔ دودھ کے بعد ماحول پر نگاہ رکھنا ضروری ہے کہ بچہ کس گود میں پل رہا ہے اور

کس ماحول میں زندگی گذار رہا ہے کہ آغوش اور ماحول خاموش معلم کا نام ہے اور بچہ ان حالات سے ناطق معلم کی نسبت زیادہ اثر لیتا ہے۔ آغوش بدکردار ہے تو بچہ بدکرداری سیکھے گا اور ماحول فاسد ہے تو بچہ کی فطرت پر فاسد نقوش اُبھریں گے۔

پیدائش کے بعد بچہ کو "بے بی سیٹنگ" کے حوالے کر دینا سہولت پسندی کے اعتبار سے بہت عمدہ شے ہے لیکن تربیت کے اعتبار سے سم قاتل ہے جہاں پالنے والی عورت بچہ کو کسی بھی غلط راستہ پر لگا سکتی ہے اور اس کا کسی کو احساس بھی نہ ہوگا۔

آزاد معاشروں میں یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ لڑکیوں کی بدکرداری کا دوران کی مُربّی عورتوں سے شروع ہوتا ہے اور بدکردار لڑکیوں کی دلالی کا کام ان کی پالنے والی عورتیں ہی انجام دیتی ہیں کہ ماں باپ بچیّوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں اور وہ نہایت آسانی سے بدکرداری کو نیک کرداری بنا کر پیش کر دیتی ہیں۔

استنتاج :

مذکورہ بالا شرائط و قوانین پر نگاہ کرنے کے بعد اگر تاریخ اسلام پر نگاہ کی جائے تو ان کے اثرات و نتائج کا بآسانی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ کی بدترین شخصیت یزید بن معاویہ میں فطری اعتبار سے تمام فاسد عناصر جمع ہو گئے تھے اور پھر ماحول بھی اسی قسم کا مل گیا تھا کہ اس کا پروردہ انسان یزید نہ ہوتا تو حیرت انگیز امر تھا۔ اس کے یزید ہونے میں کسی حیرت و تعجب کا دخل نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اسے باپ وہ ملا جس کے بارے میں متعدد افراد دعویدار تھے۔ ماں وہ ملی جو مذہبی اعتبار سے عیسائی اور دشمن اسلام تھی۔ ماحول عیسائیت اور نفاق کا اور پرورش صحرا اور بیابان میں۔ ایسے حالات میں بچہ کا یزید بن جانا کوئی حیرت انگیز امر نہیں ہے۔

یزید نجس کا کیا مقابلہ اس طیب و طاہر انسان سے۔ جس کا باپ خانہ زاد کبریا۔ جس کی ماں بضعۃ الرسولؐ۔ جس کے ماں باپ کا عقد عرش اعظم پر ہوا اور جس کی پہلی غذا لعاب دہن رسالت تھا۔ پرورش کی منزل آغوش عصمت اور رضاعت کا سامان شیر بتولؑ۔

"رُبِّيتَ فِي حِجرِ الاِسْلامِ ورُضِعتَ مِنْ ثَدي الايمان"

۲۔ نظام جزا

دنیا کی حکومتوں میں مزدور کی مزدوری اور ملازم کی تنخواہ کے علاوہ کسی عمل خیر کی کوئی جزا نہیں ہے۔ ایک ایسا انسان جو حکومت کے کسی محکمہ کا ملازم نہیں ہے، عوام کی بہترین خدمت انجام دے، ملازمین سے بہتر کام کرے تو اس کے کسی عمل کی کوئی جزا نہیں ہے۔ سزا کے مرحلہ میں البتہ کوئی تفریق نہیں ہے۔ غیر سرکاری شخص بھی حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی کرے گا تو اسے سزا ضرور ملے گی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی اطاعت اور تعمیل احکام کی کوئی جزا اور اس کا انعام نہیں ہے۔ انسان ایک دن ٹریفک کا سگنل توڑ دے تو اس کا چالان ضرور ہوگا لیکن زندگی بھر سگنل کا خیال رکھے تو اس کا کوئی انعام نہیں ہے۔

مسافر ایک مرتبہ بلا ٹکٹ سفر کرے تو اس پر جُرمانہ ضرور ہوگا لیکن زندگی بھر ٹکٹ لے کر سفر کرے تو اس کا کوئی انعام نہ ملے گا۔

●۔ اسلام کا نظام اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام میں مخالفت کی سزا ہے تو موافقت کا انعام بھی ہے بلکہ مخالفت کی سزا جُرم کے برابر ہے اور موافقت کا انعام دس گُنا۔ بیس گُنا۔ سو گُنا۔ ہزار گُنا اور لاکھ گُنا بھی ہے اور شاید اس کا ایک راز یہ ہے کہ دنیا کے نظاموں میں تعمیل احکام پر انعام دینے کی صلاحیت نہیں ہے اور ہر آن خزانے کے خالی ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس لئے انعام کے بجائے جُرمانہ کا قانون بنایا گیا تاکہ خزانہ خالی نہ ہونے پائے۔

●۔ اسلام کا حساب اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں صاحب نظام مالک کائنات ہے جس کے خزانہ کے خالی ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ہر عمل پر لاکھ گُنا انعام دیتا رہے گا اور اس کا خزانہ اسی طرح معمور رہے گا۔ بلکہ بعض اوقات تو اس نے جزا کو بے حساب قرار دیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اس کا خزانہ ہر شمار اور حساب سے بالاتر ہے لہٰذا وہ کچھ بھی عطا کر سکتا ہے۔ اس کے خزانہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

●۔ اسلام کے نظام جزا میں ایک اور خصوصیت بھی پائی جاتی ہے کہ اس نے عمل پر بھی جزا کا اہتمام کیا ہے اور جزا پانے کے بعد انسان اس کا شکریہ ادا کر دے تو مزید انعام کا وعدہ کیا گیا ہے جو پروردگار کے کرم بے حساب کی علامت اور اس کے انعام بے شمار کی دلیل ہے۔

اسلام کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے جزا میں عمل کی حیثیت کا خاص لحاظ رکھا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ ہر عمل کرنے والے کو ایک قسم کا انعام دیا جائے یا ہر عمل کی ایک جیسی جزا رکھی جائے۔ وہ ہر عمل پر عمل کی نوعیت اور عمل کرنے والے کی حیثیت کے مطابق اجر دیتا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی جزا دینے پر قادر ہے اور کوئی عمل اس کے انعام کی حدوں سے بالاتر نہیں ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر دنیا کا کوئی نظام اپنی راہ میں مرنے والوں کو کیا دے سکتا ہے۔ اس کے نام پر ایک سڑک بنا دی جائے۔ اس کا مجسمہ نصب کر دیا جائے۔ اس کی تصویر کے ٹکٹ چھاپ دیے جائیں۔ اس کے نام کا ایک ایوارڈ عطا کر دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان باتوں کا مرنے والے سے کیا تعلق ہے اور ان میں سے کونسی چیز اس کے کام آنے والی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کے لئے کسی چیز کا کوئی مصرف نہیں ہے لیکن قانون کی مجبوری یہ ہے کہ وہ زندگی کے بدلے زندگی نہیں دے سکتا ہے اور مرنے کے بعد مُردہ کو رزق سے سرفراز نہیں کر سکتا ہے۔

●۔ اس کے برخلاف اسلام کا نظام، نظام قوت و طاقت و قدرت و اختیار ہے۔ اس کے مالک کے امکان میں زندگی کے بدلے زندگی دینا بھی ہے اور قربانی کے بدلے روزی دینا بھی۔ چنانچہ اس نے صاف اعلان کر دیا کہ ہم اپنی راہ میں چند روزہ زندگی قربان کرنیوالوں کو حیات جاودانی عطا کرتے ہیں اور موت کے بعد بھی اپنی بارگاہ میں رزق دیتے رہتے ہیں۔

عمل اور جزا کے اسی تناسب کا نتیجہ ہے کہ اس نے مادی روٹیوں کے عطا کرنے پر دسترخوان جنت کا انتظام کر دیا اور اس کی راہ میں سعی کرنے پر تشکر کی جزا دے کر بندہ کی

سعی کو سعی مشکور اور عمل مقبول بنا دیا۔ اس کے یہاں ایک ضربت کا انعام عبادت ثقلین سے بالاتر ہے تو ایک نیند کی جزا مرضات پروردگار ہے۔ وہ ہر طرح کے عمل پر نگاہ رکھتا ہے اور ہر قسم کی جزا دینے پر قادر ہے۔ جس کا امکان دنیا کے کسی نظام اور قانون میں نہیں ہے۔

۳۔ نظام سزا

اسلام کا نظام سزا بھی اس کے نظام جزا کی طرح دنیا کے نظاموں سے بالکل مختلف ہے۔ دنیا کے نظاموں میں عمل اور سزا میں کوئی تناسب نہیں ہے اور اسلام کے نظام کا امتیاز اس کا تناسب ہے۔

مثال کے طور پر دنیا میں دس طرح کے جرائم کرنے والوں کو ایک ہی جیل میں بند کر دیا جاتا ہے اور ان کے عمل اور اس کی سزا میں مدت اور کیفیت زندان کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہوتا ہے جب کہ اسلام اس تناسب پر خصوصی نگاہ رکھتا ہے۔ وہ چوری کرنیوالوں کے ہاتھ کاٹتا ہے کہ یہ عمل عام طور سے ہاتھ سے انجام پاتا ہے اور زنا کرنے والے کو کوڑے لگاتا ہے کہ اس عمل کا تعلق سارے بدن سے ہے۔ وہ قتل کا بدلہ قتل کی شکل میں دیتا ہے اور آبروریزی کا بدلہ شاہراہ عام پر سنگسار یا تازیانہ کی شکل میں دیتا ہے تاکہ اپنی آبرو جانے کا احساس بھی پیدا ہو۔

۔ دنیا کے نظاموں میں ناقص اعمال کی سزا ہے لیکن مکمل جرم اور بدترین اقدام کی کوئی سزا نہیں ہے۔ ایک شخص نے خودکشی کے ارادہ سے زہر کھایا اور زندہ رہ گیا تو اس کی سزا ہے لیکن اگر جُرم مکمل ہوگیا اور موت واقع ہوگئی تو اس کی کوئی سزا نہیں ہے جب کہ اسلام اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے تکمیل جُرم کے بعد بھی سزا کا اہتمام کیا ہے اور جس طرح مجرم نے ہمیشہ کے لئے امانت الٰہی میں خیانت کی ہے اور زندگی کا ابدی خاتمہ کر دیا ہے اسی طرح اسے جہنم میں بھی ہمیشہ رہنا پڑے گا۔

۔ اسلام کی سزا کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں توبہ کرنے اور معافی مانگنے کی مہلت دی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سزا میں جلدی نہیں کی جاتی ہے بلکہ اکثر اعمال کی سزا کو

آخرت پر اُٹھا رکھا گیا ہے۔ دنیا میں صرف ان اعمال کی سزا دی جاتی ہے جن کا تعلق دوسرے انسانوں کے حقوق سے ہو یا جن پر سزا نہ دینے کی بنا پر سماج کے تباہ و برباد ہو جانے کا خطرہ ہو۔ اس کے علاوہ سارے اعمال کی سزا آخرت سے متعلق ہے، دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے.

اور اس کا ایک راز یہ بھی ہے کہ دنیا کے نظاموں کو مجرم کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہے۔ اسلام کے مالک کو اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ بندہ میری گرفت سے باہر نہیں جا سکتا ہے۔ وہ مر بھی جائے گا تو بالآخر میری ہی بارگاہ میں آئے گا "انا للہ وانا الیہ راجعون" لہٰذا جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور توبہ و استغفار کا موقع دینا چاہیئے "انما یعجل من یخاف الفوت" (سزا میں جلدی وہ کرتا ہے جسے مجرم کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف ہوتا ہے۔)

۔ دنیا کے نظام سزا کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ جاہل کی سزا زیادہ ہے اور پڑھے لکھے کی کم۔ جاہل معمولی جیل میں رکھا جاتا ہے اور پڑھا لکھا سمجھدار انسان اعلیٰ درجہ کے جیل میں جب کہ قانونی طور پر جاننے والے کی سزا زیادہ ہونی چاہیئے کہ اس نے علم کی توہین کی ہے اور جان بوجھ کر جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اسلام نے اسی نکتہ کا لحاظ رکھا ہے اور آخرت کی سزا میں عالم کی سزا جاہل سے زیادہ رکھی ہے اور اسے توہین علم کا مجرم بھی قرار دیا ہے۔

دنیا کی سزاؤں میں مساوات اس لئے رکھی گئی ہے کہ یہ جرائم مادی ہیں اور ان کی سزا بھی مادی ہے اور کھُلی ہوئی بات ہے کہ جاہل اور عالم میں مادی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ ان کا فرق معنوی ہوتا ہے لیکن معنوی سزا میں امتیاز ہوگا اور مادی سزا میں کوئی امتیاز نہ ہوگا۔

۴۔ بنیاد احکام

دنیا کے احکام اور اسلامی احکام کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ دنیا کے احکام حاکم کی حاکمیت کے اظہار یا معاشرہ کی اصلاحی تدبیر کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی واقعی بنیاد نہیں ہوتی ہے جس کی روشنی میں احکام کی واقعیت اور ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکے لیکن

اسلام کے احکام چند بنیادی اصولوں پر قائم ہیں اور انھیں اصولوں کے ذریعہ ان کی اصالت اور واقعیت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

اسلام اس کائنات میں پانچ امور کی اہمیت کا قائل ہے اور ان کے بارے میں کسی طرح کے سمجھوتے کا قائل نہیں ہے:

عقیدہ۔ عقل۔ جان۔ مال۔ آبرو۔

اس کی نگاہ میں ان میں کوئی چیز نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے اور کسی کے بارے میں کسی طرح کی رعایت نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہی پانچوں امور اس کے احکام کی بنیاد ہیں اور انھیں کے تحفظ کے گرد اس کا سارا نظام گھوم رہا ہے۔ اس نے بعض احکام ان جواہرات کی حفاظت اور ترقی کے لئے بنائے ہیں اور بعض انھیں ہر طرح کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے وضع کئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

الف۔ اس نے عقائد کے استحکام کے لئے علم و معرفت کو لازم قرار دیا ہے اور اس راہ میں کسی طرح کی تقلید کو جائز نہیں قرار دیا ہے کہ تقلیدی علم ایک شخص کے اعتماد سے پیدا ہوسکتا ہے تو دوسرے شخص کے اعتماد سے فنا بھی ہوسکتا ہے اور اسلام کسی ایسے عقیدہ کا حامی نہیں ہے جس میں ثبات اور استقلال نہ ہو اور وہ صرف لوگوں کے کہنے سے فنا ہوجائے۔

دوسری طرف عقائد کی حفاظت کے لئے شرک کو حرام اور ناقابل معافی جرم قرار دیدیا ہے تاکہ انسان اس کے بارے میں سوچنے بھی نہ پائے کہ اس طرح شیطان کو گمراہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور انسان اس عظیم دولت سے محروم ہوجاتا ہے۔

ب۔ اس نے عقل کے تحفظ کے لئے ایک طرف اسکے مسلسل استعمال کی دعوت دی ہے۔ عقائد کے استحکام کے لئے عقل کا استعمال۔ تفکر کائنات کے لئے عقل کا استعمال۔ ارتقاء علم کے لئے عقل کا استعمال۔ ترقی بشریت کے لئے عقل کا استعمال۔ فریب و تشکیک سے نجات کے لئے عقل کا استعمال۔

اور دوسری طرف اسے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر طرح کی نشہ آور چیز کو

حرام کر دیا ہے کہ اس سے تھوڑی دیر کے لئے سہی عقل معطل ہوجاتی ہے اور اسلام اس کے تعطل کو ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ اس کی نگاہ میں انسانوں کا کل امتیاز ان کی عقل سے ہے۔ عقل ہی معطل ہوجائے تو انسانیت میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔

عقل کی عظمت کے لئے روایات میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عقل محفوظ ہے تو انسان ہر طرح کی برائی سے محفوظ رہ سکتا ہے لیکن عقل معطل ہوجائے تو انسان ہر طرح کی برائی انجام دے سکتا ہے۔ گویا عقل ایک سدِّ سکندری ہے جو انسان کو ہر سیلاب و طوفان سے محفوظ رکھتی ہے اور اس کا تعطل ایک باندھ کا ٹوٹ جانا ہے جس کے بعد پوری انسانی آبادی سیلاب و طوفان کی نذر ہوسکتی ہے۔

ج۔ جان ایک ایسی قیمتی شے ہے جس کے بارے میں مثل مشہور ہے کہ "جان ہے تو جہان ہے" ورنہ کچھ نہیں ہے۔ اسلام نے اس کی واقعی اہمیت کے پیش نظر اسے ہر طرف سے محفوظ بنایا ہے اور ہر خطرہ سے بچانے کا انتظام کیا ہے۔

ایک طرف ہر اس غذا کو حرام کر دیا ہے جس سے زندگی خطرہ میں پڑ جائے۔ اور دوسری طرف ہر اس وسیلہ اور عمل پر پابندی لگا دی ہے جو انسانی زندگی کا دشمن ہو۔ وہ اس عبادت کو بھی عبادت نہیں قرار دیتا ہے جس سے بلا سبب زندگی خطرہ میں پڑ جائے اور اس عمل کو عمل صالح نہیں شمار کرتا ہے جس کا حملہ زندگی پر ہوجائے۔

وہ دوسروں کی طرف سے قتل نفس کو عذاب ابدی کا سبب قرار دیتا ہے تو خود صاحب زندگی کو بھی خودکشی کی اجازت نہیں دیتا ہے اور اسے بھی ایک جرم عظیم کا درجہ عطا کرتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں زندگی سے بالاتر کوئی شے نہیں ہے اور اس کے بے شمار احکام کا محور و مرکز یہی زندگی اور جان ہے جس کی حفاظت انسانیت کا اولین فریضہ ہے۔

د۔ مال

اگر دنیا کا کوئی کار خیر مال کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے تو مال کو تمام خیرات و صدقات کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کی عظمت و اہمیت کو اسی پیمانہ پر ناپا اور تولا جاسکتا ہے۔ اسلام نے مال کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسے خیر سے تعبیر کیا ہے اور اس کے مکمل تحفظ کا انتظام

کیا ہے۔ اس کی نگاہ میں اگر چوری۔ ڈاکہ اور غصب جُرم ہے کہ اس طرح مال کی ملکیت خطرہ میں پڑجاتی ہے تو اس کا اسراف بھی جائز نہیں ہے کہ یہ مال کی مالیت کی توہین ہے اور اس کی کھلی ہوئی نا قدری ہے۔ انسان مال کی عظمت و اہمیت سے باخبر ہو تو ہرگز اسراف نہیں کرسکتا ہے۔ اسراف مال کی نا قدری کی بہترین دلیل ہے اور اسی سے اسلام کی نگاہ میں مال کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۵۔ آبرو

اگرچہ آج کی مغربی دنیا اس لفظ کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں ہے اور اسکی نظر میں عزت و غیرت و شرم وحیا اور شرافت و آبرو بے معنی الفاظ ہیں لیکن اسلام نے اس کے مفہوم کی وضاحت بھی کی ہے اور اس کی اہمیت کا اعلان بھی کیا ہے۔

اسلام میں انسانی آبرو کی اس قدر اہمیت ہے کہ وہ نامحرم کی طرف نگاہ کو بھی جائز نہیں قرار دیتا ہے اور اس کے اعتبار سے مرد کا عورت پر نگاہ کرنا صرف عورت کی آبروریزی کے مرادف نہیں ہے بلکہ اپنی آبرو کی بھی بربادی ہے لہٰذا وہ اسے برداشت نہیں کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عورت قابل احترام نہ بھی ہو تو اسلام مرد کو اپنی آبرو کے تحفظ کا حکم دیتا ہے اور اسے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

اسلام میں حفظ آبرو کے تصور ہی نے ہر طرح کے جنسی جرم کو بدترین جرم قرار دیا ہے اور اس کی سخت ترین سزا قرار دی ہے۔ اُس کی نگاہ میں چند لمحہ جنسی لذت حاصل کرنے والا چونکہ اپنی اور عورت کی آبرو برباد کرتا ہے لہٰذا اس کی سزا یہ ہے کہ اسے منظر عام پر ۱۰۰ کوڑے لگائے جائیں تاکہ جسمانی لذت کے مقابلہ میں جسمانی اذیت کا احساس پیدا ہو اور آبروریزی کی سزا میں مجمع عام میں بے آبروئی کا سامنا کرنا پڑے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ غیر شادی شدہ عورت کی آبرو ایک شخص کی آبرو ہے لہٰذا اسلام نے اسکی سزا ۱۰۰ کوڑوں کی شکل میں معین کی ہے لیکن شوہر دار عورت سے زنا دو انسانوں کی آبرو سے کھیل کرنا ہے لہٰذا کوڑے کے بجائے سنگسار کو سزا قرار دیا ہے۔

عورت مرد کے تعلقات تو پھر فطری ہیں صرف قانون کی خلاف ورزی کی گئی ہے

لہٰذا کوڑے اور سنگسار کی شکل میں سزا دی گئی ہے۔ ہمجنسی تو ایک غیر فطری عمل ہے جہاں پوری صنف کی آبرو سے کھلواڑ کیا جاتا ہے لہٰذا اس کی سزا اس سے بھی سخت تر ہے اور اس کے نتیجہ میں انسان بدترین انداز سے قتل کیا جاتا ہے اور اسے بلندی سے پھینک دیا جاتا ہے یا اس پر دیوار گرادی جاتی ہے کہ اس نے شرافت کی عمارت کو مسمار کر دیا ہے اور انسانی عظمت کو آخری بلندی سے نیچے پھینک دیا ہے۔

استنتاج

اسلام کے ان بنیادی نکات پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے نہ تو کسی غیر اہم شے کو اہم قرار دیا ہے اور نہ کسی اہم شے کی اہمیت کو پامال ہونے دیا ہے اس نے انسانی وجود کے جواہرات کا تحفظ کیا ہے اور اپنے سارے احکام و قوانین کو انھیں کے گرد گھومنے کا عمل سپرد کر دیا ہے۔

اس کی نگاہ میں انسان کی مجرمانہ ذہنیت کو بھی اسی پیمانہ میں ناپا اور تولا جاسکتا ہے اور جو جس قدر ان جواہرات کا دشمن ہوگا وہ اسی قدر بڑا مجرم اور نالائق ہوگا۔ تنہا عقیدہ کا دشمن چھوٹا مجرم ہے اور عقیدہ و عقل دونوں کا مجرم اس سے بڑا مجرم ہے قتل نفس شامل ہوجائے تو مجرم اور بڑا مجرم ہوجاتا ہے اور غصب مال کی شمولیت اس کے جرم کو اور سنگین بنا دیتی ہے۔ آبروریزی انسان کو جرائم کی آخری منزل تک پہونچا دیتی ہے جہاں انسان، انسان کہے جانے کے قابل نہیں رہ جاتا ہے۔

واضح رہے کہ اسلام کی موجودہ شریعت اگرچہ سرکار دو عالمؐ کی لائی ہوئی ہے اور اسی بنیاد پر اسے شریعت محمدیؐ کہا جاتا ہے لیکن مذکورہ بالا قوانین کا تعلق اصل دین اسلام سے ہے۔ صرف اس شریعت سے نہیں ہے۔ دین اسلام نے ہر دور شریعت میں انھیں پانچ جواہرات کا تحفظ کیا ہے اور اس کے قوانین ہمیشہ انھیں مراکز کے گرد گردش کرتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان حدود سے تجاوز کرنے والا اور ان جواہرات کا ضائع کرنیوالا صرف ایک شریعت کا مجرم نہیں ہے بلکہ ہر شریعت الٰہیہ کا مجرم ہے اور ہر دور قانون کے

اعتبار سے مجرم اور گنہگار کہے جانے کے قابل ہے۔ پھر اگر کوئی شخص پانچوں جرائم کا مرتکب ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصل دین کا دشمن ہے اور اس کا مقصد حیات شریعت اسلام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا ہے اور یہ جرم کسی قیمت پر قابل برداشت نہیں ہے۔

تاریخ اسلام میں یزید ایسے ہی مجرم کا نام ہے جس نے تمام شریعتوں کی مخالفت کی ہے —— اور تمام حدود الٰہیہ کو پامال کر دیا ہے۔ وہ عقیدہ کی منزل میں رسالت کو بنی ہاشم کا کھیل تماشہ اور ڈھونگ قرار دے رہا تھا تو عقل کی منزل میں بدترین شرابی تھا۔ احترام نفس و حیات کے مرحلہ پر وہ کائنات کے عزیز ترین انسانوں کا قاتل تھا تو احترام مال کی منزل میں تمام حقوق الٰہیہ اور حقوق العباد کا غصب کرنے والا۔ احترام آبرو کی منزل میں وہ اس ذلّت و رسوائی کی منزل پر تھا جہاں سوتیلی ماں بہن بھی حلال ہو جاتی ہیں اور انسان کسی طرح کی شرم و حیا کا مالک نہیں ہوتا ہے۔

ایسی صورت حال میں یزید کی خلافت کی کامیابی تمام شریعتوں کی پامالی اور تمام انبیاء کرام کی زحمتوں کی بربادی کے مرادف تھا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ کوئی ایسا غیرت دار شخص ہو جو اپنے سارے گھر کی بازی لگا کر اُٹھ کھڑا ہو اور یزید کو اس کی مہم میں ناکام بنا دے۔ ایسا انسان ایک شریعت کا محافظ اور ایک پیغمبر کا وارث نہ ہوگا بلکہ تمام شریعتوں کا محافظ اور تمام انبیاء کرام کا وارث ہوگا۔ اس کا حق ہوگا کہ اسے "بنا لا الٰہ است حسینؑ" کے لفظ سے یاد کیا جائے اور اس کی حق شناسی کا تقاضا ہے کہ اسے آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کا وارث کہہ کر سلام کیا جائے اور اس خدمات کا دائمی اور ابدی اعتراف کیا جائے۔!

۵۔ احاطۂ احکام

اسلامی نظام کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کے قوانین انسان کے مکمل وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور وہ انسانی زندگی پر پیدائش کے پہلے سے نگاہ ڈالتا ہے اور مرنے کے بعد تک اسے نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں سمجھتا ہے۔

اس نے اگر ایک طرف اپنے تعلیمات کا آغاز انسان کے وجود کے پہلے والدین کے عقد سے کیا ہے تو دوسری طرف اس کی تکمیل وفات کے بعد میراث کے مسائل سے کی ہے اس کی نظر میں نہ انسان کا وجود ولادت سے قبل نظر انداز کئے جانے کے قابل ہے اور نہ مرنے کے بعد۔

دنیا کے نظاموں کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان میں مرنے کے بعد کے لئے کوئی خانہ نہیں رکھا گیا ہے اور لاش کو ایک مُردہ جسم سمجھ کر مُردہ خانہ کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور اس کے اموال کو لاوارث سمجھ کر حکومتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

یہی حال پیدائش سے پہلے کا ہے کہ انسان کے وسائل ولادت پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ہے بلکہ جو بچہ جس طرح پیدا ہو جاتا ہے اسے قانونی شکل دیکر اس کی پرورش و پرداخت کو سرکاری اداروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اسلام کا نظام اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ابتدائی منزل ہی سے ولادت کے وسائل پر بھی زور دیتا ہے اور ہر بچہ کو حلالی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے تاکہ خشت اول کج نہ ہونے پائے کہ دیوار ثریا تک ٹیڑھی چلی جائے۔!

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

اعتبار سے مجرم اور گنہگار کہے جانے کے قابل ہے۔ پھر اگر کوئی شخص پانچوں جرائم کا مرتکب ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصل دین کا دشمن ہے اور اس کا مقصد حیات شریعت اسلام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا ہے اور یہ جرم کسی قیمت پر قابل برداشت نہیں ہے۔

تاریخ اسلام میں یزید ایسے ہی مجرم کا نام ہے جس نے تمام شریعتوں کی مخالفت کی ہے ـــــ اور تمام حدود الٰہیہ کو پامال کر دیا ہے۔ وہ عقیدہ کی منزل میں رسالت کو بنی ہاشم کا کھیل تماشہ اور ڈھونگ قرار دے رہا تھا تو عقل کی منزل میں بدترین شرابی تھا۔ احترام نفس و حیات کے مرحلہ پر وہ کائنات کے عزیز ترین انسانوں کا قاتل تھا تو احترام مال کی منزل میں تمام حقوق الٰہیہ اور حقوق العباد کا غصب کرنے والا۔ احترام آبرو کی منزل میں وہ اس ذلّت و رسوائی کی منزل پر تھا جہاں سوتیلی ماں بہن بھی حلال ہو جاتی ہیں اور انسان کسی طرح کی شرم و حیا کا مالک نہیں ہوتا ہے۔

ایسی صورت حال میں یزید کی خلافت کی کامیابی تمام شریعتوں کی پامالی اور تمام انبیاء کرام کی زحمتوں کی بربادی کے مرادف تھا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ کوئی ایسا غیرت دار شخص ہو جو اپنے سارے گھر کی بازی لگا کر اُٹھ کھڑا ہو اور یزید کو اس کی مہم میں ناکام بنا دے۔ ایسا انسان ایک شریعت کا محافظ اور ایک پیغمبر کا وارث نہ ہو گا بلکہ تمام شریعتوں کا محافظ اور تمام انبیاء کرام کا وارث ہو گا۔ اس کا حق ہو گا کہ اسے "بنا لا الٰہ است حسینؑ" کے لفظ سے یاد کیا جائے اور اس کی حق شناسی کا تقاضا ہے کہ اسے آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفےٰؐ کا وارث کہہ کر سلام کیا جائے اور اس کے خدمات کا دائمی اور ابدی اعتراف کیا جائے۔!

۵۔ احاطۂ احکام

اسلامی نظام کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کے قوانین انسان کے مکمل وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور وہ انسانی زندگی پر پیدائش کے پہلے سے نگاہ ڈالتا ہے اور مرنے کے بعد تک اسے نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں سمجھتا ہے۔

اس نے اگر ایک طرف اپنے تعلیمات کا آغاز انسان کے وجود کے پہلے والدین کے عقد سے کیا ہے تو دوسری طرف اس کی تکمیل وفات کے بعد میراث کے مسائل سے کی ہے اس کی نظر میں نہ انسان کا وجود ولادت سے قبل نظر انداز کئے جانے کے قابل ہے اور نہ مرنے کے بعد۔

دنیا کے نظاموں کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان میں مرنے کے بعد کے لئے کوئی خانہ نہیں رکھا گیا ہے اور لاش کو ایک مُردہ جسم سمجھ کر مُردہ خانہ کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور اس کے اموال کو لاوارث سمجھ کر حکومتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

یہی حال پیدائش سے پہلے کا ہے کہ انسان کے وسائل ولادت پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ہے بلکہ جو بچہ جس طرح پیدا ہو جاتا ہے اسے قانونی شکل دیکر اس کی پرورش و پرداخت کو سرکاری اداروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اسلام کا نظام اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ابتدائی منزل ہی سے ولادت کے وسائل پر بھی زور دیتا ہے اور ہر بچہ کو حلالی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے تاکہ خشت اول کج نہ ہونے پائے کہ دیوار ثریا تک ٹیڑھی چلی جائے۔!

والسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ

قانونِ اسلام کی انفرادیت

۱۔ اسلام دین ہے

عربی زبان میں دین کے دو معنی ہیں: طریقہ اور جزا۔
"التقیۃ دینی و دین آبائی" (تقیہ میرا اور میرے بزرگوں کا طریقۂ زندگی ہے)۔
"کما تدین تُدان" (جیسا طریقہ اختیار کروگے ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا)۔

دنیا کے مذاہب اور قوانین کا نقص یہ ہے کہ مادیت میں طریقۂ حیات کا تعین ہے جزا کا کوئی ذکر نہیں ہے اور روحانیت میں جزائے آخرت کا زور ہے طریقۂ حیات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اسلام میں طریقۂ زندگی بھی ہے اور تصور جزا بھی ہے۔

اسلام کا تصور جزا اس قدر مستحکم اور وسیع ہے کہ عمل سے پہلے نیت عمل پر جزا ہے اور نعمت پانے کے بعد شکر نعمت پر بھی جزا ہے۔ اپنا ثواب دوسرے کے حوالہ کر دیا جائے تو اس کی بھی جزا ہے اور خیر جاری کا سلسلہ قائم کر دیا جائے تو مرنے کے بعد ہونے والے فوائد کی بھی جزا ہے۔

اسلام کا یہ تصور جزا نہ ہوتا تو مقتول مایوس دنیا سے جاتا کہ زندگی چلی گئی اور جزا ملنے کے امکانات بھی ختم ہو گئے۔ اسلام نے تصور جزائے آخرت دے کر مایوسی کو اطمینان سے تبدیل کر دیا "یا ایتہا النفس المطمئنۃ"۔

۲۔ اسلام مکمل طریقۂ حیات ہے

اسلام میں کردار سازی کا سلسلہ ابتدائے شعور سے نہیں شروع ہوتا ہے بلکہ فطرت

کی بنیاد قائم ہونے اور انعقاد نطفہ کے پہلے سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ رشتۂ ازدواج میں ان امور سے پرہیز کرو جن سے آنے والے کی فطرت متاثر ہو سکتی ہے۔ کافر سے عقد نہ کرو۔ شرابی سے عقد نہ کرو۔ حُسن و جمال اور مال و دولت کی بنیاد پر عقد نہ کرو۔ اپنے نطفہ کے لئے بہترین منزل تلاش کرو کہ یہ ایک زندگی کا نچوڑ ہے اور دوسری زندگی کا سنگ بنیاد۔

اس کے بعد مباشرت میں بھی ان تمام امور سے پرہیز کرو جن سے فطرت پر اثر پڑ سکتا ہے۔ دن، تاریخ، وقت، حالات، آداب سب کا لحاظ رکھو کہ ایک چیز کی غفلت بھی ایک زندگی کو برباد سکتی ہے،

خشت اول چوں نہد معمار کج — تا ثریا می رود دیوار کج

اسی لطیف نکتہ کی طرف لطیف اشارہ ہے۔

آداب مباشرت کے بعد دودھ کے مسائل۔ دودھ کے بعد آغوش کے مسائل۔ آغوش کے بعد غذا کے مسائل۔ غذا کے بعد تعلیم و تربیت کے مسائل اس امر کی علامت ہیں کہ اسلام ایک مکمل طریقۂ حیات ہے جس کا سلسلہ ولادت کے پہلے سے شروع ہوتا ہے۔ اور پھر وفات کے بعد تک قائم رہتا ہے۔ اس میں غسل و کفن میت کے احکام بھی ہیں اور دفن جسد میت کا طریقۂ کار بھی ہے اور ان تمام مراحل میں زندگی کے احترام کو باقی رکھا گیا ہے کہ عام میت کے غسل و کفن میں حائض اور مجنب کی حاضری مکروہ ہے اور معصوم کے غسل و کفن میں غیر معصوم کے ہاتھوں کی شرکت بھی ناقابل برداشت ہے۔

۳۔ اسلام مکمل نظام جزا ہے

اسلام نے جزا کے مرحلہ پر بھی کسی نکتہ کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ پہلے عمل پر انعام پھر شکر نعمت پر انعام — پھر انعام کی مقدار میں مسلسل اضافہ یہاں تک کہ ثواب جماعت اور ثواب صلوات کی شکل میں بےحساب انعام۔

یہاں انعام کی بھی قسمیں ہیں:

۱۔ انعام دنیا۔ جیسے اطاعت معصوم۔ جو انعام دنیا میں معصوم کو اس کے تبلیغی خدمات کی بنا پر ملتا ہے، یا احسان والدین۔ جو والدین کو ان کی خدمات تربیت کی بنا پر ملتا ہے۔

۲۔ انعام بہ شکل جنت جو ہر مومن کو عمل صالح پر ملتا ہے۔

۳۔ انعام بہ شکل رضا جو شب ہجرت جان کی قربانی پر دیا گیا۔

۴۔ انعام بہ شکل تشکر جو اہلبیتؑ کو ان کی سعی پر دیا گیا کہ ان کی سعی کو سعی مشکور بنا دیا گیا۔

۵۔ انعام بہ شکل ذات واجب "ماذا فقد من وجدک" خدایا! جس نے تجھے پالیا اس نے کھویا کیا؟ — (امام حسینؑ دعائے عرفہ)

• اسلام میں نظام سزا بھی جذباتی یا خواہشاتی نہیں ہے بلکہ اس کی بھی بنیاد ہے۔ اس کی نظر میں زندگی کے پانچ بنیادی جواہرات ہیں اور انھیں کے بارے میں کوتاہی موجب سزا بن جاتی ہے:

(۱) عقیدہ (۲) عقل (۳) جان (۴) مال (۵) آبرو

۔ عقیدہ کے تحفظ کے لئے کفر۔ شرک۔ الحاد۔ نفاق۔ شک و ریب وغیرہ کو قابل سزا قرار دیا گیا ہے

۔ عقل کے تحفظ کے لئے شراب اور تمام نشہ آور چیزوں کو حرام اور باعث سزا قرار دیا گیا ہے۔

۔ جان کے تحفظ کے لئے قتل نفس کی جملہ قسمیں اور خودکشی وغیرہ قابل سزا قرار دے دی گئی ہے۔

۔ مال کے تحفظ کے لئے سرقہ۔ غصب جیسے تمام امور کو قابل سزا قرار دے دیا گیا ہے۔

۔ آبرو کے تحفظ کے لئے زنا سے لے کر نامحرم پر نظر تک تمام امور کو حرام اور قابل سزا قرار دے دیا گیا ہے۔

استنتاج:

• مذکورہ امور کے بنیادی جواہرات کے خلاف ہونے کا نتیجہ ہے کہ یہ امور ہر دور شریعت

میں حرام رہے ہیں اور انھیں کسی شریعت میں جائز نہیں قرار دیا گیا ہے۔

• جب یہ امور ہر شریعت میں حرام ہیں تو ہر شریعت کے ذمہ دار کو ان امور سے پاک و پاکیزہ ہونا چاہیئے۔ خدائی رہنما نہ شرابی ہو سکتا ہے نہ زانی۔ نہ چور ہو سکتا ہے نہ قاتل اور نہ کافر۔

• ان امور کا مجرم صرف کسی ایک شریعت کا مجرم نہیں ہے بلکہ ہر دور شریعت کا مجرم اور ہر صاحب شریعت کا باغی ہے۔

• ان امور کا محافظ کسی ایک شریعت کا محافظ نہیں ہے بلکہ ہر شریعت کا محافظ ہے اور درحقیقت انسانی کرامت کا محافظ ہے۔

• یزید میں یہ تمام عیوب موجود تھے لہذا وہ ہر شریعت کا مجرم تھا اور امام حسینؑ نے اس سے کھل کر مقابلہ کیا لہٰذا وہ ہر شریعت کے محافظ تھے "السلام علیک یا وارث آدم صفوۃ اللہ"۔

۴۔ اسلام جواہر کا محافظ ہے

اسلام نے جن امور کو جوہر حیات اور بنیاد کرامت بنی آدم قرار دیا ہے۔ ان کا تحفظ بہت دور سے کیا ہے اور یہ قاعدہ عقل بھی ہے کہ بات جس قدر خطرناک ہوتی ہے تحفظ کا انتظام بھی اتنی ہی دور سے ہوتا ہے۔ چوراہہ پر ایکسیڈنٹ روکنے کے لئے اسپیڈ بہت دور سے کم کی جاتی ہے اور اشارات بہت دور سے ہرے، پیلے بنائے جاتے ہیں تاکہ بروقت روکنا اختیار سے باہر نہ ہو جائے اور حادثہ باعث ہلاکت نہ ہو جائے۔

اسلام نے اسی تحفظ کے پیش نظر محرمات کے پہلو بہ پہلو واجبات اور مستحبات کا ایک سلسلہ قائم کیا۔ عقیدہ کے تحفظ کے لئے جہاں کفر و شرک کو حرام قرار دیا وہیں علم و معرفت کو واجب بھی قرار دیا۔ عقل کے تحفظ کے لئے عقائد میں اس کے استعمال کو واجب بنا دیا۔ جان کے تحفظ کے لئے احترام مومن، عیادت مومن۔ سلام مومن جیسے احکام معین کئے۔ مال کے تحفظ کے لئے جملہ معاملات تجارت۔ اجارہ، شرکت، مزارعہ، مساقاۃ وغیرہ کے احکام معین کئے۔ آبرو کے

تحفظ کے لئے ہر شخص کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا۔ عورت کو حجاب کے زیور سے آراستہ کیا۔ تاکہ واجبات اور محرمات سب مل کر جواہرات زندگی کا تحفظ کریں اور کسی موڑ پر یہ سرمایہ ضائع نہ ہونے پائے۔

۵۔ اسلام میں تناسب جُرم و سزا ہے

دنیاوی قوانین میں عام طور سے دو طرح کی سزائیں رائج ہیں۔ جرمانہ اور جیل۔ اور ان سزاؤں میں جرائم کی نوعیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے اور اس طرح نہ مجرم کو جُرم کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے اور نہ باہر والوں کو جُرم کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اسلام نے جُرم و سزا میں تناسب قائم کر کے مجرم کو بھی احساس جُرم دے دیا اور باہر والوں کو بھی ہوشیار کر دیا کہ ایسے جُرم پر اس طرح کی سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مثال کے طور پر اس نے مرتد ہو جانے والے کی سزا قتل کو قرار دیا کہ جب وہ خدا کے وجود کا انکار کر رہا ہے تو خدا کے بغیر بندہ کا وجود کس طرح رہ سکتا ہے۔

قتل کی سزا کو قتل قرار دیا کہ اگر مقتول کی زندگی کی کوئی حیثیت نہیں ہے تو قاتل کی زندگی کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ بلا جیل یا جرمانہ سے نہیں ٹل سکتی ہے۔

شراب کی سزا کوڑے قرار دئے کہ جس طرح وہ سارے جسم میں سرایت کرتی ہے اُسی طرح سزا بھی جسم کو برداشت کرنی چاہیئے۔

زنا کی سزا بھی کوڑے اور سنگسار کی شکل میں دی گئی کہ بظاہر زنا ایک عضو بدن کا کام ہے لیکن واقعاً اس میں پورے بدن کی شرکت ہے اور سارا بدن لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور مادہ بھی فراہم کرتا ہے۔

اس کے علاوہ مومنین کی ایک جماعت کی حاضری بھی ضروری قرار دے دی گئی کہ عزت لوٹنے والے کو یہ احساس پیدا ہو کہ عزت لُٹنے کا صدمہ کیسا ہوتا ہے۔

چور کے ہاتھ کاٹ دئے کہ جو ہاتھ خیانت کر سکتے ہوں ان کے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد تمام سزاؤں کو شخصیت سے بالاتر بنا دیا کہ شخصیت گناہوں کے پرہیز سے پیدا ہوتی ہے نہ یہ کہ گناہوں کی حیثیت شخصیت سے کمزور ہو جاتی ہے۔

۶۔ اسلام میں جزا و سزا کا ایک وقت مقرر ہے

• دنیا کے نظام میں جزا و سزا میں عجلت کا سب سے بڑا راز یہ ہوتا ہے کہ مجرم کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کسی ملک کا مجرم اگر ملک کے حدود سے نکل گیا یا اس نے دوسرے ملک میں پناہ لے لی تو اب قانون ہر طرف سے مجبور ہو گیا اور سزا کا اختیار اس کے ہاتھوں سے نکل گیا اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر ملک کے حدود معین ہیں اور ان حدود سے باہر قانون یا سربراہ مملکت کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

• اسلام میں ملک الٰہی کا تصوّر اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے عقیدہ میں یہ کُل کائنات ایک خالق کی مخلوق ہے اور وہی اس کا مالک اور حاکم ہے۔ لہٰذا اس کے حدود مملکت سے باہر نکل جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

• اگر دنیا میں حد جاری کرتا ہے تو اس کا مقصد دوسروں کے لئے عبرت ہوتا ہے۔ یا مجرم کا دوبارہ جرأت گناہ نہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس کا راز بھی یہی ہے کہ اگر تمام جزا و سزا کا معاملہ مستقبل پر ڈال دیا جائے تو کمزور ذہن یا ناقص عقیدہ کا انسان اس کی طرف سے یکسر غافل ہو جائے گا اور پھر کوئی گناہوں سے روکنے والا نہ ہوگا۔

اس نے ان تمام جرائم کی سزا دنیا میں رکھی جن پر نظام کے چلنے اور انسانیت کے باقی رہنے کا دار و مدار تھا اور باقی زندگی کا محاسبہ آخرت پر چھوڑ دیا۔

• اسلام کے نظام حدود کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے پانچ قسم کے جرائم کی سزا دنیا میں رکھی ہے اور یہ وہی جرائم ہیں جن کا تعلق زندگی کے پانچ جواہرات سے تھا۔ سابق میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اسلام کے جملہ قوانین کی بنیاد پانچ جواہرات کے تحفظ پر ہے۔ مذہب، عقل، جان۔ مال۔ آبرو۔ ان امور کے تحفظ کے بغیر نظام کے چلنے یا دنیا میں امن و امان قائم ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس لئے اسلام نے ان کی سزا دنیا ہی میں مقرر کر دی تاکہ لوگ

عبرت حاصل کریں اور سماج تباہ و برباد نہ ہونے پائے۔

• اس نے مذہب سے بغاوت کرنے اور مرتد ہوجانے کی سزا قتل قرار دی کہ جو شخص وجود خدا کا قائل نہیں ہے اسے اپنے وجود کے اثبات کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لئے کہ مخلوق کا وجود خالق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

• اس کے بعد عقل کے تحفظ کے لئے مسکرات کے اعمال پر ۸۰ کوڑے معین کردئے کہ یہ شخص وجود خالق کا اقرار رکھتا ہے لیکن اس کے نشہ سے سماج کی عزّت کو خطرہ ہے لہٰذا اسے سرعام رُسوا ہونا چاہیئے۔

• مال کے تحفظ کے لئے چور کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ کیا تاکہ جُرم کا استیصال ہوجائے اور دوسرا آدمی ایسے گناہ کا ارادہ بھی نہ کرے۔

• جان کے تحفظ کے لئے قتل کے قصاص کو قتل ہی قرار دیا تاکہ انسان یہ محسوس کرے کہ اگر دوسروں کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے تو اُس کی زندگی کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے۔

• آبرو کے تحفظ کے لئے زنا۔ لواط۔ تہمت زنا جیسے تمام امور پر حد مقرر کی کہ یہ امور دوسروں کی بھی آبروریزی کرتے ہیں اور درحقیقت اپنی آبرو کا بھی خاتمہ کردیتے ہیں۔

اس کے بعد دیگر جملہ جرائم کی سزا آخرت میں رکھی اور جزا کا نظام بھی آخرت سے متعلق کردیا اور اس کے دو اسباب ہیں:

ا۔ جزا و سزا کا اسلامی تصور دنیا میں ممکن ہی نہیں ہے۔ اسلام جزا اس ثواب کو کہتا ہے جس میں کسی طرح کے عذاب، الم، رنج، دُکھ درد کی آمیزش نہ ہو اور سزا اس عذاب کو کہتا ہے جس میں کسی طرح کی راحت کا تصوّر نہ ہو۔ اور کُھلی ہوئی بات ہے کہ اس تصوّر کا تحقق اس دنیا میں ناممکن ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی راحت نہیں ہے جس میں تکلیف کا پہلو نہ ہو اور کوئی ایسی تکلیف نہیں ہے جس میں راحت اور فائدہ کا تصوّر ممکن نہ ہو۔ اس لئے واقعی ثواب و عذاب کا تصور اس دنیا میں ناممکن ہے اور اس کے لئے ایک ایسے عالم کا ہونا ضروری ہے جہاں خواہشات بھی آزاد ہوں اور ان کی تسکین کا بھی سامان ہو تاکہ کسی طرح کی روحانی اذیت کا امکان بھی نہ ہو "فیہا ما تشتہیہ الانفس وتلذ الاعین"۔

ب۔ اسلام کے نظام جزا و سزا میں اضافہ اور تخفیف کا امکان بھی شامل ہے۔ جزا کی منزل میں اسلام نے یہ امکان رکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے حق میں دوسرے شخص نے کوئی عمل خیر کیا ہے تو اس کا اجر و ثواب بھی اس شخص کے نامۂ اعمال میں درج کردیا جائے گا جس کے لئے عمل کیا گیا ہے۔ اور سزا کی منزل میں یہ امکان رکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے حق میں ظلم کیا ہے اور اس نے معاف کردیا، یا خدائی جُرم کیا ہے اور توبہ کرلی ہے تو عذاب میں تخفیف ہوجائے گی۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مکمل حساب موت سے پہلے ممکن نہیں ہے جب توبہ کا دروازہ بند ہوجائے اور مزید کار خیر کا امکان نہ رہ جائے۔ بلکہ مرنے کے بعد بھی یہ دفتر بند نہیں ہوسکتا ہے اور اس کا امکان بھی موجود ہے کہ انسان نے کوئی خیر جاری کا سلسلہ جاری کردیا ہو اور اس کا ثواب شامل ہوتا رہے یا کوئی شخص اس کے حق میں عمل خیر کرتا رہے اور اس کا ثواب شامل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مکمل حساب اسی وقت ممکن ہے جب تمام کار خیر کرنے والے مرجائیں اور جملہ امکاناتِ عمل خیر کا خاتمہ ہوجائے اور یہ بات قیامت سے پہلے ممکن نہیں ہے۔

۔ تیسرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر جزا و سزا کا سلسلہ دنیا تک محدود ہوجائے تو بہت سے بڑے بڑے جرائم کی سزا کا امکان ختم ہوجائے گا۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے بلا خطا ایک شخص کو قتل کیا اور اس کے بعد خودکشی کرلی تو ایسی صورت میں دو سنگین حادثات پیش آئے ۔۔ ایک مظلومانہ قتل جس کا اجر ملنا چاہیئے اور ایک قاتلانہ حملہ اور پھر خودکشی جس کی دُوہری سزا ملنا چاہیئے لیکن اگر نظام جزا و سزا کو دنیا تک محدود کردیا جائے تو نہ مظلومانہ قتل جیسے عظیم حادثہ کا اجر مل سکتا ہے اور نہ قتل و خودکشی جیسے بدترین جرائم کی سزا مل سکتی ہے۔

ضرورت ہے کہ ان تمام معاملات کو کسی اور دن (آخرت) پر اٹھا رکھا جائے تاکہ مکمل محاسبہ ممکن ہو اور ہر شخص کو اس کا واقعی اجر یا اس کی قرار واقعی سزا دی جاسکے۔

۷۔ قانون بلاتفریق و امتیاز

اسلام ایک ایسا قانون ہے جس میں کسی طرح کی تفریق نہیں ہے۔ اس کی نظر میں امیر، غریب۔ عالم و جاہل۔ مرد و عورت سب مخلوق خدا ہیں لہٰذا خدائی قانون سب پر برابر

سے نافذ ہے اور سب پر عملدرآمد کرنا فرض ہے۔ اس کے قانون میں انبیاء و مرسلین اور شہداء و صدیقین کا بھی استثناء نہیں ہے اور نہ کسی کی طرح مروت ہے۔

اس کے نظام میں پیغمبرؐ سے چور کے بارے میں سفارش کی جاتی ہے تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اس کی جگہ میری بیٹی فاطمہؑ بھی ہوتی تو اس کے ہاتھ قلم کر دیتا۔ اور پروردگار شرک کی سنگینی کا اعلان کرتا ہے تو خود پیغمبرؐ سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اگر تم شرک اختیار کر لو گے تو تمھارے اعمال بھی برباد کر دئے جائیں گے۔ اس کے بعد مقام غدیر میں اعلان ہوتا ہے کہ اگر تم نے اس پیغام کو نہیں پہونچایا تو گویا کوئی پیغام نہیں پہونچایا ہے اور تمھیں اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔

اسلام نے نابالغ کے جرائم کو اس لئے معاف کیا ہے کہ انھیں منزل بلوغ تک سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جا سکے اور وہ مکمل شعور کے بعد ذمہ داری سنبھالیں ورنہ ذمہ داری سنبھال لینے کے بعد پھر کسی طرح کی رعایت نہیں ہے۔

اسی طرح بعض جرائم میں اگر عورتوں کی سزا مردوں سے مختلف ہے تو وہ ان کی خلقت اور جسمانی ساخت وکیفیت کا اثر ہے ورنہ اصل سزا میں کوئی استثناء نہیں ہے بلکہ قرآن مجید نے تو یہ توازن بھی رکھا ہے کہ چوری کے مسئلہ میں مرد کا ذکر پہلے کیا ہے اور عورتوں کا ذکر بعد میں۔ "السارق والسارقة فاقطعوا ایدیهما" (مائدہ ۳۸)

اور زنا کے مسئلہ میں عورتوں کا ذکر پہلے کیا ہے اور مردوں کا ذکر بعد میں۔ "الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة" (نور ۲)

اور شائد اس کا راز یہ ہے کہ چوری مردانہ کام ہے اور عام طور سے ایسے کاموں میں سبقت مردوں کی طرف سے ہوتی ہے اور زنا ایک خواہشاتی عمل ہے جس کی تحریک اور اس کا اشارہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے ورنہ اس کے بغیر مرد میں قدم آگے بڑھانے کی جرأت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن بہرحال دونوں جرائم میں دونوں کا ذکر ہے اور دونوں کی سزا ہے اور کسی طرح کا استثناء یا تفرقہ نہیں ہے۔

اس کے بعد اجر و ثواب کی منزل میں تو مسئلہ اور بھی واضح ہے کہ وہاں بلوغ کا انتظار

بھی نہیں کیا گیا بلکہ نابالغ نے بھی کوئی عمل خیر انجام دیا ہے تو اس کا اجر و ثواب بھی طے کر دیا ہے۔ اس لئے کہ کمسن بچہ سے مواخذہ کرنا اور سزا دینا خلاف عقل و منطق یا خلاف عدل و انصاف ہو سکتا ہے لیکن اسے انعام دینا تو کسی عقل و منطق کے خلاف نہیں ہے بلکہ عقل اسے ایک مستحسن اور حوصلہ افزا عمل قرار دیتی ہے۔

۸۔ واضع قانون فوق الکل

کسی قانون میں کمزوری اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کا بنانے والا بھی قانون کی زد میں آتا ہے اور اُسے ہر آن یہی فکر رہتی ہے کہ قانون میں ایسی گنجائش رکھی جائے کہ اپنے مفادات خطرہ میں نہ پڑنے پائیں اور اپنے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہونے پائے۔

اس کے بعد یہی پریشانی عملدرآمد میں ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے کہ قانون ساز فرد یا ادارہ کا فطرتاً جاہل پیدا ہونا ہی قانون کے لئے ایک پیام موت ہے کہ وہ نہ تمام خصوصیات کا ادراک کر سکتا ہے اور نہ تمام خصوصیات کو نگاہ میں رکھ کر مکمل قانون بنا سکتا ہے۔

اسلام کے قانون کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کا قانون ساز پروردگار ہے جس کا علم کل کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو محیط اور اس کی ذات اقدس تمام مفادات اور مصالح سے بالاتر ہے۔ اس کے قانون سے زیادہ حکیمانہ اور پاکیزہ قانون ممکن نہیں ہے۔

اس نے اپنے قانون کی ترسیل میں بھی اس ملک کو ذریعہ قرار دیا جو روح الامین اور ملک مقرب تھا تاکہ اس مرحلہ پر بھی جذبات وخواہشات اور مفادات کی آمیزش نہ ہونے پائے اور پھر تعمیل میں بھی ان معصوم انسانوں کو ذریعہ قرار دیا جنھیں ہر طرح کے رجس، سہو و نسیان اور جرم و خطا سے پاک و پاکیزہ رکھا تھا تاکہ قانون کا تقدس مجروح نہ ہونے پائے اور وہ اپنی اصلی پاکیزگی پر باقی رہے۔

۹۔ جامع جسم و روح

دنیا کے بعض قوانین میں سارا زور مادیات اور جسمانیات پر ہے اور روحانیت کا

کوئی تصور نہیں ہے اور بعض نظاموں میں سارا زور روحانیت اور رہبانیت پر ہے اور جسمانیات و مادیات کا کوئی نظام نہیں ہے۔ لیکن اسلام نے دونوں پہلوؤں کا مکمل خیال رکھا ہے۔ اس کی روحانیت جسم سے اور اس کی جسمانیت روح سے الگ نہیں ہے۔

اس نے پہلے روح کے لئے عقائد کا نظام بنایا اور جسم کے لئے اعمال کا۔ اس کے بعد دونوں کو یوں جمع کر دیا کہ روحانی ارتقاء کے لئے جسمانی عبادات کو ذریعہ بنا دیا اور مادی مالیات میں نیت قربت کو شامل کر کے روح کے ارتقاء کا ذریعہ بنا دیا۔

۱۰۔ جامع انفراد واجتماع

اسلام نے انسان کی انفرادی زندگی کو بھی نگاہ میں رکھا ہے اور اس کے اجتماعی مسائل کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انفرادی ارتقاء کے لئے نماز جیسا عمل معین کیا جو تنہائی میں بند کمرہ میں انجام پا سکتا ہے اور اجتماعی زندگی کے لئے زکوٰۃ کا قانون بنایا جس سے معاشرے کے غریب افراد کی امداد ہوتی ہے اور رفاہ عام کا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

اسلام کا حقیقی نمائندہ اور اس کے پروردگار کا واقعی ولی وہی ہوگا جس کی زندگی میں دونوں پہلو بیک وقت جمع رہیں۔ "یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون"۔

۱۱۔ جامع حقوق اللہ وحقوق العباد

اسلام نے انسان کے ذمہ دو طرح کے حقوق معین کئے ہیں۔ ایک حق اس کا ہے جس نے پیدا کیا ہے اور ایک حق اُن کا ہے جن کے درمیان پیدا کیا ہے اور جن کی شخصیت کو اس کی زندگی کے لئے ممد و معاون قرار دیا ہے۔ دنیا کے دوسرے نظام اس خصوصیت سے بھی محروم ہیں اور مادی نظاموں میں خدا کا کوئی حق نہیں ہے تو روحانی نظاموں میں نہ [illegible] ہے اور نہ معاشرہ کے حقوق۔

اسلام میں تین طرح کے حقوق ہیں:

۱۔ حق اللہ جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔

۲۔ حق العباد جیسے احسان والدین، تجہیز وتکفین مومنین وغیرہ۔

۳۔ حق مشترک بین اللہ والعباد۔ جیسے کہ خمس کہ اس میں دونوں حقوق شامل ہیں اور اس کا غاصب دونوں کے حقوق کا غاصب ہے۔

۱۲۔ جامع سیاست ومذہب

مذہب اللہ تک پہونچانے کا راستہ ہے تو سیاست نظام زندگی کی اصلاح کا ذریعہ۔ اسلام کے قانون میں دونوں باتوں کی یکساں اہمیت ہے لہٰذا یہاں نہ مذہب سیاست سے الگ ہے اور نہ سیاست مذہب سے۔ یہ اور بات ہے کہ سیاست مذہب کی بنیاد نہیں ہے بلکہ مذہب سیاست کی بنیاد ہے۔

اسلام کا ہر سیاسی اقدام مذہب کے مفادات کے پیش نظر ہوتا ہے۔ وہ جنگ کرتا ہے تو نماز کے قیام کے لئے اور جنگ روکتا ہے تو نماز کے قیام کے لئے "فاذا اطمأننتم فاقیموا الصلوٰۃ"۔ اس کے علاوہ اسلام نے جملہ سیاسی مسائل کو مذہب کے زیر اثر طے کیا ہے۔ اس کے عبادات میں سیاسی رنگ انتہائی واضح ہے۔ وہ عبادت سے سیاست کا کام نہ لیتا تو نماز میں جماعت، جمعہ میں علاقائی اجتماع، حج میں عالمی اجتماع، مصارف زکوٰۃ میں رفاہ عام، مصارف خمس میں قیام دولت اسلام جیسے مسائل کو اہم نہ قرار دیتا۔ اسلام کا یہ انداز قانون اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اس کی عبادت سیاست سے اور اس کی سیاست عبادت سے جدا نہیں ہے اور وہ ایک کامل، جامع اور ہمہ گیر قانون ہے جس کی مثال دنیا کے کسی قانون میں نہیں ہے۔!

فقہ جعفری کے امتیازات

اس سلسلہ میں پہلی بات قابل وضاحت یہ ہے کہ اسلام میں فقہ جعفری کا الگ کوئی وجود نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق امام جعفر صادقؑ کے افکار و آرا ءسے ہے۔

یہ ایک مجموعۂ احکام ہے جس میں تمام ارباب عصمت وطہارت کے ارشادات و فرامین شامل ہیں اور اس کا سلسلہ سرکار دو عالمؐ سے شروع ہو کر امام زمانہؑ پر تمام ہوتا ہے۔

فقہ جعفری کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس میں زیادہ تر احکام اور مسائل امام جعفر صادقؑ سے نقل کئے گئے ہیں اور بنی امیہ و بنی عباس کی کشمکش میں آپ ہی کو اتنا موقع ملا تھا کہ احکام دین کی اشاعت کر سکیں اور بزرگوں کے بیانات و ارشادات کو مرتب کر سکیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے دور سے پہلے مسلمانوں میں مکاتب فقہ کا وجود نہیں تھا۔ عام مسلمان قرآن و حدیث کے حفظ پر لگے ہوئے تھے۔ مقدمات کا فیصلہ قاضی حضرات کر رہے تھے اور خلفاء اسلام خود اس مرتبہ کے حامل بنے ہوئے تھے کہ انھیں حلال محمدؐ کو حرام کرنے کا حق ہے اور حرام محمدؐ کو حلال بنانے کا۔

بنی امیہ و بنی عباس کی کشمکش خلافت نے علم کو منظر عام پر آنے کا موقع دیا اور اب دونوں کو اہل علم کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ دونوں کو اندازہ ہو گیا کہ خلافت اور حکومت عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔ اب اہل علم کا سہارا لینا ضروری ہے۔ چنانچہ ہر ایک نے ایک سرکاری عالم مقرر کر دیا اور عوام کو یہ تاثر دینا شروع کر دیا کہ مملکت کے سارے کام اسی کے حکم اور فتویٰ کے مطابق ہو رہے ہیں اور اس طرح فقہی مکاتب وجود میں آ گئے۔

تمام مکاتب کی بنیاد قرآن و حدیث کے علاوہ قیاس۔ استحسان۔ مصالح مرسلہ وغیرہ

پر تھی لہٰذا وہ سب آپس میں ایک طرح کا اشتراک رکھتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے قرآن و سنت کے علاوہ تمام مدارک کا انکار کر دیا تھا لہٰذا ان کی الگ ایک فقہ تیار ہو گئی جس میں تمام معصومینؑ کے ارشادات شامل تھے اور جس طرح ابوحنیفہ کی طرف سے آنے والی فقہ، فقہ حنفی بن گئی اور مالک کی فقہ کا نام فقہ مالکی ہو گیا اسی طرح امام جعفر صادقؑ کی طرف سے آنے والے احکام کا مجموعہ فقہ جعفری کے نام سے موسوم ہو گیا۔

• ۔ اس فقہ کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ اس میں کسی غیر معصوم کا دخل نہیں تھا اور اس کے تمامتر مصدر و مرکز سب معصوم تھے جن کی عصمت وطہارت کا اعلان صراحتاً قرآن مجید نے کر دیا تھا یا جن کے بارے میں آیۂ تطہیر نے اعلان عصمت کیا تھا انھوں نے ان حضرات کی عصمت کی تصدیق و توثیق کر دی تھی۔ اس کے برخلاف جملہ مکاتب فقہ میں کوئی مکتب ایسا نہیں تھا جس کا ذمہ دار عصمت کردار کا مالک رہا ہو اور اس کے بارے میں کسی طرح کی عصمت کی کوئی ضمانت حاصل رہی ہو۔

• ۔ دوسرا امتیاز یہ تھا کہ اس فقہ کا اُس دور کا ذمہ دار بھی اپنے دور کے تمام فقہاء سے بالاتر حیثیت کا مالک تھا اور تمام فقہاء بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے شاگرد تھے اور اس کے مدرسۂ فکر سے اسقدر استفادہ کر چکے تھے کہ اس دور کے امام اعظم تک نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اگر میں نے دو سال جعفر بن محمدؑ کی شاگردی نہ کی ہوتی تو ہلاک ہو گیا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جب مسئلہ اس منزل پر پہونچ جائے کہ ایک طرف شاگردوں کا مجمع ہو اور ایک طرف سب کا استاد ہو تو فطری طور پر نگاہیں استاد کی طرف مُڑ جائیں گی جب تک کوئی سیاست یا مصلحت اس رخ سے ہٹانے کے لئے آمادہ نہ ہو۔

گویا فقہ جعفری کے ذمہ دار امام جعفر صادقؑ کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ پروردگار کی طرف سے عصمت کردار کے مالک تھے اور بندگان خدا کی طرف سے بہترین اعترافات کے حامل تھے اور ہر شخص کو آپ کی شخصیت وجلالت کا مکمل اعتراف تھا۔

• ۔ اس فقہ کا تیسرا امتیاز یہ تھا کہ اس کا عصمتی ذخیرہ بھی بہت عظیم تھا اور دنیا کے تمام مسائل حل کرنے کے لئے کافی تھا۔ عام فقہی مکاتب میں عصمت کے فقدان کی بنا پر

فقہ کا مصدر صرف قول و فعل پیغمبرؐ تھا اور اس کے نتیجہ میں ذخیرہ بہت مختصر تھا۔ فقہ جعفری کا مصدر و ماخذ صرف سرکار دو عالمؐ نہیں بلکہ جملہ معصومینؑ تھے لہذا اس کا ذخیرہ بہت عظیم تھا اور اس میں تمام مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ وہ اپنی روایاتی جامعیت کی بنا پر نہ کسی کے قیاس کی محتاج تھی اور نہ استحسان کی۔ اس کے مسائل کو حل کرنے کے لئے نہ کسی سد ذرائع کی ضرورت تھی اور نہ مصالح مرسلہ کی۔

روایاتی ذخیرہ کے اس بنیادی فرق کا نتیجہ ہے کہ صحیح بخاری میں کل ۷۲۹۷ حدیثیں ہیں کہ اگر ان کے مکررات کو حذف کر دیا جائے تو صرف ۲۶۰۲ احادیث ہیں اور بس۔ اور یہی حال صحیح مسلم کا بھی ہے کہ اس کی اصلی روایات کا مجموعہ ۷۲۷۵ ہے اور ان میں غیر مکرر صرف چار ہزار ہیں۔ دیگر کتب کا قیاس بھی انھیں پر کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف فقہ جعفری میں ایک کافی میں ۱۶۱۹۰ احادیث ہیں اور 'من لایحضرہ الفقیہ' میں ۵۹۶۳۔ تہذیب کی روایات کی تعداد ۱۳۵۹۰ ہے اور استبصار کا ذخیرہ ۵۵۱۱ روایات پر مشتمل ہے۔

اور ان کے علاوہ دیگر مجموعے بھی ہیں جن کی روایات کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کر چکی ہے اور اپنے ماننے والوں کو ہر دوسرے مدرک سے بے نیاز بنائے ہوئے ہے۔

● ۔ اس فقہ کا چوتھا امتیاز یہ ہے کہ اس کے خدائی مدارک کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے اور ابھی ایک وارثِ پیغمبرؐ باقی ہے جس کے ارشادات و فرامین احکام الٰہیہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جسے رب العالمین نے اپنے احکام کی ترجمانی کے لئے امام مقرر کیا ہے اور جس کے بارے میں سرکار دو عالمؐ نے بارہا خبر دی ہے اور اس کے وجود اور ظہور کی تاکید کی ہے۔

ایسے مستقل مدرک کے ہوتے ہوئے اس مسلک کا اتباع کرنے والے نہ کبھی قیاس کے محتاج ہو سکتے ہیں اور نہ استحسان کے۔ ان کے لئے اسی الٰہی مدرک کا وجود کافی ہے۔ جس کا قول و عمل اسی طرح حجت ہے جس طرح سرکار دو عالمؐ کا قول و عمل حجت تھا اور اسی لئے آپ نے اسے اپنا مثیل قرار دیا ہے کہ اس کا نام میرا نام ہوگا اور اس کی کنیت میری کنیت ہوگی۔ جب کہ پروردگار نے اس کے علاوہ کسی کے لئے اس امر کو جائز نہیں قرار دیا ہے اور کسی منزل

پر اس نام اور کنیت کے اجتماع کو روا نہیں رکھا ہے۔

● ۔ اس فقہ کا پانچواں امتیاز یہ ہے کہ اس کی تشریح کا حق بھی ہر ایک کو نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس کے لئے مکمل بصیرت کے ساتھ تقویٰ اور خوفِ خدا بنیادی شرط کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے بغیر کسی کو اس کے احکام کی تفسیر کا حق ہی نہیں ہے۔ جس کا بہترین ثبوت امام عصرؑ کا وہ ارشاد ہے جس میں زمانہ غیبت میں مسائل کے حل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :۔

"جدید ترین حوادث و واقعات میں ہماری حدیثوں کے راویوں کی طرف رجوع کرنا" جس کے الفاظ میں دو طرح کے اشارات پائے جاتے ہیں :

۱۔ مسائل کو حل کرنے کا حق صاحبانِ بصیرت و تفقہ کو ہے اور ہر شخص کو اپنے ذوق کے اعتبار سے قیاس کرنے اور احکام الٰہیہ طے کرنے کا حق نہیں ہے۔

۲۔ اس بصیرت کا تعلق بھی فہمِ احادیث سے ہونا چاہیئے کہ احادیث میں مسائل کا حل موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جاہل افراد ان احادیث کو دورِ قدیم کا ترکہ قرار دیتے ہیں اور صاحبانِ بصیرت انھیں احادیث کو مسائل کا زندہ حل سمجھ کر ان کے مفہوم سے مسائل کا حل نکال لیتے ہیں جس کا تفقہ فی الدین نام رکھا گیا ہے۔

فقہ جعفری کی ہمہ گیری

عام اسلامی مکاتب فقہ اور فقہ جعفری کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ عام مکاتب فقہ کے قوانین میں اگر جامعیت اور ہمہ گیری پائی بھی جاتی ہے تو اس کا تعلق اسلامی احکام و قوانین سے نہیں ہے بلکہ اسے فقہاء اور ائمہ مذاہب کے افکار و خیالات۔ قیاسات و نظریات نے ہمہ گیر بنایا ہے ورنہ بنیادی طور پر مذہب کے پاس قرآن مجید کے چند بنیادی اور اجمالی اشارات اور احادیث رسول اکرمؐ کے مختصر توضیحات و تشریحات کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اسی لئے ہر مکتب فقہ کسی نہ کسی اضافی مدرک کا محتاج ہوا ہے اور قرآن و سنت کا نعرہ دینے کے باوجود اکثر احکام کا استنباط قیاس و استحسان اور مصالح مرسلہ یا عمل اہل مدینہ سے کیا ہے۔

لیکن فقہ جعفری کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں احکام واقعیہ کی نشاندہی کرنے والے وسائل ہیں قرآن و سنت رسولؐ کے ساتھ سیرت اہلبیتؑ بھی شامل ہے جن کی طہارت و عصمت کا اعلان قرآن مجید نے کیا ہے اور جن سے تمسک کو وسیلۂ نجات سرکار دو عالمؐ نے قرار دیا ہے اور اس بنیاد پر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ فقہ جعفری کی وسعت و جامعیت کسی فقیہ اور مجتہد کے افکار و خیالات کی دین نہیں ہے بلکہ یہ اس کے اپنے احکام و قوانین کی وسعت و جامعیت ہے جس نے اسے اسقدر ہمہ گیر اور آفاقی بنا دیا ہے کہ اس کا طول و عرض ساری کائنات بلکہ مافوق کائنات کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ اس کے قوانین میں اگر طولی اعتبار سے اسقدر وسعت پائی جاتی ہے کہ حق العباد کے پہلو میں حق اللہ کی مکمل وضاحت پائی جاتی ہے تو وہ عرضی اعتبار سے اسقدر وسیع ہے کہ اس میں خاک سجدہ سے لے کر رویت ہلال تک کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے اعتبار سے بھی اس کی آفاقیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے احکام انسان کی پیدائش

کے پہلے سے شروع ہو جاتے ہیں اور دفن کے بعد بھی تمام نہیں ہوتے ہیں۔

فقہاء کرام نے اسی جامعیت کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے اور زندگی کی مختلف تقسیمات کے سہارے اس ہمہ گیری کا اعلان کیا ہے۔ لیکن حقیر نے اس جامعیت کا جائزہ لینے کے لئے اس کے احکام کو بنیادی طور پر تین حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ کا تعلق زندگی کے احوال سے ہے اور دوسرے کا تعلق اموال سے۔ اور ایک حصہ انسانی اعمال سے تعلق رکھتا ہے جس میں اسکے مختلف منفعت بخش اعمال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تفصیلات کے لئے ایک اجمالی خاکہ اسطرح مرتب کیا جا سکتا ہے۔

شعبۂ احوال

اس شعبہ کی پانچ قسمیں ہیں:

۱۔ انسان کے حالات اپنی ذات اور اپنے نفس کے اعتبار سے !۔ اس قسم میں تمام اخلاقیات شامل ہیں جن کا تعلق انسان کی ذات سے ہے اس کے اجتماعیات سے نہیں ہے۔

۲۔ انسان کے حالات اپنے پروردگار کے اعتبار سے !۔ اس قسم میں نماز۔ روزہ۔ حج۔ جہاد۔ نذر۔ عہد۔ قسم وغیرہ جیسے مسائل شامل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ انسان کے حالات دیگر انسانوں کے اعتبار سے !۔ اس شعبہ میں امر بالمعروف' نہی عن المنکر۔ نکاح۔ طلاق۔ حدود۔ قصاص۔ دیات۔ وکالت۔ تبرّا۔ تولّا وغیرہ شامل ہو جاتے ہیں۔

۴۔ انسان کے حالات دیگر مخلوقات کے اعتبار سے !۔ اس قسم میں کھانے پینے کے مسائل شامل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ انسان کے حالات حیوانات کے اعتبار سے !۔ اس قسم میں شکار۔ ذبیحہ گھوڑ دوڑ اور تیر اندازی وغیرہ کے مسائل شامل ہو جاتے ہیں۔

شعبۂ اموال

اس شعبہ کی بھی چار قسمیں ہیں:

۱۔ ملکیت اموال !۔ اس قسم میں ملکیت کی تمام قسمیں شامل ہیں چاہے وہ انفرادی ہو

یا اشتراکی۔ عوامی ہو یا عمومی۔ ملکیت رعایا ہو یا ملکیت سرکار۔

٢۔ انتقال ملکیت ۔ اس قسم میں وہ تمام اسباب شامل ہوجاتے ہیں جن کے ذریعہ اسلام میں ملکیت کو منتقل کیا جاسکتا ہے اور جن کے بغیر نقل ملکیت اصلاً غیر ممکن ہے۔

٣۔ تحفظ ملکیت ۔ اس قسم میں وہ تمام وسائل شامل ہیں جو اسلام نے ملکیت کے تحفظ کے لئے قرار دئے ہیں اور جن کے بغیر مال کا تحفظ ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر رہن۔ حوالہ۔ ضمانت۔ امانت۔ عاریت۔ کفالت۔ غصب وغیرہ کے احکام۔

٤۔ خاتمہ ملکیت ۔ اس قسم میں وہ تمام مسائل شامل ہیں جن سے ملکیت منتقل نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے جیسے آزادی کہ آزادی کے ساتھ غلام کی ملکیت کسی شخص کی طرف منتقل نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کی ملکیت کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور وہ مکمل طور پر آزاد ہوجاتا ہے۔ یہی حال تدبیر اور مکاتبہ کا ہے کہ اگر مالک نے یہ کہہ دیا کہ میرا غلام میری موت کے بعد آزاد ہوجائے گا تو مالک کی موت کے بعد غلام کی ملکیت کا خاتمہ ہوجائے گا اور وہ ورثہ کی طرف منتقل نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر غلام نے مالک سے مکاتبت اور لکھا پڑھی کرالی ہے کہ اس قدر رقم ادا کرنے کے بعد غلام آزاد ہوجائے گا تو جب بھی اس رقم کو ادا کردے گا اسکی ملکیت کا خاتمہ ہوجائے گا اور وہ کسی دوسرے کی ملکیت کی طرف منتقل نہیں ہوگا۔

اعمال

اس شعبہ میں وہ تمام اعمال شامل ہیں جو انسان اپنی معیشت کے لئے اختیار کرتا ہے اور اپنے آذوقہ کا انتظام کرتا ہے۔

جعالہ ۔ کہ اگر کسی شخص نے یہ اعلان کردیا ہے کہ جو شخص بھی میرا فلاں کام کردے گا اسے اسقدر اجرت دے دی جائے گی، تو اس عمل کا انجام دینے والا مقررہ مقدار میں اجرت کا مستحق ہوجائیگا۔

مضاربہ ۔ جہاں ایک شخص دوسرے کے مال سے تجارت کرتا ہے کہ سرمایہ کسی اور کا ہوتا ہے لیکن عمل اس شخص کا ہوتا ہے جو اپنے عمل سے اپنے اسباب زندگی فراہم کرنا چاہتا ہے۔

مزارعہ و مساقاۃ ۔ جہاں کسی کے کھیت میں جوتنے بونے یا سینچنے کا معاہدہ ہوتا ہے

اور کام کرنے والا اپنے عمل کی اجرت کا حقدار ہوجاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس مقام پر عمل سے مراد وہ اعمال صالحہ اور عبادات نہیں ہیں جن سے انسان آخرت کا حقدار ہوتا ہے اور دنیا میں اسے کچھ نہیں ملتا ہے بلکہ بعض اوقات اپنا سرمایہ بھی قربان کرنا پڑتا ہے بلکہ کہ عمل سے مراد اقتصادی عمل ہے جس سے انسان کے اقتصادی حالات کی اصلاح ہوتی ہے اور انسان مادی منافع اور مالی فوائد کا مستحق ہوجاتا ہے۔

اسلامی انقلاب

واضح رہے کہ دور حاضر کے اسلامی انقلاب نے ان موضوعات و مسائل یا احکام و قوانین میں کسی طرح کا ردّ و بدل یا ترمیم و اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کا کام صرف یہ تھا کہ جو نظام سیکڑوں سال سے کاغذ پر سجایا ہوا تھا اسے کاغذ سے نکال کر زمین پر لاکر رکھ دیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ فقہ جعفری کا نظام مرتب موجود تھا۔ صرف منزل عمل تک نہیں پہونچا تھا اور الحمد للہ کہ اب پہونچ گیا اور اس کی جامعیت کا انداز دیکھ کر ساری دنیا بوکھلا گئی اور تمام اہل مذاہب و لامذہب افراد کے ہوش و حواس اُڑ گئے۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

حدود ولایت فقیہ

یہ بات مسلمات میں ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی ہے جب تک اس کے پاس تین قسم کے اختیارات نہ ہوں:

۱۔ زندگی کے اعتبار سے مجرم کی زندگی کا خاتمہ کرسکے اور اسے قرار واقعی سزا دے سکے۔

۲۔ عزّت وآبرو کے اعتبار سے مجرم کو سرِعام رسوا کرسکے اور ہر فرد مملکت کے اسرار کو دریافت کرسکے۔

۳۔ مالی اعتبار سے وقت ضرورت عوامی اموال پر قبضہ کرسکے۔ عوام پر ٹیکس عائد کرسکے۔ اشیاء کی قیمت پر پابندی لگاسکے اور ذخیرہ اندوزی کو روک سکے۔

یہ اختیارات نہ ہوں گے تو حکومت مجرموں کے مقابلہ میں بے دست وپا ہوجائے گی اور سارا ملک تباہ وبرباد ہوکر رہ جائے گا۔ قاتل آزاد گھومیں گے اور حکومت نہ انھیں گرفتار کرسکے گی اور نہ پھانسی دے سکے گی۔

زناکار وبدکار اپنا کاروبار چلاتے رہیں گے اور حکومت خاموش تماشائی بنی رہے گی ناجائز اموال کی درآمد وبرآمد جاری رہے گی اور کوئی چیک نہ کرسکے گا۔ جاسوسی کے خطوط آتے جاتے رہیں گے اور کوئی انھیں کھول نہ سکے گا کہ دوسرے کے اسرار دریافت کرنا اخلاقاً اور قانوناً جرم ہے۔

گراں فروش۔ اسمگلر۔ ذخیرہ اندوز سب آزاد ہوجائیں گے اور عوام گرانی سے تباہ و برباد ہوجائیں گے۔

ظاہر ہے کہ ان تمام جرائم کی روک تھام اور سماج کی زندگی کے لئے حکومت کے پاس

ان اختیارات کا ہونا ضروری ہے۔

منفی پہلو

لیکن اس اختیار کا منفی پہلو یہ ہے کہ اس طرح عقل و مذہب کے تین قوانین کا خون ہوجائیگا۔

عقلی اعتبار سے ہر انسان کی زندگی کو محفوظ ہونا چاہیئے اور کسی کو کسی کی زندگی کے خاتمہ کا اختیار نہیں ہونا چاہیئے۔

عقلی اعتبار سے ہر شخص کے اسرار ورموز کا تحفّظ ہونا چاہیئے اور کسی شخص کو دوسرے کے راز فاش کرنے کا اختیار نہیں ہونا چاہیئے۔

عقلی اعتبار سے ہر شخص کے مال کو محترم ہونا چاہیئے اور کسی کو اس کے مال کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان تینوں قوانین کا احترام کیا جائے تو حکومت کا قیام ناممکن ہوجاتا ہے اور حکومت کا قیام معطل ہوجاتا ہے تو معاشرہ میں جنگل کا قانون نافذ ہوجاتا ہے اور اس کی بقا کے سارے امکانات ختم ہوجاتے ہیں ـــ تو اب ان دونوں باتوں کو کس طرح جمع کیا جائے اور معاشرہ کو تباہی سے کس طرح بچایا جائے؟

اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے کہ عقل اپنے قانون میں اسقدر لچک رکھے کہ ہر شخص کو دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہ بھی ہو تو چند افراد کو بہر حال ہونا چاہیئے تاکہ وہ سماج کی بقا کا انتظام کرسکیں اور اس صورت حال میں قانون یہ طے پائے گا کہ دنیا میں کسی عام انسان کو لوگوں کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ لیکن جو نظام حکومت میں شامل ہوجائیں انھیں یہ اختیار ملنا چاہیئے تاکہ وہ نظام کو باقی رکھ سکیں اور معاشرہ کو تباہی سے بچاسکیں۔

لیکن اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ افراد کس طرح طے پائیں گے جنھیں نظام حکومت میں داخل ہونے کا موقع مل جائے اور انھیں وہ تمام اختیارات حاصل ہوجائینگے جو معاشرہ میں کسی بھی فرد کو حاصل نہیں ہیں۔

اس سوال کا جواب مختلف معاشروں میں الگ الگ دیا گیا ہے اور ہر معاشرہ نے

ایک خاص بنیاد پر ان اختیارات کا فیصلہ کیا ہے۔

۱۔ ملوکیت

ملوکیت کے نظام میں شہنشاہی مادۂ تولید میں یہ اثر ہوتا ہے کہ اس سے تشکیل پانے والا بچہ ان تمام اختیارات کا مالک ہوتا ہے اور گویا کہ وہ دوسرے عالم کی مخلوق ہوتا ہے جہاں والوں کو اِس عالم پر حکومت کرنے کا پیدائشی حق حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ عسکریت

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ اختیار طاقت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی عسکری طاقت کی بنا پر ملک پر قبضہ کر لے تو اسے خود بخود یہ اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں کہ وہ سارے ملک کے جان و آبرو پر تصرّف کر سکتا ہے اور کسی شخص کو روکنے ٹوکنے یا منع کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

۳۔ جمہوریت

بعض افراد کا خیال یہ ہے کہ یہ طاقت جمہوری نظام اور اکثریت رائے سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر ملک کے عوام کی اکثریت نے کسی شخص کو حکومت کرنے کا حق دے دیا تو اسے تمام اختیارات حاصل ہو گئے چاہے اقلیت اس بات سے راضی ہو یا نہ ہو۔ اقلیت کو ان معاملات میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں بنیادوں کی بنیاد کیا ہے اور کس دلیل عقلی نے شہنشاہیت کے نطفہ کو قطرۂ نجس سے نکال کر مادہ حکومت بنا دیا ہے اور اسے ساری کائنات کا اختیار دے دیا ہے۔

یا کس منطق کی رُو سے عسکری نظام کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ اس سے وابستہ ہو جانے والا ساری کائنات سے بالاتر ہو جائے۔ باقی تمام صاحبان علم و حکمت اس کے غلام قرار پا جائیں۔ کون سا ضابطۂ اخلاق یہ اجازت دیتا ہے کہ ۵۱ فیصد والے کے مقابلہ میں ۴۹ فیصد عقلوں کو دیوانگی تصوّر کر لیا جائے اور ان کی رائے کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے جبکہ اکثریت میں افراد کی گنتی ہوتی ہے، عقلوں کی پیمائش نہیں ہوتی ہے:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اسلام؟

یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے جو تھا راستہ اختیار کیا اور وہی راستہ بنیادی راستہ تھا کہ کائنات میں یہ سارے اختیارات مالک کائنات کو روز اول سے حاصل ہیں۔ اس نے زندگی، عزت اور مال دیا ہے تو اسے ان سب میں ہر ایک سے زیادہ تصرّف کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے اور اس اختیار کے لئے اس کی خالقیت اور مالکیت ہی کافی ہے۔ کسی نئی دلیل اور منطق کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد اگر وہ کسی کو یہ سارے اختیارات دیدے گا تو اسے یہ اختیارات حاصل ہو جائیں گے اور وہی حاکم ہو جائے گا۔ ورنہ اس کی بھی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے یہ اختیارات رسول اکرمؐ کو قطعی طور پر حاصل ہیں اور پروردگار نے انھیں تمام کائنات بشریت کے جان و مال و آبرو کا صاحب اختیار بنا دیا ہے اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے "النبی اولٰی بالمومنین من انفسھم" (نبی کے اختیارات مومنین کے جملہ معاملات میں خود ان کی ذات سے بھی زیادہ ہیں)۔

اس کے بعد رسول اکرمؐ نے حجۃ الوداع کی واپسی پر مقام غدیر میں ایک نئے سلسلۂ حکومت کا تعارف کرا دیا " من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ " (جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے)۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر اختیارات امت کے بارے میں سرکار دو عالمؐ کو حاصل تھے وہ علیؑ بن ابی طالب کو بھی حاصل ہیں اور اس طرح نبوت کے ساتھ امامت کی حاکمیت اور حکومت کا سلسلہ شروع ہو گیا جو بارہ منزلیں طے کر کے حضرت امام عصرؑ تک پہونچا اور وہ ایک دن حکم پروردگار سے پردۂ غیبت میں چلے گئے اور ظاہری حکومت و حاکمیت کا سلسلہ تمام ہو گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اِس کے بعد نظام دنیا کو حکومت کی ضرورت نہیں رہی یا پروردگار نے اپنے نظام کو ناتمام چھوڑ دیا اور سارا کام امت کے حوالے ہو گیا یا ابھی کوئی

دوسرا متبادل نظام موجود ہے جو سلسلۂ غیبت کی بقا تک کام کرتا رہے گا اور اس کے بعد حق کو واقعی حقدار کے حوالے کر دیا جائے گا۔

لیکن اس سوال کا جواب صاحب غیبت نے خود بھی اور دیگر ائمہؑ نے اپنے دور کے ان علاقوں کیلئے پہلے ہی فراہم کر دیا تھا جن کیلئے امام اس دور میں بھی غائب ہی کی حیثیت رکھتا تھا اور عوام کی رسائی ان کی بارگاہ تک ممکن نہ تھی۔

اس جواب کا خلاصہ دو لفظوں میں یوں بیان ہوا ہے "مجاری الامور بید العلماء" اسلام میں جملہ امور کے راستے علما طے کریں گے اور مسائل انھیں کے اشاروں پر آگے بڑھیں گے "اما الحوادث الواقعة فارجعوا فيها الى رواة احاديثنا" تازہ ترین واقعات میں ہماری حدیثوں کے راویوں کی طرف رجوع کرنا کہ وہی تمھارے لئے ہماری حجت ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس روایت میں راوی سے مراد نقل حدیث کرنے والا نہیں ہے ورنہ وہ قدیم معاملات کا راوی ہوتا ہے جدید حادثات کا نہیں۔ اس سے مراد علماء کرام اور فقہاء عظام ہی ہیں جنھیں امامؑ نے اپنی نیابت میں سارے اختیارات دیدئے ہیں اور وہ صفت عصمت سے محرومیت کے باوجود امامت کے اختیارات کے حامل ہیں کہ ان کی نگرانی کرنے والا امام موجود ہے اور حاکم میں عصمت وہاں درکار ہوتی ہے جہاں کوئی معصوم نگرانی کرنے والا نہیں ہوتا ہے ورنہ اس کی نگرانی میں عصمت کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔

والسلام علی من اتبع الهدیٰ

انسان اور عبدیت

عربی زبان میں ہموار راستہ کو "طریق معبد" کہا جاتا ہے۔ جس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ عبادت انسان کی زندگی کو احکام الٰہیہ کے لئے ہموار بنا دیتی ہے اور بندگی کے بعد انسان احکام الٰہی کی تعمیل میں کسی طرح کی دشواری کا احساس نہیں کرتا ہے۔

• عبادت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا مقصد خالق ہوتا ہے مخلوق نہیں۔ دنیا کے تمام کاموں کے مقاصد مشترک ہو سکتے ہیں۔ تجارت دنیا داری کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور رضائے الٰہی کے لئے بھی۔ سیاست فریب کاری کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور دین خدا کی اشاعت کے لئے بھی۔ اقتصاد کا مقصد ذخیرہ اندوزی بھی ہو سکتا ہے اور خلق خدا کی خدمت بھی۔ لیکن عبادت اس عمل کا نام ہے جس میں قصد قربت الٰہی ضروری ہے اور جس کا مقصد صرف ذات پروردگار ہے۔

اس اعتبار سے عبادت سے بالاتر کائنات کی کوئی شے نہیں ہے۔

• عبادت اپنے ایک رُخ کے اعتبار سے رسالت سے بھی افضل ہے اور اسی لئے اسے رسالت و نبوت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اور جناب عیسیٰ نے نبوت کا اعلان کرنے سے پہلے اپنی بندگی کا اعلان کیا تھا اور مسلمان آجتک عبدیت کی شہادت رسالت سے پہلے دیتا ہے "اشهد ان محمداً عبده ورسوله"۔

عبادت کا یہ پہلو بھی ہے کہ اس کا رُخ ہمیشہ پروردگار کی طرف ہوتا ہے جبکہ رسالت پروردگار کی بارگاہ سے شروع ہوتی ہے اور اس کا رُخ مخلوقات کی طرف ہوتا ہے۔ بندہ مقام عبادت میں اِدھر سے اُدھر جاتا ہے اور رسول منزل رسالت میں اُدھر سے اِدھر آتا

ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دونوں کے اعلانات کے لہجہ میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ رسالت کا اعلان اس انداز سے ہوتا ہے کہ "اُس خدا نے مکہ والوں میں رسول بھیجا" گویا ابتدا اُدھر سے ہے اور انتہائے کار اِدھر ہے۔ اس کے برخلاف عبدیت کا اعلان اس انداز سے ہوتا ہے کہ "بے نیاز ہے وہ پروردگار جو اپنے بندہ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا"۔

عبادت کا یہی شرف تھا کہ جب صاحبِ معراج سے عرش کی بلندیوں پر یہ کہا گیا کہ جو چاہو مانگ لو۔ میں دینے کے لئے تیار ہوں۔ تو صرف اتنا تقاضا کیا کہ پروردگار مجھے اپنا بندہ قرار دیدے کہ بندگی سے بالاتر کوئی شرف نہیں ہے۔

● عبادت کی دوسری عظمت یہ ہے کہ اسے مقصدِ تخلیق قرار دیا گیا ہے اور اعلان ہوا ہے کہ ہم نے انسان و جنات کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور کھُلی ہوئی بات ہے کہ مقصد ہی کسی شئے کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ گھڑی صحیح وقت کے لئے بنائی جاتی ہے۔ صحیح وقت دیدے تو بہترین ہے ورنہ کسی قدر و قیمت کی مالک نہیں ہے۔

۔ گھڑی صحیح وقت نہ دے تو پہلے مرحلہ پر پھینک نہیں دی جاتی ہے بلکہ اس کی اصلاح کی جاتی ہے۔ یہی حال انسان کا ہے کہ راہِ عبادت سے منحرف ہو جائے تو اس کا تزکیہ کیا جاتا ہے۔ تزکیہ کے بعد بھی درست نہ ہو سکے تو پھر کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی ہے۔

۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کمپنی قیمتی گھڑی ایجاد کرتی ہے تو اسکی مرمت کا بھی خود ہی انتظام کرتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ناتجربہ کار لوگ اس کی اصلاح شروع کر دیں اور مزید خرابی پیدا ہو جائے اور نتیجہ میں اصلاح کرنے والے کے بجائے کمپنی بدنام ہو جائے۔ مالکِ کائنات نے بھی اصلاحِ بشریت کا کام اپنے نمائندوں کے حوالے کیا ہے اور ہر ناتجربہ کار کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دیا ہے کہ وہ اصلاح کے نام پر مزید فساد پیدا کرے۔

۔ گھڑی میں سب سے بڑا کام ٹائم کے ایڈجسٹ کرنے کا ہوتا ہے کہ جب آگے پیچھے ہونے لگتی ہے تو سنٹر درست کر دیا جاتا ہے تاکہ ہر طرح کی خرابی سے محفوظ ہو جائے۔ سرکار دو عالمؐ نے بھی میدان غدیر میں یہی کام انجام دیا تھا کہ آگے جانے والے پیچھے آجائیں اور پیچھے رہ جانے والے آگے آجائیں اور ایک مرکز طے ہو جائے جس سے صحیح وقت کا اندازہ ہو جائے اور کسی

طرح کا انحراف نہ ہونے پائے۔

۔ گھڑی خراب ہونے کی صورت میں ایک مدت تک ٹھیک کی جاتی ہے لیکن جب یہ طے ہو جاتا ہے کہ اب ناقابل اصلاح ہو چکی ہے تو اُسے اُٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اسلام میں قُومُوا عَنِّی کا یہی مفہوم ہے۔

● واضح رہے کہ عبادت اس قدر عظمت اور بلندی کے باوجود خلافت کا معیار نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ مالک کائنات نے ملائکہ کی تسبیح و تقدیس کو نظر انداز کر کے جناب آدمؑ کے علم کا حوالہ دے دیا تھا۔

۔ علم اور عبادت کا بنیادی فرق یہ ہے کہ عبادت اپنی ذات کے تقرب کے لئے ہوتی ہے اور علم دوسروں کی اصلاح کا وسیلہ ہوتا ہے۔ خلافت اپنی ذات کی اصلاح کے لئے نہیں ہے بلکہ اصلاحِ خلق کے لئے ہے۔

۔ علم کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ عبادت صرف بندوں کی صفت ہے اور علم عبد و معبود دونوں کی مشترکہ صفت ہے اور خلیفہ نمائندہ معبود ہوتا ہے لہذا اس میں صفت معبود کا ہونا بھی ضروری ہے۔

● عبادت میں قصد قربت ضروری ہے۔ دوسری غرض شامل ہو جائے تو عبادت باطل ہو جاتی ہے۔ سرکار دو عالمؐ نے ذکر علیؑ کو عبادت قرار دیا ہے لہذا اسے بھی صرف قربت الٰہی کے لئے ہونا چاہیئے۔ تحصیل مال و شہرت اور خواہش تعریف و احترام عبدیت کو ختم کر دیتی ہے اور ذکر اجر و ثواب سے یکسر محروم ہو جاتا ہے۔

بنیاد شرافت عبدیت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبدیت میں وہ کون سا شرف پایا جاتا ہے جس کی بنا پر اسے دنیا کی خدائی پر بھی مقدم کیا جاتا ہے اور اسلام نے اس کے اقرار کو جزء ایمان و نماز و تشہد بنا دیا ہے۔؟

بات اصل میں یہ ہے کہ عبادت ہر اس عمل کا نام ہے جس میں قصد قربت الٰہی ضروری ہو اور تقرب پروردگار کے بغیر اس عمل کی کوئی حیثیت نہ ہو جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عبادت کا رُخ ہمیشہ بلندی کی طرف ہوتا ہے اور اس کا مقصد پروردگار عالم کا تقرب ہوتا ہے جس کے بعد اس سے بلند تر ہدف کا تصور ناممکن اور مستحیل ہے اور عبدیت سے بالاتر کسی عمل کا ہونا منطقی طور پر ناقابل تصور ہے۔ حد یہ ہے کہ رسالت کا مرتبہ بھی عبدیت کے برابر نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ رسالت کا رُخ خدا کی طرف سے بندوں کی طرف ہوتا ہے جب کہ عبادت کا رُخ بندوں سے خدا کی طرف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پروردگار جب پیغمبر اسلامؐ کے اُدھر سے اِدھر آنے کا ذکر کرتا ہے تو لفظ رسالت استعمال کرتا ہے۔ "ھوالذی ارسل رسولہ"۔ "بعث فی الامیین رسولاً"۔ "ما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین"۔ اور جب اِدھر سے اُدھر جانے کا ذکر کرتا ہے تو لفظ عبدیت استعمال کرتا ہے "سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ"۔

اسلام کے اعتراف عقائد میں بھی عبدیت کا درجہ رسالت پر مقدم ہے اور گویا عبدیت کو رسالت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے کہ بندہ نے عالم ارواح میں اس قدر بندگی کی ہے کہ جب اُس طرف سے اِس طرف بھیجا گیا ہے تو اسے رسول اور نمائندۂ پروردگار بنا کر

بھیجا گیا ہے۔

• عبدیت کا ایک شرف یہ بھی ہے کہ عبدیت بندہ کا اپنے معاملات کو پروردگار کے حوالے کر دینا ہے اور یہ کام خود اپنے نفس کے حوالہ کرنے سے کروڑوں گنا بہتر ہے۔ انسان عام طور سے یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی انسانیت کا شرف اس کی آزادی میں ہے جہاں وہ بظاہر صاحب اختیار ہوتا ہے اور واقعاً جذبات و خواہشات اور احساسات کے ہاتھوں اسیر ہوتا ہے اور یہ زنجیریں وہ ہیں کہ جن کے حلقے تاقیامت بڑھتے ہی جاتے ہیں اور کسی آن بھی ان کے ٹوٹنے یا ختم ہونے کے امکانات نہیں ہوتے ہیں۔

رہنمایان اسلام نے اسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر یہ دعا تعلیم کی ہے "ولا تکلنا الیٰ انفسنا طرفۃ عین ابداً" (خدایا! ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی ہمارے حوالہ نہ کرنا) کہ یہ آزادی درحقیقت بربادی کا پیش خیمہ ہے اور اس کے ذریعہ انسان لاشعوری طور پر مسلسل قید ہوتا چلا جاتا ہے۔

انسان کی حقیقی آزادی اور اس کی حریت یہ ہے کہ اپنے کو اپنے مالک کے حوالے کر دے اور اس مرتبہ تک پہونچ جائے جہاں اس کا ارادہ بھی مشیت پروردگار کا تابع ہو جائے کہ اس سے بلند ترین منزل کا تصور ممکن نہیں ہے اور یہی عبدیت کی واقعی معراج ہے کہ انسان نفس کی اسیری سے نجات پا جائے اور پروردگار کی بندگی میں مکمل طور پر داخل ہو جائے "فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی"۔

• عبدیت کی ایک عظمت یہ بھی ہے کہ انسان اپنے جملہ اعمال میں قرب الٰہی کے طلبگار ہونے کی بنا پر اپنے کسی عمل کو غیر خدا کے ہاتھ فروخت کرنے کے تیار نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنی بندگی کو مال و جاہ دنیا ہی سے نہیں بلکہ جنت و جہنم سے بھی بالاتر سمجھتا ہے کہ اس نے یہ عمل پروردگار کے لئے انجام دیا ہے اور پروردگار سے بالاتر کسی حقیقت کا تصوّر ممکن نہیں ہے۔

مولائے کائنات نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا کہ خدایا! میری بندگی نہ جنت کے اشتیاق میں ہے اور نہ جہنم کے خوف میں۔ میں نے تجھے بندگی کا اہل پایا ہے تو

تیرے سامنے سر جھکایا ہے۔ بندگی کا ہدف تیرے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہے تو اس کی قیمت بھی تیری رضا کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

ہجرت کی رات مولائے کائنات نے جان کی بازی لگا کر رضائے الٰہی کا سودا کر کے اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے کہ جنت و جہنم کی راہ میں ایک سجدہ بھی نہیں دیا جا سکتا ہے لیکن رضائے الٰہی کی خاطر پوری زندگی قربان کی جا سکتی ہے۔

ہجرت کی رات اگر ایک طرف پروردگار نے نفس علیؑ کی قدر و قیمت کا اعلان کیا ہے تو دوسری طرف مولائے کائناتؑ نے رضائے پروردگار کی عظمت و اہمیت کا اعلان کیا ہے کہ یہ رضا دعاؤں سے حاصل نہیں ہوتی ہے اس کے لئے جان قربان کرنا پڑتی ہے اور تلواروں کی چھاؤں میں سکون کی نیند سونا پڑتا ہے ۔۔۔ یا ہزاروں کے نرغہ میں سجدۂ شکر کرنا پڑتا ہے "یا ایتها النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربك راضية مرضية"۔

• عبدیت کی یہی اہمیت تھی کہ اسلام نے اس کے مقابلہ میں کسی دعویٰ کو قبول نہیں کیا اور جیسے ہی نصاریٰ نجران نے عبدیت کے مقابلہ میں ولدیت کا عقیدہ پیش کرنا چاہا اسلام ایسے مقابلہ پر تیار ہو گیا جس کے بعد روئے زمین پر کسی ایک عیسائی کے باقی رہ جانے کا امکان نہ تھا۔

• واضح رہے کہ عیسائی اس سے پہلے بھی عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کے قائل تھے لیکن اسلام نے ان کے حق میں کوئی بددعا نہیں کی۔ لیکن جب ان میں اتنا حوصلہ پیدا ہو گیا کہ اسلام سے بھی اپنے عقیدہ کو تسلیم کرالیں اور حق کو باطل کی پیروی پر آمادہ کر لیں تو قدرت کا لہجہ تبدیل ہو گیا اور مسئلہ تردید یا علمی بحث سے گذر کر لعنت، بددعا اور تباہی کی منزل تک پہونچ گیا جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام باطل کو اسی وقت تک برداشت کرتا ہے جب تک وہ اپنے حدود کے اندر رہے لیکن اگر باطل میں حق سے بیعت لینے کا حوصلہ پیدا ہو جائے تو اسلام اس جرأت و جسارت کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا ہے چاہے اس کا انجام کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے۔

• واضح رہے کہ واقعہ کربلا درحقیقت واقعہ مباہلہ کا ایک تسلسل ہے جہاں باطل کا

مقصد یہ تھا کہ حق اس کے خیالات و مزعومات کو تسلیم کر لے اور حق کا اعلان یہ تھا کہ گردن تلوار کے حوالے کی جا سکتی ہے لیکن حق کا ہاتھ باطل کے ہاتھ میں نہیں دیا جا سکتا ہے۔

• واقعہ کربلا اور مباہلہ کا ایک گہرا تعلق یہ بھی ہے کہ مباہلہ میں شکست کے بعد سے عیسائیت کو مستقل یہ فکر لاحق تھی کہ ان افراد کا خاتمہ کر دیا جائے جن کی بدولت میدان صداقت میں ذلّت کا سامنا کرنا پڑا ہے اور جزیہ کی ابدی رسوائی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

سرکار دو عالمؐ اور صدیقہ طاہرہؑ کا انتقال واقعہ مباہلہ کے بعد تقریباً ۱۴۔۱۵ مہینے کے اندر ہو گیا اور اس میں عیسائیت کو ظاہری طور پر انتقام کا کوئی موقع نہ مل سکا لیکن اس کے بعد اس نے ریشہ دوانیوں کا مستقل سلسلہ شروع کر دیا اور پہلا کام یہ کیا کہ اپنا ایک مستقل طبیب اثال نامی معاویہ کے دربار تک پہونچا دیا اور اس کا کام صرف زہر قاتل تیار کرنا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولائے کائنات کی شہادت میں وہ زہر استعمال کیا گیا جس کے بارے میں ابن ملجم کا بیان تھا کہ اگر اس زہر کو تمام اہل کوفہ پر تقسیم کر دیا جاتا تو ایک شخص بھی زندہ نہ رہتا۔

اس کے بعد امام حسنؑ کی شہادت میں ایسا ہی زہر استعمال ہوا کہ جگر کے ۷۲ ٹکڑے کٹ کر طشت میں آگئے۔ اس کے بعد مباہلہ کی فاتح جماعت میں صرف امام حسینؑ باقی رہ گئے تھے اور عیسائیت کی نگاہ میں ان کا وجود صداقت شہود اس کے لئے ایک مستقل خطرہ تھا لہذا اس نے بہت دور سے انتظام کیا کہ پہلے معاویہ کے محل میں اپنی ایک عورت میسونہ نامی داخل کی اور جب وہ صاحب اولاد ہو گئی تو اس کی تربیت کے لئے صحرائی فضا کا انتخاب کیا گیا تاکہ بچہ عیسائی ماحول میں تربیت پائے اور اسے اسلام کی ہوا بھی نہ لگنے پائے اور اس سے وہ عظیم کام لیا جا سکے جو عیسائیت کی شکست فاش کا واضح انتقام ہو اور جس کے بعد کاروان صداقت کے تمام افراد کا "بزعم خود" خاتمہ ہو جائے۔

یزید نے اقتدار سنبھالتے ہی وہی طریقہ کار اختیار کیا جو عیسائیوں نے پیغمبر اسلامؐ کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا اور اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ حق سے باطل کا اقرار لے لیا جائے لیکن امام حسینؑ نے انکار کر دیا تو یزید نے بددعا اور مباہلہ کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ اسے عیسائیوں کے برابر بھی اپنی صداقت کا احتمال نہیں تھا بلکہ جنگ و جدال کا راستہ اختیار کیا تو امام حسینؑ نے

نے بھی طے کرلیا کہ جان دی جاسکتی ہے۔ گھر قربان کیا جاسکتا ہے لیکن باطل کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی جاسکتی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ امام حسینؑ مع اصحاب و اولاد قربان تو ہوگئے لیکن عیسائیت کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی اور وہ امام حسینؑ سے باطل کا اقرار نہ لے سکی۔ یہ اور بات ہے کہ انکی شہادت کو صداقت کے خطرہ کے خاتمہ کی علامت دے لیا اور اس طرح ایک گونہ سکون حاصل ہوگیا۔

یہ قدرت کا الگ سے انتظام تھا کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد راستہ کے راہب سے لے کر دربار کے سفیر روم تک متعدد افراد پیدا ہوگئے جنھوں نے عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کی سربلندی کا اقرار کیا اور باطل کا راستہ چھوڑ کر حق کے راستہ کو اختیار کرلیا۔

اور درحقیقت اس حق پسندی اور حق پرستی کا سہرا جناب وہب کلبی کے سر ہے۔ جنھوں نے عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کی عظمت کا پرچم بلند کیا ہے اور ان کے ہاتھ قلم ہوجانے کے باوجود وہ پرچم آجتک لہرا رہا ہے اور اسلام کی صداقت کو عیسائیت چیلنج نہیں کرسکی ہے۔

بلکہ جب مباہلہ کے فاتحین کا وارث منظر عام پر آئے گا تو عیسائیت کا پیغمبر حقیقی پھر ایک مرتبہ آسمان سے زمین پر آکر اس کی اقتدا میں نماز ادا کرے گا تاکہ عیسائیت کو ہوش آجائے کہ اسلام کی عظمت اور اسلام کے حقیقی وارثوں کی جلالت کا کوئی مقابلہ ممکن نہیں ہے اور عیسائیت کا حقیقی تقاضا یہ ہے ان وارثان صداقت کا اتباع کیا جائے، ان کا مقابلہ کسی قیمت پر عیسائیت کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

• جناب عیسیٰ کی عبدیت کے بارے میں جاثلیق کا مناظرہ امام رضا علیہ السلام سے یادگار مناظرہ ہے جس میں جاثلیق جناب عیسیٰ کے فضائل و کمالات اور پیغمبر اسلامؐ کے مقابلہ میں ان کی عظمت و جلالت کا اعلان کر رہا تھا۔ امام رضا علیہ السلام نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا کہ تم اس شخص کی اس قدر تعریف کر رہے ہو جو نہ نماز پڑھتا تھا، نہ روزہ رکھتا تھا، نہ بندگی کرتا تھا۔ بھلا ایسے شخص کا مقابلہ پیغمبر اسلامؐ سے کیا جاسکتا ہے جو رات رات بھر مصلیٰ پر

کھڑے رہا کرتے تھے۔ یہ کس قدر شرم کی بات ہے کہ ایک بے نمازی کا مقابلہ ایک تہجد گذار سے کیا جائے، جاثلیق نے گھبرا کر کہہ دیا کہ یہ ہمارے پیغمبر عیسیٰ پر کھلا ہوا اتہام ہے۔ وہ نماز، روزہ اور بندگی کے شدت سے پابند تھے۔ ان کی بندگی کا کون مقابلہ کرسکتا ہے۔؟

تو امام رضاؑ نے مسکرا کر فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب عیسیٰؑ بندگی کیا کرتے تھے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جو آدمی زندگی بھر بندگی کرے۔ اس کے چاہنے والے اسے خدائی کا شریک اور تین میں کا ایک بنا دیں۔ یہ اپنے پیغمبر کی صریحی مخالفت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

• اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جناب عیسیٰ کا تعلق روز اول سے خانۂ خدا سے تھا اور ان کی والدہ گرامی جناب مریم خانۂ خدا کی خدمت ہی کے لئے پیدا ہوئی تھیں لیکن جب جناب مریم کے یہاں جناب عیسیٰ کی ولادت کا وقت آیا تو قدرت نے حکم دیا کہ اب بیت المقدس سے باہر نکل جاؤ کہ یہ بیت العبادۃ ہے بیت الولادۃ نہیں ہے۔ ہم تمھارے لئے سہولتوں کا تمام انتظام کرسکتے ہیں لیکن اپنے گھر کو زچہ خانہ نہیں بننے دیں گے۔ حالانکہ اس کے برعکس جب جناب فاطمہ بنت اسد مولائے کائنات کی ولادت کے موقع پر خانۂ کعبہ کے قریب دعا کرنے کے لئے آئیں اور دیوار کعبہ سے شکم اقدس کو مس کر کے دعا شروع کی تو دیوار شگافتہ ہوگئی اور مولائے کائنات کی ولادت خانۂ کعبہ کے اندر ہوئی جہاں بقول مروج الذہب مسعودی "نہ اس سے پہلے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ اس کے بعد۔"

شائد اس تفرقہ کا ایک راز یہ بھی رہا ہو کہ جناب عیسیٰؑ کے بارے میں گمراہ ہونے والے نصاریٰ عیسیٰؑ کو فرزند خدا کہتے تھے اور مولائے کائناتؑ کے بارے میں گمراہ ہونے والے نصیری انھیں خدا کہتے ہیں۔ قدرت نے چاہا کہ دنیا پر یہ واضح ہوجائے کہ عیسیٰ فرزند خدا ہوتے تو باپ کے گھر میں ولادت کا شرف مل جاتا، اور علیؑ خدا ہوتے تو صاحب خانہ ہوتے خانۂ خدا میں پیدا نہ ہوتے۔ گویا قدرت نے دونوں کے بارے میں پیدا ہونے والی گمراہی کا اس کے وجود سے پہلے ہی خاتمہ کردیا اور نہ چاہا کہ میرے کسی بھی بندۂ خاص کا وجود گمراہوں کے حق میں کوئی دلیل بن جائے۔!

عظمت عبدیت

عبدیت کی یہی عظمت تھی کہ دنیا کے ہر صاحب کمال نے اپنے کمال کو پیش کرنے سے پہلے اپنی عبدیت کا اعلان کیا اور دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ ان کمالات کی بنیاد یہ بندگی ہی ہے ورنہ بندگی سے ہٹ کر دنیا کا کوئی کمال کمال کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

جناب عیسیٰ بن مریم نے آنکھ کھولتے ہی اعلان کیا "انی عبد اللہ آتانی الکتاب وجعلنی نبیاً"، (میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے) یعنی میری کتاب اور میری نبوت پروردگار عالم کا ایک کرم ہے ورنہ اصل شرف تو یہ ہے کہ میں بندۂ پروردگار ہوں اور اس نے مجھے بندگی کے شرف سے نوازا ہے۔

واضح رہے کہ بندگی کا یہ اعلان جناب عیسیٰؑ کی زندگی کا عظیم ترین کارنامہ ہے کہ انھوں نے مستقبل میں پیدا ہونے والی تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا اور کسی گمراہی کو آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں پانے دیا۔

یہ احتمال موجود تھا کہ لوگ بغیر باپ کی ولادت دیکھ کر مادی افکار کی بنا پر ابن اللہ کہہ کر شرف کا اعلان کر دیتے لیکن آپ نے اس امکان کا راستہ بھی روک دیا کہ بغیر باپ کی ولادت بھی بندگی کا ایک شرف ہے کہ مالک اپنے بندہ کو جس طرح چاہے زندگی بھی دے سکتا ہے اور موت بھی دے سکتا ہے۔

لیکن یہ بات بہرحال طے شدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم نے جس وقت اپنی بندگی کا اعلان کیا ہے۔ اس وقت کوئی انھیں ابن اللہ کہنے والا نہیں تھا بلکہ لوگ ان کے

نسب مبارک کو بھی مشکوک بنائے ہوئے تھے لہذا عبدیت کا اظہار ایک کمال ضرور ہے لیکن اس میں عظمت عبدیت کی راہ میں بظاہر کوئی ایثار نہیں ہے۔

اس کے برخلاف سرکار دو عالمؐ نے جس دور میں عبدیت کا اعلان کیا ہے۔ وہ دور خداسازی اور تعدد الٰہ کا دور تھا۔ پتھر سے لے کر آفتاب تک سب خدا بن چکے تھے اور سب کی پرستش ہو رہی تھی۔ ایسے وقت میں یہ کام انتہائی آسان تھا کہ انسان بندگی کے بجائے خدائی کا اعلان کر دے اور معاشرہ کے سامنے یہ ثبوت بھی پیش کر دے کہ اگر پتھر خدا ہو سکتا ہے تو سنگریزوں کو ناطق بنا دینے والا خدا کیوں نہیں ہو سکتا ہے؟

اگر درخت میں خدائی کی صلاحیت ہے تو درخت کو اس کی جگہ سے حرکت دیدینے والا کیوں خدا نہیں ہو سکتا ہے۔؟

اگر ستارہ خدا ہو سکتا ہے تو اس کو ڈیوڑھی پر اتار لینے والا بھی خدا ہو سکتا ہے۔

اگر چاند خدا ہو سکتا ہے تو اسے شق کر دینے والا بھی خدا ہو سکتا ہے، بلکہ اسے بطریق اولیٰ خدا ہونا چاہیئے کہ وہ خداؤں پر حکومت کرتا ہے اور تمام خدا اس کے اشاروں پر رقص کرتے ہیں۔

لیکن یہ آپ کا کمال کردار و ایثار تھا کہ آپ نے خدائی کا اعلان نہیں کیا بلکہ عبدیت اور بندگی کا اعلان کیا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ باطل خدائی میں وہ دم نہیں ہے جو طاقت حق کی بندگی میں پائی جاتی ہے ۔ اور پروردگار عالم نے بھی اس ایثار و کردار کا بہترین انعام دیا کہ جب کائنات کی عظیم ترین بلندی کا اعلان کیا تو اس اعلان کی بنیاد رسالت، نبوت، محبت اور شریعت کو نہیں قرار دیا۔ بلکہ اعلان فرمایا کہ "سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ" یہ عبدیت ہے جو انسان کو عرش اعظم کی بلندیوں کی طرف لے جارہی ہے اور جس کے زیر قدم پوری کائنات آگئی ہے۔

اب اس کے بعد ایک منزل اور رہ جاتی ہے جہاں پہونچ کر قلم رک جاتا ہے اور پائے فکر میں لغزش ہونے لگتی ہے کہ جب سرکار دو عالمؐ نے اس خدائی کو نظر انداز کر دیا جو اہل دنیا کی طرف سے مل سکتی تھی اور پروردگار نے اس قدر عظیم ترین انعام

سے نواز دیا تو اگر کوئی بندہ اس خدائی کو نظرانداز کر دے جو ایک قوم کی طرف سے مل چکی تھی اور اس قدر ایثار کرے کہ اپنے کو بندۂ خدا بھی کہے اور "عبد محمدؐ" بھی تو اس انسان کا انعام کیا ہوگا؟ ۔ یقیناً ایسا انسان اس بات کا اہل ہے کہ صاحبِ عرش اپنے محبوب سے کلام کرے تو اس کے لہجہ میں گفتگو کرے اور صاحب رسالت خانۂ کعبہ میں توحید کا عملی اعلان کرنا چاہے تو اسے اپنے کاندھوں پر جگہ دے۔

علی بر دوشِ احمدؐ چشم بد دور
عیاں شد معنیٔ نورٌ علیٰ نور

ربط عبادت و فضیلت

ہمارے سماج میں جو بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں یا جن بعض شبہات کو شیطان رجیم نے معاشرہ کے ذہنوں میں راسخ بنا دیا ہے۔ اصول و فروع کی بے تعلقی اور ایک کا دوسرے سے اجنبی ہونا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عقیدہ کی دنیا الگ ہوتی ہے اور اعمال کی دنیا الگ ۔ عقیدہ ایک فکری سرمایہ ہے اور عمل ایک زندگی کا نظام ۔ زندگی کا نظام باعث اختلاف ہو سکتا ہے لیکن افکار میں ایک دوسرے کی مخالفت کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اس کے بعد پھر عقیدہ کو اعمال سے اہم تر ثابت کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جس کے پاس عقائد کا بہترین خزانہ موجود ہے اسے اپنی نجات میں اعمال کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور وہ اپنی ہر ضرورت کو اسی اکاؤنٹ سے پورا کر سکتا ہے۔

لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ سارے فلسفے صرف عبادات کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ دنیا داری میں ان فلسفوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ معاشرہ میں کوئی سمجھدار ایسا نہیں پایا جاتا ہے جو یہ طے کر دے کہ ہمارا عقیدہ نجات کا ضامن ہے لہٰذا ہمیں نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں مہمان نوازی کی زحمت نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں مختلف کارہائے خیر میں چندہ نہیں دینا چاہیئے۔ ہمیں سماج اور معاشرہ کی کوئی خدمت نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمیں ڈاکٹر بن کر مریضوں کا علاج نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں سماجی ورکر بن کر ملک و قوم کی حاجت روائی نہیں کرنی چاہیئے۔ حد یہ ہے کہ ہمیں مجلس۔ محفل۔ ماتم۔ نوحہ۔ جلسہ جلوس کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ہمارا عقیدہ پختہ ہے اور اس عقیدہ میں نجات کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی طرح کے عمل خیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سارا نزلہ گرتا ہے تو صرف عبادات پر کہ عقیدہ صحیح ہے تو نماز کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ روزہ و زکوٰۃ بلاسبب کی مشقت ہے۔ حج بلاوجہ پیسہ کی بربادی ہے۔ امر و نہی مفت میں جھگڑا چھیڑنے کا اقدام ہے۔ دیگر اعمال خیر کے بارے میں یہ فلسفہ استعمال نہیں ہوتا ہے بلکہ وہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ محبت امام حسینؑ ہے تو مجلس۔ ماتم۔ نوحہ۔ جلوس ہونا چاہیئے۔ محبت مولائے کائناتؑ ہے تو تیرہ رجب کا جشن ہونا چاہیئے۔ محبت امام عصرؑ ہے تو شبرات کا حلوہ اور آتش بازی ضروری ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں عقائد میں کیا فرق ہے کہ عقیدۂ امامت میں تحریک عمل پائی جاتی ہے اور عقیدۂ توحید میں یہ حرکت نہیں پائی جاتی ہے۔ محبّت اہلبیتؑ کا تقاضا عمل ہے اور محبت پروردگار کا تقاضا عمل نہیں ہے۔ محبت اہلبیتؑ نجات کے لئے کافی ہے تو صرف نماز روزہ کے مقابلہ میں کافی ہے۔ مجلس۔ ماتم۔ نوحہ۔ زنجیر اور جلوس کے مقابلہ میں کافی نہیں ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ صرف ایک شیطانی وسوسہ ہے جو اصول و فروع کے درمیان فاصلہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ اصول و عقائد کا کام ہی یہ ہے کہ عمل کی تحریک کرے اور اسی تحریک عمل کی بنا پر وسیلۂ نجات بن جائے۔

پروردگار نے خود بھی بار بار اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ بندوں کے ذہن سے یہ رابطہ محو نہ ہونے پائے اور انھیں ہمہ وقت دونوں چیزوں کا خیال رہے۔ وہ یہ سمجھتے رہیں کہ عقیدہ کو عمل سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے اور دونوں کی تاریخ ایک ساتھ چلتی ہے۔ الگ الگ لائنوں پر نہیں چلتی ہے۔

مثال کے طور پر: پروردگار عالم نے مولائے کائنات کی ولایت کا اعلان کرنا چاہا تو اسے سفر حج کے دوران کیا تاکہ ولایت علیؑ کے تصور کو حج بیت اللہ سے الگ نہ کیا جاسکے اور ہر معتقد ولایت کو یہ احساس رہے کہ حج بیت اللہ جیسی عبادت نہ ہوتی تو بظاہر اس ولایت کے اعلان کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم حج بیت اللہ کی عظمت کا تحفظ کریں کہ اس نے اپنے دامن میں اعلان ولایتِ علیؑ کو محفوظ کر رکھا ہے۔

• اسی طرح پروردگار نے اہلبیتؑ کی سخاوت و حاجت روائی کا اعلان کرنے کیلئے

سورۂ مبارکہ هَلْ أَتیٰ کو نازل کیا تو اسے بھی روزہ سے مربوط کر دیا کہ پہلے بچے بیمار ہو کر صحتیاب ہوں اور اہل خانہ نذر کی بنا پر روزہ رکھیں اور فقیر و مسکین و یتیم و اسیر آ کر افطار کا سامان مانگ لے جائیں۔ اس کے بعد سورہ نازل کیا جائے تاکہ اہلبیتؑ کی فضیلت منزل عمل سے الگ نہ ہونے پائے۔

• اعلان غدیر سے پہلے پروردگار عالم نے مولائے کائنات کی ولایت کا اعلان کیا تو اس کے واسطے بھی حالت نماز کا انتخاب کیا اور اس صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ ولی وہ صاحب ایمان ہے جو نماز قائم کرتا ہے اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتا ہے تاکہ ولایت کے تصور کو نماز سے الگ نہ کیا جاسکے۔

• انتہا یہ ہے کہ مولائے کائنات نے بھی اپنی زندگی کی کامیابی کا اعلان کیا تو اس اعلان کے لئے میدان بدر و احد یا معرکہ خندق و خیبر کا انتخاب نہیں کیا بلکہ مسجد کوفہ میں سجدہ میں سر رکھ کر اور سر کے زخمی ہونے کے بعد اعلان کیا کہ "ربّ کعبہ کی قسم علیؑ کامیاب ہو گیا"۔

گویا علیؑ کی کامیابی میں نماز کا دخل بھی ہے اور سجدہ کا بھی۔ روزہ کا دخل بھی ہے اور مسجد کا بھی۔ اذان کا دخل بھی ہے اور عبادت کا بھی۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی معتقد ولایت اصول دین کو فروع دین سے الگ کر سکتا ہے اور عقیدہ کو عمل سے بے نیاز بنا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔!

• دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج کے ان مواقع کے علاوہ جب آسمان کے فرشتہ نے علیؑ کے بے مثل و بے نظیر ہونے کا اعلان کیا تو اس نے بھی فروع دین کے میدانوں میں سے ایک میدان کا انتخاب کیا اور ٹھیک میدان جہاد میں یہ اعلان کیا کہ "لافتیٰ الاعلیؑ لاسیف الاذوالفقار"۔

• اس کے علاوہ دیگر فضائل اہلبیتؑ کا جائزہ لیا جائے تو اس کا بھی ایک بڑا حصہ فروع دین اور اعمال و عبادات ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ امام حسینؑ کی خاطر رسول اکرمؐ نے سجدہ کو طول دیا تو یہ بھی نماز کا واقعہ ہے اور خطبہ کو قطع کر دیا تو یہ بھی مسجد کا واقعہ ہے۔

• امام زین العابدینؑ کے اکثر فضائل کا تعلق عبادات و ادعیہ سے ہے اور خود لفظ زین العابدینؑ

کی تاریخ میں آپ کی نماز کا خضوع و خشوع شامل ہے۔

• امام محمد باقرؑ کے کنوئیں میں گرنے کا واقعہ بھی امام سجادؑ کی نماز سے متعلق ہے اور امام سجادؑ کے گھر میں آگ لگنے اور اس کی طرف سے امامؑ کے بے خوف ہونے کا تعلق بھی نماز ہی سے ہے۔

• امام صادقؑ کی ساری زندگی علمی زندگی ہے جہاں چار ہزار افراد کو علمی اور عملی تربیت دے کر کردار سازی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

• امام کاظمؑ کے سجدے قیدخانہ میں اور امام رضاؑ کی نماز عید ولیعہدی کے بعد تاریخ کے مسلمات میں ہے۔

• امام محمد تقیؑ کا خوفِ خدا میں گریہ اور امام علی نقیؑ کا نمازوں کے ذریعہ مشکلات دہر کا علاج کرنا ہر باخبر انسان کو معلوم ہے۔

• امام عسکریؑ کا عبادت کو غرض خلقت قرار دیتے ہوئے لہو و لعب سے اجتناب اور زمانہ کے امامؑ کا بیت العبادۃ کعبہ سے ظہور کسی صاحب ایمان کی نگاہ عقل سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اور یہ تمام امور اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام میں اصول و فروع کا رشتہ انتہائی گہرا ہے اور ائمہ معصومینؑ نے اپنے کردار سے اس رشتہ کو مزید مستحکم بنایا ہے اور اپنے فضائل و کمالات کے واقعی اظہار کا ذریعہ اسی بندگی اور عبادت کو قرار دیا ہے تاکہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ باطل کی خدائی شرف نہیں ہے حق کی بندگی شرف ہے اور باطل کی خدائی میں وہ طاقت نہیں ہے جو حق کی بندگی میں ہے۔ باطل کی خدائی لرزتی ہے اور حق کی بندگی آگ کے شعلوں میں تسبیح پروردگار کرتی ہے۔ باطل کی خدائی ڈوب جاتی ہے اور حق کی بندگی پار نکل جاتی ہے۔

شرح دعائے سمات

دعائے سمات ان عظیم دعاؤں میں سے ہے جن کی اکثر علمارِ سلف پابندی کیا کرتے تھے اور ان کی عظمت و جلالت کے معترف تھے۔ یہ دعا امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل ہوئی ہے اور اس کی روایت امام عصرؑ کے نائب خاص عثمان بن سعید نے بھی کی ہے۔

دعا کے اعتبار میں کسی طرح کا کوئی شبہ نہیں ہے اور اس کی تاثیر بھی مختلف علمار اعلام کے تجربہ میں آچکی ہے۔ اس دعا میں بعض عجیب و غریب قسم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو عام ذہنوں کے لئے نامانوس ہیں اس لئے ان کی تشریح اور توضیح ضروری ہے۔

۱۔ کروبین۔ یہ لفظ کُرب سے نکلا ہے جس کے معنی قرب کے ہیں، یعنی ملائکہ مقربین۔ اس کا واحد کروب ہے جس کے ر پر تشدید نہیں ہے۔

۲۔ غمائم النور۔ پروردگار نے بنی اسرائیل پر دو احسانات کئے تھے۔ دن میں سر پر ابر سایہ فگن رہتا تھا اور رات میں ایک نور کا ستون سامنے رہتا تھا۔ غمائم النور انھیں احسانات کی طرف اشارہ ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ جناب موسیٰؑ سے کلام بھی اسی ابر کی اوٹ سے ہوا کرتا تھا۔

۳۔ تابوت شہادت۔ وہ صندوق ہے جس میں جناب موسیٰؑ کو رکھ کر دریا کے حوالے کیا گیا تھا اور یہی قوم جناب موسیٰؑ کے لئے بہترین وسیلۂ فتح و ظفر تھا کہ جہاں بھی اسے لیکر چلے جاتے تھے میدان فتح ہو جاتا تھا اور جب قوم نے اس کا احترام ترک کر دیا تو مالک نے اسے آسمان کی طرف اٹھا لیا۔

ایک قول کی بنا پر یہ وہ تابوت ہے جس میں توریت کی تختیاں رکھ کر جناب موسیٰؑ کے

حوالے کی گئی تھیں۔

۴۔ طور سینا۔ شام کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔ سینا ایک قسم کے درخت کا نام ہے جس کی مناسبت سے اس پہاڑ کو طور سینا کہا جاتا ہے۔

۵۔ حوریث۔ سرزمین مدین کا ایک پہاڑ ہے جس پر موسیٰؑ سے کلام ہوا تھا۔ بعض روایات میں "حوریت" وارد ہوا ہے۔

۶۔ بحر سوف۔ اس دریا کا نام ہے جو جناب موسیٰؑ کے لئے شگافتہ ہوا تھا اور جس نے بنی اسرائیل کو فرعون کے شر سے محفوظ کیا تھا۔ بعض روایات میں یہ "بحر اساف" کا نام ہے اور بعض حضرات کے نزدیک یہ فارس کا دریا ہے۔

۷۔ بئر سبع۔ وہ کنواں ہے جس پر جناب اسحاق نے سات دنبے قربان کئے تھے اور اس کی قوم میں ایک عظمت وحیثیت تھی۔ یہاں تک کہ بادشاہ وقت نے اسے پاٹ دیا تو جناب اسحاق نے دوبارہ صاف کرایا اور اسی بنا پر شبع بھی کہا جاتا ہے۔

۸۔ بیت ایل۔ ایل پروردگار کا نام ہے۔ بیت ایل سے مراد خانۂ کعبہ بھی ہو سکتا ہے اور بیت المقدس بھی کہ دونوں ہی گھروں کو پروردگار نے اپنا گھر قرار دیا ہے۔

۹۔ قبہ رمان۔ وہ عمارت ہے جہاں جناب موسیٰؑ اور جناب ہارون عبادت پروردگار کیا کرتے تھے۔

۱۰۔ عمق اکبر۔ قدرت کا وہ سرچشمۂ کرم ہے جہاں سے ساری کائنات کو پانی کی سپلائی ہوتی ہے اور اس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ ایک فرشتہ کا نام ہے جس کے ہاتھ میں پانی اور دریا کا نام ہے۔

۱۱۔ ساعیر۔ بیت المقدس کے قریب ایک شہر کا نام ہے۔

۱۲۔ ربوات۔ وہ بلندیاں جہاں جناب موسیٰؑ پر وحی نازل ہوا کرتی تھی اور وہ الٰہی تعلیمات کے حصول اور مالک سے مناجات کے لئے حاضری دیا کرتے تھے۔

اس دعا کا آغاز اسم اعظم کے واسطہ سے ہوا ہے اور اس کا اختتام مختلف قسم کی

دعاؤں پر ہوا ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ وسیلہ اور واسطہ کے طور پر پروردگار کے مختلف صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

وہ جلال وجبروت جس کے سامنے کل کائنات سربسجود ہے۔ آوازیں دب گئی ہیں اور دل لرز رہے ہیں۔ وہ مشیت جس کی کل کائنات تابع فرمان ہے۔ وہ کلمۂ طیبہ جس کے ذریعہ ارض وسما کی تخلیق ہوئی ہے۔ وہ حکمت جس سے عجائب مخلوقات کا ظہور ہوا ہے اور نور وظلمت، شمس وقمر۔ لیل ونہار۔ مشرق ومغرب کی تخلیق ہوئی ہے۔ وہ بزرگی جس نے موسیٰؑ کو ملائکہ مقربین سے بالاتر منزل میں کلیم بنا دیا ہے اور دریا میں راستہ بنا کر اصحاب موسیٰ کو نجات دے کر فرعون کو غرق کر دیا ہے جس بزرگی نے ابراہیمؑ کو خلت، اسحاق کو صفوت اور یعقوب کو جلالت عطا کی ہے۔

وہ رحمت جس نے تمام مخلوقات پر احسان کیا ہے۔ وہ نورانیت جس سے طور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ وہ علم وجلال وکبریائی، عزت وجبروت جس کا بوجھ زمین وآسمان میں کوئی نہیں اٹھا سکتا ہے۔ وہ سلطنت جس کا غلبہ تمام ادوار واعصار پر ہے۔ وہ کلمۂ صدق جس نے آدمؑ کو عظمت عطا کی ہے۔

ان تمام واسطوں کے ساتھ اصل مدعا یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

۔ محمدؐ وآل محمدؐ پر رحمت نازل فرما کہ یہی وسیلۂ رحمت ومغفرت ہیں اور تمام گناہوں کو معاف فرما۔

۔ رزق حلال میں وسعت عطا فرما اور ہر طرح کے شر سے محفوظ فرما چاہے وہ شر ہمسایہ کا ہو یا ہمراہی کا۔ سلطنت کا ہو یا عوام کا۔

۔ خیر دنیا وآخرت عطا فرما اور ویسا برتاؤ کر کہ جس کا تو اہل ہے نہ وہ کہ جس کا میں اہل ہوں۔

۔ تمام اگلے پچھلے گناہوں کو معاف فرما اور لمحات وساعات کے شر سے بھی محفوظ فرما۔ بلکہ اگر کوئی ظلم وستم۔ مکر ودغا۔ جور وجفا کرنا چاہے تو اس سے انتقام لے کر مجھے ہر بلا سے محفوظ رکھنا۔

آخر میں ان عظیم واسطوں کے ذریعہ تمام عالم ایمان کے حق میں دعا کی گئی ہے:

تمام فقیروں کو بے نیاز فرما۔
تمام مریضوں کو شفا عطا فرما۔
تمام اموات پر رحمت نازل فرما۔
تمام زندوں کو مشمول رحمت قرار دے۔
تمام مسافروں کو ان کے وطن تک صحت و عافیت کے ساتھ پہونچا دے۔
اور بالآخر وہی برتاؤ کرنا جس کا تو اہل ہے۔ وہ نہیں جس کا میں اہل ہوں کہ اس طرح سوائے ہلاکت اور بربادی کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

عظمت نماز

•۔ نماز کی عظمت کے لئے پروردگار عالم کا یہ ارشاد ہی کافی ہے کہ "اقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین" (دیکھو نماز قائم کرو اور خبردار مشرکین میں سے نہ ہو جانا) گویا مالک کی نگاہ میں نماز علامت اسلام و ایمان ہے اور نماز سے انحراف کرنے والا حقیقت کے اعتبار سے مشرکین میں شامل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس کا شمار مسلمانوں ہی میں ہوتا ہے اور اس کے احکام مسلمانوں ہی کے احکام ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نماز میں حسب ذیل خصوصیات اور بھی پائی جاتی ہیں:

•۔ نماز تمثیل عمل معصوم ہے۔ نماز کے بارے میں سرکار دو عالمؐ کا ارشاد گرامی ہے "صلّوا کما رأیتمونی اصلّی"۔ (ویسے نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو) گویا کہ نمازی نماز کی حالت میں وہی انداز اختیار کر لیتا ہے جو سرکار دو عالمؐ کا انداز ہے اور مالک کی بارگاہ میں اسی طرح حاضری دیتا ہے جس طرح سرکار دو عالمؐ حاضری دیا کرتے تھے۔ یہ شرف نماز گذار کو تو حاصل ہے لیکن سرمایہ دار یا صاحب اقتدار کو حاصل نہیں ہے کہ اس کا رہن سہن اور انداز حیات و حکومت سرکار دو عالمؐ کے عمل کی تمثیل نہیں ہے۔ آپ کی زندگی میں نہ کوئی سرمایہ دارانہ انداز تھا اور نہ حاکمانہ طور طریقہ۔ بندگی کے اعتبار سے آپ بندۂ پروردگار ضرور تھے اور آپ کا ہر انداز عبدیت کا بہترین آئینہ دار تھا لہٰذا بندگی کرنے والا تو آپ کا مکمل اتباع کر سکتا ہے لیکن سرمایہ دارانہ یا حاکمانہ زندگی گذارنے والا آپ کی حیات کی تمثیل نہیں پیش کر سکتا ہے۔

•۔ نماز کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کا رُخ ہمیشہ بلندی کی طرف ہوتا ہے۔ نمازی

ابتدا ہی سے قربت خدا کی نیت کرتا ہے اور گویا اپنے ہر عمل سے بارگاہ قدس کی طرف پرواز کر رہا ہے اور بلندی کے مدارج طے کرتا جا رہا ہے۔ نماز کا یہ وہ شرف ہے جسے دنیا کا کوئی کمال نہیں پا سکتا ہے۔ ہر کمال کا رُخ کبھی بلندی کی طرف ہوتا ہے اور کبھی پستی کی طرف۔ لیکن نماز کا رُخ اول سے آخر تک بلندی ہی کی طرف رہتا ہے کہ اس کے برخلاف ہو تو نماز، نماز کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

•۔ نمازی کا بلندی کی طرف پرواز کرنا اس بات کی علامت ہے کہ نماز اس عالم کی شے نہیں ہے بلکہ کسی اور عالم کی شے ہے۔ انسان مٹی کے ڈھیلے کو فضا میں بھی چھوڑ دے تو زمین ہی کی طرف آئے گا اور غبارہ کو زمین پر بھی باندھ دے تو فضا ہی کی طرف جائیگا۔ اس لئے کہ مٹی کا مرکز پستی کی طرف ہے اور ہوا کا مرکز اس سے بلند تر ہے اور ہر شے کا یہ فطری خاصہ ہے کہ جس طرف کی ہو گی ہمیشہ اپنے مرکز کی طرف پرواز کرے گی۔

نماز کا قرب الٰہی کی طرف سفر کرنا علامت ہے کہ اس کا تعلق عالم بالا سے ہے اور اس کی تصدیق ان روایات سے ہوتی ہے جن میں نماز کے تحفۂ معراج ہونے کا ذکر ہے کہ پروردگار نے تمام احکام روح الامین کے ذریعہ زمین پر نازل فرمائے ہیں لیکن نماز کا تحفہ سرکار دو عالمؐ کو اس وقت دیا ہے جب آپ معراج میں تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ قدرت نے نہ چاہا کہ میرا حبیب اتنے عظیم اور طویل سفر سے خالی ہاتھ واپس جائے اس لئے امت کی فلاح و نجات کے لئے ایک تحفہ ساتھ کر دیا جو کسی ایک خطہ، علاقہ یا دور کے لئے نہیں تھا بلکہ ہر علاقہ والوں کے لئے ہر دور میں کام آسکتا ہے۔

•۔ نماز کے تحفۂ معراج ہونے کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ انسان اپنے کو معراج کی بلندی پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ تحفہ کا خاصہ ہے کہ انسان جب اسے استعمال کرتا ہے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا اب میں انھیں منزلوں پر پہونچ گیا ہوں۔ آب زمزم کا استعمال کرنے والا اپنے کو مکہ میں محسوس کرتا ہے اور خاک شفا پر سجدہ کرنے والا روحانی طور پر فضائے کربلا میں سجدہ کرتا ہے۔ خراسان کی سوکھی روٹی کھانے والا اپنے کو امام رضاؑ کے دستر خوان کا ایک مہمان تصوّر کرتا ہے اور نجف کی فضا میں چند روز تحصیل علم کرنے والا اپنے کو نجفی کہنے میں فخر محسوس

کرتا ہے اور جب انسانی فطرت یہی ہے تو نمازی کو حق ہے کہ وہ دو رکعت نماز ادا کر کے اپنے کو معراج کی منزلوں میں محسوس کرے اور چند لمحوں کے لئے اس دنیا سے بلند تر ہو کر فضائے قدس کا مسافر نظر آئے۔

روایات میں نماز کے معراج مومن ہونے کا ایک فلسفہ یہ بھی ہے کہ نماز تحفۂ معراج ہے اور تحفہ صاحب تحفہ کو اپنی فضاؤں سے آشنا بنا دیا کرتا ہے اور اسے ایک عالم سے دوسرے عالم میں پہونچا دیا کرتا ہے۔

•۔ نماز مادی دنیا کے لئے ایک تھرمامیٹر ہے۔ تھرمامیٹر وہ آلہ ہے جس سے انسانی جسم کی حرارت کا اندازہ کر لیا جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حرارت گھٹ کر نقطۂ انجماد کی طرف یا بڑھ کر نقطۂ ہلاکت کی طرف تو نہیں جا رہی ہے۔ نماز ایمانی حرارت کے لئے ایک تھرمامیٹر کا کام کرتی ہے۔ ہر شخص کا خیال یہ ہے کہ وہ حقیقی صاحب ایمان ہے اور ایمان وعقیدہ کے مقابلہ میں کسی شے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہے۔ اس کا عزیز ترین سرمایہ اس کا ایمان ہے اور ایمان سے بلند تر کوئی شے نہیں ہے۔ لیکن جب مقام امتحان میں آتا ہے تو بہت سے حقائق بے نقاب ہو جاتے ہیں اور ایمان کی کل حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔

انسانی زندگی میں امتحان کے تین اہم مواقع ہیں جب ایمان خطرہ میں پڑ جاتا ہے اور دنیا کی گرمی ایمان کی حرارت پر غالب آجاتی ہے اور ایمان کی گرمی کو کم کر دیتی ہے۔ ایک موقع ہے راحت کا جہاں آرام پسندی ایمان کے تقاضوں سے غافل بنا دیتی ہے اور انسان راحت و آرام کے آگے ایمان وعقیدہ کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔

دوسرا موقع ہے شہوت اور خواہش کا جہاں انسان اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ نہ عقیدہ یاد رہ جاتا ہے اور نہ ایمان۔ دل میں بس ایک ہی آواز ہوتی ہے کہ دنیا کی خواہش کی تکمیل کر لی جائے، اس کے بعد آخرت کی خبر خدا جانے۔

تیسرا موقع ہے فرصت کہ انسان کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو تھوڑی دیر فرصت سے بیٹھنا چاہتا ہے اور اس وقت اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی ہے چاہے ایمان وعقیدہ ہی کیوں نہ ہو۔

ابتدا ہی سے قربت خدا کی نیت کرتا ہے اور گویا اپنے ہر عمل سے بارگاہ قدس کی طرف پرواز کر رہا ہے اور بلندی کے مدارج طے کرتا جا رہا ہے۔ نماز کا یہ وہ شرف ہے جسے دنیا کا کوئی کمال نہیں پا سکتا ہے۔ ہر کمال کا رُخ کبھی بلندی کی طرف ہوتا ہے اور کبھی پستی کی طرف۔ لیکن نماز کا رُخ اول سے آخر تک بلندی ہی کی طرف رہتا ہے کہ اس کے برخلاف ہو جائے تو نماز، نماز کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

•۔ نمازی کا بلندی کی طرف پرواز کرنا اس بات کی علامت ہے کہ نماز اس عالم کی شے نہیں ہے بلکہ کسی اور عالم کی شے ہے۔ انسان مٹی کے ڈھیلے کو فضا میں بھی چھوڑ دے تو زمین ہی کی طرف آئے گا اور غبارہ کو زمین پر بھی باندھ دے تو فضا ہی کی طرف جائیگا اس لئے کہ مٹی کا مرکز پستی کی طرف ہے اور ہوا کا مرکز اس سے بلند تر ہے اور ہر شے کا یہ فطری خاصہ ہے کہ جس طرف کی ہو گی ہمیشہ اپنے مرکز کی طرف پرواز کرے گی۔

نماز کا قرب الٰہی کی طرف سفر کرنا علامت ہے کہ اس کا تعلق عالم بالا سے ہے اور اس کی تصدیق ان روایات سے ہوتی ہے جن میں نماز کے تحفۂ معراج ہونے کا ذکر ہے کہ پروردگار نے تمام احکام روح الامین کے ذریعہ زمین پر نازل فرمائے ہیں لیکن نماز کا تحفہ سرکار دو عالمؐ کو اس وقت دیا ہے جب آپ معراج میں تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ قدرت نے نہ چاہا کہ میرا حبیب اتنے عظیم اور طویل سفر سے خالی ہاتھ واپس جائے اس لئے امت کی فلاح و نجات کے لئے ایک تحفہ ساتھ کر دیا جو کسی ایک خطہ، علاقہ یا دور کے لئے نہیں تھا بلکہ ہر علاقہ والوں کے لئے ہر دور میں کام آسکتا ہے

•۔ نماز کے تحفۂ معراج ہونے کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ انسان اپنے کو معراج کی بلندی پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ تحفہ کا خاصہ ہے کہ انسان جب اسے استعمال کرتا ہے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا اب میں انھیں منزلوں پر پہونچ گیا ہوں۔ آب زمزم کا استعمال کرنے والا اپنے کو مکہ میں محسوس کرتا ہے اور خاک شفا پر سجدہ کرنے والا روحانی طور پر فضائے کربلا میں سجدہ کرتا ہے۔ خراسان کی سوکھی روٹی کھانے والا اپنے کو امام رضاؑ کے دسترخوان کا ایک مہمان تصور کرتا ہے اور نجف کی فضا میں چند روز تحصیل علم کرنے والا اپنے کو نجفی کہنے میں فخر محسوس

کرتا ہے اور جب انسانی فطرت یہی ہے تو نمازی کو حق ہے کہ وہ دو رکعت نماز ادا کرکے اپنے کو معراج کی منزلوں میں محسوس کرے اور چند لمحوں کے لئے اس دنیا سے بلند تر ہو کر فضائے قدس کا ساز نظر آئے۔

روایات میں نماز کے معراج مومن ہونے کا ایک فلسفہ یہ بھی ہے کہ نماز تحفۂ معراج ہے اور تحفہ صاحب تحفہ کو اپنی فضاؤں سے آشنا بنا دیا کرتا ہے اور اسے ایک عالم سے دوسرے عالم میں پہونچا دیا کرتا ہے۔

•۔ نماز مادی دنیا کے لئے ایک تھرمامیٹر ہے۔ تھرمامیٹر وہ آلہ ہے جس سے انسانی جسم کی حرارت کا اندازہ کر لیا جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حرارت گھٹ کر نقطۂ انجماد کی طرف یا بڑھ کر نقطۂ ہلاکت کی طرف تو نہیں جا رہی ہے۔ نماز ایمانی حرارت کے لئے ایک تھرمامیٹر کا کام کرتی ہے۔ ہر شخص کا خیال یہ ہے کہ وہ حقیقی صاحب ایمان ہے اور ایمان وعقیدہ کے مقابلہ میں کسی شے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہے۔ اس کا عزیز ترین سرمایہ اس کا ایمان ہے اور ایمان سے بلند تر کوئی شے نہیں ہے۔ لیکن جب مقام امتحان میں آتا ہے تو بہت سے حقائق بے نقاب ہو جاتے ہیں اور ایمان کی کل حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔

انسانی زندگی میں امتحان کے تین اہم مواقع ہیں جب ایمان خطرہ میں پڑ جاتا ہے اور دنیا کی گرمی ایمان کی حرارت پر غالب آجاتی ہے اور ایمان کی گرمی کو کم کر دیتی ہے۔

ایک موقع ہے راحت کا جہاں آرام پسندی ایمان کے تقاضوں سے غافل بنا دیتی ہے اور انسان راحت و آرام کے آگے ایمان وعقیدہ کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔

دوسرا موقع ہے شہوت اور خواہش کا جہاں انسان اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ نہ عقیدہ یاد رہ جاتا ہے اور نہ ایمان۔ دل میں بس ایک ہی آواز ہوتی ہے کہ دنیا کی خواہش کی تکمیل کر لی جائے، اس کے بعد آخرت کی خیر خدا جانے۔

تیسرا موقع ہے فرصت کہ انسان کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو تھوڑی دیر فرصت سے بیٹھنا چاہتا ہے اور اس وقت اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی ہے چاہے ایمان وعقیدہ ہی کیوں نہ ہو۔

پروردگار نے نماز کے تین اوقات معین کر کے ہر ایمانی حرارت کا امتحان کرلیا۔
صبح کی نماز راحت اور ایمان کا مقابلہ ہے اور اس وقت یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی میں راحت زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا ایمان وعقیدہ۔

ظہرین کی نماز خواہشات کا تھرمامیٹر ہے کہ انسان دنیا کمانا چاہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اسباب دنیا حاصل کرلینا چاہتا ہے اور نماز بندگیٔ پروردگار کی دعوت دیتی ہے۔
مغربین کا وقت فرصت اور عبادت کا ٹکراؤ ہے جہاں صاحب ایمان مصلیٰ کا رُخ کرتا ہے اور ضعیف الایمان انسان پہلے آرام کے بارے میں سوچتا ہے اس کے بعد نماز کا خدا حافظ ہے۔

• واضح رہے کہ جس طرح دنیا میں کسی منزل تک پہونچا دینے والا جس شرط کا مطالبہ کرتا ہے اس پر عمل مطابق عقل وفطرت ہوتا ہے۔ اسی طرح آخرت میں جنت تک پہونچانے والے کے شرائط پر بھی مکمل طور سے عمل ہونا چاہیئے۔ آخرت میں شفاعت کرنیوالے معصومین نے یہ شرط لگادی ہے کہ "ہم اہلبیتؑ کی شفاعت نماز کو ہلکا خیال کرنیوالوں کے لئے نہیں ہے۔"

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

نماز سرچشمۂ طاقت

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کمزور ہے اور کمزور ہی پیدا ہوا ہے "خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا" اس کی خلقت اور فطرت کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کمزوری کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ وہ آغاز خلقت سے اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے قابل بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں صحیح معنوں میں بصارت اور اس کے کان واقعًا سماعت کا کام بھی نہیں کرتے ہیں۔ وہ کمزوری کا مجسمہ اور ناطاقتی کا نمونہ ہوتا ہے۔

یہ تو مالک فطرت کا کرم ہے کہ وہ انسان کو صحرا اور بیابان میں نہیں اُتارتا ہے بلکہ ماں باپ کی گود میں نازل کرتا ہے تاکہ ناطاقتی میں ایک طاقت کا سہارا رہے اور کمزوری میں کوئی ہاتھ پکڑنے والا رہے۔

لیکن اس کے پہلو میں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ انسان آگے چل کر اسقدر طاقتور ہوجاتا ہے کہ اپنے کو سُپر پاور کا نام دے دیتا ہے اور اسی بنیاد پر انتہائی غرور واستکبار کا شکار ہوجاتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی اس طاقت کا سرچشمہ کہاں ہے اور وہ اس غرور وفریب میں کس طرح مبتلا ہوجاتا ہے؟

بات صرف یہ ہے کہ انسان کی طاقت کے دو میدان ہیں: انفرادی اور اجتماعی۔

انفرادی طاقت کے لئے وہ ماں باپ کی محبت۔ بزرگوں کی شفقت۔ غذاؤں کی خوبی۔ ماحول کی رنگینی اور مادی اسباب کا سہارا لیتا ہے کہ ان کے بغیر طاقت تو بڑی بات

ہے زندگی کا محفوظ رہنا بھی مشکل ہے۔

لیکن اجتماعی میدان میں یہ اسباب کام نہیں آتے ہیں اور وہاں مختلف وسائل سے اپنے کو طاقتور ثابت کیا جاتا ہے اور اس طرح دوسروں کا کیا ذکر ہے اپنے نفس کو بھی دھوکہ دیا جاتا ہے۔

ا۔ طاقت کا ایک وسیلہ نسل ہے کہ بعض نسل کے افراد کا خیال یہ ہے کہ ہمیں دنیا پر حکومت کرنے کا حق ہے اور دیگر افراد کا فرض ہے کہ وہ ہمارے محکوم بن کر زندہ رہیں اور ہمارے احکام پر عمل کرتے رہیں۔ ہم طاقتور نظر آئیں اور وہ کمزور۔

ب۔ بعض افراد کی نگاہ میں یہ وسیلہ رنگ ہے کہ گورے رنگ کا مالک ہونا طاقت کا سرچشمہ ہے اور کالے رنگ والے کی کمزوری یہ ہے کہ وہ کالا پیدا ہوا ہے لہٰذا اسے غلامی کی زندگی گذارنی چاہیئے اور گورے انسان کو اس پر حکومت کرنی چاہیئے۔

ج۔ حقوق انسانی کے دستور نے طاقت کا سرچشمہ عوام کو قرار دیا ہے کہ جس شخص کو بھی عوام کی حمایت حاصل ہو جائے وہ طاقتور ہے ورنہ کمزور کا کمزور ہی رہے گا۔ الکشن کی بنیاد اسی تصور پر رکھی گئی ہے اور حکومتوں کی طاقت کا مرکز یہی عوامی اکثریت ہے جس نے ایک فریق کو طاقتور اور دوسرے کو کمزور بنا دیا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان مصادر و مراکز کی کوئی حقیقت ہے اور کیا ان میں واقعاً کوئی طاقت و قوت پائی جاتی ہے؟

ہرگز نہیں۔!

اونچی نسل کا آدمی اونچا فرض کر لیا جاتا ہے لیکن اس اونچائی میں کوئی طاقت اور قوت پائی جاتی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ صرف ایک تصور ہے جو اونچی نسل میں پایا جاتا ہے کہ ہم طاقتور ہیں اور ایک توہّم ہے جو دوسری نسلوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ ہم کمزور ہیں۔ ورنہ نہ اس نسل میں کوئی طاقت ہے اور نہ اُس نسل میں کوئی کمزوری ــــ علاوہ اس کے کہ نسلوں میں اونچائی اور پستی کا تصور بھی ایک اعتباری شے ہے جس کی طاقت کی دنیا میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ احترام اور عزّت دوسری شے ہے۔ طاقت کی دنیا اس سے بالکل مختلف ہے۔

اس کے لئے کوئی دوسرا ہی مرکز و مصدر درکار ہے۔

یہی حال رنگ کا ہے کہ رنگ میں کوئی طاقت نہیں پائی جاتی ہے اور نہ اس سے قوت و ضعف کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک تاریخی تصور یا توہّم ہے کہ ایک رنگ والے کو طاقتور اور حاکم تصوّر کر لیا جائے اور دوسرے کے مقدر میں غلامی لکھ دی جائے، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے اس تفرقہ کی کوئی واقعیت نہیں ہے اور نہ کسی رنگ میں کسی طرح کی کوئی طاقت پائی جاتی ہے۔

عوام کا سرچشمۂ طاقت ہونا بھی فرضی اور اعتباری حکومت کے لئے تو کارآمد ہو سکتا ہے لیکن واقعی قدرت و طاقت اور حقیقی حکومت و اقتدار کے لئے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بھلا یہ بات کس طرح معقول ہو سکتی ہے کہ جو انسان فطری طور سے کمزور اور ناطاقت پیدا ہوئے ہیں، ان کا ایک مجموعہ طاقت کا سرچشمہ بن جائے اور کسی شخص کو واقعی طاقتور بنا دے۔

یہی وجہ ہے کہ عوام کی اکثریت انسان کو صدر جمہوریہ۔ سلطان۔ بادشاہ اور وزیر اعظم تو بنا سکتی ہے لیکن اس کی کھانسی۔ بخار۔ بلڈ پریشر اور کینسر کا علاج نہیں کر سکتی ہے اور نہ اس کی کمزوری کو طاقت میں تبدیل کر سکتی ہے۔ وہ اگر کمزور ہے تو کمزور رہے گا اور گھر سے نکلتے ہوئے خوف کا احساس کرے گا۔ اسے فوجوں کی سلامی طاقتور اور لشکروں کی موجودگی نڈر نہیں بنا سکتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو عہدے انسان کو اور بھی کمزور بنا دیتے ہیں اور اس کے دل و دماغ میں دہشت کا مزید گذر ہو جاتا ہے اور انسان پرچھائیوں سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔

جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی طاقت کا سرچشمہ مخلوقات میں کوئی شے نہیں ہے۔ اس کی طاقت کا سرچشمہ وہی صاحب قوت و قدرت مالک ہے جس نے اسے کمزور پیدا کر کے اس کی فطرت میں اپنا عرفان رکھ دیا ہے تاکہ جب بھی کمزوری سے وحشت کا احساس پیدا ہو فوراً اس کی طرف توجہ کر کے اپنی کمزوری کا علاج کرے اور ایک نئی طاقت حاصل کر لے۔

نماز۔ اس سے ارتباط کا بہترین وسیلہ ہے۔ جہاں کمزور انسان صبح کو گھر سے باہر نکلنے سے پہلے مالک سے استمداد کرتا ہے اور دوپہر کو حالات کا مقابلہ کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو دوبارہ طاقت کی درخواست پیش کرتا ہے اور شام کو گھر آکر پھر گذارش کرتا ہے کہ خدایا! آئندہ زندگی بھی تیرے ہی رحم وکرم کی محتاج ہے، "ایاك نستعين"۔

اور دنیا کا اقتدار واختیار بھی تیرے ہی کرم کا نتیجہ ہے "تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعزّ من تشاء وتذلّ من تشاء بيدك الخير انك علىٰ كل شيئ قدير"۔

والسّلام علىٰ من اتبع الهدىٰ

نماز اور جہاد

دین اسلام نے جہاں ایک طرف نماز کو مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ کا ہدف اصلی اور نصب العین بنا دیا ہے کہ مسلمان کو عالمی اقتدار بھی حاصل ہو جائے تو اس کا پہلا کام اقامہ صلوٰۃ ہے۔ مسلمان حضر میں رہے یا سفر میں۔ صحت کے عالم میں ہو یا مرض کے عالم میں۔ صلح کی منزل میں ہو یا میدان جدال وقتال میں، ہر موقع پر نماز کا یاد رکھنا اور اسے زندگی کے مقصود اصلی کی حیثیت دینا اس کا فرض اولین ہے۔

مولائے کائنات؏ نے میدان صفین میں جنگ روک کر نماز قائم کر کے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا "انما نقاتلهم على الصلوٰة" ہمارا جہاد اسی نماز کے لئے ہے ـــ نماز مقصد جہاد ہے اور نماز اور جہاد میں اس قدر گہرا رابطہ پایا جاتا ہے کہ یہ بات آداب جہاد میں شامل ہے کہ اس کا سلسلہ نماز کے بعد شروع کیا جائے اور یہ بات مقاصد جہاد میں شامل ہے کہ ہر گام پر نماز کا خیال رکھا جائے تو جس طرح اسلام نے نماز کو جہاد کا اوّل وآخر بنا دیا ہے اسی طرح خود نماز کو بھی جہاد کی اک شکل دے دی ہے تاکہ مسلمان نمازی اور مجاہد دو قسموں پر تقسیم نہ ہو جائیں بلکہ ہر مسلمان بیک وقت نمازی بھی رہے اور مجاہد بھی رہے اور اسے نماز ہی کے ذیل میں جہاد کی تربیت بھی حاصل ہوتی رہے۔

یہ غلط تصوّر ہے کہ جہاد طاقتور لوگوں کا کام ہے اور نماز بیکاری کا ایک بہترین مصرف ہے۔ اسلام اس تصور سے ہرگز راضی نہیں ہے۔ وہ نمازی کو اپنے امکان کی حدوں تک مجاہد دیکھنا چاہتا ہے اور مجاہد کو ایک لمحہ کے لئے بھی نماز سے الگ نہیں کرنا چاہتا ہے۔ اس نے نماز کو مکمل طور پر جہاد کی حیثیت دے دی ہے۔ مثال کے طور پر نماز اور جہاد کے مشترکہ مسائل و حالات یہ ہیں:

مراحل جہاد

اسلام اپنے جہاد کو اس طرح منظم کرتا ہے کہ پہلے اسلامی قائد کی طرف سے جہاد کا اعلان ہوتا ہے۔

اس کے بعد مجاہد کی صفیں تیار ہوتی ہیں اور سب صف باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔

اس کے بعد ہر ایک کو خدا کی عظمت و کبریائی کا احساس دلایا جاتا ہے کہ کامیابی صرف اس کی مدد پر موقوف ہے۔ انسانی طاقت اور اسلحہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے "واعلموا ان النصر من عند اللہ"۔

اس کے بعد ہر مجاہد ذکر خدا میں مصروف ہوجاتا ہے اور اپنے قائد کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے چاہے یہ سر دوبارہ اٹھے یا نہ اٹھے۔

اس کے بعد مجاہد اپنی ساری توانائی راہ خدا میں صرف کرنے کے بعد منزل شہادت میں قدم رکھ دیتا ہے۔

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

مراحل نماز

نماز بعینہ اسی جہاد کی ایک تمثیل ہے جہاں دشمن کا لشکر بظاہر سامنے نہیں ہوتا ہے لیکن شیاطین کی ایک فوج ہر آن حملہ کرنے کے لئے کھڑی رہتی ہے اور اسی لئے مسجد کے مرکزی مقام کو محراب اور محل حرب وضرب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس منزل جہاد میں کبھی انسان مکمل طور پر کامیاب ہوجاتا ہے تو "انت زین العابدین" کا لقب پا جاتا ہے اور کبھی شکست خوردہ اور ناکام ہوجاتا ہے تو "ویل للمصلین" کا حقدار ہوجاتا ہے۔ نماز کے مسلسل مراحل جہاد یہ ہیں:

اسلامی قائد پہلے اذان دلواتا ہے جو جہاد کی تیاری کا اعلان ہے جس طرح کربلا میں صبح عاشور امام حسینؑ نے اپنے فرزند علی اکبرؑ کو حکم اذان دیا تھا۔ اس کے بعد قائد اسلام خود

بھی بنفس نفیس تیاری کا اعلان کرتا ہے اور اقامت کے ذریعہ قیام کی دعوت دیتا ہے۔

جس کے بعد نمازیوں کی صفیں تیار ہوجاتی ہیں اور سب صف باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور اپنے سربراہ کے حکم کا انتظار کرتے ہیں۔

اس کے بعد سربراہ نیت کے ساتھ اللہ اکبر کہہ کر مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرتا ہے کہ دنیا کی کسی شیطانی طاقت کی کوئی حیثیت پروردگار کے سامنے نہیں ہے اور وہ ساری کائنات سے بالاتر بلکہ انسانی تصوّر و تفکّر سے بلند تر ہے۔ مسلمان کا اعتماد اسی کی ذات اقدس پر ہونا چاہیئے اور اپنی زندگی کو اسی عقیدہ کے سانچہ میں ڈھال دینا چاہیئے۔

اس کے بعد سربراہ جہاد ان آیات کی تلاوت کرتا ہے جو نمازیوں کے عقیدہ کو پختہ بناتی ہیں "ایاک نعبد وایاک نستعین" اور اس مقصد کی طرف توجہ دلاتا ہے جس کے زیر اثر اسلام میں جہاد ہوتا ہے "اھدنا الصراط المستقیم"۔

اس کے بعد تمام مجاہدین بشکل رکوع اس کی بارگاہ میں سر جھکا دیتے ہیں اور اس قدر جھک جاتے ہیں کہ پشت کی سطح برابر ہوجاتی ہے۔ گویا اسلامی قوانین کا بار مکمل طور پر اُٹھانے کے لئے تیار ہیں اور کسی حکم کے گرنے یا پھسل جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اور پھر گردن کو آگے کی طرف بڑھا دیتے ہیں کہ یہ جہاد مکمل قربانی کے لئے ہے اس کے نتیجہ میں سر قلم بھی ہوجائے تو کوئی فکر نہیں ہے۔

اس کے بعد اسی جذبہ کی تکمیل کے لئے سر سجدۂ معبود میں رکھ دیا جاتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی مرحلہ فنائے نفس اور قربانی ذات کا نہیں ہے۔

اس کے بعد تشہد کی شکل میں شہادت دی جاتی ہے اور سلام کی صورت میں تسلیم محبت کے مرحلہ کی تکمیل کی جاتی ہے۔

نماز جمعہ

نماز کے جملہ تصورات کی ایک نمایاں شکل نماز جمعہ میں نظر آتی ہے جو فی الواقع

جہاد کی تیاری کا ایک بنیادی اہتمام ہے اور عام طور سے اسلامی جہاد جمعہ کے دن نماز کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

اس نماز کے بنیادی مناظر یہ ہیں کہ پہلے اذان دی جاتی ہے اس کے بعد قرآن مجید مسلمانوں کو آواز دیتا ہے کہ قائد اسلام کی آواز سننے کے بعد فوراً دوڑ پڑیں اور ہر طرح کے کاروبار کو نظر انداز کر دیں:

"فاسعوا الی ذکر اللّٰہ وذروا البیع"

اس کے بعد جب مسلمان جمع ہو جاتے ہیں تو خطیب ان کے سامنے دو طرح کے خطبہ پیش کرتا ہے۔ ایک کا تعلق ان کی دنیا سے ہوتا ہے اور دوسرے کا تعلق ان کی آخرت سے۔ یعنی ایک کے ذریعہ عبادت کے مسائل حل کئے جاتے ہیں اور دوسرے کے ذریعہ سیاست کے مسائل۔

خطیب کے لئے بھی قیام شرط ہے کہ اگر سربراہ ہی بیٹھ کر ہدایات دے گا تو قوم میں قیام اور انقلاب کا حوصلہ کہاں سے پیدا ہوگا۔

خود نماز جمعہ میں حاضری کے شرائط و آداب بھی تمامتر جہاد سے مماثلت رکھتے ہیں:

نماز جمعہ میں شرکت انھیں لوگوں پر واجب ہے جو جہاد در راہ خدا میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں تاکہ نماز کے بعد جب جہاد کا اعلان کر دیا جائے تو نمازی دو حصّوں پر نہ بٹ جائیں کہ مجاہدین کے حوصلے پست ہو جائیں یا شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا کر دے کہ جب یہ نہیں جا رہے ہیں تو ہم ہی تنہا کیوں جائیں۔

نماز جمعہ میں عورتوں کی شرکت واجب نہیں ہے۔

نماز جمعہ اندھے اور زمین گیر لوگوں پر واجب نہیں ہے۔

نماز جمعہ مسافر اور مجبور پر فرض نہیں ہے۔

ان تمام افراد میں جہاد در راہ خدا کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے لہٰذا ان کی تربیت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ چونکہ نماز نماز ہے مکمل جہاد نہیں ہے لہٰذا

ان افراد کو منع بھی نہیں کیا گیا ہے اور شرکت کی اجازت دے دی گئی ہے کہ انکی تربیت دوسرے افراد کے کام آسکتی ہے۔

نماز جمعہ میں جماعت کی شرط بھی جہاد کی ایک تمثیل ہے اور نماز جمعہ کے واجب عینی ہونے میں حضور امامؑ کی شرط بھی جہاد کی ایک شکل ہے کہ جس طرح جہاد کا وجوب امام اصلؑ کے اذن کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے اسی طرح نماز جمعہ کا وجوب عینی بھی اذن امام عادلؑ کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔

اور یہ تمام باتیں دلیل ہیں کہ اسلام میں نماز اور جہاد ایک مقصد کے دو رُخ ہیں اور اسی لئے دونوں کے احکام میں مکمل طور پر مماثلت پائی جاتی ہے۔

فلسفۂ اوقات نماز

بندگی کی لذّت سے ناآشنا اور عبادت سے فرار کرنے والی طبیعتیں ہمیشہ اطاعت وعبادت کے مسئلہ میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کرتی رہتی ہیں اور کسی قیمت پر مالک کے احکام کے سامنے سرِنیاز جُھکانے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ ان کا تمامتر خیال یہ ہوتا ہے کہ عبادات کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر یا قانون نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے انسان کی پسند۔ مرضی اور صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ اپنی سہولت اور اپنے حالات کے اعتبار سے جب جیسا طرح مناسب ہوگا عبادت کرلے گا۔ ان بیچاروں کو بندگی اور عبادت کا مفہوم بھی نہیں معلوم ہے کہ جو عمل اپنی مرضی اور پسند سے انجام دیا جاتا ہے اسے عبادت نہیں کہا جاتا ہے اور اگر کہا جاتا ہے تو نفس پرستی اور عبادت شیطان کہا جاتا ہے عبادت رحمان نہیں کہا جاتا ہے۔ عبادت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ بندہ کی مرضی کام نہ کرے بلکہ مالک کی رضا کام کرے اور عمل اسی کے حکم کے مطابق انجام دیا جائے ورنہ اپنی مرضی کا دخل عبادت کو مرحلۂ بندگی سے باہر نکال دیتا ہے۔ عبادت کا کمال ہی اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب نفس پر جبر ہو اور بات مزاج پر بار ہو تا کہ انسان صرف مرضی معبود کی بنا پر عمل کو انجام دے اور اس میں کسی طرح کی نفس پرستی کا دخل نہ ہونے پائے۔

مولائے کائناتؑ نے مہمان نوازی۔ جہاد بالسیف اور گرمیوں کے روزوں کو اسی لئے محبوب قرار دیا تھا کہ ان تینوں مراحل میں نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے اور صرف مرضئ مولا کی بنا پر ہنسی خوشی عمل انجام دیا جاتا ہے اور پھر وہ عمل معراج بندگی بن جاتا ہے۔

مولائے کائناتؑ کے اس عمل کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب حضرات حسنینؑ

کی بیماری کے موقع پر گھر والوں نے روزوں کی نذر کی اور شفایابی کے بعد تمام اہل خانہ نے روزے رکھے اور اس عمل میں وہ بچے بھی شامل ہوگئے جو کل بیماری سے اٹھے ہیں اور پھر افطار کے موقع پر سارا سامان یتیم ومسکین واسیر کے حوالہ کر دیا تو پروردگار نے اس کی مدح کے لئے ایک آیت کو کافی نہیں سمجھا بلکہ پورا سورہ نازل کر دیا اور اس امر کا اعلان بھی کر دیا کہ یہ عظیم جزا صرف اس لئے ہے کہ یہ عمل خالص بندگی کا عمل ہے اور اس میں کسی طرح کی نفسانی خواہش یا مادی جذبہ کا دخل نہیں ہے "انما نطعمکم لوجہ اللہ ولا نرید منکم جزاءً ولا شکوراً"۔

بہرحال اعتراض پسند طبیعتوں کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ نماز کے اوقات الگ الگ کیوں رکھے گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ۱۷ رکعت نماز واجب کر کے انسان کو آزاد کر دیا جاتا اور وہ اپنی سہولت کے اعتبار سے کسی وقت بھی ۱۷ رکعت ادا کر دیتا۔ ظاہر ہے کہ اس اعتراض کے پیچھے کوئی منطق نہیں ہے اور یہ صرف اعتراض برائے اعتراض ہے ورنہ جب پروردگار نے ماہ مبارک کے روزوں کو ایک ساتھ واجب کر دیا تو انھیں طبیعتوں نے پھر یہ سوال اٹھا دیا کہ تیس روزہ ایک ساتھ کیوں؟ ــ انھیں سال بھر پر تقسیم کر دیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ گویا نماز الگ الگ کر دی جائے تو مصیبت ہے اور روزہ ایک ساتھ رکھ دیا جائے تو قیامت ہے۔

مولائے کائناتؑ نے کوفہ والوں کے بارے میں سچ فرمایا تھا کہ انھیں راہ خدا میں جہاد کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہے۔ یہ گرمی میں گرمی کا بہانہ کرتے ہیں اور سردی میں سردی کا عذر کرتے ہیں اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جو موسم کی سختی برداشت نہیں کر سکتا وہ تلواروں کی آنچ کو کس طرح برداشت کرے گا۔

مذکورہ بالا اعتراض کے بارے میں سنجیدہ فکر یہ ہے کہ عبادات کے جملہ اصول انسان کو خود پرستی سے نکال کر خدا پرستی تک لے جانے کے ذرائع ہیں لہٰذا ان میں ایک طرح کی مشق بندگی ہی ہے کہ انسان کے عمل پر حالات یا ماحول کا اثر نہ پڑنے پائے اور ایک طرح کا امتحانِ عبدیت بھی ہے کہ انسان خود اپنے نفس کا محاسبہ کرے کہ اس کا عمل بندگی کی بنیاد پر ہے یا

نفس پرستی کی بنیاد پر۔

مولائے کائنات ؑ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا کہ "اپنے نفس کا خود حساب کرو قبل اس کے کہ تمھارا حساب کیا جائے۔"

۔ نماز کے اوقات انسانی زندگی میں ایک تھرمامیٹر کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جس طرح مریض کا مزاج دریافت کرنے کے لئے صبح وشام تھرمامیٹر لگا کر درجۂ حرارت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام نماز کا تھرمامیٹر لگا کر حرارتِ ایمانی کا اندازہ کرنا چاہتا ہے۔

صبح کی نماز اس لئے واجب کی گئی تاکہ انسان کو یہ اندازہ ہو جائے کہ اس کی حرارتِ ایمانی پر خواہش آرام کا اثر ہوتا ہے یا نہیں جب کہ ایک طرف نسیم صبح کے جھونکے رات کے جاگے ہوئے انسان کو سُلانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف حیّ علی الصلوٰۃ کی آواز بستر سے اُٹھانا چاہتی ہے۔

ظہرین کی نماز حرارت ایمانی کے محنت پر غلبہ کا امتحان ہے کہ انسان اپنے کاروبارِ زندگی میں مصروف ہے اور اچانک حیّ علی الفلاح کی آواز گونجنے لگی اور اب اسے یہ سوچنا پڑا کہ زندگی کی کامیابی دفتر۔ کالج۔ کاروبار اور معاملات زندگی میں ہے یا نماز اور بندگیٔ پروردگار میں۔

مغربین کی نماز میں راحت پسندی کا امتحان ہے جب دن بھر کا تھکا ماندہ انسان ذرا آرام کرنا چاہتا ہے اور موذن آواز دیتا ہے "حیّ علیٰ خیر العمل" آرام بے عملی ہے اور نماز بہترین عمل۔ مردِ عاقل کا فرض ہے کہ بے عملی کے مقابلہ میں خیر عمل کے راستے کو اختیار کرے اور اپنے جذبۂ ایمانی پر راحت پسندی کو غالب نہ آنے دے۔ ایمان سراپا عمل۔ حرکت اور جہاد ہے اور راحت پسندی ان تمام حقائق کی مکمل دشمن ہے۔ راحت پسندی مزاج میں داخل ہو گئی تو انسان کسی محاذ زندگی کا مجاہد نہیں ہو سکتا ہے۔ جہاد۔ سعی، کوشش، زحمت، مشقت اور عمل پیہم کا نام ہے۔ جہاد میں راحتِ ابدی تو ہے لیکن راحت پسندی نہیں ہے۔

۔ نماز شب کا تعین بھی انسانی زندگی کا عظیم ترین امتحان ہے جہاں نیند کا مقابلہ بھی ہوتا ہے اور آرام کا بھی اور اس سے بالاتر جنسی جذبات کا بھی۔ اور شائد یہی وجہ ہے کہ پروردگار نے بندہ کی کمزوری پر رحم کھا کر اس نماز کو مستحب بنا دیا تاکہ اس سے محبت پروردگار کا امتحان لیا جائے۔ بندگی اور ایمان کا امتحان نہ لیا جائے ۔ ورنہ جن کے نفس کی طاقت پر

اعتبار تھا ان پر یہ نماز بھی واجب کر دی اور انھوں نے ۹ ازواج کے حلقہ میں رہ کر ایک رات بھی نماز شب قضا نہیں کی اور اپنے عمل کو قیامت تک کے لئے نمونۂ بندگی بنا دیا۔

۔ نماز کی طرح اور دیگر تھرمامیٹر بھی ہیں جن سے بندگی کا امتحان کیا جا سکتا ہے مثلاً ذکرِ جہنم خوفِ خدا کا تھرمامیٹر ہے کہ جہنم کے تصور سے انسان لرز جائے اور اس کے چہرہ کا رنگ بدل جائے تو اس میں خوف خدا ہے اور وہ جہنم کا مذاق اڑائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خوفِ خدا سے بالکل بری اور بیگانہ ہے۔

۔ موعظہ کا اثر نہ کرنا غذا کا تھرمامیٹر ہے کہ امام حسین ؑ نے فوج یزید سے فرمایا تھا کہ تم پر میری نصیحتوں کا اثر اس لئے نہیں ہو رہا ہے کہ تمھارے پیٹ مال حرام سے بھرے ہوئے ہیں۔ گویا انسان کی زندگی پر مواعظ اور نصیحتوں کا اثر نہ ہو تو اسے اپنی غذا کا جائزہ لینا چاہیئے کہ یہ غذا حرام تو نہیں ہے ورنہ حرام غذا نہ ہوتی تو موعظہ کا اثر ضرور ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی انسان جہالت کی بنا پر حلال و حرام کا فیصلہ بھی نہیں کر پاتا اور حرام گوشت۔ رشوت۔ سود کو بھی رزق حلال میں شمار کر لیتا ہے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

مسجد

• توریت میں ارشاد پروردگار ہے کہ زمین پر میرے گھر کا نام مسجد ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جو اپنے گھر میں طہارت کر کے میرے گھر میں حاضری دے۔ یاد رکھو کہ جس کی زیارت کی جائے اس پر زیارت کرنے والے کا ایک حق ہوتا ہے تو میری طرف سے رات کے اندھیرے میں مسجد کی طرف آنے والوں کو روز قیامت کے نور کی بشارت دے دو۔

(رسول اکرمؐ)

• امیرالمومنینؑ نے اپنے گھر کے اندر ایک اوسط درجہ کی جگہ نماز کے لئے مخصوص کردی تھی اور اس کی حیثیت مسجد کی تھی۔

• ابوذر نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ! آبادیٔ مسجد کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا اس میں آواز بلند نہ ہو۔ مہمل گفتگو نہ کی جائے۔ خرید و فروخت نہ ہو۔ لغویات کو ترک کردیا جائے۔ ایسا نہ کیا جائے گا تو روز قیامت اپنے ہی نفس کی ملامت کرنا پڑے گی۔

(بحار ۷۷/۸۵)

• نمازِ جماعت کے لئے مسجد کی طرف جانے میں ہر قدم پر ۷۰ ہزار نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور ۷۰ ہزار درجات بلند ہوتے ہیں بلکہ اس راہ میں مر گیا تو پروردگار ۷۰ ہزار فرشتوں کو معین کرتا ہے جو قبر میں انیس تنہائی ہوتے ہیں اور قیامت تک استغفار کرتے رہتے ہیں۔

• مسجد میں بیٹھنا جنت میں بیٹھنے سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ جنت میں بیٹھنا میری اپنی خواہش ہے اور مسجد میں بیٹھنا میرے پروردگار کی مرضی ہے۔

• جو لوگ مسجد کی اذان کی آواز سنتے ہیں۔ ان کی نماز مسجد سے باہر نماز نہیں ہے

جب تک کوئی معقول عذر یا بیماری نہ ہو۔

• جو شخص مسجد میں آمد و رفت رکھے گا اسے آٹھ میں سے کوئی ایک شرف ضرور حاصل ہوگا۔ برادر ایمانی کا حصول۔ حصول علم۔ آیت محکم۔ رحمت منتظرہ۔ وہ کلمہ جو ہلاکت سے بچالے۔ وہ کلمہ جو راہ حق کی ہدایت دیدے۔ خوف خدا یا شرم و حیا سے گناہ کا چھوڑ دینا۔

میزان الحکمہ ۴/۳۹۰)

۔" ماکان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللّٰہ شاھدین علیٰ انفسھم بالکفر اولٰئک حبطت اعمالھم وفی النّار ھم خالدون ۝ انما یعمر مساجد اللّٰہ من اٰمن باللّٰہ والیوم الآخر واقام الصلوٰۃ وآتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللّٰہ فعسیٰ اولٰئک ان یکونوا من المھتدین۔ (توبہ ۱۷-۱۸)

" یہ کام مشرکین کا نہیں ہے کہ وہ مساجد خدا کو آباد کریں جب کہ وہ خود اپنے نفس کے کفر کے گواہ ہیں۔ ان کے اعمال برباد ہیں اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کو صرف وہ لوگ آباد کرتے ہیں جن کا ایمان اللہ اور روز آخرت پر ہے اور جنھوں نے نماز قائم کی ہے، زکوٰۃ ادا کی ہے اور سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو عنقریب ہدایت یافتہ لوگوں میں شمار کئے جائیں گے۔

استنتاج

۔ جب عام مساجد خانۂ خدا ہیں تو وہ گھر جس کو خدا نے اپنے گھر کے عنوان سے تعمیر کرایا ہے اس کا کیا مرتبہ ہوگا اور جب عام مساجد میں داخلہ کا ادب یہ ہے کہ انسان طہارت کر کے داخل ہو تو خانۂ کعبہ کا قانون کیا ہوگا اور اس خاتون کی منزل طہارت کیا ہوگی جسے دیوار میں دروازہ بنا کر اندر طلب کر لیا جائے۔

۔ جب نماز جماعت میں شرکت کرنے والا ۷۰ ہزار نیکیوں کا مالک ہو جاتا ہے اور اسے ۷۰ ہزار درجات مل جاتے ہیں۔ تو اس امام جماعت کا کیا مرتبہ ہوگا جو امام وقت ہو اور جس کے پیچھے نماز پڑھنا ضروری ہو بلکہ اس سے الگ ہو کر نماز کی کوئی قیمت نہ ہو۔

ـــ جب مسجد میں بیٹھنا رضائے رب کا تقاضا ہے تو اس سے زیادہ مسجد کا رشتہ کس کا ہوگا جس نے بستر پیغمبرؐ پر سو کر رضائے الٰہی کا سودا کیا ہو۔

ـــ جب اہل دنیا اپنے گھر میں ہر کام کے لئے ایک جگہ معین کر لیتے ہیں اور دوسری جگہ کو اس کام کے لئے استعمال نہیں کرتے ہیں تو جس گھر کو عبادت کے لئے بنایا گیا ہے اسے چھوڑ کر گھر میں نماز پڑھنا ادب دنیا کے بھی خلاف ہے اور ایسا انسان مہذب نہیں کہا جا سکتا ہے۔

ـــ آبادی مساجد کے لئے ایمان باللہ ضروری ہے تاکہ خانۂ خدا کی عظمت کو پہچانے اور ایمان آخرت ضروری ہے تاکہ دنیاوی فائدہ کی فکر میں نہ رہے اور آخرت کے فائدہ کو دنیا کے نقصان کی تلافی قرار دے۔ نماز قائم کرنا ضروری ہے تاکہ نماز خانۂ خدا کو آباد کرے۔ زکوٰۃ ادا کرتا ہو تاکہ اس راہ میں پیسہ خرچ کر سکے۔ خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتا ہو تاکہ طعن و طنز اور مادی نقصانات کی پرواہ نہ کرے اور خانۂ خدا کو آباد رکھے۔

روزہ

"یا ایہا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون ؔ"

روزہ اسلام کا دوسرا فریضہ ہے جو نماز کے مقابلہ میں بہر حال با مشقت عمل تھا۔ اس لئے پروردگار نے اس احساسِ مشقت کو ختم کرنے کے لئے اور انسان کو نفسیاتی اعتبار سے اس فریضہ کے لئے آمادہ کرنے کے واسطے چار اسلوب اختیار فرمائے ہیں۔

• انسانوں کے بجائے صاحبان ایمان کو مخاطب بنایا ہے تاکہ مخاطب کو یہ احساس پیدا ہو کہ پروردگار نے مجھے عام انسانوں سے ممتاز بنا کر صاحب ایمان کا درجہ دیا ہے تو میرا کردار بھی عام انسانوں سے بلند تر ہونا چاہیے اور مجھے وہ تمام زحمتیں برداشت کرنا چاہئیں جنھیں عام انسان باعتبار انسانیت برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ "جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے"۔

• کُتِبَ مجہول کا صیغہ استعمال کیا گیا حالانکہ لکھنے والا اور فریضہ قرار دینے والا پروردگار ہی ہے۔ اس لئے کہ اس کی رحمت اس بات کو گوارا نہیں کر رہی تھی کہ وہ مشقت آمیز عمل کو براہ راست اپنی طرف منسوب کرے اور نادان انسان اس کی رحمت کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ورنہ جہاں جہاں رحمت کا تذکرہ ہوا ہے وہاں اس نے بات کو براہ راست اپنی طرف منسوب کیا ہے اور کتابت ہی کے لہجہ میں تذکرہ کیا ہے۔ ایک مقام پر اعلان ہوتا ہے "رحمتی وسعت کل شیٔ فسأکتبہا للذین یتقون" میری رحمت ہر شے کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں۔

دوسرے مقام پر اعلان ہوتا ہے "کتب ربکم علیٰ نفسه الرحمة" تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت کو لکھ لیا ہے۔

۔ رحمت اور زحمت کے ان لہجوں کا فرق قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جب صاحبان ایمان کے جنت میں سیراب کرنے کا ذکر کیا گیا تو صاف لفظوں میں کہا گیا: "سقاهم ربّهم شرابًا طهورًا" پروردگار انھیں پاکیزہ شراب سے سیراب کرے گا۔

اور جب اہل جہنم کے سیراب کرنے کی بات آئی تو کہا گیا " سقوا ماءً احميمًا" انھیں کھولتے ہوئے پانی سے سیراب کیا جائے گا۔

بظاہر اس اختلاف کا منشا یہ ہے کہ پروردگار اپنے بندوں کی کمزور ذہنیت سے باخبر ہے اور وہ نہیں چاہتا ہے کہ انسان اس کے بارے میں کسی طرح کا سوءِ ظن پیدا کرے یا اس کی طرف سے کسی مایوسی کا شکار ہوجائے اس لئے وہ بار بار رحمت و برکت کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور زحمت و مشقت کو بہ شکل مجہول بیان کرتا ہے جس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

• سابق امتوں کا حوالہ دیا گیا تاکہ انسان ذہنی طور پر مطمئن رہے کہ اس کے لئے کوئی خاص مصیبت نہیں ہے بلکہ سابق امتیں اس سے بہتر بندگی کا مظاہرہ کرچکی ہیں جب کہ روزہ کا قانون اس امت سے زیادہ مشکل تر تھا اور بعض حالات میں تو بات کرنا بھی ممنوع تھا جیسا کہ جناب مریم نے قوم سے کہا تھا کہ میں نے روزہ کی نذر کرلی ہے لہذا میں بات نہیں کرسکتی ہوں۔

خود شریعت اسلام میں ابتدائی طور پر روزہ کا یہ قانون تھا کہ اگر انسان افطار کے بعد سوگیا تو روزہ کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا چاہے ابھی سحر کا وقت نہ آیا ہو۔ چنانچہ جنگ خندق کے موقع پر جب دن میں خندق کھودنے کا کام انجام پارہا تھا۔ ایک مرد مسلمان رات کو تھک کر جلدی سوگیا اور اب جو اٹھا تو کھانا پینا ممنوع ہوچکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی عالم میں صبح کی اور حسب قاعدہ خندق کی کھدائی میں مصروف ہوگیا۔ گرمی کا زمانہ۔ پیاس کی شدت، حالات کی تاب نہ لاکر بیہوش ہوگیا۔ تو آیت کریمہ نازل ہوئی "کلوا واشربوا. . . ." اس وقت تک

کھاسکتے ہو جب تک فجر کے آثار نمودار نہ ہوجائیں۔ تو اگر کل کا مسلمان ایسے روزہ رکھ کر اس طرح کی مشقت برداشت کرسکتا تھا تو آج کا مسلمان اس راحت و آرام کے دور میں کیوں نہیں کرسکتا ہے۔ لیکن اس اطمینان قلب کے لئے دور سابق کا حوالہ ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے یہی کام انجام دیا ہے اور صاف اعلان کردیا ہے کہ تم پر اسی طرح روزے واجب کئے گئے ہیں جس طرح سابق امتوں پر واجب کئے گئے تھے۔

• لعلکم تتقون کہہ فائدہ کی نشاندہی کی گئی ہے کہ روزہ نہ کوئی مہمل اور بے سود عمل ہے اور نہ اس میں پروردگار کا کوئی فائدہ ہے۔ یہ تمہارے ہی فائدہ کے لئے واجب کیا گیا ہے اور فائدہ بھی عظیم ترین فائدہ ہے جسے تقویٰ کہا جاتا ہے اور جس کی افادیت کی طرف قرآن مجید نے مختلف انداز سے اشارہ کیا ہے اور صاف لفظوں میں بتادیا ہے کہ تقویٰ دنیا میں بھی کام آنے والا ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں انسان کسی مشکل میں مبتلا ہوجائے یا روزی کی طرف سے پریشان ہوجائے تو اس کا بہترین حل تقویٰ ہے۔

"ومن يتق الله يجعل له مخرجًا ويرزقه من حيث لا يحتسب"۔ جو شخص بھی تقوائے الٰہی اختیار کرتا ہے، پروردگار اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کے راستے بناتا ہے اور اسے ایسے مقام سے روزی دیتا ہے جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔

اور آخرت میں جنّت کا بہترین وسیلہ تقویٰ ہے " ازلفت الجنة للمتقين"۔ جنّت صاحبان تقویٰ سے قریب تر کردی جائے گی۔

ماہِ رمضان المبارک ـــــ ایک تعارف

ماہ رمضان وہ مبارک مہینہ ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید نے اپنے نزول کے ساتھ کیا ہے کہ اس مہینہ میں وہ قرآن نازل کیا گیا ہے جس میں ہدایت کی واضح نشانیاں اور حق و باطل میں تفرقہ کے نمایاں نشانات پائے جاتے ہیں۔ اس مہینہ میں وہ ایک رات بھی آتی ہے جسے شب قدر یا شب مبارک کہا گیا ہے اور اسے ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے ماہ شعبان کے آخری جمعہ کے خطبہ میں اس مہینہ کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا تھا:

"ایہا الناس! تمھاری طرف اللہ کا مہینہ برکت۔ رحمت اور مغفرت کا پیغام لے کر آرہا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جو اللہ کے نزدیک تمام مہینوں سے بہتر ہے۔ اس کے دن تمام دنوں سے بہتر اور اس کی راتیں تمام راتوں سے بہتر ہیں۔ اس کی ہر ساعت تمام ساعتوں سے بہتر ہے۔ اور تمھیں اس مہینہ میں خدا کی مہمانی میں مدعو کیا گیا ہے اور تمھیں اس کرامت سے نوازا گیا ہے۔ اس مہینہ میں تمھاری ہر سانس تسبیح ہے اور تمھاری ہر نیند عبادت۔ تمھارا ہر عمل مقبول ہے اور تمھاری ہر دعا مستجاب۔ شرط یہ ہے کہ خدا سے سچّی نیت اور پاکیزہ دل کے ساتھ یہ دعا کرو کہ وہ تمھیں روزہ اور تلاوتِ قرآن کی توفیق دے کہ جو شخص اس مہینہ میں مغفرت سے محروم ہوگیا اس سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں ہے۔ دیکھو اپنی بھوک اور پیاس

سے قیامت کی بھوک اور پیاس کو یاد کرو اور آخرت سازی کا کام انجام دو۔"

اس مہینہ کو تاریخی اعتبار سے بھی بہت سے امتیازات حاصل ہیں جو دوسرے مہینوں کو حاصل نہیں ہیں۔

نزول توریت

اس مہینہ کی چھٹی تاریخ کو توریت نازل ہوئی ہے جسے پروردگار نے جناب موسیٰؑ کو تختیوں کی شکل میں عنایت فرمایا تھا اور جس کے لینے کے لئے جناب موسیٰؑ کو کوہ طور پر جاکر خدا کا مہمان رہنا پڑا اور مسلسل عبادات میں اوقات گذارنا پڑے۔ لیکن جس پیغام الٰہی کا بروقت انجام یہ ہوا کہ جناب موسیٰ کے واپس آنے تک قوم گمراہ ہو چکی تھی اور جناب ہارونؑ کی مسلسل ہدایت کے باوجود حق و باطل میں امتیاز کے لئے تیار نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ جو قوم کتاب آنے کے پہلے اس طرح گمراہ ہو جائے وہ کتاب سے کیا استفادہ کر سکتی ہے اور اس کے احکام پر کیا عمل کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے قوم یہود کو توریت پر عمل نہ کرنے کی بنا پر حمار سے تعبیر کیا ہے جس پر کتابیں لاد دی جاتی ہیں لیکن اس میں اس بار کے اٹھانے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔

نزول انجیل

اسی مہینہ کی ۱۳ تاریخ کو انجیل کا نزول ہوا ہے جس کا علم جناب عیسیٰ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور گہوارہ ہی سے اعلان کر دیا تھا کہ پروردگار نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور نبوت سے سرفراز کیا ہے۔ لیکن جس قوم نے جناب عیسیٰؑ کے اعلانِ بندگی کی قدر نہ کی اور انھیں فرزند خدا بنا دیا۔ وہ ان کی کتاب کا کیا احترام کرے گی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جناب عیسیٰؑ حکم پروردگار سے آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے اور قوم کے پاس انجیل باقی نہ رہ سکی اور ان کے شاگردوں نے اپنے اپنے ذوق سے مختلف انجیل تیار کر کے ان کی طرف منسوب کر دیں اور اصل انجیل صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئی۔

نزول زبور

اسی مہینہ کی ۱۸ر تاریخ کو زبور کا نزول ہوا ہے جسے پروردگار نے جناب داؤد کو عنایت فرمایا تھا اور اس میں یہ بھی درج کر دیا تھا کہ اس دنیا کا آخری انجام اللہ کے نیک بندوں کو ساری زمین کا وارث ضرور بنائے گا۔

زبور عمومی اعتبار سے تعلیمات اور احکام کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ اس میں زیادہ حصہ دعاؤں اور اوراد کا تذکرہ ملتا ہے جنھیں جناب داؤدؑ اپنے مخصوص لہجہ میں پڑھا کرتے تھے اور ان کی آواز سُن کر جانور تک جمع ہو جاتے تھے جسے آجتک لحن داؤدی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اس کا دور حاضر کے گانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گانوں کو سُن کر شریف انسان جمع نہیں ہوتے ہیں تو جانوروں کا کیا ذکر ہے۔ یہ جناب داؤد کا مخصوص لہجہ اور کلام الٰہی کی مخصوص کشش تھی کہ اس کو سُننے کے لئے تمام مخلوقات جمع ہو جاتی تھی۔

جناب داؤد کی کتاب کی اسی خصوصیت کی بنا پر امام زین العابدینؑ کے صحیفۂ سجادیہ کو زبور آل محمدؐ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس کی دعاؤں کی بلاغت زبور جناب داؤد سے زیادہ موثر نظر آتی ہے۔

نزول قرآن

اسی مہینہ کی اس بابرکت رات میں جسے شب قدر سے تعبیر کیا جاتا ہے قرآن مجید کا نزول ہوا ہے اور پروردگار نے اس کے نزول کے لئے اس رات کا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ یہ رات بندوں کے مقدرات طے کرنے کی رات ہے اور قرآن مجید ایک مقدر ساز صحیفہ بن کر نازل ہوا ہے لہٰذا پروردگار نے اسے ایک تقدیر ساز رات میں نازل کیا ہے۔ قرآن مجید کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی اصلی شکل میں آجتک باقی ہے اور اس میں کسی طرح کی تحریف و ترمیم نہیں ہو سکی ہے۔ امت اسلامیہ نے اس کے الفاظ اور کلمات کے تحفظ پر بھی زور دیا ہے

اور نظم و نسق کی حفاظت پر بھی۔ اور سب سے بالاتر یہ ہے کہ پروردگار نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے اور "وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے"۔

وفات جناب خدیجہ

آسمانی کتابوں کے نزول کے علاوہ اس ماہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کی دسویں تاریخ کو اس عظیم خاتون کا انتقال ہوا ہے جسے پروردگار نے اپنے پیغمبرؐ کو غنی بنانے کا ذریعہ قرار دیا تھا اور جسے ساری امت میں سب سے پہلے اسلام و ایمان کے اظہار کا شرف حاصل ہوا ہے۔

جناب خدیجہ ملیکۃ العرب بھی تھیں اور سرکار دو عالمؐ کی پہلی شریک حیات بھی۔ آپ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں سرکار دو عالمؐ نے کوئی عقد نہیں فرمایا ہے اور نہ کسی کو آپ کی محبت کا شریک قرار دیا ہے۔

آپ نے رسم و رواج کے سارے بتوں کو توڑ کر خود سرکار دو عالمؐ کو عقد کا پیغام دیا تھا تاکہ کوئی بدبخت سرکار پر طمع دنیا کا الزام نہ لگا سکے۔ اور پھر آپ نے اس سے پہلے کے تمام پیغامات کو ٹھکرا کر سرکار دو عالمؐ کا انتخاب کیا تھا تاکہ اہل دنیا کی وجاہت اور سرکار دو عالمؐ کی عظمت کا فرق واضح ہو سکے۔

شادی کے وقت آپ کی عمر شریف ۲۳ سے ۲۸ سال کے درمیان تھی جسے مسلمان مورخین نے ۴۰ سال بنا دیا ہے اور اس پر متعدد شادیوں کا افسانہ بھی شامل کر دیا ہے۔ صرف اس لئے کہ آپ کو بیوہ اور ضعیفہ ثابت کیا جا سکے اور اس طرح آپ کے مرتبہ کو ہلکا بنایا جا سکے حالانکہ سرکار دو عالمؐ کا آپ کی زندگی میں دوسرا عقد نہ کرنا اور مرنے کے بعد بھی مسلسل آپ کو یاد کرنا آپ کی عظمتِ کردار کے لئے بہت کافی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جناب خدیجہ کی عمر ۴۰ سال قرار دینے کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح سرکارؐ پر خواہش پرستی کا الزام نہ آسکے گا اور یہ کہنا آسان ہوگا کہ آپ نے ۲۵ سال کی عمر میں ۴۰ سال کی عورت سے عقد کیا ہے۔ لیکن یہ بات اسی وقت کارآمد ہو سکتی ہے جب حضرت عائشہ کی عمر وقت عقد ۶۔۷ سال نہ بیان کی جائے ورنہ یہ الزام اور پختہ ہو جائے گا کہ پیغمبر اسلامؐ نے ۵۰ سال

کی عمر میں ۶ سال کی بچی سے عقد کیا ہے اور یہ خواہش پرستی کی بدترین مثال ہے۔؟

ولادت امام حسنؑ

اسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو سنہ ۳ھ میں امام حسنؑ کی ولادت باسعادت ہوئی ہے جن کو رسول اکرمؐ نے اپنا پھول اور جوانانِ جنّت کا سردار قرار دیا تھا۔ امام حسنؑ صدیقہ طاہرہؑ اور مولائے کائناتؑ کے پہلے فرزند تھے اور پروردگار نے مختلف مقامات پر اس اوّلیت کے شرف کو باقی رکھا ہے۔ چنانچہ چادرِ تطہیر میں وارد ہونے والوں میں بھی آپ کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے اور میدان مباہلہ میں جانے والوں میں بھی آپ سب سے آگے آگے تھے۔

قدرت نے آپ کو بیشمار فضائل و مناقب سے نوازا تھا اور سرکار دو عالمؐ نے آپ کی ناز برداری کرنے کے لئے ناقہ کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ عید کے موقع پر آپ کا لباس جنّت سے آیا تھا اور سورۂ دہر کے نزول میں آپ کی بیماری اور آپ کے اطعام کا بھی دخل ہے۔

آپ نے سنہ ۴۱ھ میں مولائے کائنات کی شہادت کے بعد پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کے مطابق صلح فرمائی ہے اور آخر حیات تک اپنے عہد کی پاسداری کی ہے۔ بنی امیہ کے سربراہ معاویہ نے عہدِ صلح کی مخالفت بھی کی ہے اور آپ پر طرح طرح کے الزامات بھی لگائے ہیں جن میں ایک تعدّدِ ازدواج کا افسانہ بھی ہے جس کی تاریخ بنی امیہ کے نمک خواروں نے ۵۰، سے شروع کر کے ۳۵۰ تک پہونچا دی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان عورتوں کے نام بتانے سے بھی قاصر رہے ہیں۔ شجرۂ نسب۔ کردار اور مہر و نفقہ کا کیا ذکر ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے اس طویل و عریض افسانہ کے ذیل میں بھی یہ خبر سُننے میں نہیں آئی ہے کہ امام حسنؑ نے کسی کا مہر نہیں ادا کیا ہے یا کسی نے آپ کے خلاف نفقہ کا مقدمہ دائر کیا ہے جو پاکیزگیٔ کردار کی بہترین مثال ہے اور جس کا جواب ملنا ناممکن ہے۔

شہادت مولائے کائناتؑ

اسی مہینہ کی ۱۹ تاریخ کی صبح کو مسجد کوفہ میں عین حالت سجدہ میں کائنات کے امیرؑ کو زخمی کیا گیا اور سر مبارک پر تلوار کا وہ بھرپور وار کیا گیا جس سے مغزِ سر بھی دو پارہ ہو گیا۔ یہ اور

بات ہے کہ اس کے بعد بھی آپ ارشاد فرماتے رہے کہ جو دریافت کرنا ہے دریافت کر لو کہ اللہ والوں کے دماغ پر نہ تلوار کا اثر ہوتا ہے اور نہ بخار کا ۔۔ وہ اور لوگ ہیں جن کا دماغ بہک جایا کرتا ہے۔ اللہ والے عقل مجسم ہوتے ہیں ان کی عقلوں پر حالات زمانہ کا اثر نہیں ہوتا ہے۔

اس شب میں مولائے کائنات اپنی دخترِ نیک اختر جناب ام کلثوم کے یہاں مدعو تھے اور افطار کے بعد تمام رات مسلسل آسمان کی طرف دیکھتے رہے اور یہ فرماتے رہے کہ یہی وہ رات ہے جس کی سرکار دو عالمؐ نے خبر دی ہے اور پھر صبح کے وقت مسجد میں آ کر خود ہی اذان بھی دی کہ اذان کوئی حقیر عبادت یا معمولی پیشہ نہیں ہے۔ یہ دین خدا کی دعوت اور اسلام کی نقابت ہے جس کا واقعی شرف ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔

ابن ملجم کی تلوار سے زخمی ہونے کے بعد مولائے کائناتؑ بیت الشرف میں تشریف لائے اور دو دن تک مسلسل زہر کے اثر سے متاثر رہے۔ اکیسویں کی رات میں ایک تفصیلی وصیت فرمائی جس میں احکام اسلامی پر زور دیا۔ نماز، روزہ، حج بیت اللہ، تلاوت قرآن، حق ہمسایہ، نصرت مظلوم کی دعوت دی اور صبح ہوتے ہوتے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

وہ رات جس میں قرآن صامت اُدھر سے اِدھر آیا تھا تقریباً اُسی رات میں قرآن ناطق اِدھر سے اُدھر رخصت ہو گیا۔ کائنات میں اندھیرا چھا گیا۔ ظلم و ستم کا راستہ کھل گیا اور آل محمدؐ کے حصہ میں ہر طرح کی مظلومیت آ گئی۔ ملک کا نوحہ فضا میں گونجتا رہا۔ "ارکان ہدایت منہدم ہو گئے۔ ریسمان ہدایت ٹوٹ گئی اور نبیؐ کا بھائی مارا گیا" اور ذریت رسولؐ کے لئے مصائب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

روزہ اور اصلاح معاشرہ

دنیا کا کوئی باہوش انسان اور باضمیر قانون ایسا نہیں ہے جسے معاشرہ کے فساد کا احساس اور اس کی اصلاح کی فکر نہ ہو۔ قوانین اور تعزیرات کی بھرمار اسی اصلاح کے لئے ہوتی ہے۔ پولیس کی جملہ قسمیں اور فوج کی متعدد ٹولیاں اسی کام کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ وزارتوں کی تشکیل اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ حکومتوں میں انقلاب اسی موضوع کے تحت ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود ہر دور میں اسی ایک امر کا رونا رہا ہے کہ معاشرہ ناقابلِ اصلاح ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اصلاح معاشرہ آسان کام نہیں ہے۔ جب تک انسان کے اندر نفس امارہ اور اس کے خواہشات موجود ہیں اور جب تک اس کا قدیم ترین دشمن اس کے سینہ کی کمین گاہ میں بیٹھ کر وسوسہ کے تیر چلاتا رہے گا اس کا راہ راست پر آجانا یا باقی رہ جانا انتہائی دشوار گذار کام ہے۔ لیکن انسانوں اور معاشروں کی ناکامی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اکثر مفکرین نے مرض کی جڑوں کو نہیں پہچانا ہے اور اکثر معالجوں نے طول عمل سے گھبرا کر علاج کو لمحوں میں تمام کر دینا چاہا ہے جب کہ فطرت کی گہرائیوں میں پائی جانے والی کمزوریوں کا علاج لمحوں میں نہیں ہوتا ہے اور علاج کو اتنے ہی پائیدار انداز سے انجام دینا ہوتا ہے جتنا پائیدار مرض یا اس کے اسباب و عوامل ہوتے ہیں۔

دین اسلام نے اس سلسلہ میں دو باتوں پر زور دیا ہے:

۱۔ اصلاح نفس اور ۲۔ پاکیزگی نیت۔

دنیا کا ہر باشعور انسان اس امر سے باخبر ہے کہ انسانی اعمال کا سب سے بڑا محرک اس کا ارادہ ہوتا ہے۔ انسان کا کوئی عمل ارادہ کے بغیر انجام نہیں پاسکتا ہے۔ ارادہ ہی اس کے اعمال

کی تحریک کرتا ہے اور ارادہ ہی اس کے کردار کی تصویر تیار کرتا ہے۔ ارادہ پاکیزہ ہو جائے تو عمل کے فاسد ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے اور ارادہ ہی ناپاک ہو جائے تو عمل کی طہارت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دنیا کے قوانین نے ظاہری اصلاحات پر بیحد زور صرف کیا ہے لیکن ارادوں کی پاکیزگی کے موضوع کو تقریباً نظر انداز کر دیا ہے اور اس کا راز شائد یہ بھی ہے کہ مصلحین عالم خود بھی پاکیزگی نیت و ارادہ کی دولت سے محروم ہیں اور ان کے کردار کی تشکیل بھی اس دولت سے محرومی کے ماحول میں ہوئی ہے۔

مفکر، محقق، استاذ اور پروفیسر نے اس درجہ تک پہونچنے کا محرک شہرت، عظمت یا دولت کو قرار دیا ہے اور حکام و سلاطین میں حکومت کی تحصیل کا جذبہ برتری، حاکمیت اور اقتدار کی بنیاد پر پیدا ہوا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ دونوں باتیں پاکیزگی نفس و ارادہ سے بالکل اجنبی ہیں اور جب مصلح کا نفس خود ہی پاکیزہ نہ ہوگا تو اس کے ہاتھوں منظر عام پر لایا ہوا قانون کس طرح پاکیزہ ہو جائے گا۔

دین اسلام نے قانون سازی کا کام ہر بشر سے لے کر پروردگار کے حوالہ کر دیا ہے تاکہ اس کے یہاں نفس اور اس کے خواہشات کا سوال ہی نہ پیدا ہو اور قانون سازی کا کام انتہائی مقدس ماحول میں انجام پائے۔

اسلام کے قانون ساز نے سب سے زیادہ زور انسان کے ارادہ اور اس کی نیت کی پاکیزگی پر دیا ہے اور اسی لئے پہلے عقائد کے ذریعہ نفس کو پاکیزہ بنایا ہے۔ اس کے بعد اعمال کی منزل میں عبادات کو معاملات پر مقدم رکھا ہے تاکہ عقائد و عبادات کے ذریعہ نفس پاکیزہ ہو جائے اس کے بعد انسان دنیاوی معاملات کے مرحلہ میں قدم رکھے اور معاملات دنیا اسے دنیاداری کی طرف کھینچنے نہ پائیں۔

عبادات میں ہر عمل میں قربت خدا کی نیت کو ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ کسی پاکیزہ نیت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ انسان کبھی بھی ارادہ کو اپنے نفس میں جگہ دے اس ارادہ کی پاکیزگی "قربت الٰہی" سے زیادہ مقدس نہیں ہو سکتی ہے۔ اور پاکیزگی ارادہ کی بنا پر تشکیل پانے

والی عبادات کی بھی دو قسمیں ہیں۔

۔ بعض عبادات میں نیت وارادہ کے علاوہ عملی پہلو بھی پایا جاتا ہے جیسے نماز کہ اس میں نیت کے ساتھ قیام وقعود اور رکوع وسجود بھی ہے یا حج میں مختلف ارکان اور مناسک ہیں یا زکوٰۃ وخمس میں مال نکال کر مستحق کے حوالہ کیا جاتا ہے یا جہاد میں میدان قتال میں زور بازو کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

۔ لیکن اس کے برخلاف روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں عملی پہلو کوئی نہیں ہے۔ روزہ دار کو متعدد چیزوں سے پرہیز کرنا پڑتا ہے اور مختلف چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے کہ اگر کل تک عالم وجود میں تھیں تو روزہ کی حالت میں انھیں منزل عدم تک پہونچا دیا جائے اور اس اعتبار سے اس عبادت کا تعلق فاعل سے ہے فعل سے نہیں ہے اور یہ ایک نفسانی عبادت ہے جس کا اعضاء وجوارح اور ظاہری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ روزہ کی حقیقت صرف ایک نیت ہے اور بس! اور اس اعتبار سے روزہ زندگی میں یہ احساس پیدا کراتا ہے کہ نیت میں ذرہ برابر فتور پیدا ہوگیا تو بارہ چودہ گھنٹہ کی بھوک پیاس لمحوں میں ضائع اور برباد ہوسکتی ہے اور اس عمل کا شمار عبادات میں نہیں ہوسکتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں روزہ دار اس قدر محتاط ہوجاتا ہے کہ شدت تشنگی وگرسنگی میں بھی یہ سوچنے کا بھی ارادہ نہیں کرتا کہ اب سے لے کر شام تک کسی وقت بھی نیت کو توڑ دے گا اور روزہ کا خاتمہ کر دے گا کہ اسے اس حقیقت کا علم ہے کہ روزہ اُسی وقت سے باطل اور بیکار ہوجائے گا اور دوبارہ رائے بدل کر راہ راست پر آجانا بھی مفید اور کارگر نہ ہوگا۔

۔ روزہ کی نیت بھی عام چیزوں کی نیت نہیں ہے کہ اس میں تحریک عمل اور اصلاح نفس کا کوئی پہلو نہ ہو بلکہ یہ نیت درحقیقت قربت پروردگار کی نیت ہے اور انسان کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہے کہ قربت پروردگار کا ذریعہ پاکیزہ نفس اور بہترین کردار ہی ہوسکتا ہے۔ اس کا قرب فسق وفجور اور بدعملی کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں ان تمام بُرائیوں اور بدعملیوں سے پرہیز کرتا ہے جن کے ذریعہ پروردگار سے دور ہونے کا اندیشہ پیدا ہوجائے اور قرب الٰہی کے امکانات ختم ہوجائیں یا مجروح ہوجائیں۔

• ۔ اصلاح نفس کے بارے میں بھی اسلام نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ان تمام امور پر پابندی

عائد کر دی ہے جن سے نفس کو کھُل کر کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور انسان دھیرے دھیرے اس کے قبضہ میں چلا جاتا ہے کہ اس کا اندازہ ہر صاحب شعور انسان کو ہے کہ زنجیروں کا قیدی تو ایک دن آزاد ہوسکتا ہے لیکن خواہشات کا قیدی کبھی آزاد نہیں ہوسکتا ہے اور وہ جس قدر آزادی کی کوشش کرے گا مزید گرفتار ہوتا جائے گا کہ یہ خواہش آزادی بھی نفس ہی کے تقاضوں سے پیدا ہوگی اور وہ آزادی کے نام پر مزید گرفتاری کی تدبیر ہوگی۔

روزہ اصلاح نفس کے سلسلہ میں ایک بہترین جہاد ہے جس میں زندگی کے تمام خواہشات کو مقید بنایا گیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ دو بنیادی خواہشات کو یکسر اسیر کر دیا گیا ہے۔ ایک خواہش خورد ونوش اور ایک خواہش جنس۔ کہ اگر انسانی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ دور قدیم سے لے کر یہی دو خواہشات ہیں جنھوں نے تاریخ انسانیت کے اوراق کو سیاہ بنایا ہے اور انسانی زندگی کو تباہی کے گڑھے میں ڈھکیل دیا ہے۔

روزہ میں یہ پابندی ایک دو دن کے لئے نہیں ہے بلکہ مکمل ایک ماہ کے لئے ہے اور ایک دو گھنٹہ کے لئے نہیں ہے بلکہ پورے بارہ چودہ سولہ اٹھارہ گھنٹے کے لئے ہے جس کے بعد ایک باشعور انسان مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ کر لیتا ہے اور اپنی زندگی میں واقعاً تبدیلی پیدا کر لیتا ہے جس کا تجربہ اس دور میں ہوچکا ہے جب نظام اسلامی رائج تھا اور اس کی قیادت سرکار دو عالمؐ کے ہاتھوں میں تھی اور آپ مسلمانوں کی عبادات کی نگرانی فرما رہے تھے۔ چنانچہ تاریخ میں ان دو حقائق کا تذکرہ موجود ہے کہ آغاز شریعت میں روزہ میں جنسی پابندی صرف روزہ کے حالات کے لئے نہیں تھی بلکہ چوبیس گھنٹے کے لئے تھی اور ایک مہینہ مکمل طور پر انسان کو اپنے جنسی جذبات کو قابو میں رکھنا پڑتا تھا اور یہی حال تقریباً کھانے پینے کا تھا کہ اگر انسان افطار کے بعد سحر تک بیدار رہا تو کھانے پینے کا اختیار سحر تک رہے گا ورنہ اگر درمیان میں سوگیا تو سحر سے پہلے بھی اُٹھ کر کچھ کھا پی نہیں سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲ھ میں روزہ واجب ہوا اور ۲ھ میں جنگ خندق کا زمانہ آگیا۔ سرکار دو عالمؐ نے مسلمانوں کو خندق کھودنے کا حکم دے دیا اور مسلمان روزہ رکھ کر خندق کھودنے میں مصروف ہوگئے اُدھر سرکار کے ایک صحابی ابن جُبیر دن بھر کام کر کے آگئے اور شام کو افطار کے بعد لیٹے تو آنکھ لگ گئی اور اس کے بعد پھر صبح تک

کچھ نہ کھا سکے اور حسب دستور وقت مقرر پر خندق کی کھدائی میں مصروف ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ضعف و نقاہت اور بھوک پیاس کی بنا پر غش کھا کر گر پڑے جس کے بعد پروردگار نے سحر تک کھانے کی اجازت دے دی اور پرانی پابندی کو برطرف کر دیا۔ یا اسی طرح بعض روایات کی بنا پر بعض اصحاب نے شب کے وقت اپنی زوجہ سے ہمبستری کر لی اور صبح آ کر سرکار دو عالم سے فریاد کی کہ میں تو ہلاک ہو گیا تو وحی پروردگار نے اس پابندی کو بھی برطرف کر دیا اور رات کے وقت عورت سے ہمبستری جائز ہو گئی۔

ان دونوں واقعات سے اس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ روزہ نے چند دنوں میں مسلمان کے نفس کو اس قدر پاکیزہ بنا دیا تھا کہ وہ بھوک اور پیاس کی شدت میں محنت کر سکتا تھا لیکن بہانہ بازی کر کے روزہ نہیں چھوڑ سکتا تھا یا اسی طرح وہ جنسی تعلقات کو ایک ہلاکت اور بربادی تصور کرتا تھا کہ حکم پروردگار کی مخالفت میں ہلاکت اور بربادی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی عمل انسان کو اس قدر پاکیزہ نفس بنا دے گا تو ایسے افراد سے تشکیل پانے والا معاشرہ کس قدر صالح اور پاکیزہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ سرکار دو عالمؐ کے دور میں اعمال کا تجربہ ۹۔۱۰ سال سے زیادہ کا نہیں رہا ہے اور اس مختصر سے وقفہ میں دور قدیم کی جاہلیت کو تقویٰ کے سانچہ میں نہیں ڈھالا جا سکتا تھا لیکن متعدد نیک کرداروں کا پیدا ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ قانون میں اصلاح معاشرہ کے عناصر پائے جاتے ہیں اور اس میں اس مہم کے سر کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اب اگر بعض افراد پر اثر نہیں ہوتا ہے تو اس کا سبب ان کی جاہلیت یا سابقہ بدنفسی اور بدکرداری ہے ورنہ سادہ مزاج انسان پر اگر ایسے قوانین کا تجربہ کیا جائے تو یقیناً قانون سو فیصد نتیجہ دے سکتا ہے۔

روایات معصومینؑ

اس کے بعد روایات معصومینؑ کا جائزہ لیا جائے تو ان میں روزہ کے ان تمام صفات کا حوالہ دیا گیا ہے جن کی طرف توجہ دینے والا انسان یقیناً پاکیزہ نفس بن سکتا ہے اور ان کا معاشرہ پر تجربہ یقیناً اصلاح معاشرہ کا عمل انجام دے سکتا ہے۔ مثال کے طور پر چند مواقع ملاحظہ ہوں:

•۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ روزہ دور قدیم میں بھی واجب تھا لیکن اُس دور میں صرف انبیاء و مرسلین پر واجب ہوا کرتا تھا۔ امت پیغمبر اسلامؐ کو پروردگار نے یہ خاص شرف بخشا ہے کہ اس خیر و برکت میں سرکار کے ساتھ اسے بھی شریک کر لیا ہے اور یہاں قانون کا اعلان "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے عنوان سے ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کسی انسان میں واقعاً یہ احساس پیدا ہو جائے کہ مالک نے یہ ذمہ داری عطا کر کے مجھے خاصانِ خدا کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے اور اس کے طفیل میں مجھے صاحبانِ ایمان کہہ کر پکارا ہے اور براہ راست خطاب کیا ہے۔ یہودیوں کی طرح رسول اکرمؐ کو ذریعہ نہیں بنایا ہے "قل یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْا"۔ تو اس کے نیک کردار اور پرہیزگار بن جانے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی ہے۔

•۔ رسول اکرمؐ نے حدیث قدسی کے حوالے سے پروردگار عالم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ابن آدم کا ہر عمل اُس کے لئے ہوتا ہے لیکن روزہ صرف میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔

•۔ امام صادقؑ نے فرمایا کہ روزہ کے واجب ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مالدار کو غریب کی بھوک اور پیاس کا احساس پیدا ہو اور وہ اس کے حال پر رحم کرے اور اس طرح غریب کے حالات بھی بہتر ہو جائیں۔ دوسری طرف وہ غریب اور فقیر جو حالات کی بنا پر فاقہ کر رہا تھا اس کا فاقہ بندگی کی شکل اختیار کر کے باعث اجر و ثواب بن جائے۔

•۔ رسول اکرمؐ نے روزہ کو بدن کی زکوٰۃ سے تعبیر کیا ہے کہ کھانے پینے کے بند ہو جانے سے تھوڑی دیر انسان کی زندگی مادیات سے الگ ہو جاتی ہے اور انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ جس قدر بھی مادیات سے الگ رہے گا روحانیت کو کام کرنے کا زیادہ موقع ملے گا اور نفس میں پاکیزگی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔

اس کے علاوہ روزہ کو صحت کا وسیلہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ دن بھر کے اوقات میں معدہ کو کام کرنے کا مکمل موقع مل جاتا ہے اور اس پر مزید کوئی بوجھ نہیں پڑتا ہے۔
اگر دنیا کے معاشروں کی اصلاح میں صحت عامہ کا موضوع بھی ایک اہمیت رکھتا ہے

تو روزہ بھی اس کا بہترین ذریعہ ہے اور اس کے ذریعہ بہت سے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔
بشرطیکہ روزہ ترک لذات کے عنوان سے ہو تیاری لذات کے عنوان سے نہ ہو۔ مسلمان معاشرہ کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ مسلمان کا وقت روزہ کے زمانہ میں بھی زیادہ حصہ کھانے کی تیاری پر صرف ہو جاتا ہے۔ عورت دوپہر کے بعد سے مستقل باورچی خانہ کی نذر ہو جاتی ہے اور انواع و اقسام کے کھانوں کی تیاری شروع کر دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روزہ بھوک پیاس کے ذریعہ عبرت اور اصلاح نفس کی تحریک نہیں ہے بلکہ بہترین کھانوں کی تیاری کی تحریک ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ مسلمان معاشروں میں ماہ رمضان میں کھانے کا بجٹ عام زمانوں سے زیادہ ہوتا ہے اور مسلمانوں کی توجہ کھانے کے انواع و اقسام پر سال بھر سے زیادہ ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ ترک لذّات اور ریاضت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ بھوکے رہ کر کھانوں سے لذّت اندوزی کا ذریعہ ہے۔

ظاہر ہے کہ جب روح عمل اس طرح مجروح ہو جائے اور سماج اس طرح کی جہالت کا شکار ہو جائے تو عمل بندگی بھی اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے اور ایک مشق ستم کے علاوہ کچھ نہیں رہ جاتا ہے۔ کاش مسلمانوں کا شعور دوبارہ بیدار ہو جائے اور وہ عبادت کے مفہوم پر غور کر کے اپنے کو بندگی کا خوگر بنائیں اور اسلامی تعلیمات کو اپنی خواہش پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ نہ چڑھادیں۔

بعض روایات نے انھیں خطرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ بعض روزہ داروں کو ان کے روزہ سے بھوک اور پیاس کے علاوہ اور بعض نمازیوں کو انکی نماز شب سے شب بیداری کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ روزہ بُرائیوں سے پرہیز اور محرمات سے اجتناب کی ایک ریاضت ہے۔ روزہ بھوک، پیاس اور محنت، مشقت کا نام نہیں ہے اور اسی طرح نماز پروردگار کی بارگاہ میں حاضری کی تیاری ہے۔ نماز شب بیداری نہیں ہے۔ روزہ کے دل و دماغ کو غلط خیالات سے ویسے ہی پاک و پاکیزہ ہونا چاہیئے جس طرح اس کا کھانے اور پینے سے خالی اور صاف رہتا ہے۔

● ۔ رسول اکرمؐ نے ایک عورت کو اپنی خادمہ کو گالیاں دیتے ہوئے دیکھا تو آپ نے کھانا ... مدعو کر لیا۔

اس نے عرض کی کہ حضور میرا روزہ ہے۔
فرمایا کہ گالی بکنے والے کا کون سا روزہ ہوتا ہے۔ روزہ بھوک پیاس کی مشق کے لئے واجب نہیں کیا گیا ہے۔ روزہ محرمات اور گناہوں سے پرہیز کا عادی بنانے کے لئے واجب کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ معاشرہ میں یہ روح عمل پیدا ہو جائے تو معاشرہ کی اصلاح میں کیا کسر رہ جاتی ہے۔ مگر افسوس کہ مسلمان معاشرہ کا یہ عالم ہے کہ اکثر افراد روزہ کی حالت میں اس طرح غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں جیسے عقل و شعور۔ شرافت و انسانیت کی دنیا سے نکل کر کسی پاگل خانہ میں داخل ہو گئے ہوں کہ نہ زبان پر قابو رہ گیا ہے اور نہ دل و دماغ پر۔
کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسے عمل کو نہ روزہ کہا جاسکتا ہے اور نہ عبادت کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

● ۔ روزہ کی اسی ترک لذات اور تربیت نفس کی مہم نے گرمی کے روزوں کو سردی کے روزوں سے زیادہ اہم بنا دیا ہے جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی انسان شدید گرمی کے زمانہ میں روزہ رکھتا ہے اور پیاس کی شدت سے بیقرار ہو جاتا ہے تو پروردگار عالم ہزار فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کے چہرہ پر ہاتھ پھیریں اور اسے جنّت کی بشارت دیں اور یہ خبر سنادیں کہ وہ اس عالم میں جب افطار کرے گا تو پروردگار اس کے تمام گناہوں کو معاف کر دے گا۔

● ۔ سردی کے روزوں کے بارے میں بھی امام صادقؑ نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مومن کی زندگی میں یہ بہار کا زمانہ ہوتا ہے جہاں دن میں روزہ کی مشقت کم ہو جاتی ہے اور راتیں طویل ہو جاتی ہیں تو نمازوں کا موقع زیادہ مل جاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان دن کے چھوٹے ہونے کو سہولت کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ مشقت کی کمی پر شکر خدا کرتے ہوئے رات کے طول کو نمازوں کی کثرت کا ذریعہ بنائے اور گویا پروردگار کی بارگاہ میں یہ گذارش کرے کہ اگر دن کے چھوٹے ہونے کی بنا پر زیادہ مشقت برداشت کرنے اور جہاد نفس کرنے کا موقع نہیں ملا ہے تو میں اس کمی کو رات کی نمازوں کے ذریعہ پورا کروں گا اور اپنے ذوقِ بندگی

کو مجروح نہ ہونے دوں گا۔

حرف آخر

روزہ کی اہمیت اور اصلاح معاشرہ میں اس کے اثرات کا اندازہ کرنا ہے تو اس تصور کا سہارا لینا ہوگا کہ اگر کوئی ایسا سماج پیدا ہو جائے جس کے افراد اپنے نفس پر اسقدر کنٹرول پیدا کر لیں کہ جب چاہیں کھانا پینا چھوڑ دیں۔ جب چاہیں جنسی لذت سے بے نیاز ہو جائیں۔ جب چاہیں گرمی کی شدت کا مقابلہ کر لیں اور پانی کے اندر سر نہ ڈبونے پائیں۔ جب چاہیں زبان پر اتنا قابو پیدا کر لیں کہ حرف غلط زبان پر نہ آنے پائے۔ سردی کی راتوں میں بھی اگر نجاست کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کیفیت کو صبح تک باقی نہ رہنے دیں بلکہ صبح کے پہلے طہارت و پاکیزگی کا اہتمام کر لیں اور یہ سب کچھ ایک حاکم اور ایک مالک کے اشارہ پر ہو۔ جس کی حاکمیت اور مالکیت ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ تو ایسے سماج اور معاشرہ کے صالح ہو جانے میں کیا کسر رہ جاتی ہے اور اس میں برائی اور فساد کو داخل ہونے کا کون سا راستہ مل سکتا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی عبادتوں کو بھی عادتوں کا درجہ دے دیا ہے اور ان کی روح سے یکسر غافل ہو گئے ہیں۔ نماز خاص اوقات میں مسجد میں حاضری کی عادت ہے اور روزہ خاص اوقات میں ترک لذات کی عادت ہے۔ حج ایک تجارت کا سفر ہے اور زکوٰۃ ایک شہرت کا ذریعہ ـــ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جب معاشرہ اندر سے اس قدر کھوکھلا ہو جائے تو باہر کے رکھ رکھاؤ سے اصلاح کا کام نہیں لیا جا سکتا ہے اور فساد کو ختم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اسلامی احکام کی افادیت کے لئے اس ماحول کی تشکیل بیحد ضروری ہے جس میں نظام صاحبان تقویٰ کے ہاتھ میں ہو اور عمل کی تربیت دینے والے صاحبان علم و معرفت ہوں تاکہ وہ ہر فرد کو عمل کی واقعی حیثیت اور اس کی روح سے آشنا بناتے رہیں اور معاشرہ اصلاح کی راہ پر گامزن رہے ورنہ معاشرہ صالح اور صحت مند قیادت سے محروم ہو گیا اور علم اقتدار کا

غلام بن گیا تو ہر عمل روح عمل سے محروم ہو جائے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام کے ذمہ دار افراد شعبان کے آخر میں بیمار ہو جائیں گے اور ماہ مبارک کے اختتام تک دوبارہ صحتمند ہو جائیں گے تاکہ عید کی مبارکباد قبول کر سکیں اور اس طرح معاشرہ کی اصلاح کے امکانات ختم ہو جائیں گے اور فساد بڑھتا ہی جائے گا۔

اگرچہ اس فساد کو ایک دن ختم ہونا ہے اور کوئی بھی ظلم و ستم ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔ وارث پیغمبرؐ کا ظہور یقینی ہے اور عالم کی اصلاح بھی قطعی اور واقعی ہے، وقت کا انتظار لازم ہے اور عمل کی تحریک ضروری ہے۔ نتیجہ اپنے وقت پر ظاہر ہوگا۔ کسان محنت آج کرتا ہے اور زراعت مہینوں کے بعد تیار ہوتی ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ محنت بہرحال لازمی ہے اور نتیجہ بھی انشاءاللہ قطعی ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

فلسفۂ حج

حج بیت اللہ بنیادی طور پر دو اجزا سے مرکب ہوتا ہے۔ ایک کو عمرہ کہا جاتا ہے اور ایک کو حج۔

دونوں کے مجموعی اعمال تقریباً ۲۴ ہیں لیکن بعض اعمال دونوں میں مشترک ہیں اور بعض کسی ایک جزو سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر احرام۔ طواف خانۂ خدا۔ نماز طواف۔ سعی صفا و مروہ دونوں میں مشترک ہیں بلکہ تقصیر بھی ایک مشترک عمل ہے جس کا عمرہ میں ہونا بھی ضروری ہے اور حج میں ہونا بھی ممکن ہے۔

اس طرح عمرہ کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو حج میں نہ پایا جاتا ہو اور حج میں بہت سے اعمال ایسے ہیں جن کا عمرہ میں کوئی تصور نہیں ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عمرہ درحقیقت حج کی آمادگی اور تیاری کا تمہیدی عمل ہے جس سے مسلمان کے ذہن کو مستقبل کے اعمال کے لئے ہموار کیا جاتا ہے یا اس کے ذریعہ سے ان مقامات مقدسہ اور مناسک کی اہمیت کا احساس دلایا جاتا ہے جن سے حج بیت اللہ کا گہرا تعلق ہے اور جن کے بغیر حج بیت اللہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔

۱۔ حج بیت اللہ کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ یہ ایک عالمی اجتماع ہے جس میں تمام دنیا کے فرزندان توحید جمع ہوتے ہیں اور سب مستقل طور پر مدعو ہوتے ہیں۔ نہ کوئی کسی ملک کا نمائندہ ہوتا ہے اور نہ کسی جماعت کا۔ نہ کسی کی دعوت میں کسی سیاست کا دخل ہوتا ہے اور نہ مصلحت کا۔ نہ کسی مخصوص صلاحیت کی شرط ہے اور نہ خاص استعداد کی۔

ہر انسان اپنے اسلام و ایمان کی بنا پر مدعو کیا جاتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے

کہ عبادت پروردگار کے زیر سایہ عالمی مسائل پر گفتگو کرے اور ہر جگہ کے مسائل کیساتھ وہاں کے مسائل کے حل کرنے کے وسائل اور ذرائع سے باخبر ہو سکے اور واپس آکر اپنے علاقہ میں اس حل کو منطبق کر سکے۔

۲۔ حج کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اسے اسلامی اور ایمانی فریضہ کے بجائے انسانی فریضہ قرار دیا گیا ہے "للہ علی الناس حج البیت" گویا حج بیت اللہ کرنا انسانیت کی دلیل ہے اور اس سے انحراف کرنا انسانیت کے اقدار سے انحراف ہے۔ حج کے فوائد صرف ایمانی دنیا تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس سے تمام عالم انسانیت مستفید ہوتا ہے۔

۳۔ حج بیت اللہ کا تیسرا امتیاز یہ ہے کہ یہ لبیک سے شروع ہوتا ہے اور رمی جمرات پر تمام ہوتا ہے۔ لبیک جناب ابراہیمؑ اور ان کے پروردگار سے تولاّ کی علامت ہے کہ انسان نے دعوت خلیلؑ پر لبیک کہنے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ دیا ہے اور خانۂ خدا کے طواف کے لئے اپنے گھر سے الگ ہو گیا ہے۔ اور رمی جمرات شیاطین سے برائت اور بیزاری کی علامت ہے کہ انسان جب تک اولیاء اللہ سے تولاّ کے ساتھ دشمنانِ خدا سے تبرّا نہ کرے اس وقت تک اس کا عمل حج کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

۴۔ یہ لبیک اس بات کی بھی علامت ہے کہ اگرچہ ہم امت خلیل میں نہیں ہیں اور ان کی دعوت کو ہزارہا سال گذر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ انھوں نے خدا کی طرف بلایا ہے اور خدا کے حکم سے بلایا ہے لہٰذا ہم ان کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہیں۔ ہماری نظر میں نبی خدا کی دعوت کا احترام ہے چاہے وہ زندہ ہو یا دنیا سے جا چکا ہو۔ ہم ان جیسے افراد میں نہیں ہیں جن کا نبی ان کے سامنے انھیں آواز دے رہا تھا اور وہ مڑ کر دیکھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

۵۔ حج کا لباسِ احرام انسانی زندگی میں سادگی کی علامت ہے اور انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ اگر پروردگار لاکھوں کے مجمع میں ایک لنگی چادر میں کھڑا کرنا چاہے تو انسان کو اپنی مادی حیثیت کو یاد نہیں کرنا چاہیئے اور حکم خدا پر اسی شان سے کھڑا ہو جانا چاہیئے جس طرح

اس نے حکم دیا ہے۔ یہی بندگی ہے اور اسی کا نام حج بیت اللہ ہے۔

۶۔ محرمات احرام سے پرہیز علامت ہے کہ انسان نے حکم خدا پر عمل کر کے اسقدر پاکیزگی نفس پیدا کر لی ہے کہ اب اسے کسی شے کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ خوشبو پر ناک بھی بند کر سکتا ہے اور بدبو کو برداشت بھی کر سکتا ہے۔ وہ انسان تو انسان جانوروں کو بھی نہیں ستا سکتا ہے۔ دوسرے کا باغ تو باغ ایک گھاس کو بھی ضائع نہیں کر سکتا ہے۔ وہ ہر طرح کی زینت سے بے نیاز ہے اور ہر طرح کی مصیبت کے لئے تیار ہے اور یہ حج بیت اللہ کی معراج ہے کہ انسان حکم الٰہی کے امتثال میں مادی تقاضوں سے بلند تر ہو جائے اور اس کی نگاہ میں سوائے مرضیٔ پروردگار کے اور کچھ نہ رہ جائے۔

۷۔ طواف خانۂ خدا زندگی کے محور اور مرکز کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان کی زندگی اسی گھر اور اس کے مالک کے اشاروں کے گرد گھوم رہی ہے اور اس کی زندگی کا کوئی دوسرا محور اور مرکز نہیں ہے۔ وہ اس چکر کے ذریعہ دنیا کے ہر چکر سے نجات حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد سجدۂ پروردگار کر کے کائنات کی بلندی حاصل کر لیتا ہے۔

۸۔ حجر اسود کا بوسہ اشارہ ہے کہ جنتی اشیاء اس قابل ہوتی ہیں کہ ان کا احترام کیا جائے اور انھیں بوسہ دیا جائے چاہے وہ پتھر کی شکل میں ہو یا بشر کی شکل میں۔

۹۔ مقام ابراہیمؑ حضرت ابراہیمؑ کی زحمتوں کی یادگار ہے کہ انھوں نے کس طرح خانۂ خدا کی دیواروں کو بلند کیا ہے اور اس عمارت کو مکمل کیا ہے۔ اسے محل عبادت اور مصلیٰ اسی لئے قرار دیا گیا ہے کہ مسلمان کی نگاہ کے سامنے وہ مرکز اخلاص رہے جو آجتک آواز دے رہا ہے کہ راہ خدا میں تعمیری کام کرنے والے ساز و سامان کے محتاج نہیں ہوتے ہیں اور وہ جب کوئی تعمیری کام کر دیتے ہیں تو پروردگار اس کے اثرات کو تاحشر باقی رکھتا ہے۔

۱۰۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی جناب ہاجرہ کی سعی کی یادگار بھی ہے اور زن و مرد کے عدم امتیاز کی علامت بھی کہ راہ خدا میں جو شخص بھی کوئی خدمت انجام دیتا ہے۔ پروردگار اسکے آثار کو باقی رکھتا ہے چاہے عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت۔

سعی اس امر کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان راہ خدا میں اخلاص عمل سے کام

کرے تو پروردگار اس قدر برکت دیتا ہے کہ ایک چلّو پانی کے طلبگار کو پورا چشمۂ زمزم عطا کر دیتا ہے جس سے عالم انسانیت تا قیامت مستفید ہوتا رہے۔

۱۱۔ عرفات و مزدلفہ کے میدانوں میں قیام راہ خدا میں ترک وطن اور ترک آبادی کے جذبہ کی علامت ہے اور مزدلفہ سے کنکریوں کا جمع کرنا تعلیم ہے کہ مسلمان جہاں بھی رہے اور جس عالم میں رہے۔ دشمن سے غافل نہ رہے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اسلحہ کا بندوبست کرتا رہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسلحہ دنیا کے کارخانہ کا ہوگا تو خود بھی بیکار ہو سکتا ہے لیکن الٰہی اشارہ کے مطابق فراہم کیا جائے تو ایک کنکری سے ایک شیطان بھی فنا ہو سکتا ہے۔

۱۲۔ قربانی انسان کی زندگی میں جذبۂ قربانی کی تشکیل ہے کہ انسان راہ خدا میں اپنے سر کے حسین و جمیل بال بھی کاٹ سکتا ہے اور اپنے قیمتی جانور کا گلا بھی۔ حکم خدا کے سامنے کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

واضح رہے کہ مطاف کا ایک ہونا اور جمرات کا تین ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ہر منزل پر خطِ مستقیم ایک ہوتا ہے اور خط منحنی و منحرف متعدد ہوتے ہیں۔ اسلام کا خطِ مستقیم خانۂ خدا ہے اور اس کے انحرافات مراکز شیطانی ہیں جس طرح کہ ایمان کا خطِ مستقیم خطِ مولودِ کعبہ ہے اور اس کے منحنی خطوط پروردہ ہائے بیوت اصنام و اوہام ہیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

حج کے ایمانی اشارات

•۔ حج سے متعلق آیات کریمہ کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں حج بیت اللہ یادِ خدا کا بہترین ذریعہ ہے اور مالک کائنات کا تمامتر مقصد یہ ہے کہ اس کے مناسک کے ذریعہ مسلمان کے دل میں اپنی یاد کو راسخ بنادے۔ ارشاد ہوتا ہے:

۔ حج اس کے لئے واجب کیا ہے کہ "لوگ مکہ آکر اپنے منافع کا مشاہدہ کریں اور معینہ دنوں میں خدا کو یاد کریں۔" (حج ۲۸)

۔ "ہم نے ہر قوم کے لئے مناسک قرار دئے ہیں تاکہ ہمارے دئے ہوئے جانوروں پر نام خدا کا ذکر کریں۔" (حج ۳۴)

۔ "دیکھو جب عرفات کے مناسک ختم ہوجائیں تو مشعر الحرام میں جاکر ذکر خدا کرنا۔" (بقرہ ۔ ۱۹۸)

۔ "جب تمام مناسک ختم ہوجائیں تو بھی خدا کو اسی طرح یاد رکھنا جس طرح اپنے آباء واجداد کو یاد کرتے ہو۔" (بقرہ ۔ ۲۰۰)

۔ "ان چند معینہ دنوں میں خدا کو یاد کرو۔" (بقرہ ۔ ۲۰۳)

۔ "ہم نے قربانی کے اونٹ کو اپنی علامت قرار دیا ہے لہٰذا اس پر ہمارے نام کا ذکر کرو۔" (حج ۳۶)

۔ "اس سے بڑا ظالم کون ہے جو مساجد خدا میں ذکر خدا پر پابندی لگادے۔" (بقرہ ۔ ۱۱۴)

•۔ اسلام میں سب سے پہلا حکم جہاد سورۂ حج میں بیان کیا گیا ہے:

"جن لوگوں پر جنگ مسلط کی جارہی ہے انھیں جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے

کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ ان کی نصرت پر قادر ہے۔" (حج ۳۹)

جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں جہاد اور حج میں تضاد نہیں ہے اور حج اندھے بہرے مناسک کا نام نہیں ہے اور اس کا حقیقی فلسفہ یہی ہے کہ مسلمان ایک مقام پر جمع ہوکر اپنی واقعی اجتماعیت کا مظاہرہ کریں اور اپنی اجتماعی طاقت کا احساس کرکے ہر طرح کے دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوجائیں۔

•۔ حج ایک اجتماعی سفر ہے جو مادی بھی ہے اور معنوی بھی۔ مادی اعتبار سے انسان اپنے وطن سے نکل کر مکہ مکرمہ کی طرف جاتا ہے اور معنوی اعتبار سے صدائے الٰہی پر لبیک کہتا ہوا اس کی بارگاہ میں حاضری دیتا ہے اور اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اگر اصلاب وارحام میں بھی ندائے ابراہیمؑ پر لبیک کہہ دی ہے تو آجتک اپنے عہد پر قائم ہے اور اس کی تجدید کے لئے حاضر ہوگیا ہے۔ مسلمان وہ نہیں ہے جو ۲½ ماہ میں اپنے عہد غدیر کو نظرانداز کردے۔ مسلمان وہ ہے جو ہزاروں سال کے بعد بھی اپنے عہد پر قائم رہے۔ اگرچہ اس عہد کا شعور دور دور تک نہیں ہے اور اس کا تعلق عالم شعور وادراک کے پہلے سے ہے۔

•۔ مدینہ سے مسافر کا فرض ہے کہ مسجد شجرہ سے احرام باندھے اور اگر اتفاقاً یہاں سے گذر گیا تو جحفہ سے احرام باندھے جو واقعاً اہل شام کا میقات ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ حج بیت اللہ کرنے والے کو اوّلاً اس عہد کو یاد کرنا ہوگا جو مسلمانوں نے سرکار دوعالمؐ سے درخت کے نیچے کیا تھا کہ جان دے دیں گے لیکن میدان نہ چھوڑیں گے۔ اس کے بعد مقام جحفہ (غدیر خم) پر پہونچ کر اس عہد کو یاد کرے جو مسلمانوں نے حج سے واپسی پر کیا تھا کہ جس طرح سرکار دوعالمؐ کو اپنا مولا تسلیم کرتے رہے ہیں اسی طرح مولائے کائنات کو اپنا مولا تسلیم کرتے رہیں گے کہ اس کے بغیر حج کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اہل شام کے لئے جحفہ کو میقات قرار دینا اور جحفہ ہی میں مولائے کائناتؑ کی مولائیت کا اعلان کرنا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ کم سے کم اہل شام حج کا ارادہ کریں تو اس مولائیت کا ادراک و اقرار کرلیں جس کا اعلان اس مقام پر ہوا تھا اور ان میں اس اعلان

کے انکار کی جرأت نہ ہو۔

●۔ سرکار دو عالمؐ کے حج کے ذیل میں دو خطبوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک میدانِ عرفات میں جس میں احکام الٰہیہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور ایک میدانِ غدیر میں جس میں احکام الٰہیہ کے ساتھ مولائے کائناتؑ کی مولائیت کا اعلان ہوا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان کا حج احکام کے علم کے بغیر صحیح نہیں ہے اور مسلمان کے حج کی تکمیل بغیر اقرار ولایت ممکن نہیں ہے۔ ولایت علیؑ کا اقرار نہ ہو تو طواف کعبہ طواف نہیں ہے تقدیر کا چکّر ہے۔ مولود کعبہ سے انحراف کر کے کعبہ کے چکّر لگانے کا فائدہ کیا ہے؟

●۔ حج کے جملہ اعمال اور مقامات ایک یادگاری حیثیت رکھتے ہیں۔ لبیک ندائے ابراہیمؑ کی یادگار ہے۔ مقام ابراہیمؑ زحمت ابراہیمؑ کی یادگار ہے۔ سعی زحمت ہاجرہؑ کی یادگار ہے۔ چشمہ زمزم تشنگی اسماعیلؑ کی یادگار ہے ـــ اور ان تمام شخصیتوں میں ایک بزرگ ہے اور ایک بچہ اور ایک خاتون ـــ جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام میں نہ بزرگوں کی یادگار کوئی بدعت ہے اور نہ بچوّں کی۔ نہ عورتوں کی یادگار کوئی بدعت ہے اور نہ مردوں کی۔ بلکہ اسلام نے ایک یادگار کو تو واجب کا درجہ دے دیا ہے جس کا نام ہے قربانی، کہ جو انسان بھی حج بیت اللہ کرے اسے راہ خدا میں ایک جانور اسی طرح قربان کرنا ہے جس طرح جناب ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو قربان کیا تھا۔ اگرچہ وہ قربانی ناتمام رہ گئی تھی اور اسمٰعیل ذبح نہیں ہوئے تھے لیکن مسلمان پر جانور ذبح کرنا واجب ہے تاکہ اسے یہ احساس رہے کہ اگر قربانی ناتمام کی یاد حرام اور بدعت نہیں ہے تو راہ خدا میں بھرے گھر کی مکمل قربانی کی یاد کس طرح بدعت اور حرام ہو سکتی ہے۔

●۔ حج بیت اللہ میں اگر سعی اس امر کی یادگار ہے کہ جناب ہاجرہ نے ایک نبی خدا کی زندگی کے لئے کافی دیر تک دوڑ دھوپ کی تھی اور اس پہاڑی سے اُس پہاڑی کی طرف پانی کی تلاش میں دوڑ رہی تھیں تو طواف اس امر کی یادگار ہے کہ ایک بندۂ خدا نے مدّتوں رسول اکرمؐ کی زندگی کے تحفّظ کے لئے اپنی ساری شخصیت کو رسالت کی قربان گاہ پر چڑھا دیا تھا اور پروردگار نے اس کے انعام میں اس کے فرزند کو اپنے گھر میں پیدا کر دیا اور اپنے گھر

کو اس کے فرزند کا زچہ خانہ بنا دیا۔

●۔ رسول اکرمؐ کے اعلان رسالت سے پہلے بھی جب عربستان کے رہنے والے خانۂ خدا کے طواف کے لئے آیا کرتے تھے تو زمزم کے پانی کو ناقابل استعمال دیکھ کر جناب ابوطالب اسے شیریں بنانے کا انتظام کر دیا کرتے تھے تاکہ بیت اللہ کے مہمانوں کو کوئی زحمت نہ ہو۔ اس راہ میں آپ نے ایک سال دس ہزار درہم قرض لئے اور ایک سال چودہ ہزار لیکن اپنی سیرت کو نظرانداز نہیں کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ ضیوف الرحمٰن کی اسطرح کی خدمت کرنے والا کافر کہا جائے اور زمزم کا ٹیکس وصول کر کے پانی کی تھیلی دیدینے والے کو خادم الحرمین کے لقب سے نواز دیا جائے۔

●۔ واضح رہے کہ حج بیت اللہ بھی ایک یادگار ہے اور محرم بھی ایک قربانی کی یادگار ہے۔ لیکن حج کے لئے حکم وجوب موجود ہے اور محرم کے لئے ایسا کوئی وجوب نہیں ہے اور اس کا راز غالباً یہ ہے کہ حج خوشی کی تقریب ہے اور خوشی کی تقریب میں لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے لیکن محرم غم ہے اور غم فطری تقاضوں کی بنا پر منایا جاتا ہے اور اس کی دعوت نہیں دی جاتی ہے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

پیدل حج

اسلام کے بنیادی قوانین میں ایک قانون یہ بھی ہے کہ پروردگار عالم عمل کی مشقت کو دیکھ کر اجر کا تعین کرتا ہے اور انسان جس قدر زحمت برداشت کرتا ہے اسی اعتبار سے اجر و ثواب عطا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پیدل حج و زیارت انجام دینے کا ثواب سواری پر سفر کرنے سے زیادہ ہے۔ لیکن اس مقام پر حج کے بارے میں ایک روایت پائی جاتی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ امام حسنؑ حج بیت اللہ کے لئے پیدل تشریف لے جاتے تھے تو سواری ساتھ چلتی تھی جس کے ذیل میں بعض اشکالات بھی پیدا ہوتے ہیں۔

چنانچہ صاحب وسائل الشیعہ محدث حر عاملیؒ نے اپنے فوائد میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے کہ میں حج بیت اللہ کا تیسرا سفر کر رہا تھا کہ ایک مقام پر آنکھ لگ گئی۔ احرام کے بعد تقریباً ستّر افراد میرے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی شخص نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ آخر اس کا راز کیا ہے کہ امام حسنؑ حج بیت اللہ کے لئے پیدل چلتے تھے اور سواریاں ان کے ساتھ چلا کرتی تھیں۔ تو میں نے حسب ذیل جوابات دے:

۱۔ تاکہ لوگ پیسہ بچانے کے لئے پیدل حج نہ کریں۔
۲۔ اس قسم کی بدگمانی امامؑ کے بارے میں نہ ہونے پائے۔
۳۔ پیدل حج کے استحباب کا اعلان ہو جائے۔
۴۔ راہ خدا میں مال خرچ کیا جائے اور سواریوں کا بندوبست کیا جائے۔
۵۔ عرفات وغیرہ میں ان سواریوں سے استفادہ کیا جاسکے۔
۶۔ اگر خدانخواستہ پیدل چلنا ناممکن ہو جائے تو سواری کام آسکے۔

۷۔ نفس مطمئن رہے کہ سواری ساتھ موجود ہے جیسا کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے کہ جسے پانی کا اطمینان ہوتا ہے اسے پیاس نہیں لگتی ہے۔
۸۔ واپسی کے موقع پر سواری کی جاسکے۔
۹۔ کمزور لوگوں کی مدد کی جاسکے اور انھیں سوار کیا جاسکے۔
۱۰۔ اگر راستہ میں ڈاکو وغیرہ مل جائیں تو سواری کے ذریعہ ان سے نجات حاصل کی جاسکے۔
۱۱۔ سواریاں تبرک کے طور پر مکہ و عرفات و مزدلفہ و منیٰ میں حاضر رہیں۔
۱۲۔ اپنی جلالت قدر کا بھی اعلان ہو جائے کہ یہ طرز عمل کسی غریب، فقیر انسان کا نہیں ہے۔
۱۳۔ اس امر کا اعلان ہو جائے کہ پروردگار کی نعمتیں مسلسل شامل حال ہیں۔
۱۴۔ جنگ وغیرہ کی نوبت آجائے تو سواریوں سے استفادہ کیا جاسکے۔

میں خواب سے بیدار ہوا تو مجھے یہ چودہ اسباب یاد رہ گئے تھے جو میں نے نوٹ کر لئے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی اسباب ہوں۔ جہاں تک عام انسان کے علم کی رسائی نہیں ہے۔ اس لئے کہ امامؑ کا علم بہرحال امامؑ کا علم ہوتا ہے وہاں تک عام انسان کے علم کی رسائی نہیں ہوسکتی ہے۔

زکوٰۃ و خمس

• ۔ اسلام نے اپنے مالیاتی نظام کو مرتب کرنے میں دو باتوں کا لحاظ رکھا ہے:

۱۔ انسان کے مالیات کا وہ کون سا حصہ ہے جس میں انسان کو خاطر خواہ محنت نہیں کرنا پڑی ہے بلکہ مال بلا محنت حاصل ہو گیا ہے یا محنت کا مقصد مال نہیں تھا اور مال گویا از غیب حاصل ہو گیا ہے جیسے معدنیات، خزانے، غوّاصی سے برآمد ہونے والے اموال یا میدان جنگ کا مال غنیمت کہ مسلمان کا مقصدِ جہاد مال غنیمت نہیں ہوتا ہے اور یہ مال بلا ارادہ حاصل ہو جاتا ہے یا سال بھر کے اخراجات کی بچت کہ اس میں کسی طرح کی محنت شامل نہیں ہوتی ہے اور یہ مال آخر کار بچ جاتا ہے۔

۲۔ مالیات کا وہ حصہ کونسا ہے جس میں انسان کو خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے جیسے سونے چاندی کے سکّوں کی جمع آوری۔ جانوروں کی پرورش یا کاشتکاری اور درخت کاری کا عمل۔

اسلام نے پہلی قسم میں خمس واجب کیا ہے جو پانچواں حصہ ہے اور دوسری قسم میں زکوٰۃ کا قانون بنایا ہے جو دسواں۔ بیسواں یا چالیسواں حصہ ہے اور اس کا راز بھی واضح ہے کہ پہلی قسم میں محنت زیادہ نہیں تھی لہٰذا وہ صرف عطیہ پروردگار تھا اور اس میں پروردگار نے اپنا حصہ زیادہ رکھا ہے اور دوسری قسم میں انسان کی محنت اور زحمت کا دخل ہے لہٰذا اس میں انسان کا حصہ زیادہ رکھا گیا ہے۔

• ۔ مالیات کے سلسلہ میں دوسرا نکتہ یہ بھی قابل توجہ ہے کہ خمس بظاہر پانچواں حصہ کہا جاتا ہے ورنہ واقعاً یہ عطیہ پروردگار کا پانچواں حصہ نہیں ہوتا ہے بلکہ بچت کا پانچواں حصہ ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر ایک شخص کی آمدنی ایک ہزار روپیہ ماہانہ ہے تو کھلی بات ہے کہ گیارہ ماہ تک

اس کے اوپر کوئی خمس واجب نہیں ہوتا ہے اور سال کا گیارہ ہزار تنہا اس کی ذات پر صَرف ہوتا ہے اس کے بعد بارہویں مہینہ کی آمدنی بھی ۲۹ دن تک اسی انسان پر صَرف ہوتی ہے اور آخری دن اگر سو پچاس روپیہ بچ جاتا ہے تو اس کا پانچواں حصہ ادا کرنا ہوتا ہے جو پروردگار کے سال بھر کے عطیہ بارہ ہزار کے مقابلہ ۱/۱۲ کے قریب ہوتا ہے اور اسے پانچواں حصہ صرف بچے ہوئے مال کی نسبت سے کہہ دیا جاتا ہے ورنہ اصل عطائے الٰہی کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

تقریباً یہی حال زکوٰۃ کا بھی ہے کہ زکوٰۃ پیداوار کا دسواں حصہ ہے۔ انسانی محنت کا دسواں حصہ نہیں ہے۔ انسان نے تو صرف دانے زمین میں ڈال دئے تھے۔ دانوں کو بالیوں کی شکل پروردگار نے دی ہے۔ بالیوں سے سو سو دانے مالک نے نکالے ہیں لہٰذا کل پیداوار مالک زمین کی محنت کا کئی سو گنا زیادہ ہے جس کے بعد زکوٰۃ کی شرح بھی ایسی ہی ہونی چاہیئے تھی لیکن یہ مالک کا کرم تھا کہ اس نے اپنا حق صرف دسواں یا بیسواں حصہ قرار دیا ہے اور باقی مال کاشتکاروں کے حوالے کر دیا ہے۔

• زکوٰۃ اور خمس کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مال خمس انسانی محنت کا نتیجہ نہ ہونے کی بناپر تمامتر خالق کائنات کی دین ہے لہٰذا اس نے اس مال میں اپنا حق بھی قرار دیا ہے اور زکوٰۃ سے اسے کو الگ رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خمس ایک محترم مال ہو گیا ہے جو خدا و رسول اور امام کے بھی شایان شان ہے لیکن مال زکوٰۃ ایسا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ میں یہ قانون رکھ دیا گیا کہ غیر سید کی زکوٰۃ سید کو نہیں دیجا سکتی ہے لیکن خمس میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ یہ ایک محترم مال ہے جس کا حقدار ایک محترم نسب شریف کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

• واضح رہے کہ خمس کا استحقاق صرف نسبی امتیازات کی بنا پر نہیں ہوتا ہے ورنہ ہر غریب وامیر سید خمس کا حقدار ہو جاتا۔ خمس کا استحقاق بھی غربت ہی کی بنا پر پیدا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس میں غیر سادات کا الگ کوئی حصہ نہیں رکھا گیا ہے اور انھیں حق امام میں شامل کر دیا گیا ہے اور سادات کرام کا الگ ایک حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اسکی تقسیم اس طرح بھی ہو سکتی تھی کہ جو حصہ رسول اور امام کا تھا وہ ان کی اولاد کے غریب افراد کو دیدیا جاتا اور دوسرا حصہ غیر سادات پر تقسیم کر دیا

جاتا لیکن اس طرح خمس ایک وثیقہ یا ترکہ بن کر رہ جاتا اور اسلام اس طرز فکر سے راضی نہیں تھا لہٰذا اس نے مسئلہ کو بالکل اُلٹ دیا اور جو حصہ رسول اور امام کا تھا اس میں غیر سادات کو حصہ دار بنایا اور سادات کے لئے نصف حصہ الگ سے قرار دے دیا تاکہ سادات کی ضرورت بھی پوری ہو جائے اور رسول اور امام کا ایثار بھی منظر عام پر آجائے کہ ان کا حصہ انکے خاندان کے علاوہ دوسرے افراد پر صَرف ہوا ہے اور ان کی اولاد کے لئے ترکہ یا جاگیر نہیں بن گیا ہے۔

• غیر سادات کے ضروریات کو حق امام میں قرار دینے اور ان کے لئے الگ سے کوئی حصّہ قرار نہ دینے کا ایک راز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس طرح حق امامؑ آزاد رہے گا اور دو مذہب کے دیگر ضروریات میں بھی صَرف ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ ایسا وقت کبھی بھی آسکتا ہے کہ جب غیر سادات فقراء کا سلسلہ تمام ہو جائے اور مال بے مصرف ہو جائے۔ لیکن غریب سادات سے زمانہ کے خالی ہونے کا امکان نہ ماضی میں کبھی رہا ہے اور نہ بظاہر مستقبل میں اس کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہر دور تاریخ میں جب محبان آل محمدؐ پر مظالم ڈھائے گئے ہیں تو ان کی اولاد کو خاص طریقہ سے نشانۂ ستم بنایا گیا ہے اور کسی دور میں بھی انھیں معاف نہیں کیا گیا ہے۔ اس بنا پر ان کے مظلومین کی زندگی کا کوئی مستقل بندوبست ہونا چاہیئے تھا جو مالک کائنات نے خمس کی شکل میں کر دیا ہے اور اس طرح رسول اکرمؐ کو ان کی محنتوں اور قربانیوں کا ایک مختصر سا صلہ دے دیا گیا ہے ورنہ واقعی صلہ تو تمام دنیا کا مال نہیں ہو سکتا ہے خمس کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

• شائد غیر سادات مومنین کی اسی مالی آسودگی کے امکان کے پیش نظر زکوٰۃ کے موارد ایسے قرار دئے گئے ہیں جو کسی وقت بھی ختم ہو سکتے ہیں اور دنیا کے بیشتر علاقے ان سے خالی ہو سکتے ہیں کہ نہ کہیں سونے چاندی کے سکّے ہوں اور نہ گائے بکری، اونٹ کی پرورش یا خرما اور کشمش کی پیداوار۔ لیکن خمس کے موارد میں سالانہ بچت ایک ایسا مورد ہے جس کا سلسلہ ہر جگہ ہے اور اس وقت تک باقی رہے گا جب تک غریب سادات کی نسل باقی رہے گی اور اولاد رسولؐ کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا رہے گا۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

اسلام کا عسکری نظام

اسلام نے اپنے معرکوں کا نام جہاد رکھا ہے اور جہاد کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔

جہاد مال۔ جہاد نفس۔

جس کا کھُلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کسی خاص مقصد کے لئے جد و جہد چاہتا ہے اور اس کا مطالبہ دوسروں کا مال لوٹنے یا ان کی زندگی کا خاتمہ کرنے کا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے چاہنے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مقصد کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان کو قربان کریں اور غارت گری کے بجائے قربانی کے راستہ کو اختیار کریں۔

اس نے قتال کا نام اس لئے لیا ہے کہ دشمن اس راستہ کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں جانتا ہے تو اسلام کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس میدان میں بھی کسی طرح کی کمزوری کا اظہار نہ کریں اور دشمن مسلح ہو کر جنگ کا راستہ کھول دے تو مسلمان بھی اپنے قدم میدانِ جنگ میں جما دیں اور سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح جم کر مقابلہ کریں۔

اسلام کے مقصد کی بلندی ہی سے اس کے عسکری نظام کے دفعات کا تعیّن ہوتا ہے اور ان دفعات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا عسکری نظام دنیا کے تمام نظاموں سے مکمل طور پر مختلف ہے اور ہر نظام پر اس کے مقاصد کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

سپاہی

عام طور سے مثل مشہور ہے کہ فوج میں ان لوگوں کو بھرتی کیا جاتا ہے جو علمی سطح کے اعتبار سے پست ہوں اور ہاتھ پیر کے اعتبار سے مضبوط ہوں تاکہ اپنے امیر کے اشارہ پر جان

دے دیں اور جان لے لیں اور کسی مرحلہ پر اپنی عقل و فکر کو استعمال نہ کریں۔

معاویہ بن ابی سفیان نے اسی کافرانہ طرز فکر کا اظہار کیا تھا جب مولائے کائنات علیؑ بن ابی طالب کو یہ پیغام دیا تھا کہ میرے پاس ایک لاکھ کا لشکر ہے جسے اونٹ اور اونٹنی کا فرق معلوم نہیں ہے اور وہ میری اطاعت میں عقل و ہوش سے یوں عاری ہو چکا ہے کہ صرف میری بات کو دُہرانا جانتا ہے اور بس۔

اسلام نے اس کے بالکل برخلاف سپاہی کے لئے عقل و فکر و ہوش کو لازمی قرار دیا ہے اور اس کے بغیر میدان جنگ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی ہے کہ اس طرح جہالت بہرحال خون ناحق پر آمادہ کر دے گی چاہے دشمن کا خون ناحق ہو یا اپنا ہی خون ناحق ہو جائے۔

اس کے علاوہ سپاہی میں قوت صبر و تحمل کا ہونا ضروری ہے تاکہ مصائب کے مقابلہ میں فرار بھی نہ کرے اور جذبات میں آکر حد سے تجاوز بھی نہ کرے کہ اس طرح جہاد غارت گری کے مرادف ہو جائے گا۔

قوم طالوت میں قوت صبر ہی کی کمی تھی کہ نہر کو دیکھ کر پانی پر ٹوٹ پڑے اور امتحان تشنگی میں کامیاب نہ ہو سکے اور مولائے کائنات کی قوت صبر و تحمل ہی کا معجزہ تھا کہ عمرو بن عبدود کے سینے سے اُتر آئے اور اس وقت تک ظالم کا سر قلم نہیں کیا جب تک یہ احتمال ختم نہ ہو جائے کہ علیؑ نے راہ خدا میں نہیں راہ جذبات میں سر قلم کیا ہے۔

اسلامی قانون میں عالم اور سپاہی ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں اور نہ سپاہی بن جانا عالم کی شان کے خلاف ہے۔ یہ صرف ایک استعماری سازش تھی کہ عالم کے سپاہی کا لباس پہن لینے کو عدالت کے خلاف قرار دے دیا گیا تھا ورنہ اسلام کا سب سے عظیم سپاہی وہ تھا جو باب مدینۃ العلم تھا۔ یہ اور بات ہے کہ سپاہی بن جانا اگر تحصیل علم کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے تو انسان کا پہلا فرض ہے کہ علم دین حاصل کرے اس کے بعد سپاہی بننے کا حوصلہ پیدا کرے کہ اسلام جاہل سپاہی کی کسی حیثیت کا قائل نہیں ہے۔ اسلام اس سپاہی کا طرفدار اور طلبگار ہے جو اپنے دین و مذہب سے مکمل واقفیت رکھتا ہو اور اسی بصیرت کے ساتھ میدان جہاد میں قدم رکھے جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے کربلا کے سب سے عظیم سپاہی کے بارے میں فرمایا ہے "کان

عمی العباس نافذ البصیرۃ" عباسؑ بصیرت میں کامل اور راسخ تھے اور اس کمال کے بغیر کوئی انسان اسلام کا سپاہی یا اسلامی سپاہ کا سردار لشکر نہیں ہو سکتا ہے۔

سردار

ظاہر ہے کہ جس عسکری نظام میں جاہل کے سپاہی بننے کا امکان نہیں ہے اس میں سردار لشکر بننے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دین خدا میں سپاہی اور سردار کا بنیادی فرق یہ ہے کہ سپاہی میں صرف علم اور بصیرت کی شرط ہے لیکن سردار میں بصیرت کی گہرائی اور علم کی وسعت بھی ضروری ہے۔ اسی لئے جب قوم طالوت نے جناب طالوت کی سرداری پر اعتراض کیا کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں ہے، انھیں سردار بننے کا کیا حق ہے تو پروردگار نے دو لفظوں میں سرداری کے جملہ شرائط کا اعلان کر دیا تھا۔ کہ طالوت کا پہلا شرف یہ ہے کہ انھیں پروردگار نے منتخب کیا ہے اور دوسرا شرف یہ ہے کہ یہ انتخاب بے بنیاد نہیں ہے بلکہ ان کے پاس علم اور شجاعت کی وسعت پائی جاتی ہے اور پروردگار نے انھیں علم و جسم میں وسعت عنایت فرمایا ہے "زادہ بسطۃ فی العلم والجسم"۔

اسلام میں سرداری کی دوسری شرط یہ ہے کہ سردار لشکر خود میدان جنگ میں حاضر رہے اور ثبات قدم کا مظاہرہ کرتا رہے۔ اسلام کسی ایسے سردار کا قائل نہیں ہے جو گھر بیٹھ کر لوگوں کو میدان جنگ میں سر کٹانے کا حکم دیدے اور نہ ایسے سردار کا قائل ہے جس کے قدم میدان جنگ سے اکھڑ جائیں کہ اس کے بعد لشکر فرار ہونے پر مجبور ہو جائے اور فرار کو بھی اطاعت اولی الامر کا ایک شعبہ قرار دیدے۔

مولائے کائنات نے میدان احد میں اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا جب سرکار دو عالمؐ نے سوال کیا کہ یا علیؑ! جب سب نے فرار اختیار کر لیا تو تم کیوں نہ چلے گئے؟ تو عرض کی، "ان لی بک اسوۃ"، میں آپ کے نقش قدم پر ہوں۔ جب تک آپ میدان میں رہیں گے میرا فرض ہے کہ میں میدان میں رہوں۔ ہاں آپ چلے جائیں گے تو میں بھی چلا جاؤں گا۔

یہ فقرہ اگر ایک طرف مولائے کائنات کی بے نظیر شجاعت کا اظہار کرتا ہے تو دوسری طرف

سرکارِ دو عالمؐ کی بے مثال استقامت کا بھی اعلان کرتا ہے کہ آپ تلوار کو ہاتھ نہ لگانے کے باوجود میدان جنگ ہی میں رہے اور آپ نے فرار نہیں کیا کہ میدان احد میں آپ کی حیثیت حاکم وقت کی نہیں بلکہ سردار لشکر کی تھی اور آپ اسلامی لشکر کو اپنی قیادت میں لیکر آگے بڑھے تھے اور حدود مدینہ پر دشمن کی پیشقدمی کو روک دیا تھا۔

طریقۂ جنگ

اسلامی نظام میں جنگ کا طریقہ بھی دوسرے نظاموں سے مختلف ہے۔ دوسرے نظاموں میں طاقت کا غرور پہلے میدان جنگ میں اُتار دیتا ہے۔ اس کے بعد جب کامیابی نہیں ہوتی ہے تو صلح وسلامتی کی بات چیت شروع ہوجاتی ہے لیکن اسلام کا نظام اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام ابتدائی منزل میں آخری دم تک صلح و آشتی کی کوشش کرتا ہے اس کے بعد جب دشمن کا غرور حد سے بڑھ جاتا ہے اور وہ مسالمت آمیز روش کو کمزوری کا نام دینے لگتا ہے تو اسلام مجبوراً میدان میں اُتر آتا ہے اور اس شان سے جہاد کا حق ادا کرتا ہے کہ دشمن صلح وسلامتی کی فریاد کرنے لگتا ہے۔

اسلام نے اپنے نظام کا نام اسلام اسی لئے رکھا ہے کہ اس کی بنیاد امن وسلامتی پر ہے اور وہ جنگ و جہاد کا نام بہت بعد میں لیتا ہے۔ چنانچہ اس کی تاریخ بھی گواہ ہے کہ اس نے تیرہ سال مکہ میں تمام مصائب و آلام کے باوجود فلاح ہی کا پیغام دیا ہے اور اینٹ کا جواب اینٹ سے نہیں دیا ہے۔ یہانتک کہ ترک وطن کی روحانی اذیت بھی برداشت کرلی لیکن اس کے بعد جب دشمن کے حوصلے بلند ہی ہوتے رہے اور وہ اپنے آپے سے باہر ہوگیا تو اسلام نے وہ جہاد کیا کہ بدر و احد و خندق کے مسلسل تجربات کے بعد اور خندق میں کل کفر کی شکست کے بعد حدیبیہ میں کفر نے صلح کا پیغام بھیجدیا اور اس طرح واضح ہوگیا کہ اسلام اور کفر کے دو متوازی راستے ہیں۔ کفر کی دنیا میں بات جنگ سے شروع ہوتی ہے اور صلح پر تمام ہوتی ہے اور اسلام کی دنیا میں بات امن وسلامتی اور فلاح و کامیابی سے شروع ہوتی ہے اور جنگ پر تمام ہوتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ اسلام امن وسلامتی کا پیغامبر ہے لہٰذا جنگ کے میدان میں بہادرانہ جوہر دکھلانے کے بعد اور کل کفر کے خاتمہ کے بعد بھی اگر کفر صلح کا پیغام دیتا ہے تو اسلام فوراً منظور

کرلیتا ہے اور اگر فتح مکہ میں امن کا طلبگار ہوتا ہے تو فوراً امان دے دیتا ہے اور کفر کے سربراہ کے گھر کو بھی "دارالامان" بنا دیتا ہے تاکہ کفر پر اسلام کی حقیقی روش کا بھی اظہار ہوجائے اور وہ اسلام کو فریب دہی کا نظام نہ قرار دے سکے اور مسلمان پر بھی اس حقیقت کا اظہار ہوجائے کہ وہ کونسے منافقین ہیں جو سرکار دو عالمؐ کے گھر میں یا اللہ کے گھر میں پناہ نہیں لینا چاہتے ہیں بلکہ ابوسفیان کے گھر میں پناہ لینا چاہتے ہیں اور ان کا ملجأ و ماویٰ آج بھی ابوسفیان اور اس کا گھر ہی ہے۔

مقصد اور ذمہ دار

واضح رہے کہ اسلام وکفر کے مقاصد جنگ بھی الگ الگ ہیں۔ کفر کا نمائندہ معاویہ جب کوفہ میں قدم رکھتا ہے تو صاف اعلان کرتا ہے کہ میری جنگ کا مقصد نماز و روزہ و حج نہیں تھا۔ میں تم پر حکومت کرنا چاہتا تھا اور وہ مقصد حاصل ہوگیا اور اسلام کا نمائندہ جب میدان صفین (شام) میں قدم رکھتا ہے تو عین حالت جنگ میں مصلیٰ بچھا کر اعلان کرتا ہے کہ میری جنگ اسی نماز کے لئے ہے۔ انانیت اور آمریت کے لئے جنگ کفار کا مقصد حیات ہے اور بندگی پروردگار کے لئے جہاد اسلام کا نصب العین ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ کفر کا ذمہ دار ہر وہ شخص ہوسکتا ہے جس میں انانیت، غرور، استکبار اور آمریت کا جذبہ پایا جاتا ہو لیکن اسلام کا ذمہ دار وہی ہوگا جو نفس سے بھی جہاد کرسکتا ہو اور عصمت کردار کا مالک ہو تاکہ لیلۃ الہریر میں بھی تلوار چلائے تو ایمان کی بصیرت اور عصمت کی روشنی میں نسلوں کا جائزہ لے لے اور اس کے بعد تلوار اٹھائے کہ اگر کسی کی ستر پشت میں بھی کوئی مومن آنے والا ہو تو اسے چھوڑ دے تاکہ اس مومن کے وجود کا راستہ نہ رُکنے پائے اور دنیا ایک مومن کے وجود سے محروم نہ ہونے پائے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

اسلام اور غلامی

غلامی کے بارے میں اسلام کا موقف دریافت کرنے سے پہلے غلامی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جس سے بخوبی یہ اندازہ ہوجائے گا کہ غلامی کی جڑیں انسانیت کی تاریخ میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور کوئی دور تاریخ ایسا نہیں رہا ہے جب انسانوں نے طاقت اور دولت کے زور پر انسانوں کو غلام نہ بنایا ہو۔

غلامی کا ایک رُخ انسانی فطرت سے قریب تر ہے کہ کوئی انسان اپنے سارے کام خود انجام نہیں دے سکتا ہے اور ہر شخص مجبور ہے کہ دوسرے کا سہارا لے۔ اب اگر انسان سادہ لوح ہوتا ہے تو جس سے کام لیتا ہے اسے اپنا محسن اور اپنے سے بالاتر تصور کرتا ہے اور اگر شاطر اور ہوشیار ہوتا ہے تو اپنے کو بالاتر قرار دے کر اسے نوکر اور مزدور کا درجہ دے دیتا ہے۔ یہی فطرت جب مصلحت پرستی سے دوچار ہوجاتی ہے تو غلامی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور انسان دوسرے شخص کو محسن سمجھنے کے بجائے نوکر اور مزدور سمجھنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا ہے کہ اس کی اجرت ادا کرنا پڑے گی بلکہ اپنے کو ایسا صاحب حق تصوّر کر لیتا ہے جہاں ہر شخص کو بلا اجرت و معاوضہ اس کی خدمت کرنا چاہیئے اور اپنے کو اس کا غلام تصور کرنا چاہیئے۔

غلامی کی نشو ونما اسی ماحول میں ہوئی ہے کہ شاطر اور ہوشیار افراد نے طاقت اور ذہانت کے سہارے اپنے کو مالک بنا لیا اور دوسرے کمزور افراد کو غلام کا درجہ دے دیا جہاں انسان کو بندہ بے دام بن کر کام کرنا ہے اور اسے زندگی میں کسی طرح کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسلام نے عرصہ عمل میں قدم رکھا تو اس صورت حال کا سختی سے مقابلہ کیا۔ جناب ابراہیمؑ

نے انسانیت کو نمرود کے تشدد سے نجات دلائی۔ جناب موسیٰؑ نے فرعون کی غلام سازی کا مقابلہ کیا۔ جناب عیسیٰؑ نے اپنے دور کے حرام خور یہودیوں کا مقابلہ کیا اور سرکار دو عالمؐ نے اپنے دور کے ظالموں کے خلاف صدائے احتجاج بلند فرمائی۔ جاہلیت کا دور اس قدر ذلیل دور تھا جب خدا کی کوئی قدر نہ تھی اور شاطر بندے شام کو اپنے خدا "حلوہ" کو کھا جاتے تھے ذکر در انسانوں کی کیا حیثیت ہوگی۔

آپ نے ابتدائی طور پر اجرت اور مزدوری کے مسائل پر زور دیا تاکہ کمزور انسان کو اپنی قدر و قیمت کا احساس پیدا ہو اور طاقتور اپنے کو مالک تصور کرنا چھوڑ دے۔ آپ کو معلوم تھا کہ غلامی کی چھاؤں میں پروان چڑھنے والا معاشرہ نظام خدمتگاری سے آزاد نہیں ہوسکتا ہے اور غلامی کا مسئلہ شراب جیسا انفرادی مسئلہ نہیں ہے کہ اسے یکبیر حرام کردیا جائے۔ غلامی کی جڑیں زندگی کے ہر شعبہ میں پھیلی ہوئی ہیں لہذا اسے حرام کرنے کے لئے پہلے نظام اجرت کو رائج کرنا پڑے گا تاکہ خدمت گذاری پر اثر نہ پڑے اور معاشرہ دوسرے افراد کے سہارے زندہ رہ سکے۔

صرف مسئلہ یہ رہ جائے گا کہ کارگر افراد کی حیثیت کیا ہوگی۔ اسلام نے اسے غلام سے مزدور کی شکل میں تبدیل کر دیا تاکہ انسانی شرافت کا احساس بھی بیدار رہے اور طاقتور انسان مفت خوری کی لعنت سے نجات بھی حاصل کرسکے۔

اس کے بعد اسلام نے اصل مسئلہ غلامی پر توجہ دی اور اس کے خاتمہ کے دو راستے اختیار کئے:

۱۔ غلامی ایجاد کرنے کے تمام راستوں کو بند کر دیا جائے اور اس سلسلہ کو صرف میدان جنگ تک محدود کر دیا جائے کہ میدان جنگ میں آنے والے دشمنان انسانیت اگر اپنے ساتھ عورتوں اور بچّوں کو بھی لے آئے ہیں تو جنگ کے خاتمہ پر عورتوں کو اسیر اور کنیز بنا لیا جائے گا اور بچّوں کو غلام کا درجہ دے دیا جائے گا۔

یہ درحقیقت غلام سازی کا عمل نہیں ہے بلکہ حق و حقیقت کے خلاف جنگ چھیڑنے کا ردعمل ہے جسے کسی قیمت پر خلاف عدل و انصاف نہیں کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت کے خلاف جنگ چھیڑنے والوں کو سزا بہرحال ملنی چاہیئے۔ اگر وہ بالغ اور مرد ہیں اور جنگ میں شریک

ہوئے ہیں تو ان کی سزا قتل ہے۔ لیکن اگر نابالغ ہیں یا عورتیں ہیں اور قتل و قتال میں حصہ نہیں لیا ہے تو ان کا قتل خلاف انصاف ہے لیکن سزا بہر حال ضروری ہے تاکہ جنگ چھیڑنے والوں کو یہ احساس پیدا ہو کہ جنگ کے اثرات سپاہیوں تک محدود نہیں رہتے ہیں بلکہ نسلوں میں منتقل ہو جاتے ہیں اور اس کا خمیازہ پشتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ اسلام نے عورتوں اور بچوں کی کمزوری اور بیکسی کے پیش نظر ان کے ساتھ اچھے سلوک کو واجب قرار دے دیا اور کسی طرح کی بدسلوکی کو جائز نہیں رکھا۔

۲۔ آزادی کے متعدد راستے کھول دئے:

ا۔ اگر کسی انسان نے فی سبیل اللہ ثواب کے لئے غلام کو آزاد کر دیا تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ اس کے لئے مزید کسی ترتیب و تنظیم کی ضرورت نہیں ہے۔

ب۔ اگر کوئی شخص بروقت آزاد کرنے کے بجائے غلام سے یہ کہہ دے کہ تو میری وفات کے بعد آزاد ہے تو مالک کے مرتے ہی غلام آزاد ہو جائے گا اور ورثہ کو دخل دینے کا حق نہیں ہوگا۔

ج۔ اگر کوئی شخص غلام سے معاملہ کرلے کہ "اسقدر رقم کما کر دیدیگا تو آزاد ہو جائے گا" تو جیسے ہی غلام رقم کو ادا کر دے گا آزاد ہو جائے گا۔

د۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کا ایک حصہ بھی آزاد کر دے تو پورا غلام آزاد ہو جائیگا اور اگر غلام دو افراد کے درمیان مشترک ہے اور ایک نے آزاد کر دیا تو پورا غلام آزاد ہو جائے گا اور اسے دوسرے شریک کے حصہ کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

ھ۔ اگر کسی شخص نے اپنی کنیز سے بچہ پیدا کرا لیا تو اس کنیز کا فروخت کرنا حرام ہو جائے گا اور وہ کنیز مالک کے مرنے کے بعد بطور میراث تقسیم ہوگی تو ایک حصہ کا وارث اس کا فرزند بھی ہوگا اور اسلام میں بیٹا ماں کا مالک نہیں ہو سکتا ہے لہٰذا اتنا حصہ آزاد ہو جائے گا اور اس کے طفیل میں ساری کنیز آزاد ہو جائے گی اور اسے باقی شرکا کا حق ادا کرنا ہوگا۔ اگر اس بیٹے کے علاوہ دوسرے ورثہ بھی ہوں اور انھیں اس کنیز میں سے حصہ ملنے والا ہو۔

و۔ اگر کسی شخص نے اپنی زوجہ کو اپنی ماں جیسا قرار دے دیا تو دوبارہ حلال ہونے کے لئے ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ یہی حال کسی مومن کو قتل کر دینے والے اور ماہ رمضان کے روزہ کو کھا جانے والے کا ہے۔

ز۔ اگر کسی شخص نے خدا سے عہد کیا یا قسم کھا لی اور پھر اس کے مطابق عمل نہیں کیا تو اسے بھی غلام آزاد کرنا ہوگا۔

اسلام کے انھیں احکام کا نتیجہ تھا کہ دیکھتے دیکھتے لاشعوری طور پر غلامی کا خاتمہ ہو گیا اور سماج پر کوئی بار بھی نہیں پڑا۔ کتابوں میں "کتاب العتق" باقی رہ گئی اور استرقاق کا ذکر ختم ہو گیا۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

الزّوجیّۃ فی القرآن

قرآن مجید میں دو طرح کی زوجیت کا ذکر پایا جاتا ہے:
زوجیتِ فطری اور زوجیتِ سببی۔

زوجیت فطری

- ومن کل الثمرات جعلنا فیہا زوجین اثنین۔
- ومن کل شیئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون۔
- وانہ خلق الزوجین الذکر والانثیٰ۔ (النجم ۴۵)
- ثمانیۃ ازواج من الضان اثنین ومن المعز اثنین۔ (انعام ۱۴۳)
- وانزل من السماء ماءً فاخرجنا بہ ازواجًا من نبات شتیٰ۔ (طٰہٰ ۵۳)

زوجیت سببی

یہ وہ زوجیت ہے جو رشتۂ عقد وغیرہ کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ اس کا تذکرہ دنیا سے لے کر آخرت تک تقریبًا ۵۶ مقامات پر کیا گیا ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

احکام زوجیت، نفقہ زوجیت، طلاق زوجیت، میراث زوجیت، ازواج انبیاء ماسبق، ازواج پیغمبر اسلامؐ، شرائط زوجیت، مرتبہ زوجیت، زوجیت حوران جنت وغیرہ۔

ان تمام مقامات کے درمیان دو مقامات ایسے ہیں جن میں صراحتًا رشتۂ زوجیت کو پروردگار کی طرف منسوب کیا گیا ہے:

زوجیت حور العین (کذٰلک وزوجناھم بحور عین) دخان ۵۴
زوجیت زینب بنت جحش (فلما قضیٰ زید منہا وطرًا زوجناکہا) احزاب ۳۷
لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ حور العین کا رشتۂ زوجیت تقریبًا فطری انداز کا ہے اور اس کا صیغۂ عقد وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور جناب زینب کے عقد کے بارے میں پروردگار کی نسبت پیغمبر اسلامؐ کے موقف کی صفائی کے لئے ہے کہ اس رشتہ میں معاذ اللہ پیغمبرؐ کی نفسانیت کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ درحقیقت یہ رشتہ پروردگار نے قائم کیا تھا۔

جس کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ سببی زوجیت کا سارا کاروبار پروردگار نے بندوں کے حوالہ کر دیا ہے اور ان کے مکمل اختیار پر چھوڑ دیا ہے کہ خدائی شرائط کے مطابق جہاں چاہیں رشتۂ زوجیت قائم کر سکتے ہیں۔ زوجہ کا پیدا کرنا پروردگار کا کام ہے اور اس سے رشتۂ زوجیت قائم کرنا بندہ کا کام ہے۔

"ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجًا لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ" اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ اس نے تمھارا جوڑا تمھیں میں سے پیدا کیا ہے اور پھر تمھارے درمیان محبّت اور رحمت کا جذبہ قرار دیدیا ہے تاکہ تمھیں سکون زندگی حاصل ہو۔ اور اس کی نعمت کا شکریہ ادا کر سکو۔ ورنہ اگر سکونِ زندگی فراہم نہ ہو سکے تو زوجۂ نوحؑ نہیں ہے بلکہ "امرأۃ نوحؑ" اور "امرأۃ لوطؑ" ہے۔

واضح رہے کہ زوجہ کا کام سکونِ زندگی فراہم کرنا ہے نہ کہ سکون و راحت کا مطالبہ کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ زینت حیات الدنیا کے مطالبہ پر ازواج پیغمبرؐ کو طلاق کا پیغام سُنا دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ تمھارا کام یہ نہیں ہے اور نہ نبی کے گھر میں زینت و آرائش کی گنجائش ہے۔ "فتعالین امتعکن واسرحکن سراحًا جمیلاً" (احزاب)

استنتاج

- کائنات کی اصل زوجیت ہے اور مالک نے ہر شے کو مرکب بنایا ہے۔ وحدت حقیقی صرف مالک کائنات کا حصہ ہے جس میں کسی طرح کی ترکیب اور زوجیت

کی گنجائش نہیں ہے۔

• انسان کے تمام رشتوں میں اصل رشتہ زوجیت کا ہے جو جناب آدمؑ اور جناب حوّاؑ کے درمیان قائم ہوا تھا کہ اگر یہ رشتۂ زوجیت نہ ہوتا تو کائنات میں کسی رشتہ کا وجود نہ ہوتا۔

• قرآن مجید نے ازواج کی تین قسمیں قرار دی ہیں: عدو[1]۔ خنکی چشم (قرۃ اعین)[2]۔ ازواج مطہرہ[3]۔

• ازواج پیغمبرؐ کی مادری حیثیت کا مفہوم "حرمت نکاح" ہے۔ اور حرمت نکاح کا فلسفہ ایذاء پیغمبرؐ ہے۔ اس کے علاوہ اس مادری رشتہ کا کوئی اور اثر شرعی نہیں ہے۔

• ازواج پیغمبرؐ سے سخت لہجہ میں گفتگو اس بات کی دلیل ہے کہ آیت تطہیر کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چاہے دونوں باتوں کا تذکرہ ایک ہی مقام پر کیوں نہ ہو۔

اہمیت ازواج

• یوں بھی عالم انسانیت میں بقائے نوع کے لئے مرد و عورت کا ارتباط ضروری ہے اور ترک لذّات یا رہبانیت انسانیت کو تباہ کر سکتی ہے مقدس نہیں بنا سکتی ہے لیکن اسلام نے خصوصیت کے ساتھ رشتۂ ازدواج پر زور دیا ہے کہ بقائے نوع تو ہر جائز و ناجائز تعلق سے ممکن ہے لیکن بقائے نسب و شرافت جائز تعلقات کے بغیر ممکن نہیں ہے اور جائز تعلق ہی کا نام ہے ازدواج۔

قداح کہتے ہیں کہ ایک شخص میرے والد کے پاس آیا تو اس سے امام صادقؑ نے دریافت کیا۔ کیا تم نے شادی کی ہے؟۔ اس نے عرض کی نہیں۔

فرمایا کہ میں تو اس بات پر بھی راضی نہیں ہوں کہ مجھے کل کائنات دے دی جائے اور میری زندگی میں زوجہ شامل نہ ہو۔ یاد رکھو کہ شادی شدہ کی دو رکعت نماز غیر شادی شدہ کے تمام رات قیام اور تمام دن صیام سے بہتر ہے۔

یہ سُننا تھا کہ میرے بابا نے اسے سات دینار دیدئے تاکہ وہ جاکر شادی کر لے۔

• اسلام نے شادی کے حسب ذیل فوائد بیان کئے ہیں:

۱۔ شادی سے نصف دین محفوظ ہو جاتا ہے۔ شائد اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کام تمام کر کے رات گھر میں گذارتا ہے اور اندھیروں میں بھٹکنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

۲۔ شادی دو تہائی دین کو محفوظ بنا دیتی ہے۔ گویا انسانی زندگی کے تین حصّے ہیں ایک حصّہ اللہ کے لئے۔ ایک حصّہ آرام کے لئے اور ایک حصّہ کام کے لئے۔ اب اگر شادی شدہ ہے تو کام اور آرام کے دونوں حصّے محفوظ ہو گئے ورنہ کام کے بعد آرام کے لمحات میں بہکنے

کے امکانات باقی رہ جاتے ہیں۔

۳۔ شادی شدہ کی عبادت کا ثواب بے پناہ ہے۔ اسلام کا قانون اجر و ثواب یہ ہے کہ جس قدر زحمت زیادہ ہوگی عمل میں اجر و ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ شادی شدہ فجر کے ہنگام بستر سے اٹھتا ہے تو فرض جہاد بھی انجام دیتا ہے لہٰذا اس کے عمل کا اجر بہرحال زیادہ ہونا چاہیئے۔

۴۔ کبھی کبھی شادی دنیاوی مسائل کا بھی حل بن جاتی ہے۔ جویبر یمامہ سے اسلام کا ذکر سُن کر مدینہ آیا اور اسلام لے آیا۔ سرکارؐ نے اسے اصحاب صفہ میں شامل کر دیا۔ ایک دن اسے شادی کا پیغام دے کر ایک سرمایہ دار شخص زیاد بن لبید مدنی کے گھر بھیج دیا۔ جویبر نے پیغام پیش کیا۔ زیاد حیرت میں پڑ گیا۔ بیٹی نے سوال کیا کہ کیا واقعاً سرکارؐ نے بھیجا ہے۔ معلوم ہوا کہ یقیناً ایسا ہوا ہے۔ اس نے عقد کی منظوری دے دی۔ زیاد نے خود مہر اور مکان کا انتظام کیا اور عقد ہو گیا۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ جویبر نے شب زفاف سجدۂ شکر شروع کر دیا۔ دو روز کے بعد رسول اکرمؐ کے پاس شکایت پہونچی کہ جویبر زوجہ سے رابطہ نہیں رکھتا ہے۔ آپ نے دریافت کیا۔ اس نے عرض کی کہ زفاف کی رات آج ہے۔ آج تک تو میں رات میں سجدۂ شکر اور دن میں روزہ پر گذارا کر رہا تھا۔

۵۔ شادی شدہ تحصیل رزق کو فریضہ سمجھتا ہے اور اس طرح بیکاری اور بیروزگاری سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ کتنے ایسے افراد ہیں جنھوں نے مجرّد زندگی میں مکان وغیرہ کی فکر نہیں کی لیکن جیسے ہی شادی ہوئی گھر آباد کرنے کی فکر ہو گئی۔

۶۔ شادی شدہ کی رات گھر میں گذرتی ہے اور اس طرح شب کے منکرات سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

۷۔ شادی انسان کے مرتبہ کو ملائکہ سے بلند تر بنا دیتی ہے۔ ملائکہ کی زندگی میں خواہشات نہیں ہیں لہٰذا ان کی عبادات کی بھی وہ اہمیت نہیں ہے۔

استنتاج:

سرکار دو عالمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کے یہاں کثرت ازدواج میں یہی دو امور کار فرما تھے:

۱۔ اس طرح اسلام کا پیغام مختلف قبائل تک پہونچ جائے گا اور ہر قبیلہ کی عورتوں کو اپنے احکام بخوبی معلوم ہو جائیں گے۔ علاوہ اس کے کہ اسلام مختلف قبائل کے شر سے محفوظ ہو جائے گا کہ رشتہ داری بہرحال کسی نہ کسی حد تک مروّت پیدا کرا دیتی ہے۔

۲۔ انسانی کردار کی عظمت کا اظہار ہو جائے گا کہ کمزور انسان ایک زوجہ کے گھر میں رہنے سے بیشمار فرائض سے غافل ہو جاتا ہے اور بلند کردار انسان متعدد ازواج کے رہتے ہوئے بھی فرائض الٰہیہ سے غافل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ سب کے نفقہ کا انتظام بھی کرتا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کا لحاظ بھی رکھتا ہے ــــ اور یہی وجہ ہے کہ ان گھروں میں کثرت ازواج کے باوجود کبھی نان و نفقہ میں کمی۔ فرائض میں کوتاہی یا سلوک میں ناانصافی کی آواز نہیں سنائی دی۔!

رشتۂ اسلام وکفر

• اسلام اس عقیدہ کا نام ہے جہاں بنیادی طور پر توحید پروردگار، رسالت رسول اکرمؐ اور روز قیامت کا اعتراف کیا جائے۔ کفر و شرک اسی کے بالکل برعکس ہے۔
لیکن اس کی مشہور دو قسمیں ہیں۔ وہ قسم جس میں توحید کا انکار کیا جاتا ہے اور وہ قسم جس میں رسالت کا انکار کیا جاتا ہے۔ توحید و رسالت کے اقرار کے بعد قیامت کے منکرین کی کوئی جماعت اور اس نام کا کوئی مذہب نہیں ہے۔

• اسلام کفر کی دونوں قسموں کا مخالف ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ قسم اول کے ساتھ کوئی مشترک نقطہ نہیں ہے اور اختلاف ابتدا ہی سے شروع ہو گیا ہے اور اس کے برخلاف قسم دوم کے ساتھ ایک توحید نقطۂ مشترک ہے۔ اختلاف اس کے بعد رسالت سے شروع ہوا ہے لہذا اس کا حساب پہلی قسم سے یقیناً مختلف ہوگا۔
اہل کتاب کی طہارت کا مسئلہ یہیں سے شروع ہوا ہے کہ ان کا شمار عام مشرکین میں نہیں ہوتا ہے لہٰذا مشرکین کے احکام کا بھی ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

• اسلام کے دائرہ کے اندر دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ عدالتؑ و امامت کا اعتقاد رکھتا ہے اور ایک اس سے انکار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی دونوں کے احکام الگ الگ ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ ان احکام کا زیادہ تر تعلق آخرت سے ہوگا دنیا سے نہیں۔ اس لئے کہ دنیاوی اعتبار سے سب مسلمان ہیں اور اسلام کے مشترکہ احکام میں کوئی تفریق نہیں ہے۔
جس طرح کہ ایمان کے دائرہ میں بھی دو قسمیں ہیں صالح اور فاسق و فاجر۔ ان دونوں

کا حساب بھی الگ الگ ہے لیکن اس کا تمامتر تعلق آخرت سے ہے۔ دنیاوی اعتبار سے یہ تفرقہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب مسئلہ کا تعلق آخرت سے ہو جیسا کہ نماز جماعت میں دیکھا جاتا ہے کہ عادل فاسق کا امام ہو سکتا ہے لیکن فاسق عادل کا امام نہیں ہو سکتا ہے۔ اگرچہ نماز ایک ہی نماز ہے اور جماعت ایک ہی جماعت ہے۔
ـ رشتۂ ازدواج بظاہر ایک جنسی تسکین یا نسلی تولید کا رشتہ ہے اور اس کا عقائد و افکار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جنس کی تسکین ایک عقیدہ سے بھی ہو سکتی ہے اور مختلف عقیدہ سے بھی۔ تولید کا کام متحد عقیدہ میں بھی ہو سکتا ہے اور مختلف عقیدہ میں بھی۔ لیکن جب اسلام نے اصل ازدواج کا قانون بنایا تو اس قانون ہی سے واضح ہو گیا ہے کہ مسئلہ صرف تسکین اور تولید کا نہیں ہے۔ یہ کام زنا اور بدکاری سے بھی ہو سکتا ہے۔ مسئلہ اس سے بالاتر اور بلندتر ہے اور اس کے لئے رشتۂ ازدواج ضروری ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم تر مقصد اور نظام کے اعتبار سے عقائد کے فرق کو بھی نظر میں رکھا جا سکتا ہے اور اس کی بنا پر بھی رشتہ داریوں میں فرق کیا جا سکتا ہے۔

• چنانچہ اسلام نے اس مسئلہ میں بھی تمام قسموں کو الگ کر دیا۔ جو بالکل کافر و مشرک تھے اور جن کے ساتھ کوئی نقطۂ اتحاد نہیں تھا۔ ان سے رشتہ کو یکسر حرام کر دیا اور صاف اعلان کر دیا کہ نہ مسلمان کا عقد مشرکہ سے ہو سکتا ہے اور نہ مشرک کا عقد مسلمہ کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ دونوں کی دنیا الگ ہے اور اسلام ان کے ساتھ اس قسم کی معاشرت پسند نہیں کرتا ہے نہ بشکل حاکم اور نہ بشکل محکوم۔

• لیکن اس کے برخلاف اہل کتاب کا قانون الگ کر دیا کہ ان سے عقد منقطع (متعہ) ہو سکتا ہے اور نکاح احتیاط شدید کے خلاف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ توحید جیسا نقطۂ مشترک موجود ہے لہذا عقد جائز ہے اور رسالت میں اختلاف ہے لہٰذا اس کا اظہار عقد دائم کے خلاف احتیاط ہونے کی شکل میں ہونا چاہیئے۔

• اب سوال یہ ہے کہ عقد منقطع ہی کیوں جائز ہوا۔ اسے کیوں حرام نہیں کیا گیا؟۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبوت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ سرکار دو عالمؐ کے علاوہ تمام نبوتیں موقت ہیں

اور ان کی مدت تمام ہونے والی ہے لیکن سرکار دو عالمؐ کی نبوت دائمی ہے اور اسے قیامت تک رہنا ہے۔ اہل کتاب نے موقت رسالت کا اقرار کیا ہے لہٰذا ان کے ساتھ موقت رشتہ ہو سکتا ہے۔ دائمی رسالت کا اقرار نہیں کیا ہے لہٰذا دائمی رشتہ کا امکان نہیں ہے۔

• موقت رشتہ میں بھی اس عقائدی نقطہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے کہ اسلام کفر کا حاکم ہو سکتا ہے محکوم نہیں ہو سکتا ہے لہٰذا مسلمان اہل کتاب عورت سے متعہ کر سکتا ہے۔ اہل کتاب مرد مسلمان عورت سے متعہ بھی نہیں کر سکتا ہے۔

• مسلمان عورت سے عقد بہر حال جائز ہے لیکن مسلمان مرد اگر مومنہ عورت سے عقد کرنا چاہے تو وہاں بھی عقائدی نقطہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے اور یہ ضرور دیکھا جائے گا کہ اگر عقیدہ خطرہ میں نہیں ہے تو عقد ہو سکتا ہے ورنہ یہ عقد بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ اسلام نسل و جنس سے پہلے عقیدہ کا تحفظ چاہتا ہے۔ عقیدہ کے بعد نسل اور جنس کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

• یہی وجہ ہے کہ فاسق و فاجر۔ تارک الصلوٰۃ اور شرابی سے بھی مومنہ عورت کا عقد خلاف احتیاط ہے کہ صحیح عقیدہ کے باوجود اگر کردار صحیح نہیں ہے تو بد کرداری عورت پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور اس طرح اسلام کا دوسرا مرکزی نقطہ مجروح ہو سکتا ہے اور اسلام نہ عقیدہ کی بربادی برداشت کر سکتا ہے اور نہ کردار کی۔!

اسلامی تعزیرات

ہزاروں طرح کے جذبات۔ احساسات، خواہشات اور رجحانات رکھنے والے انسانوں کے درمیان کوئی قانون اس وقت تک رائج نہیں ہو سکتا جب تک اس میں تعزیراتی نظام نہ ہو اور قانون شکنی پر سزا نہ دی جائے۔ کوئی انسان اس قدر شریف نہیں ہے کہ صرف قانون کی عظمت یا اس کا احترام اسے قانون کی پیروی پر آمادہ کر سکے۔ انسان فطری طور پر لالچی ہے تو اسے قانون کے اتباع پر انعام درکار ہے اور اس کی فطرت میں نفس پرستی اور بغاوت کے جذبات پائے جاتے ہیں تو اسے قانون کی خلاف ورزی پر سزا ملنی چاہیئے اس کے بغیر انسان قانون پر مکمل طور سے عملدرآمد نہیں کر سکتا۔

اسلام نے اپنے تعزیراتی نظام کو تین حصوں پر تقسیم کر دیا ہے:

ایک حصّہ ان جرائم کا ہے جن کی سزا معین کر دی گئی ہے اور اس کی حد بندی ہو گئی ہے اور اسی بنا پر اسے حدود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسرا حصہ ان جرائم کا ہے جن کی سزا معین نہیں ہے لیکن سزا لازم ہے اور اس کا اختیار حاکم شرع کو دے دیا گیا ہے کہ وہ حالات اور کیفیات کا جائزہ لے کر سزا معین کرے۔

تیسرا حصہ ان جرائم کا ہے جن کی سزا کا اختیار صاحب معاملہ یعنی مظلوم کو دیدیا گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے ظالم کے ساتھ معاملہ کرے اور ظالم کو اس مطالبہ کو بہر حال قبول کرنا پڑے گا۔

حدودی جرائم

اسلام میں جن جرائم کی سزا طے کر دی گئی ہے۔ ان کی آٹھ قسمیں ہیں اور ہر ایک کی

الگ الگ سزا معین ہے۔ مثال کے طور پر:

- قتل۔ یہ سزا نسبی رشتہ دار ماں۔ بہن۔ بیٹی سے زنا۔ مرد کے ساتھ بدفعلی۔ نبی اور امام کو بُرا بھلا کہنے۔ نبوت کا ادّعا کرنے۔ سحر و جادو گری کے کاروبار کرنے اور اسلام کے محرمات کو حلال بنا لینے کی ہے۔ (صرف اغلام بازی کے قتل میں یہ اختیار ہے کہ تلوار سے گردن اُڑا دی جائے یا بلندی سے اٹھا کر پھینک دیا جائے یا آگ میں ڈال دیا جائے یا زیر دیوار بٹھا کر دیوار اوپر سے گرا دی جائے کہ اس سے کم اس بدترین عمل کی سزا نہیں ہے)۔
- سنگسار۔ یہ سزا شوہر دار عورت اور شادی شدہ مرد کے زنا کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مرد کو کمر تک زمین میں دفن کر کے سنگسار کیا جائے گا اور عورت کو سینہ تک دفن کر کے تاکہ اسلامی حجاب کی رعایت باقی رہے۔ سنگسار کرنے سے پہلے ان مجرمین کو غسل میت کا حکم دیا جائے گا۔ اس کے بعد زندگی کا خاتمہ کیا جائے گا۔
- سّو کوڑے۔ یہ سزا عام حالات میں زنا کرنے والوں کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مرد پر قیام کی حالت میں ستر عورتین کے ساتھ حد جاری ہوگی اور عورت پر بٹھا کر سارے بدن کے ستر کے ساتھ حد جاری ہوگی۔
- کوڑے اور سنگسار دونوں۔ یہ سزا اس سن رسیدہ مرد و عورت کے لئے ہے جو شادی شدہ ہو اور معمر بھی ہو لیکن اس کے بعد بھی زنا کا ارتکاب کرے۔
- کوڑے اور شہر بدری۔ یہ سزا اس شخص کی ہے جو کمسن باکرہ لڑکی سے زنا کرے۔
- ۸۰ کوڑے۔ یہ سزا زنا کی تہمت لگانے والوں اور شراب پینے والوں کے لئے ہے۔
- ۷۵ کوڑے اور شہر بدری۔ یہ سزا عورت مرد کے درمیان دلالی کرنے والوں کے لئے ہے۔
- ہاتھ کاٹنا۔ یہ سزا چوری کرنے والوں کے لئے ہے (ان میں بھی پہلی مرتبہ چوری کرنے والوں کا داہنے ہاتھ کی چاروں انگلیاں کاٹی جائیں گی اور دوسری مرتبہ پیر کی ایڑی کاٹی جائے گی اور اس کے بعد پھر چوری کرنے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندان میں بند کر دیا جائے گا۔

تعزیراتی جرائم

تعزیر اس سزا کا نام ہے جس کی حد معین نہیں ہے اور اس کا اختیار حاکم شرع کے ہاتھ میں ہے۔ اس فہرست میں جملہ جرائم شامل ہو جاتے ہیں جن سے سماج میں اخلاقی فساد کے پھیل جانے کا خطرہ ہو۔ یا ان کی حیثیت حدودی جرائم سے قدرے ہلکی ہو اور حدود کی حد میں نہ آتی ہو۔

اختیاری سزائیں

اس باب میں قتل نفس وغیرہ آتا ہے جہاں وارث کو اختیار ہے کہ قاتل سے قصاص لے اور حاکم شرع سے اس کے قتل کا مطالبہ کرے یا پھر دیت اور معاوضہ لے کر قصاص سے آزاد کر دے۔ لیکن اس کے علاوہ قتل میں کفارہ بھی ادا کرنا ہے۔ اور وہ کفارہ قصداً قتل کرنے میں غلام آزاد کرنا۔ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اور ساٹھ مسلسل روزے رکھنا تینوں عمل ہیں۔ اور دھوکہ کے قتل میں تینوں میں سے کوئی ایک کام ہے۔

واضح رہے کہ اگر بچہ کا قبل ولادت اسقاط کرا دیا گیا ہے تو روح داخل ہونے یعنی چار ماہ مکمل ہو جانے کے بعد کفارہ اور دیت دونوں ادا کرنا ہے اور اس سے پہلے اسقاط میں صرف دیت ہے کفارہ نہیں ہے۔ دیت کی مقدار نطفہ کی منزل میں تقریباً ۶۸ گرام سونا ہے اور علقہ کی منزل میں ۱۳۵ گرام۔ گوشت کا لوتھڑا بن جانے کے بعد تقریباً ۲۰۳ گرام اور ہڈیاں بن جانے کے بعد تقریباً ۲۷۰ گرام ہے۔ روح داخل ہو جانے کے بعد دیت کی مقدار تقریباً ۳۴۰ گرام ہے۔

دیت کے حقدار ورثہ ہیں لیکن چونکہ اسلام میں قاتل وارث نہیں ہوتا ہے لہذا اگر اسقاط ماں نے کرایا ہے تو باپ وارث ہوگا اور اگر باپ نے کرایا ہے تو ماں وارث ہوگی اور اگر دونوں نے کرایا ہے تو دیگر ورثہ وارث ہوں گے اور انہیں مذکورہ مقدار میں سونا یا اس کی قیمت ادا کی جائے گی۔

اسلامی امتیاز

اسلامی قانون کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسکی سزاؤں میں کسی طرح کا امتیاز اور استثناء

نہیں ہے جب کہ دنیاوی قوانین میں کہیں شخصیات کو آزاد کر دیا جاتا ہے اور کہیں دوسرے ممالک اور سفراء مملکت کو۔ اور اس کا جواز یہ قرار دیا جاتا ہے کہ اس طرح دوسرے ملکوں کے مہمانوں کا احترام کیا جاتا ہے یا شخصیات کا اثر قوم پر باقی رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح اقتدار پر قبضہ کر کے فساد پھیلایا جائے اور سفارت کے نام پر جاسوسی کی جائے کہ یہ کام سوائے بڑی طاقتوں کے اور کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ کمزور حکومتوں کو تو صرف بہلایا جاتا ہے کہ ہمارے قانون میں سفارت خانوں اور مہمانوں کا احترام بھی شامل ہے۔ اسلام نے اس تمام مکاری کا قلع قمع کر دیا اور اس کا فلسفہ صرف یہ ہے کہ قانون سے بالاتر کوئی شخص نہیں ہے۔ پیغمبرؐ شرک کرے گا تو اس کے اعمال بھی برباد کر دئے جائیں گے اور پیغمبرؐ کا قریب ترین رشتہ دار بھی چوری کرے گا تو اس کے ہاتھ بھی کاٹ دئے جائیں گے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

چند مجرّب عملیات

۱۔ بعض بزرگان دین کا بیان ہے کہ اگر چھ برس سے کم عمر کے بچہ کی ہتھیلی پر اصحاب کہف کے نام لکھ کر وقت ولادت عورت کے سامنے وہ ہتھیلی کر دی جائے اور اسے وہ نام دکھلائے جائیں تو ولادت کی مشکل فوراً آسان ہو جائے گی۔

شاید یہ برکت اصحاب کہف کے راہ خدا میں ایثار کی بنا پر پیدا ہو گئی ہو اور اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ جس طرح پروردگار نے انھیں طویل نیند کے بعد بیدار کر دیا۔ اسی طرح بچہ کو بھی شکم مادر کے تاریک مرحلہ سے گذر کر روشن دنیا میں قدم رکھنے کا موقع ملے گا اور ایک نئی بیداری حاصل ہوگی۔

اصحاب کہف کے نام یہ ہیں، ہلیخا۔ مکسلینا۔ کشفوطط۔ آذرفطیوفس۔ یُونُس۔ یوافس تینس۔ تینونُس۔ اور آخر میں قطمیر لکھے جو اُن کے محافظ کا نام ہے۔

۲۔ اپنے ہاتھ پر یہ عملیات لکھ کر پہلے سات مرتبہ سانپ کے کاٹے ہوئے پر دم کرے۔ اس کے بعد ہاتھ دھو دے۔ انشاء اللہ زہر کا اثر ختم ہو جائے گا۔

آھناً بنیاً حیاً نیاً شفیعاً

۳۔ حفظ جان و مال اور بچھو کے کاٹنے کے اثر کو زائل کرنے کے لئے یہ نقش اپنے ہمراہ رکھے

☆ ۱۱۱م ‡ ۱۱۱ ھ ی

ب س م اللہ

☆

۴۔ کسی بھی عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دو رکعت نماز حاجت پڑھے۔ اس کے بعد بارہ مرتبہ صلوات پڑھ کر ۵۷۹ مرتبہ کٓھیٰعٓصٓ حٰمٓعٓسٓقٓ پڑھے اور پھر بارہ مرتبہ صلوات پڑھ کر سجدہ میں جا کر دعا کرے۔ انشاء اللہ مقصد حاصل ہوگا۔

حصۂ چہارم

تاریخ و سیرت

سیرت نگاری

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس قدر مسلمان اہل قلم نے سرکار دو عالم کی حیات طیبہ کے بارے میں لکھا ہے — اور اس کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔ کسی قوم نے اپنے لیڈر اور رہنما کے بارے میں نہیں کیا ہے۔ خود اردو زبان میں سرکار کی سیرت طیبہ پر اتنا کام ہوا ہے جو شاید اصل عربی زبان میں نہیں ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عربی زبان اصل ہے اور اردو کا بیشتر ماخذ بھی عربی ہی ہے — لیکن عربی کا یہ ذخیرہ مختلف کتابوں میں منتشر تھا اور اردو نے اسے سیرت کے عنوان سے اکٹھا کر دیا اور پھر اس میں ندرت تحریر کا بھی مظاہرہ کیا۔

قرآن مجید کی بے نقط تفسیر کا کام بھی برصغیر میں ہوا ہے اور سرکار دو عالم کی بے نقط سیرت نگاری کا کام بھی اسی علاقہ میں ہوا ہے — لیکن افسوس یہ ہے کہ اس قدر دیدہ ریزی کے بعد بھی بعض پہلو یکسر تشنہ رہ گئے ہیں اور بعض کو بقدر استحقاق اہمیت نہیں ملی ہے۔

بعض ارباب سیرت نے کام حضرت آدمؑ سے شروع کیا ہے اور اس طرح سرکار دو عالم کے تمام بشری حالات کو جمع کر دیا ہے لیکن انھوں نے بھی عالمِ انوار کا تذکرہ یکسر نظر انداز کر دیا ہے یا بطور تبرک کیا ہے اور اس سلسلہ میں وہ حضرات معذور بھی ہیں کہ نہ وہ خود عالمِ انوار کی مخلوق ہیں اور نہ ان کے مدارک اور راویوں میں کسی کا تعلق عالمِ انوار سے تھا۔ ان حضرات نے قدرے انصاف سے کام لیا ہوتا تو اپنے مآخذ میں ان حضرات کو بھی شامل کر لیا ہوتا جو شریک نور پیغمبرؐ تھے اور جنھیں عالمِ انوار کے حالات معلوم تھے اور انھوں نے وقتاً فوقتاً بیان بھی فرمائے ہیں۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ بعض حضرات نے سیرت سے زیادہ صورت پر زور دیا ہے

اور زُلف و رُخسار سے لے کر سُرمہ اور کنگھی تک کے تمام مسائل کو درج کر دیا ہے لیکن سیرت
کے بعض عظیم پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور شاید اس کی مصلحت ان کے سیاسی
حالات یا پیدائشی نظریات رہے ہوں جو ان حقائق کے اظہار کی اجازت نہ دیے رہے ہوں
ورنہ مورخ کو رات کے اندھیرے میں گُم ہونے والی سوئی نظر آجائے اور غدیر کی دوپہر میں
رسول اکرمؐ کے ہاتھوں پر علیؑ نظر نہ آئیں۔ یہ بات اس وقت تک معقول نہیں ہے جب تک
مورخ کو کسی ایسے گھرانے کا نہ تسلیم کر لیا جائے جسے رات میں نظر آتا ہے اور وہ غار کے اندر
تک کی خبر لے آتا ہے اور دن میں اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ کھُلے میدان کا منظر بھی نظر نہیں آتا ہے۔

ارکانِ سیرت

سیرت نگاری کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کے تین طرح کے حالات پر توجہ
دی جائے :

۱۔ اس کا رابطہ اپنے پروردگار سے کیسا ہے۔؟
۲۔ اس کے گھر کے اندر اور باہر کی زندگی میں فرق کیا ہے۔؟
۳۔ اس کا برتاؤ دوست اور دشمن کے ساتھ کیسا ہے۔؟

— سرکار دو عالمؐ کی زندگی کا کمال یہی ہے کہ پروردگار کی عبادت پر اس قدر زور دیا کہ
ساری دنیا کو بستر سے اٹھا کر منزل عبادت میں لانے والے پروردگار نے اسے بستر
پر آرام کرنے کا حکم دے دیا اور ارشاد فرمادیا کہ نزول قرآن کا مقصد اپنے کو مشقت
میں ڈالنا نہیں ہے۔ راتوں کو قیام کرو لیکن ذرا آرام بھی کرو۔

— خانگی زندگی کی صورت حال یہ تھی کہ سب سے پہلے ایمان کا اعلان کرنے والی زوجہ کی
تھی جب کہ عام طور سے کمال کا اقرار ہر شخص کر لیتا ہے، زوجہ نہیں کر پاتی ہے۔ اس لئے
کہ اسے تمام جلوت و خلوت کے حالات کا علم ہوتا ہے اور اس کا مسئلہ روٹی روزی کا اور
آسائش و آرائش کا بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ خود مرسل اعظمؐ کے گھر میں دیگر ازواج کی طرف
سے مطالبہ زینت حیات دنیا سے ظاہر ہوتا ہے لیکن حضورؐ کا صریحی انکار اور زینت دنیا

کے بعد طلاق کا اعلان اس امر کی دلیل ہے کہ اس انسان کی سیرت پر زوجہ کی خواہش
اثر انداز نہیں ہوسکتی ہے۔

— دشمنوں کے ساتھ برتاؤ کا یہ عالم تھا کہ کوڑا پھینکنے والی عورت کی عیادت فرماتے تھے
اور قتل کے لئے تلوار اٹھانے والا بھی یہ احساس رکھتا تھا کہ ان کے ہاتھ میں تلوار
آگئی تو ان کی مہربانی کے حوالہ کے علاوہ کوئی شئے زندگی کا تحفظ نہیں کر سکتی ہے۔

— سرکار دو عالمؐ کا یہ اعلان کہ جتنی مجھے اذیت دی گئی ہے کسی نبی کو نہیں دی گئی ہے۔
اور پھر آپ کا جناب نوحؑ کی طرح بددعا نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اس سیرت کی
بلندی کو انبیاء کرام نہیں پاسکتے ہیں۔ عام انسان کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو مورخ کا نقص
ہے کہ اس نے آپ کو بشر محض بنا کر مدعیان نبوت کے لئے راستہ کھول دیا اور مسیلمہ کذاب
سے لے کر غلام احمد تک سب اسی راستہ پر چل پڑے۔

— سرکار کی سیرت کا یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آپ کی ولادت کے قریب جناب آمنہ
کے کانوں میں ایک آواز آئی کہ اس کا نام "محمدؐ" رکھو۔ یہ آسمان میں احمدؐ ہے اور
زمین میں محمدؐ۔ اس کے بعد ایک تعویذ کی تعلیم کی گئی جو حرز رسولؐ کے نام سے موجود
ہے اور کتاب مُہج الدعوات سید ابن طاؤس کا پہلا تعویذ ہے۔

دورِ جاہلیت

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جاہلیت کا دور عام طور سے جہالت کا دور تھا اور اس میں تعلیم و تربیت کا یکسر فقدان تھا۔ بعثت سرکار دو عالمؐ کے موقع پر تمام مکہ و مدینہ میں صرف ۲۶۔۲۷ پڑھے لکھے افراد کا تاریخی وجود اس امر کا بہترین ثبوت ہے کہ وہ زمانہ تعلیمی حیثیت سے انتہائی درجہ کا پسماندہ تھا اور شائد اس کی کوئی مثال آج کے کسی معاشرہ میں نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دور کو دورِ جہالت کیوں نہیں کہا جاتا ہے دورِ جاہلیت کیوں کہا جاتا ہے؟ کیا اس دور کی جہالت میں بھی کوئی خاص امتیاز تھا جس کی بنا پر اس کو جاہلیت کا نام دیا جاتا ہے اور اس دور کے اچھے اعمال کا اتباع بھی اچھا نہیں تصوّر کیا جاتا ہے، نہ اس دور کی حیا و غیرت کو حیا و غیرت سمجھا جاتا ہے اور نہ اس دور کی زینت و آرائش کو زینت و آرائش تصوّر کیا جاتا ہے۔؟

حقیقت امر یہی ہے کہ وہ دور مختلف اعتبارات سے جہالت کی آخری حدود پر تھا جس کو جاہلیت کے علاوہ کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

۔ وہ دور اقدار و افکار سے اس قدر محروم تھا کہ درختوں۔ پتھروں۔ ستاروں اور دریاؤں کے ساتھ حلوہ کے ان ٹکڑوں کو بھی خدا تصور کر لیا جاتا تھا جنھیں شام کو ہضم کر لیا جاتا تھا اور انسان کا شکم اس کے خداؤں کا مقبرہ بن جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ طریقۂ کار صرف ایک عمل نہیں تھا بلکہ ایک ذہنیت اور ایک فطرت کی حیثیت رکھتا تھا جس کا اسلام لانے کے بعد بھی باقی رہ جانا ناگزیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جن جاہلیت زدہ افراد نے کلمہ پڑھ لیا تھا، ان میں یہ ذہنیت اسلام کے بعد بھی باقی رہ گئی اور وہ جاہلی خداؤں

کی طرح توحید۔ رسالت۔ کلمہ۔ قرآن۔ اصول و فروع سب کو ہضم کر گئے اور ان کی زندگی پر کسی طرح کا کوئی اثر نمایاں نہ ہو سکا۔

۔ اس دور میں انسانی اقدار اسقدر تبدیل ہو گئی تھیں کہ خونریزی کا نام شجاعت۔ آبروریزی کا نام جرأت، بیٹیوں کو زندہ درگور کر دینے کا نام حیا و غیرت اور راہزنی و قزاقی کا نام علاقہ کی حفاظت پڑ گیا تھا اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ جس دور میں بھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ اسلام کی نگاہ میں دورِ جاہلیت ہے۔ چاہے ظاہری اعتبار سے جہالت کے بجائے علم و تمدن کا گہوارہ کہا جاتا ہو۔

۔ اس دور کی کاہلی اور بیخبری کا یہ عالم تھا کہ جس مقام پر تالاب میں پانی دیکھ لیا کرتے تھے وہیں خیمے نصب کر دیتے تھے اور جب پانی ختم ہو جاتا تھا تو خانہ بدوشوں کی طرح دوسرے صحراؤں کی طرف کوچ کر جاتے تھے اور کسی ایک شخص کو بھی یہ شعور نہیں تھا کہ جس جگہ بالائے زمین پانی ختم ہو گیا ہے وہاں زیرِ زمین کھود کر دیکھا جائے شاید پانی اندر محفوظ ہو گیا ہو اور عالم شہود کے علاوہ ایک عالم غیب بھی ہو جو اپنے برکات سے قوموں کو زندہ رکھ سکے۔ لیکن عقائد کی دنیا میں وحدہ لاشریک کے انکار کی عادی ہر میدانِ حیات میں اسی نظریہ کی خوگر ہو گئی تھی کہ ہر ظاہر پر ایمان لایا جائے اور ہر غائب کا انکار کر دیا جائے اور اسی امر نے اس دور کو دورِ جاہلیت کا نام دے دیا تھا اور جاہلیت کی اساس اور بنیاد اس کا انکارِ غیب تھا جو کسی دور کو بھی دورِ جاہلیت بنا سکتا ہے۔

اس دور کا فکری انحطاط اس منزل پر تھا کہ افضل و غیر افضل کا فرق بالکل مفقود ہو گیا تھا اور اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو طاق پر رکھ کر اس کے قدموں میں کھڑے ہو کر ان کی عظمت و جلالت کا اقرار کیا کرتے تھے جب کہ وہ خود زبان حال سے آواز دے رہے تھے کہ "مجھے زبردستی خدا بنا دیا گیا ہے۔ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ تم میں اشرف المخلوقات لوگ پائے جاتے ہیں۔ بھلا میں ان کے ہوتے ہوئے کس طرح حکمراں ہو سکتا ہوں۔ خیر اس کا خیال رکھنا کہ اگر میں اپنی حدوں سے تجاوز کروں اور کوئی حماقت کر بیٹھوں تو مجھے سیدھا کر دینا۔"

یا بسا اوقات اپنی دنیا میں رہنے والے افراد کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ "ہماری خدائی انھیں کے رحم و کرم پر چل رہی ہے ورنہ یہ نہ ہوتے تو ہم ہلاک ہو جاتے اور ہمارا کوئی وجود باقی نہ رہ جاتا۔"

ظاہر ہے کہ ایسے حالات کو جاہلیت کے علاوہ کس لفظ سے یاد کیا جا سکتا ہے اور ایسے

دور کو دور جاہلیت کے علاوہ کونسا نام دیا جا سکتا ہے۔

۔اس دور میں اقدار و افکار کی جگہ پر مصالح و منافع کی حکمرانی قائم ہو گئی تھی اور حالات و مصالح کو دیکھ کر پتھروں کو بھی خدا تسلیم کر لیا جاتا تھا اور کوئی یہ سوچنے والا نہیں تھا کہ ان پتھروں کا خدائی سے کیا تعلق ہے اور یہ کس رُخ سے خدائی کرنے کے قابل ہیں۔

۔اس دور کی سفاہت و حماقت کا یہ عالم تھا کہ پتھروں کو خدا ماننے کے لئے تیار تھے لیکن پیغمبر اسلامؐ جیسے عظیم المرتبت انسان کو رسول خدا اور بندۂ خدا ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس لئے کہ انھیں خیال تھا کہ پتھر صامت خدا ہیں۔ ان کی مرضی کی ترجمانی کا اختیار ہمیں ہوگا اور جس طرح چاہیں گے تاویل و تفسیر کر کے قوم کو بیوقوف بنائیں گے۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ ایک ناطق انسان ہیں اور یہ اپنے افکار کی ترجمانی خود کریں گے اور ہمیں من مانی کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ گویا جہالت کا ایک عنصر یہ بھی ہے کہ صامت کی ہر عظمت کا اقرار کر لیا جائے لیکن ناطق کی کسی حیثیت کا اقرار نہ کیا جائے کہ صامت سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے اور ناطق سے بہر حال خطرہ رہتا ہے۔

۔اس دور میں عورت اسقدر اہمیت رکھتی تھی کہ تمام ادبیات کا دار و مدار اسی کی طرح ذِکر پر تھا اور معلقات سبعہ اسی کی توصیف و تعریف کے گرد گردش کر رہے تھے اور اس کے بعد اسقدر بے قدر و قیمت بھی تھی کہ اسے پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اور اس کے وجود کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ اور اس تضاد کا راز یہ تھا کہ ذہنوں پر مادیت اور جنسی خواہشات کا غلبہ تھا۔ عورت جنس کی راہ میں کام آسکے تو قابل تعریف و توصیف ہے ورنہ زندہ دفن کر دینے کے قابل ہے دوسرے الفاظ میں عورت زوجہ کے روپ میں آئے تو اس کی ہر تعریف و توصیف گوارا ہے اور قابل تعریف و توصیف نہ بھی ہو تو اس کی شان میں روایات وضع کی جا سکتی ہیں۔ لیکن بیٹی کی شکل میں آجائے تو اسے زندہ دفن بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس سے کسی مادی تصور کو وابستہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اسلام اپنے عصر اول میں اس جاہلیت کا شکار بھی رہ چکا ہے جس کے نتیجہ میں سرکار دو عالمؐ کا فرض تھا کہ ازواج سے قطع تعلق بھی کر لیں تو بیٹی کی تعظیم کے لئے ضرور اٹھیں۔!

ارسال

قرآن مجید نے مالک کائنات کی طرف سے ارسال ہونے والی مختلف چیزوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بعض چیزیں بطور رحمت ارسال کی گئی ہیں۔

۔ وھوالذی ارسل الریاح بُشرًا بین یدی رحمتہ۔ (فرقان ۴۸)

۔فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرًا سویًّا۔ (مریم ۱۷)

۔یرسل السماء علیکم مدرارًا۔ (نوح ۱۱)

بعض چیزیں بطور عذاب و عتاب نازل کی گئی ہیں۔

۔فارسلنا علیھم الطوفان والجراد والقمل والضفادع۔ (اعراف ۱۳۳)

۔فارسلنا علیھم سیل العرم۔ (سبا ۱۲)

۔فارسلنا علیھم ریحًا صرصرًا فی ایام نحسات۔ (فصلت ۱۲)

۔انا ارسلنا علیھم صیحۃ واحدۃ فکانوا کھشیم المحتظر (قمر ۳۱)

۔یرسل علیکما شواظ من نار و نحاس فلا تنتصران۔ (رحمٰن ۳۵)

۔وارسل علیھم طیرا ابابیل۔ (فیل ۳)

ان دونوں مقامات کا ادبی فرق یہ ہے کہ ارسال کی تین قسمیں ہیں ــــ کبھی یہ ارسال رحمت و بشارت کے عنوان سے ہوتا ہے تو اس کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔ اور کبھی اس کا عنوان مطلق ہوتا ہے جہاں صرف ارسال کا اعلان ہوتا ہے جس کے بعد انسان اسے رحمت و بشارت بھی بنا سکتا ہے اور اپنی نالائقی سے اپنے لئے عذاب بھی بنا سکتا ہے تیسری قسم وہ ہے جہاں ارسال بطور عذاب و عتاب ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا

آیات میں طوفان، سیلاب، بادصرصر، صیحہ آسمانی، آتش غضب، اور ابابیل کے ارسال کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ان سب کا ارسال بطور عذاب تھا اور اس کا اظہار لفظ علیٰ کے ذریعہ کیا گیا ہے۔

لیکن تمام اقسام میں جو بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے ـــ وہ یہ ہے کہ جسے جس مقصد یا قوم یا علاقہ کے لیے ارسال کیا گیا ہے۔ اس نے اس مقصد کو پورا کر دیا اور اپنے حدود سے بال برابر تجاوز نہیں کیا۔

ابرہہ کا قصہ اس امر کی بہترین دلیل ہے کہ پروردگار نے اس کے لشکر فیل کے مقابلہ میں ملک الموت کو نہیں بھیجا کہ وہ سب کا خاتمہ کر دیں اور خانۂ خدا محفوظ ہو جائے بلکہ لشکر ابابیل کو ارسال کیا جو بے عقل جانوروں کا مجموعہ ہے اور جس کے بارے میں ہر طرح کی غلطی کا امکان پایا جاتا ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ پرندے ابرہہ کے لشکر کو مارنے کے بجائے کنکریاں جناب عبدالمطلب یا خود خانۂ کعبہ پر گرا دیں اور جس کے تحفظ کا انتظام کیا گیا ہے وہی تباہ و برباد ہو جائے ـ لیکن پروردگار نے ملک معصوم کے بجائے بے شعور پرندوں کا انتخاب کیا تا کہ ارسال الٰہی کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ ہو جائے کہ پروردگار جسے بھیجتا ہے وہ بے شعور جانور بھی ہوتا ہے تو اس کے یہاں خطا کا امکان نہیں ہوتا ہے۔

اس کے بعد پروردگار نے اسی واقعہ اور اسی ارسال کو مستقبل کے لئے تمہید بنا دیا اور اس واقعہ کے چند دنوں کے بعد اپنے حبیبؐ کو دنیا میں بھیج دیا اور پھر مختلف لہجوں میں اعلان بھی کر دیا "وما ارسلناك الّا رحمة للعالمين" ـ "هو الذى ارسل رسوله بالهدىٰ ودين الحق" ـ "انّا ارسلنا اليكم رسولاً شاهداً عليكم" ـ "انا ارسلناك شاهداً ومبشراً ونذيراً" ـ تا کہ اہل دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ اس کے کردار میں کسی خطا کا کوئی امکان نہیں ہے ـ یہ پروردگار کا فرستادہ ہے اور اس کا فرستادہ بے شعور بھی ہو تو خطا نہیں کرتا ہے چہ جائیکہ عقل کل اور نور مجسم ـ!

اشتراک مصطفیؐ و مرتضیٰؑ

صاحب زین الفتیٰ علامہ زین السنة ابو محمد احمد بن محمد بن علی العاصمی تحریر فرماتے ہیں کہ پروردگار عالم نے حضرت علی مرتضیٰؑ کو حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ساتھ ۲۳ صفات میں شریک قرار دیا ہے۔ (روائع القرآن مفتی سید محمد عباسؒ ص ۳۰۷)

۱۔ خلق وطینت ـــ انا وعلى من نور واحد۔
۲۔ اخوت و قرابت ـــ انت اخى فى الدنيا والآخرة۔
۳۔ مدت حیات ـــ ۶۳ سال۔
۴۔ استسقاء ـــ دونوں کی برکت سے بارش ہوئی۔
۵۔ عبودیت ـــ سبحٰن الذى اسرىٰ بعبده ـ انا عبدالله وانه رسوله۔
۶۔ عفو و مغفرت ـــ دونوں کو صاحب عفو و مغفرت قرار دیا۔
۷۔ اذن واعیہ ـــ دونوں کو گوش شنوا عطا کیا۔
۸۔ عصمت و تطہیر ـــ دونوں کو مرکز تطہیر قرار دیا۔
۹۔ اطاعت ـــ دونوں کی اطاعت واجب قرار دی۔
۱۰۔ اذیت و محنت ـــ دونوں مصائب برداشت کرتے رہے۔
۱۱۔ مودت و محبت ـــ دونوں کی محبت کو فرض قرار دیا گیا۔
۱۲۔ بغض و عداوت ـــ دونوں سے عداوت کی گئی۔
۱۳۔ مفارقت ـــ يا على من فارقك فقد فارقنى۔
۱۴۔ سب و شتم ـــ من سبّ عليّاً فقد سبّنى۔

۱۵۔ سیادت و رفعت ــــ وہ سید الانبیاء یہ سید الاولیاء۔

۱۶۔ اولویت ــــ دونوں اولیٰ بالمومنین۔

۱۷۔ مولائیت و ولایت ــــ دونوں ولی دونوں مولا، من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ۔

۱۸۔ لواء و وراثت ــــ دونوں کو دنیا و آخرت میں صاحب لواء و وراثت بنایا گیا۔

۱۹۔ سبقت الی الایمان والعمل۔ دونوں نے سب سے پہلے ایمان و عمل کا راستہ دکھایا۔

۲۰۔ صاحب و صحبت ــــ دونوں ہمیشہ ابتدا سے انتہا تک ساتھ رہے۔

۲۱۔ تشبیہ بالشجرہ ــــ دونوں ایک ہی شجرہ سے تھے۔

۲۲۔ تسمیہ سماوی ــــ دونوں کا نام آسمان سے نازل ہوا۔

۲۳۔ عدم اسلام والدین ــــ افسوس کہ موصوف نے ساری فہرست کو ملوث کر دیا اور ساری محنت کو روز قیامت ضائع کر دیا ورنہ نہ حضرت عبداللہ کافر تھے اور نہ حضرت ابوطالب۔ اور نہ اس مسئلہ کا فضائل و کمالات سے کوئی تعلق ہے۔ اس کا تذکرہ تو نقائص اور کمزوریوں کے درمیان ہونا چاہیئے تھا۔

اضافہ مشترکات از سرکار مفتی محمد عباس رح

۲۴۔ سلام ــــ دونوں پر پروردگار کا سلام ہے۔

۲۵۔ صلوات ــــ دونوں پر پروردگار کی طرف سے صلوات ہے۔

۲۶۔ طہارت ــــ دونوں کو پاک بنایا گیا ہے۔

۲۷۔ تحریم صدقہ ــــ دونوں پر صدقہ حرام ہے۔

۲۸۔ وجوب محبت ــــ دونوں کی محبت واجب ہے۔

۲۹۔ امان امت ــــ دونوں امت کے لئے باعث امان از عذاب ہیں۔

۳۰۔ داخلہ مسجد ــــ دونوں کا ہر وقت مسجد میں داخلہ مباح ہے۔

۳۱۔ انفتاح باب مسجد ــــ دونوں کے دروازے مسجد میں ہمیشہ کھلے رہے۔

۳۲۔ حکومت شمس و قمر ــــ دونوں کو مالک نے شمس و قمر کا اختیار دیا تھا۔

۳۳۔ قتال علی التاویل و التنزیل۔ دونوں شریک جہاد در راہ خدا تھے۔

۳۴۔ اشتقاق اسم ــــ دونوں کے نام نام خدا سے مشتق ہیں۔

۳۵۔ مباہلہ ــــ دونوں مباہلہ میں شریک تھے۔

۳۶۔ چادر تطہیر ــــ دونوں زیر کساء یمانی جمع ہوئے۔

۳۷۔ اسماء مکتوبہ علی العرش ــــ دونوں کے نام فراز عرش پر لکھے ہوئے ہیں۔

۳۸۔ مبیت علی الفراش ــــ شب ہجرت علیؑ اسی بستر پر سوئے جس پر پیغمبرؐ آرام فرماتے تھے۔

۳۹۔ ثبات قدم ــــ دونوں میدان جہاد میں ہمیشہ ثابت قدم رہے۔

۴۰۔ سورۂ برائت ــــ رسول اکرمؐ پر نازل ہوا اور علیؑ کے ذریعہ تبلیغ ہوئی۔

۴۱۔ بارگاہ احدیت ــــ دونوں روز اول سے اس کی بارگاہ میں حاضر رہے۔

۴۲۔ میثاق ــــ دونوں کے بارے میں روز اول عہد لیا گیا۔

۴۳۔ اسم باب جنت ــــ دونوں کے نام دروازۂ جنت پر لکھے ہوئے ہیں۔

۴۴۔ خیر البریہ ــــ دونوں بہترین مخلوقات ہیں۔

۴۵۔ سوال ــــ دونوں کے بارے میں روز قیامت سوال کیا جائے گا۔

۴۶۔ کساء قیامہ ــــ دونوں قیامت کے دن ایک چادر میں ہوں گے۔

۴۷۔ حجیت ــــ دونوں کی زندگی اسلام میں حجت ہے۔

۴۸۔ مثلیت ــــ دونوں ایک دوسرے کی مثال اور نظیر ہیں۔

۴۹۔ عظمت ــــ دونوں عظمت میں شریک ہیں۔ خلق عظیم۔ نبأ عظیم۔

۵۰۔ کسر اصنام ــــ دونوں نے بت شکنی میں حصہ لیا۔

۵۱۔ عدم سجود اصنام ــــ دونوں کی پیشانی غیر خدا کے سجدہ سے مبرا ہے۔

۵۲۔ مقاساۃ کروب و حروب۔ دونوں نے میدانوں میں برابر سے حصہ لیا ہے۔

۵۳۔ علم و حکمت ــــ دونوں شہر و باب علم و حکمت ہیں۔

۵۴۔ زہد و قناعت ــــ دونوں کی زندگی سراپا زہد و قناعت ہے۔

۵۵۔ فصاحت و بلاغت ــــ دونوں صاحب نہج فصاحت و بلاغت ہیں۔

۵۶۔ عدالت ــــــ کفی وکف علیؑ فی العدل سواء (فردوس الاخبار دیلمی)

۵۷۔ جود و سخا ــــــ دونوں سخاوت میں برابر کے شریک ہیں۔

۵۸۔ حلم و تواضع ــــــ دونوں کمال بلندی کے باوجود حلیم و متواضع ہیں۔

۵۹۔ شجاعت ــــــ دونوں کی شجاعت تاریخ میں بے مثال ہے۔

۶۰۔ سیرت و سیاست ــــ دونوں ایک جیسی سیرت و سیاست کے حامل تھے۔

۶۱۔ عبادت ــــــ دونوں کی عبادت کی قرآن کریم نے مدح کی ہے۔

۶۲۔ نفسہ نفسہ ــــــ دونوں اس منزل اتحاد پر ہیں کہ قرآن مجید نے ایک کو دوسرے کا نفس قرار دیا ہے۔

ماہِ رجب المرجب

اسلامی کلنڈر کے اعتبار سے یہ مہینہ انتہائی مبارک مہینہ ہے کہ جسقدر خصوصیات اس ماہ کو حاصل ہیں کسی مہینہ کو حاصل نہیں ہیں۔

فقہی دنیا میں یہ مہینہ ان چار مہینوں میں شمار ہوتا ہے جن کو شہر حرام کہا جاتا ہے اور جن میں جدال و قتال کو حرام کر دیا گیا ہے۔

روایات میں اس ماہ کو اصب سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس میں رحمت قطرات کی شکل میں نہیں بلکہ موسلا دھار بارش کی شکل میں نازل ہوتی ہے۔

رجب جنت کی نہروں میں سے ایک نہر کا بھی نام ہے جس سے صاحبان ایمان و کردار سیراب ہونے والے ہیں۔

رجب کو شہر اللہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ مہینہ اللہ کا ہے اور ماہ شعبان پیغمبرؐ کا ہے اور ماہِ رمضان اللہ کی طرف سے امت پیغمبرؐ کے لئے ہے۔ گویا اللہ کی بندگی کے لئے رجب، پیغمبرؐ کی اطاعت کے لئے شعبان اور امت کی بخشش و مغفرت کے لئے ماہ رمضان۔

بہر حال ان خصوصیات کے علاوہ ماہ رجب از اول تا آخر ان مناسبات و امتیازات کا مالک ہے جنھوں نے اس مہینہ کی عظمت کو چار چاند لگا دئے ہیں۔

ـ اس مہینہ کی پہلی تاریخ ۵۷ھ میں امام محمد باقر علیہ السّلام کی ولادت ہے۔

ـ تیسری تاریخ کو ۲۵۴ھ میں امام علی نقی علیہ السلام کی شہادت ہے۔

ـ پانچویں تاریخ کو ۲۱۴ھ میں امام علی نقی علیہ السلام کی ولادت ہے جس کی شاہد ماہ رجب کی ایک دعا ہے ورنہ تاریخوں نے ولادت کا زمانہ ماہ رمضان کو قرار دیا ہے۔

— دسویں تاریخ کو ۱۹۵ھ میں امام محمد تقی علیہ السلام کی ولادت ہے۔

— ۱۳ رجب کو ۳۰ عام الفیل میں مولائے کائنات کی ولادت ہے خانۂ کعبہ میں جہاں ان سے قبل و بعد کوئی نہیں پیدا ہوا ہے۔

— ۱۵ تاریخ کو ۲ھ میں تحویل قبلہ ہے بیت المقدس سے خانۂ کعبہ کی طرف اور ۳ھ میں معصومۂ عالم جناب فاطمہ کی رخصتی ہے۔ پیغمبر اسلام کے گھر سے مولائے کائنات کے گھر کی طرف۔

— ۲۱، ۲۲ تاریخ کو ۷ھ میں مسلمانوں کی ہزیمت ہے جب مستقبل کے خلفاء یکے بعد دیگرے میدان جنگ میں گئے اور ہزیمت اُٹھا کر واپس آ گئے۔

— ۲۲ تاریخ ۶۰ھ میں بروایتے مرگ معاویہ ہے۔ اگر چہ عام تاریخوں میں ۱۵ رجب کا تذکرہ ہے۔

— ۲۳ تاریخ ۷ھ کو سرکار دو عالم نے اعلان فرمایا کہ کل میں عَلَم لشکر اُسے دوں گا جو کرّار غیر فرار ہوگا۔ محب و محبوب خدا و رسول ہوگا اور میدان کو فتح کئے بغیر ہرگز واپس نہ آئیگا۔

— ۲۴ تاریخ ۷ھ کو فتح خیبر ہے جہاں حیدر کرّار نے پرچم اسلام لے کر میدان میں قدم رکھا اور مرحب و عنتر کا خاتمہ کر کے تمام قلعوں کو فتح کر لیا۔ اثنائے جنگ میں دروازہ کو اکھاڑ کر ڈھال بنا لیا اور پھر اسی کو پُل بنا کر سارے لشکر کو قلعہ میں اُتار دیا کہ مسلمانوں نے جہاد میں حصّہ نہیں لیا ہے تو کم سے کم مال غنیمت ہی میں شریک ہو جائیں۔

— ۲۵ تاریخ ۱۸۳ھ کو امام موسیٰ کاظم کی شہادت ہے جو ہارون رشید کے زہر سے واقع ہوئی اور جس سے پہلے امام کو تقریباً ۱۴ برس قیدخانوں میں رہنا پڑا۔

— ۲۶ تاریخ ۱۰ بعثت بروایتے جناب ابوطالب کی وفات ہے جس حادثہ نے پیغمبر کو بے سہارا بنا دیا اور جس کی بنا پر سرکار نے سارے سال کو 'عام الحزن' قرار دیدیا۔

— ۲۶ تاریخ ۱۲ بعثت کی شب میں سرکار دو عالم کی معراج ہے جس کا ایک سفر مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک زمین پر ہوا۔ اور دوسرا سفر مسجد اقصیٰ سے عرش اعظم کی طرف ہوا جس کی حدوں کا اندازہ کائنات کے کسی انسان بلکہ ملک کو بھی نہیں ہے اور اس کی

منزل کا تعارف قرآن مجید نے صرف قاب قوسین او ادنیٰ کہہ کر کرایا ہے۔

— ۲۷ رجب ۴۰ عام الفیل سرکار دو عالم کی بعثت ہے جب آپ غار حرا میں مصروف عبادت تھے اور جبریل امین نے آکر سورۂ اقرأ کی تلاوت کے ذریعہ سرکار کے عہدہ کا آغاز کیا اور آپ نے حکم پروردگار سے کارِ تبلیغ اسلام شروع کر دیا۔

— ۲۸ رجب ۶۰ھ امام حسین کے مدینہ سے سفر کربلا پر روانہ ہونے کی تاریخ ہے جس دن اس مصیبت کا آغاز ہو گیا جس سے بالاتر مصیبت اولین و آخرین میں دیکھنے میں نہیں آئی اور جس کے نتیجہ میں سرکار دو عالم کو ام سلمہ اور ابن عباس کے خواب میں آکر گریہ کرنا پڑا اور جناب فاطمہ کو جنّت سے نکل کر صحرائے کربلا میں فریاد کرنا پڑی۔

تجزیہ

مذکورہ بالا حالات کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ماہ رجب میں دو محمدؑ دنیا میں آئے (امام محمد باقر و امام محمد تقی) اور دو علیؑ دنیا میں آئے (امام علیؑ اور امام علی نقیؑ)، جب کہ تاریخ عصمت میں چار محمد ہیں اور چار علیؑ۔ گویا جس برکت کے نصف میں گیارہ مہینہ شریک ہیں، اس کا نصف صرف ماہ رجب کے مقدر میں ہے۔

— پروردگار نے جن چار معصوموں کو محمد قرار دیا ہے ان میں ایک مصلحت رکھی ہے اور جن کو علیؑ قرار دیا ہے، ان میں بھی ایک امتیاز رکھا ہے۔

اسلام میں فضیلت کے چار عنوان ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے:

علم — "قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون"۔ (کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟)

تقویٰ — "ان اكرمكم عند الله اتقاكم"۔ (تم میں سب سے زیادہ محترم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے)

جہاد — "فضّل الله المجاهدين"۔ (اللہ نے جہاد کرنے والوں کو گھر میں بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت دی ہے)

ایمان ــ "أفمن کان مومنا کمن کان فاسقًا لا یستوون"۔ (کیا مومن فاسق جیسا ہو سکتا ہے؟ ــ ہرگز نہیں ۔ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے ہیں)

پروردگار نے چاروں محمدؐ کو ایک ایک فضیلت کا نمونہ اور مثالیہ بنا دیا ہے۔ پہلے محمدؐ کو ایمان کا مجسمہ بنا کر بانیٔ اسلام قرار دے دیا ہے ۔ دوسرے محمدؐ کو علم کا نمونہ بنایا ہے "باقرؑ" تیسرے محمدؐ کو تقویٰ کی علامت قرار دیا ہے "تقیؑ" اور آخری محمدؐ کو جہاد کا ذمہ دار قرار دیا ہے "قائمؑ"۔

یہی صورت حال چاروں علیؑ کی ہے کہ علم کا مجسمہ مولائے کائنات ہیں تو تقویٰ کی علامت علی نقیؑ ــ ایمان کا مثالیہ علی رضاؑ ہیں تو جہاد کا نمونہ زین العابدین علی بن الحسینؑ۔

حفاظت اسلام

ماہ رجب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسلام کو سب سے پہلا محافظ ماہ رجب ہی میں حاصل ہوا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ دنیا کا کوئی نظام بغیر محافظ کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے ۔ پروردگار عالم نے صاحبان شریعت کے ساتھ مرسلین اور مرسلین کے ساتھ انبیاء کا سلسلہ اسی لئے رکھا ہے کہ پیغام رسانی کے ساتھ پیغام کی حفاظت کا انتظام بھی ہوتا رہے ۔ ورنہ وہ نظام ہرگز باقی نہیں رہ سکتا ہے جس کا کوئی محافظ نہ ہو ۔

سرکار دو عالمؐ نے بھی تبلیغ کے پہلے دن جب بوجھ بٹانے والے کا سوال کیا تھا تو اس کا مقصد یہی تھا کہ رسالت میرا حصہ ہے اور میری ذمہ داری ہے، اس میں میرا کوئی شریک نہیں ہے ۔ لیکن بہر حال اس پیغام کو ایک محافظ درکار ہے اور اس کے بغیر پیغام کے پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ۔

محافظت کا مسئلہ اسقدر سنگین ہے کہ اسلام میں سبقت لے جانے والے بھی محافظت کے میدان میں سب سے پیچھے ہی نظر آتے ہیں اور کسی سابق الاسلام کا نام نہ پیغمبرؐ کی محافظت میں آتا ہے اور نہ اسلام کی محافظت میں ۔ صرف عیب پوشی کے لئے غصب فدک ۔ ظلم اہلبیتؑ اور استحصال خلافت کا نام حفاظت اسلام رکھ لیا گیا ہے جس طرح آج جملہ آثار اسلام کے محو کر دینے کا سیاسی نام خدمت حرمین شریفین رکھا گیا ہے ۔

بہر حال اسلام کو ایک مبلغ کے ساتھ ایک محافظ کی بہر صورت ضرورت تھی اور اس کے بغیر کام مکمل نہیں ہو سکتا تھا ۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اسلام کا پیغام آخری پیغام تھا اور اس پیغمبرؐ کے بعد کوئی دوسرا پیغمبرؐ بھی نہیں آنے والا تھا لہٰذا اس دین کو ایسے محافظ کی ضرورت تھی جو تمام انبیاء کرام اور ان کے دین کے محافظوں کی کمی کو پورا کر دے تاکہ اس کے بعد کسی پیغمبر کی ضرورت باقی نہ رہ جائے ۔

اسے علمی طاقت کا بھی مالک ہونا چاہیئے تاکہ پیغام کے خصوصیات کو واضح کر سکے اور جسمانی طاقت کا بھی حامل ہونا چاہیئے تاکہ ہر طرح کے حملے کا دفاع کر سکے ۔

اسلام کے پاس چار طرح کے سرمائے تھے جن کی حفاظت کی ضرورت تھی ۔ توحید پروردگار، نبوت پیغمبر اسلامؐ ۔ قرآن حکیم اور کعبہ محترم ۔

اسلام ایک ایسے محافظ کا محتاج تھا جو چاروں جواہرات کی حفاظت کر سکے اور کسی ایک کو بھی ضائع اور برباد نہ ہونے دے ـــــ ماہ رجب نے اس ساری کمی کو پورا کر دیا اور اسلام کو ایک ایسا محافظ فراہم کر دیا جو علم کے اعتبار سے "من عندہ علم الکتاب" اور "باب مدینۃ العلم" ہو، اور جسمانی طاقت کے اعتبار سے "لا فتیٰ الا علیؑ" کا مصداق ہو، اور پھر مقام عمل میں اسلامی سرمایہ کا اس طرح تحفظ کرے کہ کعبہ کے بت توڑ کر توحید پروردگار کا تحفظ کرے اور آغوش رسالت میں حفظ رسالت کا عہد کرے ۔ قرآن کی تلاوت کر کے حفاظت قرآن کا اعلان کرے اور کعبہ میں پیدا ہو کر عظمت کعبہ کا تحفظ کرے ۔

اب جبتک اسلام زندہ رہے گا علیؑ کی یاد باقی رہے گی اور جب تک علیؑ کی یاد باقی رہیگی ماہ رجب کی عظمت کا اعلان ہوتا رہے گا کہ علیؑ اسلام کے لئے ماہ مبارک رجب ہی کا تحفہ ہیں ۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

حیاتِ امیرؑ — بہترین نمونۂ عمل

مولائے کائنات حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا سب سے پہلے جس حقیقت کا ادراک کرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی ایک عظیم ترین مثالیہ اور روشن ترین نشان منزل ہے۔ انسانیت جس جنت گمشدہ کی تلاش میں ہے اس کے حاصل کرنے کا بہترین وسیلہ حیات علی بن ابی طالبؑ ہے جس میں زندگی کے ہر رُخ کا بہترین نمونہ ہے اور ہر پہلو کا عظیم ترین شاہکار پایا جاتا ہے۔

ذیل میں آپ کی زندگی کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جنکا ادراک اور اتباع کرنے والا انسانیت کی عظیم ترین منزل پر فائز ہو سکتا ہے اور سرکار دوعالمؐ سے کمال ایمان کی سند لے سکتا ہے جیسا کہ سلمان و ابو ذر جیسے افراد نے کیا کہ اس سیرتِ مبارکہ کو نمونۂ عمل بنا کر اپنے کو ان بلندیوں تک پہونچا دیا جہاں سرکار دوعالمؐ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر علم اور ایمان ستارہ ثریّا پر ہوتا تو اسے بھی سلمان جیسے افراد حاصل کر لیتے۔ یا۔ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ابو ذر سے زیادہ صادق اللہجہ کوئی نہیں ہے۔ یا۔ عمار حق کے ساتھ ہے اور حق عمار کے ساتھ ہے۔ عمار کا قاتل اسلام کا باغی گروہ ہوگا مسلمان نہیں ہو سکتا ہے . . . .

عقائد

عقائد کی منزل میں مولائے کائناتؑ کے ارشادات کا مطالعہ کرنا ہے تو نہج البلاغہ بہترین شمع راہ ہے جہاں پہلے ہی خطبہ میں عقائد کے وہ حقائق اور تفصیلات بیان کر دی گی

ہیں جہاں تک پہونچنا کسی غیر معصوم کے بس کا کام نہیں ہے۔

آپ نے واضح لفظوں میں اعلان کر دیا تھا کہ "دین کا آغاز معرفت پروردگار سے ہوتا ہے اور معرفت کا کمال صرف پہچان لینا نہیں ہے بلکہ اس کا اقرار اس کی تصدیق کرنا ہے اور تصدیق کا کمال بھی توحید میں پوشیدہ ہے۔ توحید کی حقیقت اخلاص ہے اور اخلاص کا کمال صفات کی نفی کرنا ہے کہ صفات اس بات کی علامت ہیں کہ موصوف سے الگ ایک چیز ہیں اور اس طرح حقیقت میں دوئی اور ترکیب پیدا ہو جاتی ہے اور مرکب محتاج ہو سکتا ہے خدائے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔"

— اس کے بعد رسالت کے تعارف میں وہ تاریخی کلمہ ارشاد فرمایا جس سے بالاتر عظمت رسالت کے تعارف کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ فرمایا "میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں اور اس بالاتر عظمت کا ادراک کرنا ہے تو یوں سمجھو کہ میں ابتدا سے ان کے ساتھ یوں رہا کرتا تھا جیسے بچہ شتر اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے ان سے جُدا ہونا گوارا نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے مجھے علوم الٰہیہ اس طرح تفویض کئے ہیں جس طرح پرندہ اپنے بچہ کو دانہ بھراتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پروردگار نے مجھے یہ کمال ادراک دیا ہے کہ ان کے عطا کئے ہوئے ایک باب سے مجھ پر ہزار باب کا انکشاف ہو جاتا ہے۔"

— عبادت الٰہی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "خبردار انسان یہ خیال نہ کرے کہ وہ ایک خدائے غائب کی عبادت کر رہا ہے جس کا رشتہ اس سے غائبانہ حیثیت رکھتا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے میں کسی ایسے خدا کی عبادت نہیں کر سکتا ہوں جو میرے ادراک اور مشاہدہ کی حدوں سے باہر ہو — یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کمال کی بنا پر ظاہری آنکھوں کی زد میں نہیں آتا ہے بلکہ ایمان کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور دل کی آنکھوں کے مشاہدہ میں آتا ہے۔"

— وہ ایسا لامکان ہے جس کی معیت کا احساس بیک وقت مسافر کو بھی ہوتا ہے اور اہل منزل کو بھی — انسان جب گھر سے نکلتا ہے تو اس سے اپنی حفاظت کی بھی درخواست کرتا ہے اور اپنے اہل منزل کی بھی — گویا وہ یہ شعور اور احساس رکھتا ہے کہ یہ دونوں کام بیک وقت اس کے علاوہ کوئی انجام نہیں دے سکتا ہے۔ وہ سفر میں مسافر کے ساتھ

بھی رہتا ہے اور گھر میں اہل منزل کی حفاظت بھی کرتا رہتا ہے اور یہ اس کی لامکانیت کا کرشمہ ہے ورنہ وہ بھی کسی مکان میں گرفتار ہوجاتا تو یا مسافر کے ساتھ رہتا یا اہل خانہ کے ساتھ دونوں کی بیک وقت حفاظت نہیں کرسکتا تھا۔

۔ اسلامی مقدسات کے بارے میں آخری لمحات زندگی میں وصیت فرمائی کہ" خبردار اپنے قرآن کا خیال رکھنا اور تم سے پہلے کوئی دوسرا عمل نہ کرنے پائے کہ دنیا قرآن سے استفادہ کرے اور امت اسلامیہ ہی محروم رہ جائے "۔

اپنے خدا کے گھر کا بھی خیال رکھنا کہ وہ تم سے خالی نہ ہونے پائے۔ ایسا نہ ہو کہ دوبارہ اس پر اغیار اور اشرار کا قبضہ ہوجائے اور پھر ایک لشکر ابابیل کا انتظار کرنا پڑے جو فی الحال آنے والا نہیں ہے ــــــ اور اب تطہیر کعبہ کا کام وارث علیؑ ہی انجام دے گا جو اپنے جد کی طرح تمام چھوٹے بڑے بتوں کو نکال باہر کرے گا اور ہر طرح کے انسانی اور غیر انسانی اصنام سے حرم خدا کو پاک کردے گا۔

۔ انسانی عظمت کے بارے میں فرمایا کہ" اے انسان دیکھ کسی کا غلام نہ بن جانا۔ اللہ نے تجھے آزاد پیدا کیا ہے "۔ جب مالک نے آزادی اور اختیار سے نواز دیا ہے تو اب کہاں کی عقلمندی ہے کہ اس آزادی کو غلامی میں تبدیل کردیا جائے اور اس سے استفادہ نہ کیا جائے۔

۔ گناہوں کے بارے میں فرمایا کہ اے انسان دیکھ تنہائی اور اندھیرے میں بھی گناہ کا ارادہ نہ کرنا کہ جو گواہ ہے وہی حاکم بھی ہے۔ اسے کسی گواہ کا انتظار نہیں ہے کہ تجھے اطمینان ہوجائے کہ اس وقت کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو گواہی کون دے گا اور جرم کس طرح ثابت ہوگا۔ پروردگار کا کمال یہ ہے کہ وہ بیک وقت دیکھ بھی رہا ہے۔ فیصلہ بھی کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ گواہ بھی بنے اور حاکم بھی بنے لیکن اس کے لئے حاکمیت اس کا حق ہے اور گواہی اس کی لامکانیت کا تقاضا ہے۔

۔ مستقبل کی تیاری کے بارے میں فرمایا کہ" فرزند آدمؑ زادراہ کا زیادہ انتظام کر کہ راستہ بہت طولانی ہے اور کشتیٔ نجات پر مسلسل نگاہ رکھنا کہ سمندر انتہائی گہرا ہے اور عمل کو ہمیشہ خالص

رکھنا کہ پرکھنے والا بڑی دقیق نگاہ رکھتا ہے۔

۔ دنیا داری میں مبتلا ہوجانے والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ" انسان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا ہے جبتک اسے اپنے ہاتھ کی ملکیت سے زیادہ وعدۂ الٰہی پر اعتبار نہ ہو "۔

خدا گواہ ہے کہ انسان صرف اسی ایک نکتہ زندگی اور راز حیات کو پہچان لے تو لاکھوں مصیبتوں سے نجات حاصل کرسکتا ہے اور اس کمال ایمان کی منزل پر فائز ہوسکتا ہے جس کا فی الحال تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ صبح وشام روٹی روزی کی راہ میں دوڑ دھوپ اسی نکتہ سے غفلت کا نتیجہ ہے اور دولت پانے کے بعد غرور اسی حقیقت کے نہ پہچاننے کا اثر ہے۔ ورنہ انسان کو یہ خیال پیدا ہوجاتا کہ جو ہاتھوں میں ہے وہ ضائع ہوسکتا ہے لیکن جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے اس کے ضائع ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے تو کسی قسم کی پریشانی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اجتماعیات

انسان ایک مدنی الطبع مخلوق ہے جس کی فطرت میں اجتماعیت کو ودیعت کردیا گیا ہے۔ وہ صحرائی جانور نہیں ہے جو سارے معاشرہ سے الگ ہو کر زندگی گذار سکے۔ اس کی فطرت میں اجتماع پسندی کا جذبہ رکھ دیا گیا ہے۔ وہ معاشرہ کے اندر رہنا چاہتا ہے۔ وہ بازار کی چہل پہل سے لاکھ گھبرا جائے لیکن جیل کی کال کوٹھری کو بہر حال منزل تسکین نہیں قرار دے سکتا ہے۔ اور جب پیدا کرنے والے نے اس کے اندر یہ جذبہ رکھ دیا ہے تو کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں ہزاروں لاکھوں انسان زندگی گذاریں گے اور سب کے پاس اپنے جذبات، خواہشات، احساسات اور ضروریات ہوں گے وہاں ایسے قانون کا ہونا ناگزیر ہوگا جو سب کے حقوق کا تحفظ کرسکے اور جس کی پابندی سماج اور معاشرہ کو سکون واطمینان کی دولت سے مالامال کرسکے۔ ورنہ جذبات کا ٹکراؤ معاشرہ کو تباہ کردے گا اور مصلحتوں کا کھنچاؤ سماج کو بربادی کے گھاٹ اُتار دے گا۔

مولائے کائنات نے انسان کے اجتماعی فرائض اور اس کے ذمہ دارانہ احساسات

کو بیدار کرنے کے لئے ایک مکمل ضابطہ بھی پیش کیا اور پھر اس پر عملدرآمد کر کے بھی انسان کو متوجہ کیا کہ ایک ذمہ دار انسان کی زندگی کیسی ہوتی ہے اور اس کی ذمہ داری کا دائرہ کس قدر وسیع ہوتا ہے۔

۔ "میں اپنے نفس کو کیسے مطمئن کر سکتا ہوں کہ مجھے مومنین کا امیر کہا جائے اور میں ان کی تکلیفوں میں ان کا ساتھ نہ دوں"۔ اسلام میں امارات گردنوں پر سوار ہونے کا نام نہیں ہے۔ گردن پر ذمہ داری کا بوجھ اُٹھانے کا نام ہے۔

۔ "میں اس وقت تک شکم سیر نہیں ہو سکتا ہوں جب تک یمامہ میں کوئی انسان بھوکا ہے"۔ انسان کا مرتبہ جس قدر بلند ہوتا جاتا ہے اس کی ذمہ داری کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اور ایک وہ وقت آتا ہے جب حدود مملکت میں ایک آدمی کا بھوکا رہ جانا بھی اسے ایک لقمۂ نان استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

۔ "یاد رکھو کہ جس کا ہمسایہ بھوکا ہو اور وہ شکم سیر ہو کر سو جائے سمجھو کہ اس کا ایمان اللہ و رسول پر نہیں ہے"۔ ورنہ اللہ کا بندہ اللہ کے بندوں سے اسقدر غافل کس طرح ہو سکتا ہے۔

۔ "جب کسی غنی کے پاس ضرورت سے زیادہ سرمایہ دیکھو تو سمجھ لو کہ کسی غریب کا حق ضائع ہوا ہے"۔ ورنہ پیدا کرنے والے کا نظام تقسیم غلط نہیں ہو سکتا ہے اور اس نے دولت کو ذخیرہ اندوزی کے لئے نہیں پیدا کیا ہے۔

۔ برّ و بحر میں کوئی مال بھی ضائع ہو جائے تو سمجھو کہ اس میں اللہ یا بندوں کا کوئی حق تھا"۔ جس کی بنا پر مال تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور ذمہ داری تمہاری گردن پر رہ گئی ہے۔

اخلاقیات

سرکار دو عالمؐ نے اپنی بعثت کے مقصد کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے"۔ جس کا واضح ترین مفہوم یہ تھا کہ اسلام دین اخلاق ہے وہ عالم انسانیت کو بد اخلاقی سے نجات دلانے کے لئے آیا ہے۔ اس کے پیغمبرؐ کا مقصد لوگوں کے نفوس کو پاکیزہ بنانا اور انہیں اعمال صالحہ کا پابند بنانا ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اسلام کا ذمہ دار اور پیغمبر کا نائب بنکر منظر عام

پر آئے گا اسے کمال اخلاق کی منزل پر فائز ہونا چاہیئے اور اس مقصد کی تکمیل کرنا چاہیئے جس کے لئے سرکار دو عالمؐ کو عرش اعظم سے اس زمین کی طرف بھیجا گیا ہے۔

مولائے کائناتؑ اسلام کے ذمہ دار۔ پیغمبرؐ کے بھائی اور جانشین اور قرآن حکیم کے عملی مفسر تھے لہٰذا ان کی زندگی میں انھیں اخلاقیات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جن کا مشاہدہ کل پیغمبرؐ کی زندگی میں کیا گیا تھا یا جنھیں اسلام کا طرۂ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی چند مثالیں تاریخ میں یوں نقل کی گئی ہیں:

۔ آپ عالم اسلام کے خلیفہ بھی تھے اور عالم ایمان کے امام بھی۔ لہٰذا ہر شخص کی خواہش تھی کہ آپ کی رکاب میں رہے اور جب آپ سوار ہو کر چلیں تو سواری کے ساتھ چلے جیسا کہ سلاطین دنیا اور خلفاء اسلام کا دستور تھا۔ آپ نے اس صورت حال کو دیکھ کر پہلے ہی اعلان فرما دیا کہ "سوار کے ساتھ کسی کا پیدل چلنا سوار کی تباہی کا ذریعہ ہے کہ اس کے دماغ میں غرور اور تکبّر پیدا ہو سکتا ہے اور پیدل چلنے والے کی ذلّت کا سامان ہے" لہٰذا انسان کو کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس میں کوئی مفید اور منفعت بخش پہلو نہ ہو بلکہ ہر پہلو سے مذمت اور منقصت ہی کا اظہار ہوتا ہو۔

۔ مدینہ سے کوفہ کی طرف چلے تو راستہ میں ایک یہودی کا ساتھ ہو گیا جو بصرہ جا رہا تھا۔ ایک مقام پر دونوں کا راستہ الگ ہوا تو آپ اسی راستہ پر چل پڑے جس کی طرف یہودی جا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر ٹوکا کہ آپ کا راستہ یہ نہیں ہے۔ آپ راستہ بھول گئے ہیں۔ فرمایا مجھے معلوم ہے۔ لیکن میرے مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ راستہ کے ہمسفر کا حق یہ ہے کہ وہ جب جُدا ہو تو اسے چند قدم رخصت کیا جائے۔ یہودی یہ سُن کر حیرت زدہ ہو گیا اور بیساختہ پکار اُٹھا کہ جس مذہب میں اغیار کے لئے اتنی جگہ پائی جاتی ہو وہ اس قابل ہے کہ ہر شریف انسان اسے اختیار کرے اور یہ کہہ کر مسلمان ہو گیا ـــ اور حضرت نے ثابت کر دیا کہ میں راستہ بھول نہیں گیا تھا بلکہ بھولے ہوئے کو راستہ سے لگانے کے لئے اس طرف آیا تھا اور الحمدللہ کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

۔ ایک موقع پر لوگوں نے حضرت کی خدمت میں فالودہ پیش کیا تو آپ نے یہ کہہ کر

انکار فرما دیا کہ "کہیں نفس لذّتوں کا عادی نہ ہو جائے"۔ حقیقت امر یہ ہے کہ یہ خطرہ امیرالمومنینؑ کی زندگی میں تو نہیں ہے لیکن یہ ایک فطری بات ہے کہ نفس کو ایک مرتبہ کسی لذّت کا احساس ہو جاتا ہے تو بار بار اسی کا مطالبہ کرتا ہے اور انسان جس قدر اس کے مطالبات کو پورا کرتا جاتا ہے اسی اعتبار سے خواہشات کا اسیر بنتا جاتا ہے اور پھر حلال سے گذر کر حرام کی منزل تک بھی پہونچ جاتا ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص کی زندگی میں صبح و شام کیا جا سکتا ہے۔

۔ جنگ صفین کا یہ واقعہ زبان زد خاص و عام ہے کہ معاویہ کے لشکر نے دریا پر قبضہ کر کے پانی بند کر دیا اور آپ کے لشکر نے حملہ کر کے دریا کو آزاد کرا لیا تو آپ نے فوراً اعلان کر دیا کہ خبردار دشمن پر بھی پانی بند نہ کرنا ۔ اور خود معاویہ نے بھی اپنے لشکر کو اطمینان دلا دیا کہ تم لوگ پریشان نہ ہو۔ علیؑ کریم ہیں کسی پر پانی بند نہیں کر سکتے ہیں۔

۔ جنگ جمل کے خاتمہ پر مسلمانوں نے مال غنیمت کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس طرح ناموس رسولؐ کو کنیز بنا کر تقسیم کرنا پڑے گا اور یہ بات میری غیرت کے خلاف ہے اور پھر نہایت احترام سے حضرت عائشہ کو گھر واپس کر دیا جس کا احساس انھیں زندگی بھر رہا اور وہ حضرت علیؑ کی شرافت کا تذکرہ کرتی رہیں۔

۔ ۱۹ ویں ماہ رمضان کو ابن ملجم کی تلوار سے سر اقدس کے زخمی ہو جانے کے بعد جب قاتل کو گرفتار کر کے لایا گیا اور آپ نے اس کی کیفیت کا مشاہدہ کیا تو فوراً اعلان فرما دیا کہ خبردار اس طرح سے ہاتھوں کو پس گردن سے مت باندھو اور اسے پیاسا مت رکھو۔ اس کے لئے پانی کا انتظام کرو جو عالم اخلاقیات کے معجزہ کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

۔ قنبر آپ کے غلام تھے لیکن جب دو پیراہن خرید کر لائے گئے تو آپ نے قیمتی پیراہن قنبر کے حوالے کر دیا۔ قنبر میں پہننے کی جرأت نہ تھی تو انھیں اطمینان دلایا کہ یہ کام میں نے اسلئے کیا ہے کہ تم جوان ہو اور جوانوں کو زینت کا اہتمام زیادہ کرنا چاہیئے۔

۔ روایات کا بیان ہے کہ آپ یتیموں کے ساتھ ایسی شفقت و محبّت کا برتاؤ کیا کرتے تھے کہ اکثر بچّے آپ کے سلوک کو دیکھ کر یتیم ہونے کی آرزو کیا کرتے تھے کہ انھیں مقدر سے ایسا شفیق اور مہربان باپ نہیں ملا

۔ ایک شخص نے گھر میں چٹائی دیکھ کر عرض کی کہ آپ خلیفۃ المسلمین ہیں یہ فرش آپ کو زیب نہیں دیتا ہے۔ فرمایا کہ میں نے بہترین فرش "مستقل گھر" میں رکھوا دیا ہے۔ یہاں کی چند روزہ زندگی اسی چٹائی پر گذار لوں گا۔ یہاں بہترین فرش کی ضرورت نہیں ہے۔

سیاست

مولائے کائنات اجتماعیات و اخلاقیات کی طرح سیاسیات میں بھی اسلام کا مکمل نمونہ اور مرقع تھے۔ آپ کی زندگی کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام حکام کیلئے کس طرح کی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کی نگاہ میں حاکمیت راحت و لذّت کا نام ہے یا مسئولیت اور ذمہ داری کا۔ تاریخ میں مولائے کائنات کی سیاسی زندگی کے یہ چند نمونے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں:

طعام:

احنف بن قیس نے معاویہ کے دربار میں غذائی صورت حال کا مشاہدہ کیا تو رو دئے۔ معاویہ نے گھبرا کر پوچھا کہ رونے کا کیا سبب ہے؟ فرمایا کہ میں نے حضرت علیؑ کی زندگی بھی دیکھی ہے جو کھانے پر مہر لگوا دیتے تھے کہ کوئی شخص اس میں کسی لذت آمیز شے کا اضافہ نہ کر دے اور فرمایا کرتے تھے کہ حاکم کے لئے لذیذ غذا مباح نہیں ہے جب تک تمام رعایا کی غذا کا انتظام نہ ہو جائے۔

لباس:

آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے اپنی چادر میں اس قدر پیوند لگوائے ہیں کہ اب رفوگر کو دیتے ہوئے شرم آتی ہے"۔ آپ مدینہ سے جو چادر لے کر آئے تھے کوفہ کی سلطنت و ریاست کے دور میں بھی اسی کو استعمال کرتے رہے اور بقول غزالی: "بیت المال مسلمین سے کچھ نہیں لیا اور ایک قمیض بھی خریدی تو اپنی تلوار بیچ کر"۔

طرز معاشرت:

آپ کی شہادت کے بعد ضرار معاویہ کے دربار میں آئے تو اس نے کہا کہ علیؑ کے اوصاف

بیان کرو۔ ضرار نے معذرت کی۔ معاویہ نے اصرار کیا اور جاں بخشی کی ضمانت دے دی تو ضرار نے ایک تفصیلی تذکرہ فرمایا جس کا عظیم ترین حصہ یہ فقرہ تھا کہ " وہ ہماری بزم میں ہماری ہی جماعت کے ایک فرد کی طرح رہا کرتے تھے۔ اتنا ہی حق لیتے تھے جتنا دوسروں کو دیتے تھے اور ان ساری ذمہ داریوں کو ادا کرتے تھے جو دوسروں پر عائد کرتے تھے۔"

حق حکومت :

آپ کا واضح نظریہ یہ تھا کہ یہ کائنات پروردگار کی بنائی ہوئی ہے لہٰذا حکومت کرنے کا حق صرف اُس کا ہے۔ وہ کسی کو اپنا نائب بنا دے تو اور بات ہے۔ ورنہ کسی شخص کو ملک خدا میں حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ چنانچہ جنگ صفین کے بعد جب آپ کے اور معاویہ کے درمیان تحکیم کے ذریعہ حکومت کا فیصلہ ہونے لگا تو آپ نے فوراً شرط لگا دی کہ فیصلہ کتاب خدا کے مطابق ہوگا اس لئے کہ ملک ملک خدا ہے اور حاکمیت کا فیصلہ کرنے کا حق اُس کے علاوہ کسی کو نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دنیاداروں نے آپ کی بات کو یکسر نظر انداز کر دیا اور عمرو عاص کی عیاری سے اسلامی حکومت کا فیصلہ ہو گیا اور معاویہ مسلمانوں کے مقدر کا مالک ہو گیا۔

قانون کی بالاتری :

دنیا کی ہر حکومت میں ایک طبقہ اشراف کا ہوتا ہے جسے مخصوص رعایت دیدی جاتی ہے اور اس کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جاتا ہے جو عوام الناس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ گویا اصل قانون عوام الناس کے لئے بنتا ہے اور اشراف اس قانون سے بالاتر ہوتے ہیں۔ آپ نے اپنی حکومت کا انداز اس سے بالکل مختلف رکھا اور صاف اعلان کر دیا کہ "میری حکومت کی بنیاد طبقاتی شرافت نہیں ہے بلکہ کرداری شرافت ہے"۔ میری نگاہ میں تمہارا شریف اگر غاصب ہے تو اس وقت تک ذلیل رہے گا جبتک مظلوم کا حق ادا نہ کرے اور تمہارا ذلیل اگر مظلوم ہے تو اس وقت تک عزیز رہے گا جبتک اُسے اس کا حق نہ مل جائے۔ اسلام حقوق کا محافظ ہے، بدکرداری کا مروج نہیں ہے۔

رشتہ داری :

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کسی رشتہ دار کے ہاتھ میں حکومت آجاتی ہے تو رشتہ داروں

کی عید ہو جاتی ہے کہ اب ہر طرح کی رعایت حاصل ہو گی اور حکومت کے مصالح کو جس طرح چاہیں گے استعمال کر سکیں گے۔ لیکن امیر المومنینؑ نے اس نظام کو بھی اُلٹ دیا اور جب حقیقی بھائی جناب عقیل بیت المال سے زیادہ حق کا مطالبہ کرنے کے لئے آ گئے اور اس کی وجہ بھی بیان کر دی کہ مجھے عیش و عشرت درکار نہیں ہے۔ میرے اخراجات زیادہ ہیں اور میں کثیر العیال ہوں ـــ تو آپ نے لوہا گرم کر کے ان کے جسم کو داغنے کا ارادہ کر لیا اور جب انھوں نے فریاد کی کہ کیا سائل کے سوال کا جواب اسی طرح دیا جاتا ہے تو فرمایا کہ جو اپنے بھائی کو جہنم کی آگ میں ڈال سکتا ہے اسے خود بھی کم سے کم دنیا کی آگ کو تو برداشت کرنا چاہیئے اور اس طرح جناب عقیل پر یہ واضح کر دیا کہ مال مسلمین اسلامی قوانین کے خلاف استعمال نہیں ہو سکتا ہے۔

تعلقات :

تاریخ کا مشہور ترین واقعہ ہے کہ جب ایک چاہنے والا چوری کے الزام میں پکڑا گیا اور اس کا جُرم ثابت ہو گیا اور آپ نے ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے سفارش کی کہ یہ حضور کا چاہنے والا ہے۔ فرمایا مجھے قانون الٰہی سے زیادہ کوئی شئے عزیز نہیں ہے۔ اگر یہ میرا چاہنے والا تھا تو اس کے کردار کو پاکیزہ ہونا چاہیئے تھا۔

ـــ نصیری نے اپنی جانب میں انتہائی محبت کا اظہار کیا تھا جب آپ کی خدائی کا اعلان کر دیا تھا لیکن آپ نے اسے قتل بھی کر دیا اور جلا بھی دیا کہ میں اپنی عظمت کی خاطر مرتبۂ خدائی کی توہین برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔

ـــ کوفہ میں آپ کو خبر دی گئی کہ آجکل عورتیں بازاروں کا دورہ کر رہی ہیں تو فوراً مسجد میں تشریف لے آئے اور مجمع کو بلا کر منبر پر تشریف لے گئے۔ فرمایا "مجھے خبر ملی ہے کہ تمھاری عورتیں بازاروں میں جاتی ہیں اور نامحرموں کے شانہ بہ شانہ چلتی ہیں۔ کیا تمھیں غیرت نہیں آتی ہے؟ ـــ یاد رکھو کہ جس کے پاس حیا نہیں ہے اس کے پاس دین بھی نہیں ہے۔ دین حیا کا پاسدار ہے۔ بے غیرتی کا طرفدار نہیں ہے۔!

خصائص امیر المومنینؑ

کسی انسان کے خصوصیات کو دو اعتبارات سے دیکھا جاسکتا ہے:

۱۔ اس کے خصوصیات عام انسانوں کے اعتبار سے ۔ اس اعتبار سے دنیا کا ہر باکمال کچھ نہ کچھ خصوصیات کا ضرور حامل ہوتا ہے جو عام انسانوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، اور جن کی وجہ سے اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔

۲۔ اس کے خصوصیات خاص انسانوں کے اعتبار سے ۔ اس مقام پر عام صاحبان کمالات کے قدم بھی نظر نہیں آتے ہیں بلکہ انھیں اولیاء اللہ کا نام آتا ہے جو باکمال افراد کے درمیان بھی امتیازی اور انفرادی حیثیت کے مالک ہیں اور جن کی منزل تک خواص بشر بھی نہیں پہونچ سکے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ بن ابیطالب کا شمار انھیں باکمال افراد میں ہوتا ہے جن کے خصوصیات خواص بشر کے درمیان بھی امتیازی حیثیت کے مالک ہیں اور جن کا ہر کمال اس اعتبار سے ان کے خصائص میں شامل ہے کہ اس منزل کمال تک امت اسلامیہ یا عالم انسانیت کا دوسرا کوئی انسان نہیں پہونچا ہے۔ وہ عالم و فاضل ہونے کے اعتبار سے بھی اس خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان کی منزل تک پر کوئی انسان نہیں پہونچ سکا ہے اور نہ کسی کو باب مدینۃ العلم ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

ذیل میں امیر المومنینؑ کے چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے جن کا سلسلہ ولادت سے شروع ہوکر شہادت پر ختم ہوتا ہے اور جنھوں نے آپ کی زندگی کو تمام کائنات سے ممتاز بنادیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فہرست فقط ایک خاکہ ہے اور اس کے علاوہ اسکی

کوئی حیثیت نہیں ہے ورنہ آپ کے خصوصیات و کمالات کے بارے میں سرکار دو عالمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر تمام انس و جن مل کر بھی علیؑ کے کمالات کا احاطہ کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے ہیں۔

۱۔ آپ کی ولادت باسعادت خانۂ کعبہ میں ہوئی ہے جس میں اوّلین و آخرین میں کوئی آپ کا شریک نہیں ہے۔

۲۔ آپ کو پہلی غذا سرکار دو عالمؐ کے لعاب دہن سے ملی ہے۔

۳۔ آپ کی تربیت کا مکمل کام سرکار دو عالمؐ نے انجام دیا ہے۔

۴۔ اسلام کی دعوت اول کے موقع پر انتظامات کا سارا کام آپ نے انجام دیا ہے۔

۵۔ شب ہجرت بستر رسولؐ پر آپ نے فداکاری کا مظاہرہ کرکے سرکار کی جان بچائی ہے۔

۶۔ ہجرت کے موقع پر اہل مکہ کی امانتوں کے واپس کرنے کا کام سرکارؐ نے آپؑ کے سپرد کیا تھا۔

۷۔ مدینہ میں قدم رکھتے وقت جب مسجد قبا کی تعمیر ہوئی ہے جو اسلام کی سب سے پہلی مسجد ہے تو اس کی تعمیر کا بنیادی کام آپ ہی نے انجام دیا تھا۔

۸۔ اسلام کے پہلے جہاد بدر میں ستّر کفار میں سے نصف سے زیادہ آپ ہی کی تلوار سے مارے گئے تھے۔

۹۔ میدان احد میں "لافتیٰ الا علیؑ" کا خطاب آپ ہی کو ملا تھا۔

۱۰۔ جنگ خندق میں کل ایمان آپ ہی کو قرار دیا گیا تھا۔

۱۱۔ عمرو بن عبدود عامری کے قتل کے موقع پر سرکار دو عالمؐ نے آپ ہی کی ضربت کو ثقلین کی عبادت سے گراں تر قرار دیا تھا۔

۱۲۔ اعلم صحابہ کا خطاب آپ ہی کو دیا گیا ہے اور باب مدینۃ العلم آپ ہی کو قرار دیا گیا ہے۔

۱۳۔ منبر پر "سلونی قبل ان تفقدونی" کا اعلان آپ ہی نے کیا ہے۔

۱۴۔ معصومہ عالم جناب فاطمہؑ سے عقد کا شرف آپ ہی کو حاصل ہوا ہے۔
۱۵۔ مباہلہ میں نفس رسولؐ آپ ہی کو قرار دیا گیا ہے۔
۱۶۔ اسلامی مجاہدات میں ہزاروں افراد کے قتل کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔
۱۷۔ عالم انوار سے رسالت پیغمبرؐ کے گواہ بننے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہوا ہے۔
۱۸۔ اسلام میں مختلف علوم بالخصوص ادبیات کے ایجاد کا کام آپ ہی نے انجام دیا ہے۔
۱۹۔ جنگ خیبر کے موقع پر کرّار غیر فرار کا لقب آپ ہی کو دیا گیا ہے۔
۲۰۔ اسلام کے جملہ مجاہدات میں ایسا امیر لشکر جن کا کوئی دوسرا امیر نہ رہا ہو آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔
۲۱۔ معراج میں پیغمبر اسلامؐ سے آپ ہی کے لہجہ میں باتیں ہوئی ہیں۔
۲۲۔ ایسی سخاوت جس پر سورۂ دہر کا نزول ہو جائے آپ ہی کا کارنامہ ہے۔
۲۳۔ ایسی زکوٰۃ جس پر آیت ولایت نازل ہو جائے آپ ہی کی زکوٰۃ ہے۔
۲۴۔ سب سے پہلے اظہار اسلام اور تصدیق پیغمبرؐ کا کام آپ ہی نے انجام دیا ہے۔
۲۵۔ سب سے پہلے سرکارؐ کے ساتھ نماز آپ ہی نے ادا کی ہے۔
۲۶۔ اسلام کے سب سے بہتر قاضی اور فیصلہ کرنے والے آپ ہی تھے۔
۲۷۔ معرفت الٰہی میں سرکار دو عالمؐ کے بعد سب سے بالاتر آپ ہی کی ذات تھی۔
۲۸۔ آپ نے تمام زندگی میں ایک لمحہ بھی بتوں کی پرستش نہیں کی ہے اور اسی لئے "کرّم اللہ وجہہ" کی تعبیر بھی آپ ہی کے لئے ہے۔
۲۹۔ اُحُد کے میدان میں ثبات قدم کا مظاہرہ کرنے والوں میں سب سے نمایاں ہستی آپ کی ہے۔
۳۰۔ حدیبیہ کے موقع پر صلحنامہ کی کتابت کا کام آپ ہی نے انجام دیا ہے۔
۳۱۔ آیت تطہیر میں آپ کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس میں دوسرے مسلمانوں میں کوئی آپ کا شریک نہیں ہے۔

۳۲۔ آپ کو سرداران جوانان جنّت سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے۔
۳۳۔ آپ کو ساقیٔ کوثر کا لقب ملا ہے۔
۳۴۔ دوشِ پیغمبرؐ پر بلند ہو کر بت شکنی کا کام آپ ہی نے انجام دیا ہے۔
۳۵۔ غدیر خم میں آپ ہی کو مولا بنایا گیا ہے۔
۳۶۔ قرآن مجید کو ترتیب و تفسیر و تشریح کے ساتھ آپ ہی نے جمع کیا تھا۔
۳۷۔ سرکار دو عالمؐ کی تجہیز و تکفین کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہوا ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

تراب اور ابو تراب

قرآن مجید نے ۱۷ مقامات پر تراب کا تذکرہ کیا ہے اور مختلف اعتبارات سے کیا ہے:

● ۔ تراب اصل وجود بشر ہے "واللہ خلقکم من تراب ثم من نطفة..." (اللہ نے پہلے تمھیں تراب سے خلق کیا ہے اس کے بعد نطفہ اور علقہ وغیرہ سے) فاطر ۱۱

● ۔ تراب اصل وجود آدمؑ ہے "کمثل آدم خلقه من تراب" (عیسیٰ کی مثال آدمؑ جیسی ہے کہ اللہ نے انھیں تراب سے پیدا کیا ہے) آل عمران ۵۹

● ۔ تراب داعی ایمان ہے "أکفرت بالذی خلقك من تراب" (کیا تو نے اس کا انکار کر دیا ہے جس نے تجھے تراب سے پیدا کیا ہے) کہف ۳۷

● تراب پردہ پوش ہے "أیمسکه علیٰ هون أم یدسه فی التراب" (جاہلیت کا انسان لڑکی کی پیدائش پر سوچا کرتا تھا کہ اس ذلّت کو باقی رکھے یا تراب میں چھپا دے) نحل ۵۹

● ۔ تراب آیت الٰہی ہے "ومن آیاته ان خلقکم من تراب" (خدا کی نشانیوں میں یہ بھی ہے کہ اس نے تمھیں تراب سے پیدا کیا ہے) روم ۲۰

● ۔ تراب کافر کے لئے ناقابل برداشت ہے "قالواء اذا متنا وکنا ترابًا وعظامًا ءانا لمبعوثون" (کفار کہتے ہیں کہ کیا ہم مرنے اور تراب ہو جانے کے بعد بھی دوبارہ زندہ کئے جا سکتے ہیں) مومنون ۸۲

● ۔ تراب کفار کی آخری آرزو ہے "یقول الکافر یٰلیتنی کنت ترابا" (کافر قیامت کے دن کہے گا، کاش میں تراب ہوتا) نبأ ۴۰

فقہ اسلامی میں خاک کو بیحد اہمیت حاصل ہے۔ اسے ایک طرف وسیلۂ طہارت قرار

دیا گیا ہے "التراب احد الطهورین" (طہارت کے دو وسائل میں سے ایک تراب بھی ہے۔ جو کام اختیاری حالات میں پانی انجام دیتا ہے وہی کام اضطراری حالت میں خاک انجام دیتی ہے اور جب تک اضطرار باقی رہتا ہے اس کی طہارت کا سلسلہ برقرار رہتا ہے۔

واضح رہے کہ اسلام میں طہارت کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری طہارت اور باطنی طہارت۔

ظاہری طہارت ازالہ نجاست سے پیدا ہوتی ہے اور باطنی طہارت ازالہ حدث سے۔ حدث انسانی زندگی میں ایک خاص کیفیت کا نام ہے جو نجاست تو نہیں ہے لیکن ایسی حالت ہے جس میں انسان پروردگار کی بارگاہ میں حاضری کے قابل نہیں رہ جاتا ہے۔ چاہے وہ حدث اصغر ہو جس کا ازالہ وضو کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یا حدث اکبر ہو جس کے ازالہ کے لئے غسل درکار ہوتا ہے۔ حدث کے ہوتے ہوئے انسان کتنا ہی مجبور کیوں نہ ہو جائے بارگاہ احدیت میں حاضری کے قابل نہیں رہ جاتا ہے۔

اسلام نے تراب کو ازالہ نجاست کا ذریعہ نہیں بنایا ہے جس کے رہتے ہوئے بعض حالات میں نماز ہو سکتی ہے جس طرح انتہائی مختصر مقدار میں خون کہ اس نجس کے ہوتے ہوئے بھی نماز ادا کی جا سکتی ہے یا لاعلمی کی نجاست کہ اس کے ساتھ نماز ادا کی جا سکتی ہے یا مجبوری کی حالت کہ اس میں نجس لباس یا بدن کے ساتھ بھی نماز ہو سکتی ہے۔ لیکن حدث کا مسئلہ اس قدر سنگین ہے کہ اس میں کسی طرح کی رعایت کی گنجائش نہیں ہے۔ سو سال کے بعد بھی معلوم ہو جائے کہ وضو باطل تھا تو دوبارہ وضو کر کے نماز ادا کرنا ہوگی۔ اور دفن کے بعد بھی یقین ہو جائے کہ غسل میت صحیح نہیں تھا تو دوبارہ میت کو نکال کر غسل دینا ہوگا۔

اسلام نے تراب کو اسی حدث کے ازالہ کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس کی نگاہ میں تراب کا کام کپڑے اور بدن کا پاک کرنا نہیں ہے بلکہ نفس کی اس کیفیت کو دور کرنا ہے جسے حدث سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے انسان بارگاہِ احدیت میں حاضری کے قابل نہیں رہ جاتا ہے۔ گویا تراب بارگاہ احدیت میں حاضری کا بہترین وسیلہ ہے جس کے بغیر انسان اس بارگاہ میں حاضری سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔

پانی کا مرتبہ تراب سے بالاتر ہے کہ اس کی طہارت تمام حالات کے لئے ہے اور تراب

کی طہارت صرف مجبوری کے حالات کے لئے ہے۔ لیکن اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ پانی صاحبان اختیار کے کام آتا ہے اور تراب کا سہارا اسے بھی مل جاتا ہے جو بیمار، معذور اور مجبور ہو اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کے مجبور اور مضطر انسانوں کو تراب سے بہرحال رابطہ رکھنا چاہیئے۔ چاہے صاحبان اختیار و اقتدار اسے نظر انداز ہی کیوں نہ کر دیں۔

تراب کا دوسرا مصرف سجدہ ہے کہ اسلام نے جن چیزوں کو قابل سجدہ قرار دیا ہے ان کی اصل یہی تراب ہے۔ اس مقام پر پانی بھی پیچھے ہٹ جاتا ہے اور آگ بھی۔

عناصر اربعہ میں یہی ایک عنصر ہے جسے قدرت نے سجدہ کے قابل بنایا ہے اور جس پر پیشانی رکھ دینے سے انسان معراج کی منزلوں سے آشنا ہو جاتا ہے اور اس کی حیثیت "فلک مقام" مخلوق کی ہو جاتی ہے۔

فقہ میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں آب و تراب دونوں مل کر کام کرتے ہیں اور تنہا کوئی بھی مکمل عمل انجام نہیں دے سکتا ہے اور وہ وہ جگہ ہے جہاں کتا کسی برتن کو چاٹ لے کہ "نجس العین" کی زبان کے جراثیم آسانی سے رفع نہیں ہوتے ہیں۔ انھیں مارنے کیلئے آب و تراب دونوں کا سہارا لینا ہوتا ہے اور پہلے برتن کو مانجھا جاتا ہے اس کے بعد غوطہ دیا جاتا ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ دونوں کا الگ الگ استعمال کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ بلا فصل تمسک ضروری ہے کہ آب و تراب کو ملا کر "گیلی مٹی" سے طہارت کا کام لیا جائے۔ ایسے نجس العین کی نجاست اور وہ بھی جراثیم کی نجاست۔ اس کا ازالہ آب و تراب کے بلا فصل تمسک کے بغیر ناممکن ہے۔

فلسفہ عظمت خاک

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات کے جملہ عناصر میں خاک کو اس قدر اہمیت کیوں حاصل ہو گئی ہے کہ اسے اشرف مخلوقات کے وجود کی بنیاد بنا دیا گیا ہے اور کائنات بشریت کی پوری عمارت اسی کی اساس پر کھڑی کر دی گئی ہے۔

لیکن اس کا جواب بھی واضح ہے کہ خاک میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو

تشکیل بشریت یا بقائے انسانیت کے لئے ضروری تھیں۔ اسی لئے مالک نے اسے اس کائنات میں بنیاد کا درجہ دے دیا ہے۔

خاک کا پہلا شرف یہ ہے کہ یہ تمام عناصر میں امانتدار کا درجہ رکھتی ہے۔ آگ کا کام جلا دینا۔ پانی کا کام بہا دینا۔ ہوا کا کام اڑا دینا ہے اور خاک کا کام اپنے دل میں جگہ دے دینا ہے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ انسان کا وجود خاک سے تیار کیا جائے کہ اسے تمام امانت الٰہی کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھنا ہے اور اسی کے ذریعہ بقائے کائنات کا بندوبست کرنا ہے۔

خاک کے علاوہ کسی عنصر میں جاذبیت کی صلاحیت نہیں ہے۔ ہوا سے آفتاب کی شعاعیں بآسانی گذر جاتی ہیں۔ پانی سے کرنٹ فوراً پاس ہو جاتا ہے۔ آگ روشنی کے جلوؤں کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ لیکن یہی نعمتیں جب خاک کے حوالے کر دی جاتی ہیں تو وہ فوراً انھیں جذب کر لیتی ہے اور اپنے سینہ میں محفوظ کر لیتی ہے۔

دوسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ فوراً ان شعاعوں کو جذب کرنے کی صلاحیت تراب کے علاوہ کسی میں نہیں ہے۔ اسی لئے پروردگار نے انسانی وجود کو تراب سے خلق کیا ہے اور اسے تمام انوار الٰہیہ کا مرکز و مخزن بنا دیا ہے۔

خاک مختلف کرات میں بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ زمین کے علاوہ دیگر کرات میں جانے والے بھی وہاں سے خاک ہی لے کر آئے ہیں۔ آگ اور پانی یا ہوا لے کر نہیں آئے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ تراب کا فیض ہر عالم میں کام آسکتا ہے اور دیگر عناصر صرف اپنے عالم میں کارآمد ہیں۔ اس سے باہر نکلنے کے بعد ان کی کوئی بنیادی افادیت نہیں رہ جاتی ہے۔

خاک کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ انسانی زندگی میں خاکساری اور انکسار پیدا کرتی ہے اور انسان جس قدر اپنی اصل سے قریب تر رہتا ہے، اپنے ہوش میں رہتا ہے۔ اس میں عیب اسی وقت شروع ہوتا ہے جب وہ اپنی اصل سے رشتہ توڑنا شروع کر دیتا ہے۔

پیدل اور ننگے پیر چلنے والا انسان انتہائی درجہ کا خاکسار اور متواضع ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کے اور خاک کے درمیان جوتا حائل ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی میں غرور کا سلسلہ

شروع ہوجاتا ہے۔ سائیکل پر بیٹھ کر غرور اور بڑھ جاتا ہے۔ موٹر پانے کے بعد غرور میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے اور جہاز پر بیٹھ کر دماغ بالکل بے قابو ہوجاتا ہے اور غریب آدمی کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے یا اپنے کو کسی خاص شرف کا مالک تصور کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ اس کا شرف یا عیب کچھ نہیں ہے۔ خرابی صرف یہ پیدا ہوگئی ہے کہ اس تراب سے رشتہ ٹوٹ گیا ہے جس نے دماغ کو قابو میں رکھا ہوا تھا اور ہوش کو بیہوش نہیں ہونے دیا تھا۔

تراب انسان کو اس کی اوقات سے باخبر رکھتی ہے اور اسے مغرور نہیں ہونے دیتی ہے جبکہ آگ اسے "شعلہ مزاج" بنا سکتی ہے اور "شعلہ مزاج" کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اسلام نے خاک کے اسی رشتہ کو برقرار رکھنے کے لئے اور انسان کے مزاج کی توازن کو باقی رکھنے کے لئے خاک پر سجدہ لازم قرار دیدیا ہے کہ انسان چاند، سورج اور مریخ تک بھی پہونچ جائے تو اسے سجدہ خاک ہی پر کرنا ہوگا تاکہ خاک سے اس کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور وہ اپنی فطری اصلی خاکساری سے محروم نہ ہوجائے۔

خاک میں ایک تاثیر شفا بھی پائی جاتی ہے۔ دور حاضر میں کتنے ہی امراض ہیں جن کا علاج خاک کے ذریعہ ہوتا ہے اور مثل مشہور ہے کہ جو بچہ خاک میں نہیں کھیلتا ہے اور خاک پر نہیں بیٹھتا ہے اس کے جسم پر جراثیم کا حملہ بآسانی ہوسکتا ہے اور وہ دفاع کی بڑی طاقت سے محروم ہوجاتا ہے۔

مولائے کائنات نے خاک کی اسی کیفیت کی طرف اشارہ اس وقت کیا تھا جب ۱۹ ماہ مبارک کو سر اقدس پر ضربت لگنے کے بعد زخم پر خاک مسجد کو فہ ڈال رہے تھے اور زبان اقدس پر "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" کا نعرہ تھا اور اس طرح اس حقیقت کا اظہار فرما رہے تھے کہ جس خاک میں کسی شہید کا خون جذب ہوجائے وہ خاک، خاکِ شفا بن جاتی ہے اور اس سے سخت ترین زخموں کے علاج کا کام لیا جا سکتا ہے۔

خاک میں مالک نے اتنی صلاحیت رکھی ہے کہ وہ بروقت اپنی ظاہری کیفیت تبدیل کر کے سونا بھی بن سکتی ہے اور اس وقت انسان کو اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جسے ارزاں ترین عنصر تصور کیا تھا اسی کے دامن میں انتہائی قیمتی جواہرات کا ذخیرہ بھی پایا جاتا

ہے اور انسان کو کبھی تراب کی ظاہری حالت دیکھ کر اسے حقیر نہیں تصور کرنا چاہیئے۔ اس کے دامن میں بڑے ذخائر پائے جاتے ہیں۔ مگر افسوس انسان اس کی عظمت سے باخبر نہیں ہے۔

خاک کے بارے میں ایک تجربہ یہ بھی ہوا ہے کہ عربستان کے علاقہ میں زیر زمین پٹرول کا بے پناہ ذخیرہ موجود تھا لیکن زمین پر بسنے والا اس سے بے خبر تھا جب دوسری اقوام نے اس سرزمین پر قدم رکھا اور انھوں نے زمین کی تہہ میں جھانک کر دیکھا تو انھیں بقائے کائنات کا ایک ذخیرہ نظر آگیا اور انھوں نے بے حساب پٹرول برآمد کر دیا جس سے آج پورے عالم اسلام کی معیشت زندہ ہے اور مسلمان دولت کے دم پر اکڑ کر چل رہا ہے جس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ خاک کے دامن میں بے پناہ ذخائر ہیں مگر افسوس کہ مسلمان ان سے بے خبر ہے اور دیگر اقوام کو ان کا ادراک ہے اور وہی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور جس قدر چاہتے ہیں ان فوائد کی خیرات مسلمانوں کو دیدیتے ہیں اور مسلمان ان سے اپنی دولت کا صدقہ لے کر خوش ہوجاتا ہے جب کہ درحقیقت یہ صورت حال تراب کی عظمت سے بے خبری کی خدائی سزا ہے جس میں عالم اسلام مبتلا ہے۔

خاک کی عظمت کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ پروردگار نے سوال کیا کہ موسیٰ تمھیں معلوم ہے کہ میں نے تمھیں کلیمیت کے لئے کیوں منتخب کیا ہے؟ عرض کی پروردگار تو بہتر جانتا ہے۔ ارشاد ہوا ہمیں تمھاری یہ ادا پسند ہے کہ تم سجدہ کرتے ہو تو خاک پر سر رکھ دیتے ہو۔

گویا خاک سے رابطہ اور تراب پر سجدہ انسان کو طور کی بلندیوں تک لیجا کر کلیمیت کے شرف سے بھی سرفراز کرا دیتا ہے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ امیر المومنینؑ نے بیت المال کا مال تقسیم کر کے اسی زمین پر نماز ادا کی اور فرمایا کہ زمین روز قیامت اپنے سجدوں کی گواہ بنتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ زمین روز قیامت گواہی دے کہ علیؑ نے تمام مال مستحقین میں تقسیم کر دیا ہے اور کسی طرح کی کوئی خیانت نہیں کی ہے۔

تیسری روایت یہ ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان مولائے کائنات کو بُرا بھلا کہنے میں لفظ ابوتراب کو استعمال کرتا تھا اور اسے آپ کی ذلّت کی علامت قرار دیتا تھا جب کہ خود آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنے تمام القاب میں سب سے زیادہ لقب "ابوتراب" پسند ہے کہ اس لقب سے میری خاکساری کا اعلان ہوتا ہے اور دیگر القاب سے میری عظمت اور برتری کا اعلان ہوتا ہے اور مجھے خاکساری کا اعلان برتری کے اعلان سے کہیں زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔

استنتاج

مذکورہ تمام مطالب کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولائے کائنات کے وہ کون سے فضائل و کمالات اور خصوصیات و امتیازات تھے جنھیں نگاہ میں رکھنے کے بعد سرکار دو عالمؐ نے "ابوتراب" کا لقب دیا تھا اور آپ کو کیوں یہ لقب تمام القاب سے زیادہ عزیز تھا۔!

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

کتاب اور علم کتاب

یہ بات صحیح ہے کہ دنیا میں علم کتاب کا تعلق کتاب ہی سے ہوتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ علم کتاب کی دنیا اصل کتاب سے الگ ہوتی ہے۔ کتاب ایک مادی شے ہے جو اوراق اور صفحات سے مرکب ہوتی ہے اور علم کتاب ایک معنوی دولت ہے جس کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہوتا ہے اور اس کا مادیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔

مدرسہ میں بچہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیٹھتا ہے تو کتاب بچہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن علم کتاب استاد کے ذہن میں ہوتا ہے جس کا بچہ کے ہاتھ کی کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس طرح ایک عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کے پاس کتاب ہے اس کے پاس علم کتاب نہیں ہے اور جس کے پاس علم کتاب ہے اس کے ہاتھ میں بظاہر کتاب نہیں ہے۔

پروردگار نے مذہب کی دنیا میں اسی اختلاف کو مٹانا چاہا تھا جب اپنی کتاب صاحبانِ علم و فہم اور ارباب عقل و دانش پر نازل کی تاکہ جہاں کتاب رہے وہیں علم کتاب بھی رہے اور جہاں علم کتاب رہے اسی کے ہاتھ سے کتاب بھی حاصل کی جائے۔

سرکار دو عالمؐ نے اسی نکتہ کے پیش نظر فرمایا تھا کہ میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک کتاب اور ایک اہلبیتؑ۔ تاکہ امت کے پاس کتاب کے ساتھ علم کتاب کا وسیلہ بھی رہے اور وہ اہلبیتؑ سے اسی طرح علم کتاب حاصل کرتی رہے جس طرح کل سرکار دو عالمؐ سے حاصل کر رہی تھی۔ لیکن یہ امت کی بدبختی تھی کہ اس نے کتاب اور علم کتاب کو الگ

کردیا اور حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ کا نعرہ لگا کر اہلبیتؑ کو نظر انداز کر دیا اور اس طرح امت کی حیثیت اس بچہ کی ہو گئی جس کے ہاتھ میں کتاب تو ہے لیکن کوئی پڑھانے والا نہیں ہے اور اہلبیتؑ کی حیثیت اس استاد کی ہو گئی جس کے شاگرد نالائق نکل جائیں۔ اور تحصیل علم سے انکار کر دیں۔

یہ تو خوش قسمتی تھی اس مخلص گروہ کی جس نے اس نکتہ کو محسوس کر لیا اور دامن اہلبیتؑ سے وابستہ ہو کر کتاب اور علم کتاب دونوں کی دولت حاصل کر لی اور اپنے دامن ایمان کو کسی دولت سے خالی نہیں رکھا۔

ــ قرآن مجید نے اہل کتاب ان افراد کو بھی قرار دیا ہے جنھیں نہ کتاب کا علم تھا اور نہ کتاب کے احکام پر عمل پیرا تھے جو اس بات کی علامت ہے کہ کتاب کی دنیا الگ ہے اور علم وعمل کی دنیا الگ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان علم وعمل کے زیور سے آراستہ ہو جاتا ہے تو مومن کامل کے لقب سے سرفراز ہو جاتا ہے اور اس دولت سے محروم ہو جاتا ہے تو "کَمَثَلِ الْحِمَارِ" کہے جانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ــ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی رسالت کی گواہی میں نہ کتاب کو پیش کیا ہے اور نہ اہل کتاب کو۔ بلکہ آپ کا واضح اعلان تھا "قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰہِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ" (ہمارے تمہارے درمیان گواہی دینے کے لئے خدا کافی ہے اور وہ انسان کافی ہے جس کے پاس علم کتاب ہے) جو اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے اپنا گواہ اس امت کو نہیں قرار دیا ہے جو صرف کتاب سے وابستہ ہو گئی ہے بلکہ ان اہلبیتؑ کو قرار دیا ہے جو علم کتاب کے وارث اور علم لدنی کے حامل ہیں۔

•ــ کتاب اور علم کتاب کے فرق کو سمجھنے کے بعد اس نکتہ کا بھی سمجھنا ضروری ہے کہ دنیا کی ہر کتاب کا علم ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے زیادہ علم میں کچھ نہیں ہوتا ہے۔ صاحب علم اسی کو کہا جاتا ہے جس پر حقائق کا انکشاف ہو جاتا ہے ورنہ دیگر افراد کو لفظ جاہل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن علم کتاب کی حیثیت اس سے قدرے مختلف ہے۔ علم کتاب انکشاف بھی ہے اور طاقت بھی۔ معرفت بھی ہے اور قدرت بھی۔

جناب سلیمان نے تخت بلقیس منگانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہر شخص نے اپنی قوت کا مظاہرہ شروع کر دیا لیکن آخر میں جس آصف بن برخیا کے ذریعہ تخت بلقیس کو منگا لیا گیا اس کی شان میں قرآن مجید نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں: "قال الذی عندہ علم من الکتاب" (اس کے پاس کتاب خدا کا تھوڑا سا علم تھا) اور اس نے تخت بلقیس کو ملک سبا سے خدمت سلیمان میں پہونچا دیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ علم کتاب صرف مفاہیم کا جاننا اور حقائق کا انکشاف نہیں ہے بلکہ اس میں ایک طاقت اور قوت پائی جاتی ہے جو پورے ملک کی بساط کو لمحوں میں سیکڑوں میل سے خدمت سلیمان تک پہونچا سکتی ہے اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ جسے پروردگار نے پوری کتاب کا علم عطا کیا ہے اس کی طاقت و قوت کیا ہو گی اور وہ کتنا بڑا انقلاب پیدا کر سکتا ہے؟

اس کے بعد کوئی تعجب نہیں رہ جاتا ہے اگر صاحب علم کتاب ایک جنبش لب کے ذریعہ مغرب سے ڈوبے ہوئے آفتاب کو پلٹا لے اور پروردگار اس کی خاطر پورے نظام شمسی کو منقلب کر دے۔

ــ اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جناب سلیمان کے وصی آصف بن برخیا کے پاس قرآن مجید کا علم نہیں تھا بلکہ اُس دور کی کتاب کا علم تھا جس کے احکام قرآن مجید کے آنے کے بعد منسوخ ہو چکے ہیں تو اگر منسوخ کتاب کا علم نظام سیر وسفر کو منقلب کر سکتا ہے تو جس کے پاس ناسخ کتاب کا علم ہے وہ اگر نظام شمس وقمر کو منقلب کر دے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ یہ کسی انسان کی ذاتی مادی طاقت کا کرشمہ نہیں ہے۔ یہ علم کتاب کا کرشمہ ہے جو اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر امت نے صرف قرآن لے کر اپنے کو گمراہ نہ کر لیا ہوتا اور صاحبان علم سے علم کتاب بھی لے لیا ہوتا تو وہ آج عارف حقائق بھی ہوتی اور صاحب قوت وطاقت بھی۔

یہ امت کی بدقسمتی ہے کہ اس نے علم کتاب کے راستہ کو چھوڑ دیا اور اس کے نتیجہ میں اس طرح کمزوری کا شکار ہو گئی کہ مٹھی بھر اسرائیلی اسے زندگی کی بھیک دے رہے ہیں اور وہ نہایت ذلّت کے ساتھ بھیک لے کر خوش ہو رہی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ آج بھی ایسے افراد پائے جاتے ہیں جنھوں نے راسخون فی العلم سے علم کتاب لیا ہے اور وہ علم کتاب کی توانائیوں کے حامل ہیں اور انھیں کے زور پر دنیا کی ہر بڑی طاقت کو چیلنج کر رہے ہیں اور کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا ہے۔

علم کتاب میں انکشاف اور طاقت کا باہمی ارتباط دیکھنا ہے تو مولائے کائنات کے بچپنے کے دو واقعات کی طرف نظر کرنا ہوگی۔ ایک آغوشِ رسالت میں تلاوت قرآن۔ اور دوسرے گہوارہ میں کلۂ اژدر کا دو پارہ کر دینا۔ گویا آپ تلاوت کر کے علم کتاب کا اعلان کر رہے تھے اور کلۂ اژدر کو دو نیم کر کے علم کتاب کی قوت اور طاقت کا اعلان فرما رہے تھے۔ کاش امت اسلامیہ اس نکتہ کو سمجھ سکتی۔؟

والسّلام علیٰ من اتبع الهدیٰ

منازلِ شہادت امیر کائناتؑ

الف۔ شہادت سے چند روز قبل منبر کی بلندی سے اپنے فرزند امام حسنؑ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اس ماہ رمضان کے کتنے دن گذر چکے ہیں؟ عرض کی تیرہ — پھر امام حسینؑ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟ عرض کی سترہ۔ فرمایا خدا کی قسم اب امت کا بدترین انسان میری ریش سفید کو میرے خون سے رنگین کرنے والا ہے۔

استنتاج :

اس روایت سے سب سے اہم نکتہ علم امامت کے بارے میں منظر عام پر آتا ہے کہ امام حسنؑ کو مہینہ کی صحیح تاریخ کا علم ہے جب کہ عام طور پر تاریخوں کا مسئلہ مشکوک ہی رہتا ہے اور امام حسینؑ کی زبان سے اس سے زیادہ عظیم علم کا اظہار ہو رہا ہے کہ مہینہ کی گذرنے والی تاریخوں کا حساب تو گذشتہ رویت کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے لیکن مہینہ میں باقی رہ جانے والے دنوں کا حساب انتہائی مشکل بلکہ بعض اوقات ناممکن ہے کہ اس کا تعلق آئندہ رویت سے ہے اور مستقبل کا علم ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔

اس کے بعد امیر المومنینؑ نے اپنے علم کا اعلان کیا اور اس واقعہ کی اطلاع دی جس کے بظاہر امکانات نہیں تھے کہ آپ اپنے دار الحکومت میں مقیم تھے اور چار طرف آپ کے ملنے والوں کا حلقہ تھا اور نہایت سکون کے ساتھ صبح کی نماز کے وقت بھی مسجد کی طرف تن تنہا جایا کرتے تھے۔

ب۔ ۱۹ر رمضان کی صبح جب مسجد میں تشریف لائے تو اذان کے ساتھ خود ابن ملجم کو بھی

بیدار و ہوشیار کیا کہ وقت نماز آگیا ہے اور یہ سونے کا طریقہ اسلامی طریقہ نہیں ہے۔

استنتاج :

اس واقعہ سے تین باتوں کا اندازہ ہوتا ہے :

• پروردگار کا منصب دار منزل ہدایت میں اپنے اور پرائے کی تفریق نہیں کرتا ہے بلکہ ہر ایک کو اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ کرتا ہے چاہے وہ اپنا قاتل ہی کیوں نہ ہو۔

• مولائے کائنات کا کردار یہ ہے کہ آپ نماز کے وقت اپنے قاتل کو بھی سوتا نہیں دیکھ سکتے ہیں اور اسے بھی نماز کے لئے بیدار کر دیتے ہیں اگرچہ آپ جانتے ہیں کہ اس کی نماز کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

• علیؑ اس صاحب کردار کا نام ہے جو نماز کے وقت اپنے قاتل کو بھی بیدار کرتا ہے۔ وہ اپنی نماز کے لئے کسی غلام یا آزاد کے بیدار کرنے کا محتاج نہیں ہے۔

ج ـ مولائے کائنات نے فرق اقدس پر ابن ملجم کی تلوار لگنے کے بعد زبان مبارک پر "فزت ورب الكعبة" کا فقرہ جاری فرمایا اور پھر خاک مسجد کو اٹھا کر زخم سر پر ڈالنا شروع کیا اور امام حسنؑ کے آنے کے بعد انھیں نماز پڑھانے کا حکم دیا۔

استنتاج :

ان حالات سے درج ذیل امور کا اندازہ ہوتا ہے :

• مولائے کائنات نے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ اسلام میں کامیاب زندگی کا معیار دشمن کا گلا کاٹنا نہیں ہے بلکہ اپنا سر کٹانا ہے کہ گلا کاٹنے میں اس جذبۂ قربانی کا اظہار نہیں ہوتا ہے جس جذبۂ قربانی کا اظہار سر کٹانے میں ہوتا ہے۔

• مولائے کائنات نے کامیابی کے اعلان میں "ربِّ کعبہ کی قسم" کا استعمال کیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ کامیابی تازہ نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ کعبہ سے ملا ہوا ہے۔ پہلا سجدۂ بندگی اس وقت ہوا تھا جب سرزمین کعبہ پر قدم رکھا تھا اور آخری سجدہ آج ادا ہو رہا ہے۔

• خاک مسجد کو زخم سر پر ڈال کر مولائے کائنات نے واضح کر دیا کہ زخموں کے لئے نقصان دہ دنیا کی خاک ہے لیکن شہید راہ خدا کے مقتل کی خاک مضر نہیں ہے بلکہ خاک شفا

اور صحت بخش ہے۔

د ـ مولائے کائنات کی شہادت حالت صیام میں مسجد کوفہ اور حالت سجدہ میں ہوئی جس سے تین امور کا اندازہ ہوتا ہے۔

• انسان زندگی کے سنگین ترین لمحات میں بھی عبادت الٰہی کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔

• زندگی کے خطرات مسلمان کو خانۂ خدا سے الگ نہیں کر سکتے ہیں۔ مسلمان کا کام خانۂ خدا کی آبادی ہے اور آبادی خانۂ خدا کا اہتمام کرنے والے اس راہ میں جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔

• علیؑ کے قاتل نے سجدہ کی حالت کا انتخاب اس لئے کیا کہ حالت قیام و رکوع میں ہاتھ آزاد ہوتے ہیں اور قاتل کو معلوم ہے کہ جب تک علیؑ کے ہاتھ آزاد ہیں ان پر حملہ کرنا آسان نہیں ہے۔ سجدہ میں نمازی کے ہاتھ مقید ہو جاتے ہیں لہٰذا اس عالم میں کوئی بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔

• سجدہ کی شہادت نے ان نصیریوں کا خیال بھی باطل کر دیا جو علیؑ کو خدا بنا کر سجدہ سے بالاتر بنانا چاہتے تھے اور ان خارجیوں کی بھی تردید کر دی جو مولائے کائناتؑ کو بے عمل قرار دے کر کافر قرار دینا چاہتے تھے۔

ھ ـ ابن ملجم نے تلوار کو زہر میں بجھا کر مولائے کائنات کے سر اقدس پر وار کیا۔ جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صاحب سرّ الشہادتین نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی شہادت کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ پروردگار نواسوں کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ کو دونوں طرح کی شہادت کا اجر دینا چاہتا تھا کہ ایک فرزند کے ذریعہ زہر کی شہادت مل جائے اور دوسرے کے ذریعہ خنجر و شمشیر کی شہادت جس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے شرف شہادت کی تکمیل میں نواسوں کا واسطہ شامل ہو گیا لیکن مولائے کائناتؑ کو دونوں شہادتوں کا شرف مکمل طور پر براہ راست حاصل ہو گیا۔

و ـ زخمی ہونے کے بعد بیت الشرف میں آکر محمد حنفیہ سے فرمایا کہ مسلمانوں سے کہہ دو کہ میں عنقریب دنیا سے جانے والا ہوں لہذا جو دریافت کرنا ہو دریافت کر لیں اور

محمد حنفیہ نے مسلمانوں کے درمیان یہ اعلان کر دیا۔

• یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ امامؑ سر کے زخمی ہونے کے بعد اور مغز سر کے دو پارہ ہو جانے کے بعد بھی بہکتا نہیں ہے اور اس کا دماغ مسلسل کام کرتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب وصی کا دماغ اتنا مستحکم اور فعال ہوتا ہے تو پیغمبرؐ کا دماغ ایک بخار میں کس طرح گزر ہو سکتا ہے۔

ن۔ مولائے کائناتؑ کے فرق اقدس پر ایک شب قدر میں تلوار لگی اور پھر دوسری شب قدر میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

• گویا اسلام میں شب قدر کے دو رُخ ہو گئے۔ ایک شب قدر میں قرآن صامت اُدھر سے اِدھر آرہا تھا اور ایک شب قدر میں قرآن ناطق اِدھر سے اُدھر جا رہا تھا۔

واضح رہے کہ مسجد میں شہادت امیرؑ نے مسجد کے شرف میں اضافہ کر دیا ہے — اور صاحبان ایمان کے دلوں کو مسجد کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ مسجد سے دور رہنے والا علیؑ کے بلند ترین کمال سے دور ہے اور اسے شہادت کی عظمت کا کوئی عرفان نہیں ہے۔!

سراپا ہدایت کردار

اگر دنیا کے مادّہ سے پیدا ہونے والی اور مادی ماحول میں زندگی گذارنے والی مخلوق بھی جنّت میں سکونت کی حقدار ہو جاتی ہے تو جس کی تخلیق سیب جنت سے اور تربیت آغوش رسالت میں ہوئی ہو اسے خاتون جنّت ہونا ہی چاہیئے اور پھر اس کی آغوش مقدس میں پلنے والے بچّوں کو سرداریٔ جنّت کا شرف ملنا ہی چاہیئے اس میں کوئی بات حیرت و استعجاب کی نہیں ہے۔

دنیا کے انسانوں کی زندگی میں بھی ایمان و کردار کی بنا پر ایسے حالات اور واقعات مل جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے نمونۂ عمل بن جاتے ہیں تو جسے پروردگار عالم نے اس اہتمام وانتظام کے ساتھ پیدا کیا ہو اُسے سراپا ہدایت ہونا ہی چاہیئے۔

معصومۂ عالمؑ جناب فاطمہؑ کی تخلیق میں یہ خاص اہتمام اس بات کی علامت ہے کہ پروردگار عالم نے انھیں ہدایت لینے کے لئے نہیں بلکہ ہدایت دینے کے لئے بنایا ہے اور ان کی تخلیق جنّت کی سکونت کے لئے نہیں جنّت کی سیادت کے لئے ہوئی ہے۔ ان کا کردار ایک پوری صنف بلکہ پورے عالم انسانیت کے لئے سراپا ہدایت ہے۔

تفصیلات کے لئے کتابیں اور مولفات درکار ہیں۔ اس مقام پر صرف حیات معصومہؑ کا ایک نقشہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پروردگار نے اس زندگی کو کس طرح سراپا کردار اور سراپا ہدایت قرار دیا ہے۔

• یہ بات مسلمات میں ہے کہ معصومۂ عالم کی تخلیق اس سیب جنّت سے ہوئی ہے جسے کسی معراج کے سفر میں سرکار دو عالمؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ (مستدرک حاکم ۱/۱۵۴، تاریخ بغداد ۵/۸۷، ذخائر العقبیٰ ص ۴۴، مناقب ابن المغازلی ص ۳۵۸، میزان الاعتدال

۲/۹۷، مقتل خوارزمی ص ۶۴)

اور اس تخلیق میں بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس طرح پروردگار نے خاتون جنت بنانے کے لئے ایسے پاکیزہ مادہ سے پیدا کیا ہے اور ایسے پاکیزہ ماحول میں رکھا ہے۔ اسی طرح ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر اپنی اولاد کو جنتی بنانا چاہتا ہے تو اس کی تخلیق میں حلال وطیب مادہ کا انتظام کرے اور پھر تربیت کے لئے بھی پاکیزہ ماحول تیار کرے۔ اس کے بغیر اولاد اپنے مقدر اور اپنے ایمان وکردار کی بنا پر جنتی ہو بھی جائے تو ماں باپ کا فرض تربیت وہدایت بہرحال انجام نہیں پاتا ہے اور اس کی مسئولیت ان کے ذمہ باقی رہ جاتی ہے جس کے بارے میں روز قیامت ضرور سوال کیا جائے گا۔

• جناب فاطمہؑ کی تخلیق کے لئے پروردگار نے پیغمبر اسلامؐ جیسے باپ اور جناب خدیجہ جیسی ماں کا انتخاب کیا ہے جس کے اسلام اور کردار کی تاریخ انسانیت نے گواہی دی ہے اور جس نے ایسی عظیم ترین اولاد کی تمنا میں عرب کے تمام رشتوں کو ٹھکرا دیا کہ صاحبان جاہ ومال کثرت اولاد کا سبب تو بن سکتے ہیں لیکن عظیم ترین اولاد کی ماں بننے کے لئے عظیم ترین شوہر کا انتخاب کرنا پڑے گا چاہے اس راہ میں سماج کے تمام قوانین کو ٹھکرا کر خود ہی پیغام کیوں نہ دینا پڑے اور خود ہی مہر کیوں نہ ادا کرنا پڑے اور سارا مال شوہر کی راہ میں قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اور اس انداز ازدواج میں بھی یہ ہدایت پائی جاتی ہے کہ جو مرد بہترین اولاد کا خواہشمند ہے اسے صاحب کردار عورت کا انتخاب کرنا ہوگا اور جو عورت بہترین اولاد کو اپنی زینت آغوش بنانا چاہتی ہے اسے بہترین شوہر کا انتخاب کرنا ہوگا۔

شکل وصورت، حسن وجمال۔ مال ومنال۔ جہیز وخاندان۔ سماجی حیثیت اور سیاسی شخصیت کی بنیاد پر ہونے والے رشتہ دنیاداری کا سامان تو فراہم کرسکتے ہیں لیکن صحن خانہ کو باشندگان جنت کی منزل نہیں بنا سکتے ہیں۔

عقد جناب خدیجہؓ نے اس نکتہ کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ شادی کا کوئی تعلق دولت یا نوکری سے نہیں ہے۔ انسان صاحب کردار ہو اور دست وبازو میں کھانے کمانے

کی طاقت رکھتا ہو تو اسے شوہر بنایا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ عقد کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ جس دور میں جناب خدیجہ نے سرکار دوعالمؐ سے عقد کیا ہے اُس دور میں تو سرکار دوعالمؐ حضرت خدیجہؓ ہی کے مال سے تجارت کر رہے تھے اور اپنا کوئی ذریعہ معاش بھی نہ تھا جس کی بنا پر زوجہ کے مقابلہ میں فخر کرسکیں کہ اگر وہ ملیکۃ العرب ہے تو میں عرب کے عظیم ترین سرمایہ دار کا شہزادہ ہوں۔

خود سرکار دوعالمؐ نے بھی اس عقد سے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ صاحب عقیدہ وکردار خاتون مل جائے تو عقد کرنے میں تمام سماجی اصول اور جذباتی اسباب کو نظر انداز کر دینا چاہیئے اور صرف عقیدہ وکردار کی بنا پر عقد کر لینا چاہیئے کہ اسی سے عظیم ترین اور حسین ترین مستقبل کی تخلیق کا عمل انجام پاتا ہے۔

• جناب فاطمہؑ کی ولادت ۵ بعثت میں ہوئی ہے جب پیغمبر اسلامؐ کی زندگی انتہائی شدائد سے گذر رہی تھی اور کفار مکہ مستقل اذیتوں پر اذیتیں دے رہے تھے اور ہر آن یہ فکر تھی کہ کس طرح اس شمع رسالت کو خاموش کر دیا جائے تاکہ توحید الٰہی کا نعرہ دب جائے اور مُردہ اصنام کو ایک زندگی حاصل ہو جائے۔ جس کے نتیجہ میں تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سرکار کو شعب ابوطالبؓ میں پناہ لینا پڑی اور تین سال اس عالم میں گذارنا پڑے کہ آخر کار درختوں کے پتوں پر گذارہ ہونے لگا اور اللہ کے نیک بندے ایک لقمۂ نان سے بھی محروم ہوگئے۔ (سیرۃ ابن ہشام ۱/۳۷۶، ۲/۱۷، طبری ۲/۷۴)

جناب فاطمہؑ کی عمر اس وقت صرف دو یا تین سال کی تھی لیکن آپ نے ان تمام مصائب میں ماں باپ کا ساتھ دیا اور ایک لمحہ کے لئے بھی فریاد نہیں کی جو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کی ہر شریف اولاد کا فرض ہے کہ ماں باپ کے نیک مقاصد میں ان کا ساتھ دے اور اپنے مطالبات سے ان کی پریشانیوں میں اضافہ نہ کرے۔

ہمارے معاشرہ میں یہ عمر صبح وشام تقاضوں اور مطالبات کی ہوتی ہے اور کسی بچہ کو ماں باپ کی کسی پریشانی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ لیکن جناب فاطمہؑ نے واضح کر دیا کہ ہمارا کردار امت کے کردار سے الگ ہے اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ امت کے باہوش افراد

اس بات کا خیال رکھیں اور ماں باپ کوئی بھی ایسا تقاضا نہ کریں جو ان کے لئے باعث تکلیف ہو۔

• شعب ابوطالبؑ کا محاصرہ ختم ہوا تو جناب سیدہؑ کی زندگی ایک نئی مصیبت سے دوچار ہوگئی کہ آپ کی شفیق ترین والدہ گرامی کا انتقال ہوگیا اور ایک طرف آپ ماں کی شفقت و عنایت سے محروم ہوگئیں اور دوسری طرف اسلام بہترین مددگار سے محروم ہوگیا۔

اس حادثہ سے چند روز قبل سرکار دو عالمؐ ایک عظیم ترین مصیبت سے دوچار ہوچکے تھے کہ آپ کے شفیق ترین چچا جناب ابوطالب کا انتقال ہوچکا تھا اور اب جناب خدیجہ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

سرکار دو عالمؐ کی زندگی ہر اعتبار سے مصائب کا مرکز بن گئی اور بظاہر بے سہارا ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ ان حوادث کا جس قدر اثر ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا اور آپ نے پورے سال کا نام 'عام الحزن' رکھ دیا۔

عام الحزن کے نام ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ پر ان مصائب کا کتنا اثر تھا اور آپ کس قدر رنجیدہ تھے لیکن جناب فاطمہؑ نے سات آٹھ برس کی کمسنی میں آپ کا اس قدر ہاتھ بٹایا کہ اپنے واقعاً "ام ابیہا" ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا کہ جس طرح ایک ماں اپنے بچہ کے غم کا بہترین مداوا ہوا کرتی ہے اسی طرح جناب فاطمہؑ نے پیغمبر اسلامؐ کے ہم و غم میں باپ کا مکمل ساتھ دیا اور امت کو ہوشیار کر دیا کہ اولاد کا فرض ہے کہ باپ کے بلند ترین مقصد میں اس کا ساتھ دے اور اس راہ میں ہر راحت و آرام کے تصور کو اپنے ذہن سے باہر نکال دے۔

• ابھی جناب فاطمہؑ کی عمر صرف آٹھ سال تھی کہ مکہ کے مصائب اور ابوطالبؑ کے انتقال کی بنا پر پروردگار نے اپنے حبیب کو ہجرت کا حکم دے دیا اور آپ مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ جس رات آپ نے مکہ چھوڑ کر مدینہ کا رُخ کیا ہے اس رات بستر پر بحکم پروردگار اپنے بھائی علیؑ کو جگہ دی تھی اور گھر میں جناب فاطمہؑ۔ جناب فاطمہؑ بنت اسد جیسی خواتین تھیں جن کو ساتھ لے کر آنے کا حکم حضرت علیؑ کو دیا گیا تھا۔

ظاہر کہ وہ مکان جو دشمنوں کے محاصرہ میں ہو۔ جس کے چاروں طرف تلواریں

چمک رہی ہوں اور نیزے لچک رہے ہوں اس میں اگر ایک مجاہد کا بستر پر سو جانا ایک معجزہ ہے تو ایک کمسن خاتون کا خاموش رہ جانا بھی کسی معجزہ سے کم نہیں ہے۔

اس رات میں تو تاریخ نے یہ منظر بھی نقل کیا ہے کہ بزرگ ترین صحابی کی آنکھوں میں خوف کے آنسو آگئے جب کہ دشمن غار کا محاصرہ کئے ہوئے نہیں تھے اور سہارا دینے والے سرکار دو عالمؐ ساتھ موجود تھے۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ گواہ ہے کہ جناب فاطمہؑ کی آنکھ میں نہ کوئی آنسو آیا اور نہ آپ کے گریہ و زاری کی کوئی آواز سُنی گئی اور یہ بات اگر ایک طرف عظمت و شجاعت و ہمّت کی دلیل ہے تو دوسری طرف اس امر کی تعلیم بھی ہے کہ انسان کو حق کی راہ میں مصائب سے گھبرانا نہیں چاہیئے اور دشمن کسی قدر کیوں نہ ہو جائیں اس کثرت کے مقابلہ میں وحدت پروردگار کا خیال رکھنا چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہمیشہ مظلومین اور صابرین کے ساتھ ہے اور کسی حال میں انھیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا ہے۔

• ہجرت کے بعد جب امیرالمومنینؑ جناب فاطمہؑ بنت محمدؐ۔ فاطمہ بنت اسد اور فاطمہ بنت زبیر کو لے کر مدینہ آگئے اور مسلمانوں کو مکہ کے مصائب سے قدرے سکون مل گیا تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد کفار نے مدینہ پر حملہ کا ارادہ کر لیا اور مسلمانوں کی طرف سے قافلہ تجارت کو لوٹنے کا بہانہ بنا کر ایک میدان جنگ گرم کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ سرکار دو عالمؐ نے نہایت درجہ بے سروسامانی کے ماحول میں اس میدان کا مقابلہ کیا اور پروردگار نے مسلمانوں کے اخلاص عمل اور سرکار دو عالمؐ کے معصوم کردار کی بنا پر اسلام کو مظفر و منصور بنا دیا۔ جہاں کفر کے تقریباً تمام سربراہ کام آگئے اور مسلمانوں کو کافی مال غنیمت ہاتھ آگیا جس میں سے ایک زِرہ مولائے کائناتؑ کو بھی ملی جو اس وقت کام آئی جب آپ نے جناب فاطمہؑ کے لئے عقد کا پیغام دیا اور مہر کے ادا کرنے کے لئے سرکار دو عالمؐ کے حکم سے اس زِرہ کو فروخت کرکے معصومۂ عالمؑ کا مہر ادا کیا جس کی قیمت ۴۸۰ یا ۵۰۰ درہم تھی جو خود جناب خدیجہ کے مہر کی مقدار تھی جسے تاریخ نے بارہ اوقیہ اور نصف لکھا ہے اور اوقیہ کی مقدار ۴۰ درہم کے برابر ہوتی ہے۔ (سیرۃ حلبیہ ۱/۱۶۵)

علامہ ابن شہرآشوب نے مناقب ۲/۴۰۸ اور علامہ مجلسی نے بحار ۲۳/۲۰ میں زِرہ

کی قیمت پانچسو تحریر کی ہے۔

اس واقعہ سے پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ شادی میں کسی فریق کے دولتمند ہونے کی شرط نہیں ہے۔ شادی دو انسانوں کے رشتہ اور رابطہ کا نام ہے دو شخصیتوں کے مقابلہ اور موازنہ کا نام نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مولائے کائناتؑ کی ظاہری غربت کے باوجود سرکار دو عالمؐ نے نقد مہر کا مطالبہ کر دیا تاکہ امت میں مہر ادا کرنے کا شعور پیدا ہو اور اس کے ذکر کو تبرک نہ بنا دیا جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس عقد میں جہیز کا سامان مہر کی رقم سے خریدا گیا ہے جو جہیز اور مہر میں تناسب پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے کہ شوہر جس قدر بھی جہیز کا طلبگار ہے اسی اعتبار سے مہر ادا کر دے تاکہ زوجہ کے گھر والے جہیز کا سامان فراہم کر کے اس کے حوالے کر سکیں۔

• معصومۂ عالمؑ کا عقد تاریخ کے بیان کے مطابق مسجد نبوی میں انجام پایا تھا۔

(کشف الغمہ ۱/۳۵۸، بحار الانوار ۴۳/۱۲۰-۱۲۹)

جو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے مبارک رشتہ کو ایسے ہی مبارک مقام پر انجام پانا چاہیئے تاکہ تمام مسلمان بلا تفریق رنگ و نسل شرکت کر سکیں اور انسان جگہ کی برکت سے بھی استفادہ کر سکے۔ مگر افسوس کہ انقلاب زمانہ نے مساجد کو زندگی کے بجائے موت کے مسائل کا حل بنا لیا اور مسجدیں شادی اور مسرت کا مرکز ہونے کے بجائے فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی کا مرکز بن گئیں۔!

• معصومۂ عالمؑ کا عقد ماہ رجب میں ہوا لیکن رخصتی کو ماہ ذی الحجہ تک معطل رکھا گیا اور سنہ ۲ھ کے ماہ ذی الحجہ میں شہزادی کو شوہر کے گھر کی طرف رخصت کیا گیا اور بعض حضرات کے بیان کے مطابق عقد کے ایک ماہ کے بعد۔ (مسار الشیعہ ص ۱۰۔ مناقب ابن شہر آشوب ص ۱۱۲، تقویم المحسنین، بحار ۴۳/۱۱۰)

جو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ نئی زندگی میں قدم رکھنے کے لئے عورت کی زندگی کے ابتدائی مراحل کو اپنے گھر میں انجام پانا چاہیئے جہاں اسے کسی طرح کی وحشت کا سامنا نہیں

ہوتا ہے اور ازدواجی زندگی کا آغاز سسرال کے وحشت کدہ سے نہیں ہوتا ہے جہاں ایک عورت زندگی کی پہلی منزل میں ہزار طرح کی وحشت اور دہشت کا شکار رہتی ہے۔

ہمارے ملک کا ماحول سیرت معصومینؑ کو مکمل طور پر اپنانے کی اجازت دیتا اور ایک عورت کے ساتھ جانے اور صبح سویرے واپس لانے کے بجائے اگر عورت اور شوہر کی ملاقات خود عورت کے گھر میں ہو جاتی تو شائد زندگی ہزاروں گنا زیادہ خوشگوار ہوتی اور عورت کسی طرح کی دہشت اور وحشت کا شکار نہ ہوتی۔

البتہ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے تقلید آباء اور پابندی رسم و رواج سے بڑی حد تک آزاد ہونے کی ضرورت ہے جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔!

• رسول اکرمؐ نے اپنی دختر نیک اختر کو نہایت درجہ مختصر سامان جہیز دیا اور وہ بھی شوہر کے دئے ہوئے مہر میں سے خرید کر۔ اور صرف وہ سامان جو دونوں کے مشترکہ ضروریات میں شامل تھا جس میں نہ شوہر کی مخصوص سواری کا ذکر تھا اور نہ اس کی مخصوص گھڑی کا۔ لیکن ہمارے معاشرہ نے اس نظام کو بھی یکسر منقلب کر دیا اور جہیز مہر سے بالکل الگ ہو گیا اور اس کا سارا زور صرف شوہر کے ضروریات پر صرف ہونے لگا۔

• مولائے کائنات کے بیت الشرف میں آنے کے بعد زندگی کا یہ عملی معاہدہ سامنے آیا کہ گھر کے اندر کا کام صدیقہ طاہرہؑ انجام دیں گی اور باہر کا کام مولائے کائنات انجام دیں گے۔ ایسا نہیں ہوگا کہ باہر سامان کی خریداری، سماجی تعلقات کی پاسداری کا کام زوجہ انجام دے گی اور بچوں کے کھلانے کا کام شوہر انجام دے گا جو ہمارے ترقی یافتہ سماج کا طرۂ امتیاز ہے۔

• واضح رہے کہ مولائے کائنات کے ولیمہ میں مختلف صحابۂ کرام نے بھی حصہ لیا تھا۔ سعد نے دنبہ فراہم کیا اور دیگر افراد نے غلہ کا انتظام کیا۔ رسول اکرمؐ نے روغن، کھجور اور دیگر اشیاء کا بندوبست فرمایا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ولیمہ صرف لوٹ کر کھانے کے طعام کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں بھی شوہر سے تعاون کیا جائے تو بہترین کار خیر ہے۔

• صدیقہ طاہرہؑ کی زحمتوں کو دیکھ کر مولائے کائنات نے مرسل اعظمؐ سے ایک

شریک خدمات کا مطالبہ کیا تو آپ نے تسبیح زہراؑ کی تعلیم دے دی کہ مسلمان کی زندگی کا بہترین مددگار ذکر خدا سے بالاتر کوئی نہیں ہے اور انسان کو اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرنا چاہیئے۔

• گھر کے اندر ایک خاص طریقہ کار یہ بھی تھا کہ صدیقہ طاہرہؑ دال پکاتی تھیں تو مولائے کائنات اسے صاف کیا کرتے تھے اور مولائے کائنات نفقہ کا بندوبست کرتے تھے تو صدیقہ طاہرہؑ اون کاتنے میں حصہ لیا کرتی تھیں جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام میں نہ شوہر کی انانیت کی کوئی جگہ ہے اور نہ عورت کے احساس کمتری کی۔ دونوں کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کریں تاکہ ایک مشترک زندگی کو مشترک انداز سے گذاریں اور کسی طرح کا کوئی اختلاف نہ ہونے پائے۔

• پروردگار عالم نے صدیقہ طاہرہؑ کو پانچ اولاد عطا کی اور آپ نے سب کو راہ خدا میں قربان کر دیا جو اس بات کی علامت ہے کہ صاحب ایمان کی اولاد گھر کے کاموں کے لئے ذخیرہ نہیں کی جاتی ہے بلکہ وقت آنے پر راہِ خدا میں قربان کی جاتی ہے۔

• معصومۂ عالمؑ گھر کی خدمت کی ساری ذمہ داری کے باوجود اس قدر عبادت کیا کرتی تھیں کہ بقول حسن بصری ان سے زیادہ عبادت گذار اور زاہد کسی انسان کو نہیں دیکھا گیا۔

(مناقب ابن شہر آشوب ۳/۳۴۱)

• تعلیم و تربیت کا یہ عالم تھا کہ گھر میں کام کرنے والی خادمہ کو اس قدر علم و فضل سے آراستہ کر دیا کہ جناب فضّہ نے ۲۰ سال تک آیات قرآنی کے علاوہ کوئی کلام نہیں کیا اور ہر مقصد کا اظہار آیات قرآنی سے کیا کرتی تھیں اور ہر سوال کا جواب آیات قرآنی سے دیا کرتی تھیں۔

• گھر کی ساری ذمہ داریوں کے علاوہ شہزادی کائناتؑ نے اسلامی مجاہدات میں بھی بقدر امکان حصہ لیا ہے۔ احد کے معرکہ میں پیغمبرؐ کے زخموں کا علاج کیا ہے۔ (مسند احمد بن حنبل ص ۳، سیرۃ ابن ہشام ۳/۲۰۶)

جناب حمزہ کی لاش پر حاضری دی ہے۔ (مغازی ۱/۲۹۰)

خندق کے موقع پر رسول اکرمؐ کی غذا کا بندوبست کیا ہے۔ (طبقات ابن سعد ۱/۱۱۴)

فتح مکہ کے عظیم واقعہ میں شرکت فرمائی ہے۔ (مغازی واقدی ۱/۸۳۰)

رسول اکرمؐ کے آخری حج میں شریک سفر رہی ہیں۔ (مغازی ۳/۱۰۸۷)

• رسول اکرمؐ کے آخری لمحات حیات میں بھی باپ کی خدمت میں حاضر رہیں جب آپ کا سرِ اقدس مولائے کائنات کے زانو پر تھا اور بیٹی آپ کے غم میں برابر کی شریک تھی۔

• رسول اکرمؐ کے بعد جب غصب فدک و خلافتِ علیؑ کے مراحل سامنے آئے تو وہاں بھی صدیقہ طاہرہؑ نے اپنے خطبوں کے ذریعہ حقائق کا اعلان کیا اور ہر قدم پر مولائے کائنات کی مدد کی۔

• ان تمام مصائب و حوادث کے باوجود روایات میں آپ کی زبان مبارک سے مختصر اور مفصل ۲۶۰ اقوال و ارشادات نقل کئے گئے ہیں جب کہ عالم اسلام کی بے رُخی نے ان کی تعداد صرف دس قرار دی ہے (الثغور الباسمہ فی حیاۃ سیدتنا فاطمہؑ۔ علامہ سیوطی ص ۵۲) اور علامہ بدخشانی نے حاشیہ میں اسے اٹھارہ تک پہونچا دیا ہے۔!

افسوس کہ اسقدر فضائل و مناقب۔ تعلیمات و ارشادات کی مالک خاتون دنیا سے جائے تو یہ وصیت کر کے جائے کہ میرا جنازہ رات کی تاریکی میں اٹھایا جائے اور میرے ظالم میرے جنازہ میں شرکت نہ کرنے پائیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

زندگانی امام حسنؑ

ولادت باسعادت مدینہ منورہ میں ۱۵ رمضان ۳ھ میں ہوئی اور شہادت ۲۸ صفر ۵۰ھ میں معاویہ کی طرف سے زہر دغا کی بنا پر واقع ہوئی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

صفات و کمالات میں بزرگوں کے وارث اور پروردگار کے نمائندہ تھے۔ تاریخ میں مختلف واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

علم

• ایک شخص امیرالمومنینؑ کے پاس اظہارِ محبت کے لئے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ تو معاویہ کا جاسوس ہے۔ قیصر روم نے اس سے چند سوالات کئے ہیں اور اس نے اپنی جہالت کی بنا پر تجھے میرے پاس جواب لینے کے لئے بھیجا ہے۔ خیر اب میرا فرزند حسنؑ جواب دے گا۔

امام حسنؑ نے سوالات اور جوابات دونوں بیان کرنا شروع کر دئے:

۱۔ حق و باطل کا فاصلہ کیا ہے؟ ج۔ چار انگل کا۔ جو آنکھ سے دیکھا وہ برحق ہے (جیسے غدیر) جو کان سے سُنا اس میں باطل کا امکان ہے (جیسے قصۂ غار)۔

۲۔ زمین و آسمان کا فاصلہ کتنا ہے؟ ج۔ بقدرِ آہِ مظلوم، کہ وہ مظلوم کے دل سے نکل کر عرش الٰہی تک جا کر دم لیتی ہے۔

۳۔ قوس قزح کیا ہے؟ ج۔ موسم کی تبدیلی اور رزق کی آمد کی علامت ہے۔

۴۔ خنثیٰ کی میراث کا طریقہ کیا ہوگا؟ ج۔ اس کی شناخت علامات بلوغ سے ہوگی ورنہ پیشاب کرنے کے انداز سے۔

۵۔ مختلف اشیاء میں ایک سے زیادہ ایک سخت شے کیا ہے؟ ج۔ پہلے پتھر ہے۔ اس سے سخت لوہا ہے کہ اسے توڑ دیتا ہے۔ اس سے قوی آگ ہے کہ اسے پگھلا دیتی ہے۔ اس سے قوی پانی ہے کہ اسے بُجھا دیتا ہے۔ اس سے قوی بادل ہے جو اسے اُٹھائے ہوئے ہے۔ اس سے قوی ہوا ہے جو بادل کو حرکت میں لاتی ہے۔ اس سے قوی فرشتہ ہوا ہے جو اس پر حکومت کرتا ہے۔ اس سے قوی ملک الموت ہے جو اسے موت دیدے گا۔ اس سے قوی موت ہے جو انھیں بھی مار دے گی۔ اس سے قوی تر حکم خدا ہے جو موت پر بھی حکومت کرتا ہے۔ (جلاء العیون)

امام کے ارشاد سے اولی الامر کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جنھیں پروردگار اپنے امر کا اختیار دیدے ان کی حکومت دنیا کی ہر مخلوق پر ہوگی۔

ــ صلح کے بعد معاویہ کے ساتھ نخلستان میں تشریف فرما تھے کہ اس نے کہا کہ آپ کے جد بزرگوار نخلستان کے خرموں کا اندازہ بتا دیا کرتے تھے۔ فرمایا کہ میں عدد بھی بتا سکتا ہوں۔ اس نے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے چار ہزار خرمے بتائے۔ توڑنے پر ایک کم نکلا۔ فرمایا یہ غیر ممکن ہے۔ مزدور کی تلاشی لی گئی تو اس کی جیب سے برآمد ہوگیا۔
(منتخب التواریخ)

ــ ایک یہودی نے کہا کہ آپ کے جد کا ارشاد ہے کہ دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنّت ہے حالانکہ آپ کی زندگی اور آپ کا لباس قیدیوں جیسا نہیں ہے۔ فرمایا اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ مومن کے مستقبل کو دیکھا جائے تو دنیا قید خانہ ہے اور کافر کے انجام کو دیکھا جائے تو دنیا ہی جنت ہے۔

اخلاق

• ایک مرد شامی نے راستہ روک کر بُرا بھلا کہا تو فرمایا کہ اگر غذا یا لباس یا سواری

کی ضرورت ہے تو میں اس کا انتظام کر سکتا ہوں۔ بُرا بھلا کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا کہ اسلام کو ایسے ہی اخلاق کی ضرورت ہے جہاں دشمن کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے۔ (بے شک اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنا پیغام کس کے حوالے کرے گا) (جلاء العیون)

• ایک شخص نے آکر فریاد کی کہ میرا دشمن بہت اذیت کر رہا ہے۔ فرمایا وہ کون ہے؟ اس نے کہا غربت۔ آپ نے پانچ ہزار درہم دے کر فرمایا کہ جب دشمن پریشان کرے تو میرے پاس آجانا میں دفاع کا انتظام کر دوں گا۔ (حالانکہ بیت المال مسلمین دوسرے افراد کے قبضہ میں تھا لیکن آل محمدؐ حاجت روائی میں کمی نہیں کر سکتے تھے)۔

معاویہ نے آپ کو طلب کر کے خراج کی فہرست پیش کر دی۔ آپ نے اسے خزانچی کو بخش دیا۔ اس نے مدینہ میں مال تقسیم کرنا شروع کیا اور جب آپ آخر میں تشریف لے گئے تو اُس نے کہا کہ آپ مجھے شرمندہ نہیں کر سکتے۔ میرے خزانے میں بڑی وسعت ہے۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ جتنا مال اب تک تقسیم کیا گیا ہے اتنا تنہا حسنؑ کو دے دیا جائے اس لئے کہ میں فرزند ہند ہوں۔ آپ نے مال پر ایک نگاہ ڈالی اور جب چلتے وقت معاویہ کے نوکر نے جوتیاں سیدھی کر دیں تو سارا مال اس کے نوکر کے حوالے کر دیا کہ میں ابن الزہرا ہوں۔ (جلاء العیون)

اسباب صلح پر روشنی ڈال رہے تھے کہ ایک شامی نے اعتراض کر دیا۔ طاقت ہوتی تو کبھی صلح نہ کرتے۔ فرمایا تجھے شرم نہیں آتی ہے کہ مردوں کے درمیان بیٹھی ہے۔ کہنا تھا کہ اس کی جنس تبدیل ہو گئی اور محفل سے اُٹھ کر بھاگ گیا۔ (امامت کے اقتدار پر اعتراض کوئی مردانہ کام نہیں ہے)۔

دوؔ اعتراضات

آپ کی زندگانی میں دو مسائل کو اکثر زیر بحث لایا جاتا ہے اور انہیں کو طعن و تشنیع کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ ایک مسئلہ طلاق اور ایک مسئلہ صلح۔

طلاق۔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ بہت زیادہ طلاق دیا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں کثرت ازدواج کا افسانہ بھی تیار کیا گیا ہے۔

• ابن ابی الحدید نے علی بن عبداللہ المدائنی سے نقل کیا ہے کہ ازواج کی تعداد سترؔ تھی جب کہ یہ روایت ضعیف اور غیر معتبر ہے۔

• شبلنجی نے نور الابصار میں ۹۰ کی تعداد بتائی ہے اور یہ روایت بھی مرسلہ ہے جس کی کوئی سند نہیں ہے۔

• مجلسیؒ اور ابن شہر آشوب نے قوت القلوب ابو طالب مکیؒ کے حوالے سے ۲۵۰ اور ۳۰۰ کی تعداد نقل کی ہے جب کہ یہ شخص بھی ضعیف تھا۔

(مدائنی کے بارے میں میزان الاعتدال ذہبی کی رائے یہ ہے کہ یہ امام مسلم کی نظر میں ناقابل روایت تھا۔ اور بنی عباس کا مصاحب تھا۔ پھر اس نے ازواج میں نام صرف دس کے نقل کئے ہیں۔ صرف تعداد ۷۰ بتا دی ہے)۔

اس سلسلہ میں روایات بہت کچھ وضع کی گئی ہیں۔ لیکن اس کا مختصر تجزیہ یہ ہے کہ اسلام میں بیک وقت چار سے زیادہ دائمی زوجہ کا امکان نہیں ہے اور پانچویں زوجہ کے لئے ایک کو طلاق دے کر تین ماہ زمانہ عدت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس طرح ایک سال میں بہت سے بہت بارہؔ شادیوں کا امکان ہوگا اور ۳۰۰ کا عدد پورا کرنے کے لئے ۲۵ سال کا زمانہ درکار ہوگا اور کم سے کم مہر فاطمی بھی طے کیا جائے تو ایک لاکھ پچاس ہزار درہم مہر ہوگا۔ نفقہ کے اخراجات الگ ہوں گے۔ امام حسن علیہ السلام کی کل حیات ۴۷ سال ہے۔ ۱۵ سال قبل بلوغ نکالنے کے بعد کل زمانہ ۳۲ سال ہوتا ہے جس میں سے ۳۵ھ تک تو اہلبیتؑ انتہائی پریشانی کی زندگی گذار رہے تھے اور حکومت دوسرے افراد کے قبضہ میں تھی۔ امیر المومنینؑ کا دور حکومت آتے ہی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ان کی شہادت کے فوراً بعد معاویہ سے صلح کی بنا پر پھر بیت المال ہاتھ سے نکل گیا۔ آخر وہ ۲۵ سال کون سے تھے جن میں امام حسنؑ کے پاس ڈیڑھ لاکھ مہر دینے کے لئے تھے اور ۳۰۰ عورتوں کا خرچ بھی چلا رہے تھے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ جھوٹ بولنے والے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔

صلح امام حسنؑ

صلح کے اسباب میں بھی حسب ذیل امور کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے:

۱۔ لشکر کی کمزوری۔ ایک طرف گروہ بندی۔ دوسری طرف مسلسل جنگوں سے خستہ حالی۔ مال غنیمت کی طرف سے مایوسی۔ مذہبی شعور کی کمی۔ معاویہ کی طرف سے پیغام صلح جس کا منظور کرنا قرآنی اعتبار سے فرض تھا۔ عبید اللہ بن عباس جیسے افراد کی خیانت، معاویہ کی طرف سے لوگوں میں رشوت کی گرم بازاری۔ غلط پروپیگنڈے۔

۲۔ دشمن کی طاقت۔ اس کا لشکر اطاعت گذار۔ سپاہی بے شعور۔ باہمی اتحاد۔ اموال کی کثرت، افراد کی جمعیت وغیرہ۔

۳۔ شہادت امیر المومنینؑ سے حالات کی اچانک تبدیلی۔

۴۔ مسلمانوں کے خون کے تحفظ کا خیال۔

۵۔ مدائن کے واقعات۔ جہاں امام حسنؑ کے ساتھ سخت بے ادبی کی گئی اور کوئی دفاع نہ ہوسکا۔

۶۔ حدیث پیغمبرؐ میں صلح کی پیشین گوئی۔

۷۔ عصمت کردار کی بنا پر کسی بھی نامناسب اقدام کا عدم امکان۔

۸۔ صلح کے ذریعہ معاویہ کی حقیقت کے اظہار کا تصور۔

۹۔ یہ خیال کہ معاویہ انکار صلح کو قتل کی دلیل نہ بنالے۔

۱۰۔ یہ فکر کہ صلح نامہ کے ذریعہ معاویہ سے مظالم کا تحریری اقرار لے لیا جائے۔

۱۱۔ یہ سیاست کہ دشمن اسلام ہی کو اسلامی سرحدوں کا محافظ بنا دیا جائے۔ سب سے زیادہ محفوظ طریقہ یہی ہوتا ہے کہ جس سے خطرہ ہو مال اسی کے حوالے کر دیا جائے۔

شرائط صلح امام حسنؑ

۱۔ حکومت معاویہ کے ہاتھ میں اس شرط سے دی جائے گی کہ وہ کتاب وسنت پر

عمل کرے (ابن ابی الحدید)۔ کتاب وسنت پر عمل نہ کرنے کی شکل میں صلح نامہ کی بقا اور حکومت کے استمرار کا کوئی جواز نہ ہوگا اور اس کے بعد معاویہ حاکم صالح کے بجائے غاصب حاکم کہا جائے گا۔

۲۔ معاویہ کے بعد حکومت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی ہوگی اور معاویہ کسی کو ولیعہد نامزد نہیں کرے گا۔ (اصابہ، حیوٰۃ الحیوان۔ الامامۃ والسیاسۃ)

۳۔ اہل عراق کے لئے عمومی امن وامان ہوگا اور کسی کو پریشان نہیں کیا جائے گا۔ (حیوٰۃ الحیوان۔ مقاتل الطالبین)

۴۔ معاویہ اپنے کو امیر المومنین کے لقب سے ملقب نہیں کرے گا۔ (تذکرۃ خواص الامۃ)

۵۔ معاویہ کے پاس شہادت قائم نہیں کی جائے گی۔ وہ صرف امور مملکت کا نگراں ہوگا۔ (اعیان الشیعہ)

۶۔ امیر المومنین علیؑ کو ہرگز برا بھلا نہ کہا جائے گا اور سب علیؑ کے سلسلہ کو یکسر بند کر دیا جائے گا۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید)

۷۔ ہر صاحب حق کو اس کا حق دیا جائے گا۔ (فصول مہمہ، مناقب ابن شہر آشوب)

۸۔ شیعوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ امن وسکون کی ضمانت رہے گی۔ (طبری ۶/۹۷)

۹۔ دارابجرد (اہواز) کا خراج جنگ جمل وصفین کے مقتولین پر تقسیم کیا جائے گا۔ (الامامۃ والسیاسۃ، تاریخ ابن عساکر)

۱۰۔ کوفہ کا بیت المال امام حسنؑ کے اختیار میں رہے گا۔ (تاریخ دول الاسلام)

۱۱۔ امام حسنؑ کو سالانہ دس لاکھ درہم دئے جائیں گے۔ (جوہرۃ الکلام فی مدح السادۃ الاعلام)

۱۲۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور دیگر اہلبیتؑ کو کوئی اذیت نہ دی جائے گی۔ (بحار ۱۰/۱۱۵)

مذکورہ بالا شرائط سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ امام حسنؑ نے معاویہ کو صاحب اختیار واقتدار نہیں بنایا ہے۔ بلکہ اس سے جملہ اختیارات سلب کر لئے ہیں اور اسے بالکل بے دست وپا بنا دیا ہے۔ معاویہ جیسے انسان کے لئے کتاب وسنت پر عمل کی شرط حبس دوام سے کمتر سزا نہیں ہے۔ پھر مستقبل کے لئے ولیعہد نامزد نہ کرنا بنی امیہ کو روز اول ابتر بنا دینے کی مہم ہے جس پر معاویہ جیسے انسان کے لئے عمل ناممکن ہے۔

سبِّ علی پر پابندی بنی امیہ سے تاریخی حربہ کا چھین لینا اور انھیں بے بال و پر بنا دینا ہے۔ بنی امیہ کی کل پرواز جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعہ ہے۔ اب اگر اس کا اختیار بھی سلب کر لیا جائے اور امیر المومنین کہلوانے کا حق بھی نہ دیا جائے تو معاویہ کی زندگی کا سہارا کیا ہوگا۔

صلح حسنؑ نے معاویہ کو مطلق العنان بادشاہ بنا دیا ہے تو اس بادشاہت کی وہی شکل ہے کہ ایک انسان کو ہاتھ پیر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جائے کہ ¼ زمین پر ساری دنیا کے بادشاہوں کی حکومت ہے اور ¾ خطۂ ارض صرف آپ کا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا بادشاہ غرق تو ہو سکتا ہے حکومت نہیں کر سکتا ہے۔

امام حسنؑ نے معاویہ کو پابند بھی بنا دیا اور اس سے سارے جرائم کا اقرار بھی لے لیا۔ اور اس کا دوسرا عظیم فائدہ یہ ہوا کہ محبانِ علیؑ کو فضائلِ علیؑ کے نشر کا موقع مل گیا اور جس طرح کل جمعہ کے خطبہ میں گالیاں دی جاتی تھیں۔ اسی طرح گلدستۂ اذان سے ولایتِ علیؑ کا اعلان شروع ہو گیا جس کے نتیجہ میں اسلامی ذہنیت بالکل منقلب ہو گئی اور مسلمان شعور بیدار ہو گیا۔ یہ صحیح ہے کہ دہشت گردی نے قوم کو امام حسنؑ یا امام حسینؑ کی کھلی حمایت پر آمادہ نہیں ہونے دیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ حالات اس قدر تبدیل ہو گئے کہ امام حسینؑ کو قیام کرنے کے لئے مجاہدین مل گئے اور کربلا کے بعد یزیدیت کا جنازہ نکل گیا۔

صلح حسنؑ کا اشارہ یہ ہے کہ آلِ محمدؐ کا ہدف اور مقصد دینِ الٰہی کا تحفظ ہے۔ اس کے وسائل حالات کے اعتبار سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ کام کوفہ میں حکومت لے کر ہوتا ہے اور صلح حسن میں حکومت دے کر۔ بدر و احد میں یہ کام جان لے کر ہوتا ہے اور مسجد کوفہ میں جان دے کر۔ کربلا میں دونوں وسائل جمع ہو جاتے ہیں اور آلِ محمدؐ جس طرح بدر و احد میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم طاقت سے دبنے والے نہیں ہیں۔ اسی طرح صلح کی منزل میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم طاقت کے زور سے دبانے والے بھی نہیں ہیں۔!

معیارِ صلح و عدمِ صلح

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام دینِ صلح و سلامتی اور قانونِ امن و آشتی ہے۔ وہ دنیا کو سب سے پہلے امن و اطمینان کا پیغام دیتا ہے اس کے بعد بدرجۂ مجبوری میدانِ جدال و قتال کا رُخ کرتا ہے۔ اس نے اپنا نام اسلام رکھا ہے کہ اس کی بنیاد سِلم و تسلیم و سلامتی پر قائم ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ انسان کو ذلّت و خواری اور بیجا تواضع و انکساری کا سبق دیتا ہے۔ اسلام کا بنیادی قانون ذلّت کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ وہ انسانی کرامت کا محافظ اور بشری عزت کا پاسبان ہے۔ اس نے اپنے احکام میں اس سور کے گوشت تک کو برداشت نہیں کیا ہے جس سے بے غیرتی اور بیحیائی پیدا ہوتی ہے تو وہ دوسروں کے مقابلہ میں ذلّت قبول کرنے کو کس طرح پسند کر سکتا ہے۔

اس نے صلح و جنگ کا ایک معیار بنایا ہے جس کا اندازہ اس کے احکام اور اس کے رہنماؤں کے کردار سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تاریخ میں صلح میں بھی ہے اور جنگ بھی ہے لیکن دونوں کے الگ الگ نشانات اور مظاہر ہیں جن کے ذریعہ اس کے حقیقی تعلیمات اور حقائق کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر چند مقامات کا مطالعہ کرنا ہوگا:

— مشرکینِ مکہ نے سرکارِ دو عالمؐ کے پیغامِ توحید کو دیکھ کر اور اس کے خطرہ کا احساس کر کے یہ تجویز رکھی کہ آپ ہمارے خداؤں کو تسلیم کر لیں اور ہم آپ کے خدا کو تسلیم کر لیں، ہم اس ایثار کے لئے بھی تیار ہیں کہ اگر آپ ہمارے خداؤں کی ایک دن عبادت کریں گے تو ہم آپ کے خدا کی عبادت ایک ہفتہ تک کرتے رہیں گے اور اگر آپ ایک ہفتہ کے لئے خدا تسلیم کر لیں گے تو ہم ایک ماہ تک بندگی کرتے رہیں گے۔ بظاہر مطالبہ نہایت درجہ سنجیدہ اور منطقی تھا لیکن قرآن مجید

نے اس کی شدّت سے تردید کی اور اس حقیقت کو بار بار دُہرایا کہ نہ تم میرے خدا کی عبادت کروگے اور نہ میں تمھارے خدا کی عبادت کرسکتا ہوں۔ عبادت توحید کی مقتضی ہے اور تم توحید کے مخالف ہو، اور حق کے باطل کے سامنے جُھکنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

— البتہ اپنے اپنے مقام پر اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں ہے "لکم دینکم ولی دین"۔

• اس سورۂ مبارکہ کافرون سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے عقیدہ محفوظ رہے تو صلح ہوسکتی ہے لیکن عقیدہ خطرہ میں پڑجائے تو صلح کا کوئی امکان نہیں ہے۔

— سرکار دو عالمؐ کے دور میں نجران کے لوگ اپنی عیسائیت پر قائم تھے اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا تسلیم کررہے تھے لیکن اسلام نے نہ ان پر حملہ کیا اور نہ ان کی تباہی کا کوئی انتظام کیا۔ لیکن جب وہ مدینہ میں آکر سرکار دو عالمؐ سے مطالبہ کرنے لگے کہ آپ بھی عیسیٰؑ کو ابن اللہ تسلیم کرلیں تو آپ حکم خدا کے مطابق مباہلہ پر آمادہ ہوگئے اور صاف اعلان کردیا کہ اب سرِ میدان فیصلہ ہوگا اور ایسی بد دعا ہوگی کہ روئے زمین پر ایک بھی عیسائی باقی نہ رہ جائے گا۔

• اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اپنے اپنے عقیدہ کے تحفظ پر صلح وسلامتی کا قائل ہے لیکن مطالبہ بیعت کا جواب میدان میں دینا چاہتا ہے تاکہ کفر کے حوصلے بلند نہ ہونے پائیں۔

— حدیبیہ کے موقع پر کفار نے مطالبہ کیا کہ محمد رسول اللہؐ کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھا جائے تو آپ نے فوراً منظور کرلیا لیکن جب عبادت اصنام کا مطالبہ کیا تھا تو یکسر رد کردیا تھا۔

• جس کا مطلب یہ ہے کہ صلح غلط بات پر نہیں ہوسکتی ہے۔ صحیح بات پر بہر حال ہوسکتی ہے، محمد رسول اللہ کے مقابلہ میں محمد بن عبداللہ غلط نہیں ہے۔ یہ بھی ایک سچی بات ہے اور کفار نے ایک حرف حق کو دوسرے حرف حق سے بدلنے کا مطالبہ کیا تھا اس لئے اسلام نے اسے منظور کرلیا تھا۔

— صفین میں جبتک حاکم شام اپنے اقتدار کو منوانے کی فکر میں رہا امیر المومنینؑ مسلسل مشغولِ جہاد رہے لیکن جب کتاب خدا اور سنت رسولؐ سے فیصلہ کرنے پر آمادہ ہوگیا تو آپ نے جنگ کو موقوف کردیا اور مکّاری کے ساتھ نیزوں پر بلند ہونے والے قرآنوں کو بھی تسلیم کرلیا۔

• جس کا مطلب یہ ہے کہ اقتدار کے مقابلہ میں جنگ ہوتی ہے اور قرآن کی حاکمیت کے

سامنے صلح کرلی جاتی ہے۔ امام حسنؑ نے بھی باپ کی شہادت کے بعد شام کے حاکم سے صلح کی تو اس کی بنیادی شرط یہی رکھی کہ حکومت کا کاروبار قرآن مجید اور سنت رسولؐ کے مطابق ہوگا۔

— امام حسنؑ نے شام کے حاکم کے ساتھ صلح کی اور امام حسینؑ جنگ پر آمادہ ہوگئے اس لئے کہ معاویہ بن ابی سفیان تخت وتاج کا طلبگار تھا۔ امام حسنؑ سے اپنی خلافت کی تصدیق وتوثیق کا طلبگار نہ تھا لیکن یزید نے امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا تھا اور بیعت کے معنی یہ تھے کہ امام حسینؑ اپنے ضمیر کو فروخت کردیں اور یزید کے جملہ منکرات کو جزِ اسلام بنادیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مورد جنگ کا ہوسکتا ہے ـــ صلح و مصالحت کا نہیں ہوسکتا ہے۔

ان تمام مقامات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کو صلح کی بات کرتے وقت اس حقیقت کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ نہ عقیدہ پامال ہو اور نہ عزت نفس پر حرف آئے۔ نہ حقائق کی تباہی ہو اور نہ باطل کو آگے بڑھنے کا موقع ملے ورنہ حق کی پامالی کا وقت آجائے تو گلا کٹا دینا واجب ہے کہ حق کی عظمت اور دین خدا کی کرامت سے بالاتر کسی انسان کی جان عزیز نہیں ہے۔ انسان کو دین حق کی راہ میں ہر نفس ونفیس کو قربان کردینا چاہیئے اور عزت دین کو بچالینا چاہیئے۔!

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

الحسینؑ والقرآن

یوں تو قرآن کریم پروردگار عالم کی طرف سے ہر مرد مسلمان اور ہر فرد انسان کےلئے ایک مکمّل ضابطۂ حیات ہے اور ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنا ہر قدم قرآن کی روشنی میں اٹھائے اور اپنی زندگی کو قرآنی تعلیمات کے سانچہ میں ڈھال دے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ بیشمار افراد اس حقیقت سے غافل ہیں اور ان کے اقدامات یکسر قرآنی تعلیمات سے اجنبی اور بیگانہ ہوتے ہیں۔ وہ افراد نہایت درجہ محدود ہیں جن کی زندگی کا دستور قرآن مجید ہوتا ہے اور جن کے اقدامات قرآن مجید کی روشنی میں ہوتے ہیں۔

اہلبیت طاہرینؑ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے انھیں ہمسر و ہمرنگ قرآن کریم قرار دیا ہے اور ان کی پوری زندگی کے بارے میں یہ ضمانت دی ہے کہ یہ ہمیشہ قرآن کے ساتھ رہیں گے اور قرآن ان کے ساتھ رہے گا اور حوض کوثر تک دونوں میں کسی طرح کی جُدائی نہیں ہوسکتی ہے۔ اب یہ مسلمان کا مقدر ہے کہ وہ ان دونوں کا ساتھ اختیار کرکے اپنے کو گمراہی سے بچالے یا دونوں میں سے کسی ایک سے بھی انحراف کرکے ضلالت ابدی کا حقدار ہوجائے۔

اہلبیتؑ کے بارے میں یہ بات مسلّم ہے کہ ان کے قرآن سے جُدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اسی روشنی میں ان کی زندگی کے ہر اقدام کا جائزہ لیا جاسکتا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ امام حسینؑ نے شہادت کے بعد نوک نیزہ سے تلاوت کرکے اس حقیقت کا سر بازار اعلان کردیا ہے کہ میرا پورا کردار قرآن کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے اور میرا قرآن سے الگ ہونا ناممکن ہے۔ میرے سروتن میں جُدائی ہوسکتی ہے لیکن مجھ میں اور قرآن میں جُدائی ممکن نہیں ہے۔

ذیل میں اسی حقیقت کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

نقش زندگانی

قرآن مجید میں سورۂ احقاف میں ایک انسان کا تذکرہ پایا جاتا ہے کہ ہم نے اسے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کی وصیت کی کہ اس کی ماں نے حمل کے زمانہ میں بھی اور وضع حمل کے ہنگام بھی ناخوشگوار حالات کا سامنا کیا ہے اور اس کا حمل اور رضاعت کا کل زمانہ ۳۰ مہینہ ہے اور جب وہ زندگی کی توانائیوں تک پہونچ گیا اور ۴۰ سال کا ہوگیا تو اس نے پروردگار کی بارگاہ میں دعا کی کہ خدایا مجھے توفیق ہے کہ میں اس نعمت کا شکریہ ادا کروں جو تونے مجھ پر اور میرے والدین پر نازل کی ہیں اور میں ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہوجائے اور میری ذریت میں صالح افراد پیدا کر کہ میں تیری ہی طرف متوجہ ہوں اور تیرا عبادت گذار بندہ ہوں۔

آیت کریمہ کے خصوصیات کو دیکھتے ہوئے مفسرین نے تین احتمالات بیان کئے ہیں کہ تاریخ صلاح و فلاح میں تین ہی افراد ایسے گذرے ہیں جن کا شکم مادر میں رہنے کا زمانہ چھ ماہ ہے لیکن اس کے باوجود دنیا میں زندہ رہے ہیں اور بہترین اعمال انجام دئے ہیں۔ جناب یحییٰؑ، جناب عیسیٰؑ اور امام حسینؑ۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ جناب یحییٰؑ ۴۰ سال سے پہلے ہی راہ خدا میں شہید ہوگئے اور جناب عیسیٰؑ والدین کے بارے میں دعا کرنے سے معذور ہیں کہ پروردگار نے انھیں بغیر باپ کے پیدا کیا ہے لہذا آیت شریفہ میں صاف اشارہ امام حسینؑ کی طرف ہے اگرچہ اس کی شکل اور اس کا عنوان عام ہے۔

امام حسینؑ ہی وہ شخصیت ہیں جن کے حمل اور ولادت کے موقع پر ماں نے ناخوشگوار حالات کا سامنا کیا ہے اور بچہ کی خبر شہادت تک سُنی ہے۔

امام حسینؑ ہی وہ فرزند ہیں جن کا حمل و رضاعت کا کُل زمانہ تیس مہینہ کا ہوتا ہے۔

امام حسینؑ ہی وہ انسان ہیں جن کے ماں باپ دونوں نعمات الٰہیہ کا مرکز۔ اور انعمت علیھم کا مصداق تھے۔

امام حسینؑ ہی وہ نیک کردار ہیں جن کے عمل صالح پر آسمان سے آواز آئی تھی۔ اے نفس مطمئن اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ آ۔ تو ہم سے راضی ہے اور ہم تجھ سے راضی ہیں۔

امام حسینؑ ہی وہ صاحب ذریت ہیں جن کی ذریت میں قیامت تک عباد صالحین کا سلسلہ قائم رہے گا۔

امام حسینؑ ہی وہ سراپا اطاعت ہیں جنھوں نے تہ خنجر بھی آواز دی تھی "رضاً برضائک وتسلیماً لامرک۔"

ان خصوصیات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ امام حسینؑ وہ واحد شخصیت ہیں جنکی پوری تاریخ حیات قرآن مجید نے بیان کی ہے اور اب امام حسینؑ کا فرض ہے کہ جس طرح قرآن مجید نے ان کی حیات کی تصویر کھینچی ہے اسی طرح وہ قرآن مجید کی تعلیمات کی تجسیم کریں اور اپنی زندگانی میں اس کے تعلیمات کو مجسم کر کے سراپا قرآن بن جائیں۔ چنانچہ امام حسینؑ نے ایسا ہی کیا اور اپنی زندگی کو قرآن مجید کے سانچہ میں ڈھال دیا۔

پہلا مرحلہ

ماں باپ کے ساتھ احسانات کی بہترین مثال پیش کرنے کے بعد جب سنہ ۴۰ھ میں امیر المومنینؑ کی شہادت ہوگئی تو اب امام حسینؑ کی زندگی کا پہلا مسئلہ یہ پیش آیا کہ وقت کے حاکم کے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔؟

اُدھر وقت کے حاکم نے صفین کے تلخ تجربہ کے بعد امام حسنؑ کی خدمت میں صلح کی درخواست پیش کر دی اور انھوں نے بحکم قرآن اسے منظور کر لیا "والصلح خیر" اور امام حسینؑ نے مکمل طور پر اس حکم قرآنی پر عملدرآمد کیا۔

دوسرا مرحلہ

صلح کے بعد حاکم شام نے مسلسل صلح نامہ کی مخالفت کرنا شروع کر دی اور اس بات

کی کوشش کی کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کسی ردعمل کا مظاہرہ کریں۔ لیکن حضرات حسنینؑ نے "اوفوا بالعقود" پر عمل کرتے ہوئے اپنے عہد کی پاسداری کی اور کسی طرح عہد شکنی کا الزام نہیں آنے دیا۔

تیسرا مرحلہ

۲۰ سال تک ظالمانہ انداز سے حکومت کرنے کے بعد حاکم شام راہی ملک عدم ہوا اور یزید کو مسلمانوں کی حکومت حاصل ہوگئی تو اس نے مدینہ کے حاکم ولید کو خط لکھا کہ حسینؑ سے بیعت لے لو۔ ولید نے امام حسین علیہ السّلام کو دربار طلب کیا۔ اور آپ قرآن مجید کے حکم "وان جنحوا للسلم فاجنح لھا" (سورہ انفال۔ ۶۱) ۔ "اگر وہ لوگ صلح و سلامتی کی دعوت دیں تو اسے قبول کر لو" پر عمل کرتے ہوئے دربار میں چلے گئے۔

چوتھا مرحلہ

دربار میں جانے کے بعد ولید نے حاکم شام "معاویہ" کے مرنے کی خبر سنائی تو آپ نے حکم قرآنی کے مطابق کلمہ استرجاع زبان پر جاری کیا۔ "وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

پانچواں مرحلہ

اس کے بعد ولید نے یزید کی خلافت کی خبر سنا کر امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا تو آپ نے ارشاد قرآنی کے مطابق اسے یکسر ٹھکرا دیا اور صاف فرما دیا کہ مجھ جیسا انسان یزید جیسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا۔

"ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار" (ہود۔ ۱۱۳)

"خبردار! ظالموں کی طرف جھکاؤ نہ پیدا کرنا کہ جہنم کی آگ تم تک پہونچ جائے۔"

چھٹا مرحلہ

انکار بیعت کے بعد امام حسینؑ دربار سے واپس چلے آئے اور یہ طے کرنے کا مرحلہ آگیا کہ اب اگلا قدم کیا ہوگا۔ مدینہ میں شام کے مظالم سے مقابلہ کرنا ہوگا یا مدینۃ الرسول کو خیرباد

کہنا ہوگا؟ قرآن مجید نے آواز دی "ومن یخرج من بیتہ مھاجرًا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ" (نساء-۱۰۰) "جو شخص بھی اپنے گھر سے خدا اور رسولؐ کی طرف، ہجرت کے ارادہ سے نکلتا ہے، اسے راستہ میں موت بھی آجائے تو اس کا اجر پروردگار کے ذمہ ہے۔"

امام حسینؑ نے اس ہدایت کی روشنی میں یہ طے کر دیا کہ اب مدینۃ الرسولؐ رہنے کے قابل نہیں ہے لہٰذا اصلاح اسی میں ہے کہ وطن کو ترک کر دیا جائے چنانچہ آپ ۲۸ رجب ۶۰ھ کو گھر سے نکل پڑے۔

ساتواں مرحلہ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کس طرف کا رُخ کریں اور اگلی منزل کیا ہوگی؟

قرآن مجید نے آواز دی "ومن دخلہ کان آمنا" (آل عمران ۹۷) "جو حرم خدا میں داخل ہوگیا وہ محفوظ ہوگیا۔"

لہٰذا امام حسینؑ نے طے کر دیا کہ اگلی منزل حرم خدا ہوگی اور وہاں جانے کے بعد حالات کا جائزہ لیا جائے گا۔

آٹھواں مرحلہ

مکہ میں قیام کے دوران اہل کوفہ کے خطوط آنے لگے کہ ہمارے پاس کوئی امام اور رہنما نہیں ہے اور ہم یزید کی قیادت سے راضی نہیں ہیں لہٰذا آپ ہمارے حال پر رحم فرمائیے۔ امام حسینؑ نے حکم قرآن کے مطابق حضرت مسلمؑ کو کوفہ کی ہدایت اور وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیج دیا۔

"وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر"۔ (انفال ۷۲)

"اگر لوگ تم سے دین کے بارے میں مدد مانگیں تو ان کی مدد کرو کہ یہ تمہارا فرض ہے۔"

نواں مرحلہ

اُدھر یزید نے چند افراد کو لباس احرام میں بھیج دیا کہ عین حالت طواف میں امام حسینؑ کو قتل کر دیں اور نہ کسی کو قاتل کا اندازہ ہونے پائے اور نہ کسی طرح کا ہنگامہ ہونے پائے۔

امام حسینؑ نے دیکھا کہ اس طرح سرزمین حرم خون ناحق سے رنگین ہو جائے گی اور حرم کی بے حرمتی ہو جائے گی، لہٰذا آپ نے حکم قرآن کے مطابق حرم خدا سے جُدا ہونا گوارا کر لیا اور حرمت حرم کو خطرہ میں نہیں پڑنے دیا۔

"ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب" (حج ۳۲) "جو شخص بھی شعائر اللہ کی تعظیم کرے اس کی یہ تعظیم تقوائے الٰہی کا نتیجہ ہے۔"

دسواں مرحلہ

حرم خدا سے نکلنے کے بعد پھر یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ اب کدھر کا رُخ کیا جائے۔ جائے امن تو ہاتھ سے نکل گئی ہے اور اس میں قتل کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔؟

قرآن مجید نے فورًا آواز دی کہ جس کے لئے جائے امن ممکن نہ ہو اور قتل ناگزیر ہو جائے اس کا فرض ہے کہ اس منزل کی طرف جائے جس کا مقتل ہونا روز اول سے مقدر ہو چکا ہے اور امام حسینؑ نے عراق کا رُخ کر لیا۔

"قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الی مضاجعھم"۔ (آل عمران ۱۵۴)

"پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ گھر میں بیٹھے رہ جاؤ گے تو وہ لوگ بہر حال اپنے مقتل کی طرف جائیں گے جن کے لئے قتل مقدر ہو چکا ہے۔"

گیارہواں مرحلہ

عراق کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد ۲ محرم کو سرزمین کربلا پر ورود ہوا۔ اور امام حسینؑ نے دریا کے قریب خیمے نصب کرا دئے۔ اُدھر دشمنوں نے دوسرے ہی دن خیام کے دریا کے کنارے سے ہٹانے پر اصرار شروع کر دیا اور امام حسینؑ نے اس امتحان تشنگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے خیام دریا کے کنارے سے ہٹا لئے۔

"ان اللہ مبتلیکم بنھر فمن شرب منہ فلیس منی"۔ (البقرہ-۲۴۹)

جناب طالوت نے کہا کہ عنقریب پروردگار تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعہ لینے والا ہے کہ جو اس کا پانی پی لے گا وہ مجھ سے نہ ہوگا مگر یہ کہ ایک چلّو پانی لیلے۔

بارہواں مرحلہ

پیاس کی مصیبت کے بعد بھی ظالموں کی طرف سے دباؤ بڑھتا رہا اور مسلسل تیاریاں ہوتی رہیں کہ اگر امام حسینؑ اور ان کے اصحاب پیاس کے دباؤ میں آکر بیعت نہیں کرتے تو انھیں قتل کر دیا جائے اور ان کا سلسلہ تمام کر دیا جائے۔

امام حسینؑ نے اس صورت حال کو دیکھ کر حکم قرآن کے مطابق مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور نہایت درجہ مختصر فوج اور بے سروسامانی کے باوجود میدان جہاد میں قدم جما دیے کہ اسلام میں میدان جنگ سے فرار جائز نہیں ہے۔

"اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر"

"جن لوگوں پر جنگ مسلّط کر دی گئی ہے انھیں جہاد کا اذن دے دیا گیا ہے اور پروردگار ان کی امداد کی مکمل طاقت رکھتا ہے"۔ (حج ۳۹)

تیرہواں مرحلہ

عاشور کا دن آیا اور صبح سویرے ابن سعد نے فوجوں کو حملہ کرنے کا حکم دیدیا۔ پہلا تیر خود خیام حسینی کی طرف پھینکا جس کے نتیجہ میں چار ہزار تیر اندازوں نے تیروں کا مینھ برسانا شروع کر دیا اور امام حسینؑ اس سخت ترین صورت حال کا مقابلہ کرتے رہے یہاں تک کہ ۴۰ - ۵۰ اصحاب کام آگئے اور اس کے بعد مسلسل جنگ کا سلسلہ قائم رہا اور عصر کے ہنگام تک امام حسینؑ کے تمام اعزا اور اصحاب و انصار کام آگئے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ اس صورت حال میں حضرت امام حسینؑ کو کیا کرنا ہوگا اور اس پوری جنگ اور ساری محنت کا ماحصل کیا ہوگا؟

قرآن مجید نے اس مسئلہ کو بھی دو لفظوں میں حل کر دیا کہ انسان کو راہ خدا میں قربانی سے ہرگز دریغ نہیں کرنا چاہیئے اور بارگاہ الٰہی میں نہایت درجہ سرخروئی کیساتھ حاضر ہونا چاہیئے۔

"یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی"۔ "اے نفس مطمئن! اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ آ۔ تو

ہم سے راضی ہے۔ ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ ہمارے بندوں میں شامل ہو جا۔ اور ہماری جنت میں داخل ہو جا۔!"

چودہواں مرحلہ

امام حسینؑ نے میدان جہاد میں قدم جما دئے اور تن تنہا تیس ہزار کے لشکر کا مقابلہ کرتے رہے۔ کبھی میمنہ پر حملہ کیا کبھی میسرہ پر۔ کبھی قلب لشکر کو توڑا اور کبھی جناح لشکر پر نظر ڈالی اور اس طرح عصر کے ہنگام آخری سجدۂ شکر ادا کر کے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو گئے اور قرآن مجید نے اس پورے معرکہ کا نتیجہ بیان کر دیا۔

"ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون"۔ (آل عمران ۱۶۹)

خبردار! راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مُردہ خیال بھی نہ کرنا۔ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں رزق پا رہے ہیں"۔

معرکۂ کربلا تمام ہو گیا۔ امام حسینؑ نے حیات ابدی کی سند حاصل کر لی اور قرآن مجید نے واضح کر دیا کہ ہمارے پاس زندگی کے ہر مرحلہ کے لئے اور انسانی حیات کے ہر مسئلہ کے لئے فیصلہ کن حل موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بندگان دنیا ہمیشہ الٰہی تعلیمات سے غافل اور منحرف رہتے ہیں اور اپنے خواہشات نفس ہی کو اپنا دستور العمل اور ضابطۂ حیات تصور کر لیتے ہیں اور اس طرح ہلاکت ابدی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

امام حسینؑ کا کمال کردار یہ ہے کہ انھوں نے سخت ترین حالات میں بھی قرآن مجید کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر اقدام قرآن مجید کے تعلیمات کی روشنی ہی میں کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حسینؑ اور قرآن اسلام کے حق میں توام بن گئے اور نہ قرآن امام حسینؑ سے الگ ہے اور نہ امام حسینؑ قرآن سے۔

قرآن امام حسینؑ کے نصب العین اور دستور حیات کا نام ہے اور حسینؑ قرآن کے تعلیمات کی تجسیم و تمثیل کا۔ حسینؑ زندہ ہیں تو قرآن زندہ ہے اور قرآن زندہ ہے تو حسینؑ زندہ ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ ایسے مجسمۂ قرآن و کردار کو باغی اور خارجی سے تعبیر کیا جائے اور قرآن مجید کے جملہ تعلیمات کو پامال کر کے شراب و رقص و رنگ و لہو و لعب میں زندگی گذارنے والے یزید کو خلیفۃ المسلمین کہا جائے۔

خلافت اسلامیہ ایسے ہی کردار کا نام ہے تو سنجیدہ فکر انسان خلافت سے نہیں اسلام سے بھی بیزار ہو جائیں گے اور عالم اسلام کے لئے اسلام و قرآن کی آبرو کا تحفظ مشکل ہو جائے گا۔

امام حسینؑ کی زندگی کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے ورنہ تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو امام عالی مقامؑ کی زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں ہے جو قرآنی ہدایات سے الگ اور اسلامی تعلیمات کی تجسیم سے بیگانہ ہو۔

رب کریم امت اسلامیہ کو توفیق دے کہ امام حسینؑ کے نقش قدم پر چل کر قرآن مجید کو اپنا دستور العمل قرار دے اور اپنی پوری زندگی کو قرآنی ہدایات و تعلیمات کے سانچہ میں ڈھال دے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

شہادت

• ہر نیکی سے بالاتر نیکی ہے لیکن اگر انسان راہِ خدا میں شہید ہو جائے تو اس سے بالاتر کوئی نیکی نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ (بحار ۱۰۰/۸)

• بہترین موت قتل شہادت ہے۔ رسول اکرمؐ (بحار ۱۰۰/۸)

• دو قطرات سے بالاتر کوئی شے محبوب خدا نہیں ہے۔ راہ خدا میں قطرۂ خون اور رات کی تاریکی میں مرضی خدا کی طلب میں قطرۂ اشک۔ امام زین العابدینؑ (بحار ۱۰۰/۱۰)

• جنگ صفین کے لئے نکلتے وقت امیر المومنینؑ کی دعا۔ خدایا! اگر تو نے ہمیں دشمن پر فتح دی تو ظلم سے محفوظ رکھنا اور حق کی توفیق دینا اور اگر دشمن کو غلبہ دیا تو ہمیں شہادت عطا کرنا اور فتنہ سے محفوظ رکھنا۔ امیر المومنینؑ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۱)

حُبّ شہادت

• میری تمنا ہے کہ راہ خدا میں جہاد کروں۔ قتل ہو جاؤں۔ پھر دوبارہ زندہ کیا جاؤں۔ پھر جہاد کروں اور قتل ہو جاؤں۔ رسول اکرمؐ (صحیح مسلم ۳/۱۴۹۶)

• مشکل یہ ہے کہ میں بولوں تو کہیں گے کہ اقتدار کی لالچ ہے اور چپ رہ جاؤں تو کہیں گے کہ موت سے گھبرا گئے۔ حالانکہ ابوطالب کا فرزند موت سے اس سے زیادہ مانوس ہے جتنا بچہ پستانِ مادر سے مانوس ہوتا ہے۔ امیر المومنینؑ (شرح نہج البلاغہ معتزلی ۱/۲۱۳)

• ایہا الناس! موت سے نہ مقیم بچ سکتا ہے اور نہ فرار کرنے والا۔ موت سے کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔ انسان قتل نہیں بھی ہوگا تو مرجائیگا جب کہ قتل بہترین موت ہے۔ قسم

اُس ذاتِ اقدس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ تلوار کی ہزار ضربت برداشت کر لینا میرے لئے بستر پر مرنے سے آسان تر ہے۔ امیرالمومنینؑ (شرح النہج ۱/۳۰۶)

• امام رضاؑ سے دریافت کیا گیا کہ امیرالمومنینؑ کے اس ارشاد کے کیا معنی ہیں کہ تلوار کی ضربت بستر کی موت سے آسان تر ہے؟ — فرمایا راہِ خدا میں۔
(مشکوٰۃ الانوار ص ۳۰۴)

کفّارۂ گناہ

• شہادت قرض کے علاوہ ہر گناہ کا کفارہ ہے۔ رسول اکرمؐ (کنز العمال خ ۱۱۰۹۸)

• راہِ خدا میں شہید ہو جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے علاوہ قرض کے کہ اسے بہرحال ادا کرنا ہے۔ چاہے مقروض ادا کر دے یا صاحب حق معاف کر دے۔ امام باقرؑ (نوادر راوندی)

• جو راہِ خدا میں شہید ہو جائے۔ خدا اس کے سامنے کسی برائی کو پیش نہ کرے گا۔
امام صادقؑ (وسائل الشیعہ ۱۱/۹)

حیاتِ شہید

• خبردار راہِ خدا میں قتل ہو جانے والوں کو مُردہ خیال بھی نہ کرنا۔ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں رزق پا رہے ہیں۔ (آل عمران ۱۶۹)

• جو راہِ خدا میں قتل ہو جائیں انھیں مُردہ نہ کہنا۔ وہ زندہ ہیں لیکن تمھیں انکی حیات کا شعور نہیں ہے۔ (بقرہ - ۱۵۴)

حسابِ قبر سے آزادی

• یا رسول اللہ! کیا وجہ ہے کہ تمام مومنین کی قبر میں آزمائش ہوتی ہے اور شہید کو معاف کر دیا جاتا ہے ہے۔ اس لئے کہ سر پر تلوار کا چمکنا آزمائش کے لئے کافی ہے۔
(کنز العمال خ ۱۱۱۳۸)

شوقِ شہادت

• کسی بھی جنتی کو دنیا میں واپس آنے کی آرزو نہیں ہوتی ہے لیکن شہید کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ دنیا میں واپس کر دیا جائے تاکہ دس مرتبہ شرفِ شہادت حاصل کر سکے۔
رسول اکرمؐ (صحیح مسلم ۲/۴۹۸)

• رسول اکرمؐ نے جابر سے فرمایا کہ پروردگار ہر بندہ سے پس پردہ سے گفتگو کرتا ہے لیکن تمھارے باپ کے لئے حجابات اٹھادئے اور آواز دی کہ کیا چاہتے ہو۔ میں دینے کے لئے تیار ہوں۔ تو انھوں نے عرض کی کہ خدایا! دنیا میں پلٹا دے تاکہ دوبارہ جہاد کر کے شرفِ شہادت حاصل کر سکوں۔ (مستدرک الوسائل ۲/۲۴۳)

موت ذلّت سے بہتر ہے

• میں موت کو سعادت اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو ذلّت تصوّر کرتا ہوں۔
امام حسینؑ (تحف العقول ص ۱۷۶)

• راہ حق میں جہاد کرنے کے بارے میں کس چیز کا انتظار کر رہے ہو۔ یاد رکھو! حق کو چھوڑ کر ذلّت کی زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔ امیرالمومنینؑ (شرح النہج ۶/۹۰)

کربلا کے قبل وبعد

واقعۂ کربلا کے بارے میں کتنے ہی حقائق کا انکار کر دیا جائے اس حقیقت کا انکار ناممکن ہے کہ واقعۂ کربلا اپنی حقانیت اور مظلومیت کے زیر اثر ہر دور میں موثر رہا ہے اور آج بھی ہے۔ تازہ ترین محقق علامہ ادریس الحسینی جنھوں نے مسلک اہلبیتؑ اختیار کیا ہے اور اپنی داستان انقلاب نہایت تفصیل کے ساتھ کتابی شکل میں بیان کی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب کا نام رکھا ہے "لقد شیعنی الحسینؑ" (مجھ کو امام حسینؑ نے شیعہ بنایا ہے) یعنی واقعۂ کربلا کو چودہ صدیاں گذر گئیں۔ امام حسینؑ زیر لحد آرام فرما رہے ہیں۔ انکے نشان قبر تک مٹانے کی مہم چل چکی ہے لیکن ان کی مظلومیت کا مشن آج بھی سرگرم عمل ہے اور ہر شرافت وانسانیت کے خوگر کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

اس واقعہ کے جملہ تاثرات کا ذکر کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف دو مسائل کیطرف اشارہ کرنا مقصود ہے جن سے واضح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس واقعہ کے قبل وبعد اس کے اثرات کس قدر نمودار ہوئے اور واقعہ سے پہلے امام حسینؑ کی حقانیت نے کیا اثر کیا اور واقعہ کے بعد ان کی مظلومیت نے کیا انقلاب برپا کیا۔

انقلاب قبل کربلا

امام حسینؑ کا قافلہ صحراؤں میں سرگرم سفر ہے اور اس کی منزل سوائے امام حسینؑ کے کسی کو معلوم نہیں ہے۔ ابن زیاد کو یہ اطلاع مل چکی ہے کہ امام حسینؑ نے ۸ ذی الحجہ کو مکہ چھوڑ دیا ہے اور اہل کوفہ کے خطوط کی بنا پر عراق کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ اس نے

ایک ہزار کا رسالہ حُر کی سرکردگی میں روانہ کر دیا تاکہ امام حسینؑ کو راستہ ہی میں روک لے اور انھیں عراق کی طرف نہ آنے دے کہ ہو سکتا ہے وہ مسلم بن عقیل کی شہادت سے پیدا ہونے والے جذبات سے فائدہ اٹھا کر حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلا دیں۔

حر کا رسالہ روانہ ہوا اور اس نے ایک منزل پر امام حسینؑ کے قافلہ کا راستہ روک لیا۔ امام حسینؑ کو معلوم تھا کہ حُر ذاتی طور پر خبیث اور بدسرشت انسان نہیں ہے۔ اسے حکومت کے جھوٹے پروپیگنڈہ نے دھوکہ دیا ہے اور وہ حقائق سے بے خبری کی بنیاد پر اتنے بڑے اقدام پر آمادہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ آپ نے حر سے ملاقات کے بعد فوراً ہی ایک فصیح وبلیغ اور مختصر خطبہ ارشاد فرمایا:

> "ایہا الناس! رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ظالم بادشاہ کو دیکھے کہ وہ حرام خدا کو حلال بنا رہا ہے اور عہد الٰہی کو توڑ کر سنت رسول کی مخالفت کر رہا ہے۔ اس کا تمام تر کاروبار گناہ اور تعدّی کا ہے اور پھر اپنے قول وعمل سے صورت حال کی تبدیلی کی کوشش نہ کرے تو خدا کا فرض ہے کہ وہ اسے اس کے کیفر کردار تک پہونچا دے۔ یاد رکھو ان ظالموں نے پروردگار کی اطاعت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ زمین میں فساد برپا کیا ہے۔ حدود الٰہیہ کو معطل کر دیا ہے۔ مال خدا پر قبضہ کر لیا ہے۔ حرام خدا کو حلال اور حلال خدا کو حرام بنا دیا ہے اور میں دین خدا کا سب سے زیادہ حقدار ہوں۔
>
> میرے پاس تمھارے نمائندے آئے اور سب نے اس امر کا اظہار کیا کہ تم بیعت کے لئے تیار ہو اور میرا ساتھ نہ چھوڑو گے لہٰذا اگر تم اس بیعت پر قائم رہو گے تو منزل ہدایت تک پہونچ جاؤ گے۔ میں حسین بن علیؑ اور فرزند فاطمہؑ بنت رسول اکرمؐ ہوں۔ میرا نفس تمھارے ساتھ ہے اور میرے گھر والے تمھارے سامنے ہیں۔ تمھارے لئے میرے کردار میں بہترین نمونۂ عمل ہے۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی اور عہد کو توڑ دیا اور میری بیعت سے الگ ہو گئے تو یہ بھی کوئی نئی بات نہ ہو گی۔ تم یہی برتاؤ میرے والد بزرگوار، میرے برادر بزرگ اور میرے

ابن عم مسلم بن عقیل کے ساتھ کر چکے ہو۔ فریب خوردہ وہ ہے جو تمہارے دھوکہ میں آجائے۔ میں حقائق سے باخبر ہوں۔ تم نے خود اپنا نصیب خراب کیا ہے اور اپنا مقدر پھوڑ لیا ہے۔ عہد شکنی کرنے والے کا وبال اسی کے سر ہوتا ہے۔"

(طبری ۴/۳۰۲، کامل ۳/ ۲۸۰، اعیان الشیعہ ۴/ ۲۲۸ ق ۱)

امام حسینؑ نے اپنے ردعمل کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ صورت حال قدرے بدل رہی ہے۔ لہٰذا تھوڑی دیر کے بعد دوسرا خطبہ ارشاد فرمایا:

"ایہا الناس! اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کرو گے اور حق کو اہلِ حق کے حوالہ کردو گے تو یہ بات اللہ کی رضا کا سبب بنے گی۔ دیکھو ہم اہلبیتؑ اس امرِ ولایت کے زیادہ حقدار ہیں ان تمام ظالموں سے جو بلا سبب اس حق کا دعویٰ کر رہے ہیں اور ظلم و جور کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ اب اگر تم ہمیں ناپسند کر رہے ہو اور ہمارے حق سے بے خبر ہو اور تمہاری رائے بدل چکی ہے اور وہ نہیں رہ گئی ہے جو تم نے خطوط میں لکھی تھی اور تمہارے نمائندوں نے بیان کی تھی تو ہم واپس چلے جا رہے ہیں۔" (طبری ۴/ ۳۰۳، کامل ۳/۲۸۰)

امام حسینؑ کے بیان کی متانت اور امورِ دنیا سے آپ کی بے نیازی نے حُر کے دل پر اس قدر اثر کیا کہ اس کے کردار میں نمایاں تبدیلی شروع ہو گئی۔ وہ حاکم کی مخالفت سے خوفزدہ بھی تھا اور امام حسینؑ کے بارے میں کسی بھی غلط اقدام سے گھبرا بھی رہا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک مسالمت آمیز پالیسی پر عمل شروع کیا اور جب اس کا انجام کربلا کے مصائب کی شکل میں سامنے آیا تو احساسِ ندامت سے مجبور ہو کر صبحِ عاشور توبہ کرنے کیلئے امام حسینؑ کی خدمت میں آگیا اور اس طرح امام حسینؑ کی حقانیت اور حق کی وضاحت نے واقعۂ کربلا سے پہلے ہی ایک انقلاب برپا کر دیا اور کل کا راستہ روکنے والا آج پہلا شہید بننے کیلئے بےچین نظر آرہا ہے۔

واقعۂ کربلا کے بعد

اس کے بعد جب واقعۂ کربلا پیش آگیا تو حقانیت پر مظلومیت کا بھی اضافہ ہوگیا

اور ہر باضمیر انسان اس بات پر اپنے نفس کو ملامت کرنے لگا کہ حالات کچھ بھی رہے ہوں ہماری زندگی میں فرزندِ رسولؐ شہید ہو گیا اور ہم اس کے کام نہ آسکے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم مجبور تھے یا بعض افراد حالات سے مکمل طور پر باخبر نہ ہو سکے تھے لیکن بہرحال یہ دھبّہ ہمارے نفس پر رہ گیا کہ ہماری زندگی میں فرزندِ رسولؐ تین دن کا بھوکا پیاسا شہید ہو گیا۔ کس قدر خوش قسمت تھے وہ افراد جنھوں نے مصائب میں فرزندِ رسولؐ کا ساتھ دیا اور ان سے پہلے درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے اور کس قدر کم نصیب تھے ہم لوگ کہ ان کی رکاب میں رہ کر شہادت سے محروم رہ گئے۔ اب ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم ان ظالموں سے انتقام لیں جنھوں نے اتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ چنانچہ بغیر کسی سیاسی تحریک کے چند باضمیر افراد اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے انتقامِ خونِ حسینؑ کا نعرہ لگا دیا۔ اس قیام میں پیش پیش جناب سلیمان صرد۔ مسیب بن نجبہ۔ عبداللہ بن سعد بن نفیل ازدی۔ عبداللہ بن وائل تیمی اور رفاعہ بن شداد بجلی تھے۔ یہ قیام ۶۱ھ سے شروع ہوا اور دھیرے دھیرے منظم ہوتا رہا یہانتک کہ ۵ ربیع الاول ۶۵ھ کو سارا قافلہ کربلا کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں پہونچکر قیامت خیز گریہ و ماتم کیا۔ یہ اور بات ہے کہ مقام عین الوردہ پر یزیدی لشکر سے شدید معرکہ ہوا اور تمام قائدینِ انقلاب شہید ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ اس قیام کے پیچھے کوئی مکمل سیاسی تحریک نہیں تھی۔ اس کا زیادہ حصّہ حالات سے تاثر کا نتیجہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ سلیمان بن صرد کے دیوان کے ۱۶ ہزار افراد میں سے صرف ۴ ہزار برآمد ہوئے۔ مدائن ۱۷۰ افراد اور بصرہ سے ۳۰۰ افراد ساتھ آئے ورنہ جہاں انقلاب اور اقتدار کی بات آجاتی ہے وہاں ساتھیوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

انقلاب اہلِ مدینہ:

اس انقلاب کا مقصد بنی امیہ کے اقتدار کا خاتمہ تھا اور مدینۂ رسولؐ کا بنی امیہ سے آزاد کرا لینا تھا۔ اس لئے کہ شام سے مظالم کی خبریں آچکی تھیں اور مدینہ ان مظالم سے سخت ناراض تھا۔ اہلِ مدینہ نے پہلا کام یہ کیا کہ یزید کے گورنر کو نکال باہر کیا اور اپنے استقلال کا اعلان کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید نے اس اقدام کو کچلنے کے لئے سارا زور

صَرف کر دیا اور مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں ایسا خبیث لشکر روانہ کر دیا جس نے مدینۂ رسولؐ کو تاراج کر دیا اور ایک ابن زبیر کی گرفتاری کے لئے حرم خدا کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا۔

انقلاب جناب مختار ثقفی:

اہل عراق نے ابتدائی طور پر ابن زبیر کو بنی امیہ کا دشمن سمجھ کر اس کا ساتھ دے دیا تھا لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ اس نے تمام قاتلانِ حسینؑ کو اپنے ساتھ لے لیا ہے اور عامل کوفہ کو حکم دے دیا ہے کہ سیرت عمر و عثمان پر عمل کرے چنانچہ اہل عراق برہم ہو گئے اور انھوں نے انقلاب کا اعلان کر دیا۔ ادھر کوفہ کے گورنر عبداللہ بن مطیع نے شمر و عمر بن الحجاج جیسے افراد کو ساتھ لے کر قائد انقلاب جناب مختار سے مقابلہ کیا اور انھیں ختم کر دینے کی سازش کر لی۔ لیکن جناب مختار نے نہایت دانشمندی سے موالی کی حمایت حاصل کر لی اور نتیجہ میں جملہ قاتلانِ حسینؑ کا خاتمہ کر دیا اور امام زین العابدینؑ کی دعاؤں کا شرف حاصل کر لیا۔ یہ انقلاب سلیمان بن صرد کے انقلاب کے خاتمہ پر ۶۶ھ میں شروع ہوا۔

●۔ ادھر ۷۷ھ میں مطرف بن مغیرہ نے حجاج بن یوسف اور عبدالملک بن مروان کے خلاف اقدام شروع کیا اور کتاب و سنت کے نام پر جہاد کا نعرہ دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن مروان کو معزول کر دیا گیا اور اس اقدام نے بھی بنی امیہ کے خلاف عوامی غیظ و غضب کی نشاندہی کر دی۔

●۔ اس کے بعد ۸۱ھ میں عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث نے حجاج کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ بنیادی طور پر حجاج ہی کا کمانڈر تھا لیکن اس کی تباہ کاریوں سے ناراض تھا۔ چنانچہ جب حجاج نے تباہ کاری پر اصرار کیا تو اس نے بغاوت کر دی اور اہل بصرہ نے بھی اس کا ساتھ دے دیا کہ وہ بھی حجاج کے مظالم سے ناراض اور عاجز تھے ۸۳ھ تک یہ سلسلہ جاری رہا یہانتک کہ حجاج نے شامی فوجوں کی کمک حاصل کر کے اس انقلاب کو دبا دیا۔ اس انقلاب میں وہ سارے عرب شامل تھے جنھیں جنگوں میں مال غنیمت نہ ملا تھا

اور ظاہر ہے کہ ایسے افراد مصائب میں ساتھ نہیں دیتے ہیں۔

انقلاب زید بن علیؑ:

اس اقدام کی تیاریاں ۱۲۱ھ سے شروع ہوئیں اور ۱۲۲ھ میں یہ انقلاب منظر عام پر آگیا۔ ادھر عراق میں مقیم شامی فوجوں نے مقابلہ شروع کر دیا اور نتیجہ میں یہ انقلاب جناب زیدؒ کی شہادت پر تمام ہوا۔ جن کی لاش کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کیا گیا کہ اسے سولی پر لٹکا دیا گیا اور ایک عرصہ کے بعد سولی سے اُتار کر نذر آتش کر دیا گیا۔

لیکن بہر حال امام حسینؑ نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا جو حوصلہ دے دیا تھا وہ برقرار رہا اور الحمدللہ آجتک امام حسینؑ کے چاہنے والوں میں برقرار ہے اور انشاءاللہ تاقیامت رہے گا۔

اسلامی تحریکیں

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام ایک دعوت بھی ہے اور ایک تحریک بھی۔ اسلام نے جہالت کے دور میں علم و فکر کی دعوت دی اور پتھروں کی خدائی سے پیدا ہونیوالے جمود کے ماحول میں "قولوا لا الٰہ الا اللہ" سے حرکت بھی پیدا کی۔ اسلام نہ فکری جمود کا قائل ہے اور نہ معاشرتی بیحسی کا۔ لہٰذا اس نے داخلی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھایا اور خارجی اصلاح کا بھی۔ اس کے نزدیک زندگی کو خسارہ سے بچانے کے لئے تینوں باتیں ضروری ہیں :

۱۔ انسان علمی اعتبار سے اس قدر بلند ہو جائے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کا ادراک پیدا کرلے اور اس پر ایمان لے آئے۔

۲۔ عملی اعتبار سے اس قدر طیّب و طاہر ہو جائے کہ اس کے اعمال "اعمال صالحہ" کہے جانے کے قابل ہو جائیں۔

۳۔ معاشرہ میں اس قدر حرکت پیدا کردے کہ ہر طرف حق و حقیقت کی وصیت و نصیحت کا سلسلہ شروع ہو جائے اور انسان اس راہ میں ہر مصیبت کو برداشت کرنے کیلئے تیار ہو جائے۔

۔ تحریکِ اصلاح اسلام کا اس قدر محبوب عمل تھا کہ ہر مسلمان اپنے کو ایک مصلح کی شکل میں دیکھنا چاہتا تھا۔ حد یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے منافقین کو فساد برپا کرنے سے روکا تو انھوں نے بھی اپنے کو مصلح ہی قرار دیا۔

۔ اصلاح کی محبوبیت اور فساد کی بُرائی صرف علم و ادراک تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ ابتدائے تخلیق سے ملائکہ تک پہونچا ہوا ہے اور انھوں نے بھی انسان کے خلاف یہی آواز اٹھائی تھی کہ "کیا اسے خلیفہ بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرتا ہے اور خوں ریزی کرتا ہے" جبکہ

ہم تسبیح و تقدیس کرنے والے موجود ہیں۔

ملائکہ نے اپنی صلاحیت کا ذکر تو کر دیا لیکن خلیفۃ اللہ کی صلاحیت سے باخبر نہیں تھے۔ اسی لئے جب فریقین کا امتحان لیا گیا تو یہ اقرار کر کے الگ ہو گئے کہ ہمیں اتنا ہی معلوم ہے جتنا تو نے بتایا ہے اس سے زیادہ استنباط و استخراج ہماری صلاحیت سے باہر ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ملائکہ کو پروردگار نے تعلیم دے دی تھی تو وہ کون سی چیز تھی جو ان کے حدود علم و ادراک سے باہر رہ گئی۔ اس کا اشارہ قرآن حکیم نے دیا ہے کہ پروردگار کے سوال کا تعلق اسمار سے نہیں تھا بلکہ مسمّٰی سے تھا" انبئونی باسماء ھٰٓؤلآء" (ان کے نام بتاؤ)۔ ملائکہ نام تو بتا سکتے تھے لیکن "ان" پر انطباق ان کے بس کا کام نہیں تھا۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ خلافت کا کل دار و مدار "ھٰٓؤلآء" پر تھا اور انھیں کے علم و عرفان پر جناب آدمؑ کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ "ھٰٓؤلآء" کون حضرات تھے ؟ تو اس کا اشارہ حدیث کساء میں موجود ہے" انی ماخلقت سماء مبنیۃ .... الا فی محبۃ "ھٰؤلاء"۔

۔ اسلام میں "عملوا الصّٰلحٰت" کے بعد "وتواصوا" کا ذکر اس بات کی علامت ہے کہ اسلام زندگی کی کامیابی صلاح میں نہیں سمجھتا ہے بلکہ اس کی نگاہ میں انسانی زندگی کی کامیابی کا تعلق اصلاح سے ہے اور اصلاح کے بغیر کوئی زندگی خسارہ سے باہر نہیں آسکتی ہے۔

۔ اصلاح کی دو قسمیں ہیں۔ فکری اصلاح اور معاشرتی اصلاح۔

عالم اسلام میں ہر دور میں دونوں طرح کی تحریکیں وجود میں آئیں۔ کبھی غزالی نے فکری اصلاح کا کام شروع کیا اور احیاء العلوم جیسی کتاب لکھی اور کبھی علویین نے قیام کر کے معاشرہ کو ظلم و ستم اور جور و استبداد سے پاک و پاکیزہ بنانے کا کام شروع کیا۔

مصر میں اخوان الصفا کی تحریک دونوں شعبوں کی جامع تھی اور ان کا مقصد مسلمانوں کی فکری اصلاح کے ساتھ ان کی معاشرتی اصلاح سے بھی وابستہ تھا۔

۔ فکری اصلاح کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ فکر کی اصلاح کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان کو ماضی کے اندھیروں میں ڈھکیل دیا جائے اور اگر ذرا شعورِ زندگی

پیدا ہوگیا ہے تو اسے بھی سلب کرلیا جائے اور اسی شعور کو زندگی کا سب سے بڑا عیب قرار دیدیا جائے۔ جو کام ابتدا میں اشاعرہ نے کیا تھا کہ ہر عقل وفکر کی بات کو نظر انداز کردیا تھا اور آج وہابیت کر رہی ہے کہ اس کا تمامتر مقصد یہ ہے کہ ہر ترقی کو بدعت کا نام دے کر مسلمانوں کو فکری جہالت کے دور جاہلیت تک پہونچا دیا جائے جہاں عقل وشعور کا استعمال جرم ہو اور مسلمان صرف اندھا مقلد بنا رہے۔

دوسرے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ اصلاح فکر کے لئے ارتقاء علم وشعور ضروری ہے لہٰذا معاشرہ کی فکری اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اسے علم وادراک سے آشنا نہ بنایا جائے۔

اس آخری دور میں انیسویں صدی میں یہی تحریک جمال الدین افغانیؒ نے کی تھی کہ معاشرہ کو علم وعرفان میں بھی آگے بڑھایا جائے اور اسے عمل وکردار سے بھی آراستہ کیا جائے۔

جمال الدین افغانیؒ حوزہ علمیہ کے جیّد اساتذہ شیخ انصاریؒ۔ ملا ہادی سبزواریؒ اور سید سعید حبوبیؒ کے شاگرد تھے اور خود ایک جیّد عالم تھے۔ انھیں قوم کے سیاسی اور معاشرتی حالات پر مکمل عبور تھا اور انھوں نے اپنی تحریک کا آغاز دو نکات سے کیا۔

۱۔ مسلمانوں میں اتحاد واتفاق کا شعور پیدا کرایا جائے اور اختلافی مسائل کو نظر انداز کرکے اتفاقی مسائل کی اہمیت سے روشناس کرایا جائے۔

۲۔ مسلمانوں کے دونوں فرقوں میں اس نکتہ کو پیش نظر رکھا جائے کہ شیعہ قوم میں اصل علماء اعلام ہوتے ہیں اور عوام ان کے تابع ہوتے ہیں اور برادران اہلسنت میں اصل عوام ہوتے ہیں۔ علماء عام طور سے حکومتوں کے ملازم اور تنخواہ دار ہوتے ہیں لہٰذا ان کی مرضی کے خلاف کسی مسئلہ میں ساتھ نہیں دے سکتے ہیں۔

جمال الدین افغانی ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔ اس عرصہ میں متعدد مقامات کا دورہ کیا اور ۱۸۹۵ء کے تنباکو کے جہاد میں بھی حصہ لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز حکومت درپے آزار ہوگئی اور ایک طرف ان کی دعوت اتحاد کے مقابلہ میں فرقہ واریت قومیت اور وطنیت کے جھگڑے پیدا کرادئے اور دوسری طرف ان کا زندہ رہنا بھی دشوار بنادیا۔ جمال الدین افغانیؒ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ مغربیت اور تدیّن کو جمع کرنا چاہتے

تھے بلکہ مغربیت کو دیانت کا تابع بنانا چاہتے تھے۔

ورنہ سر سید احمد خان کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ انھوں نے ۱۸۶۴ء میں برطانیہ کا دورہ کیا تو آتے ہی مسلم لیگ کو خیرباد کہہ دیا اور جدید علوم کے نام پر دیانت کو بھینٹ چڑھانا شروع کردیا۔ انگریزوں کی غلامی کو مسلمان کی ترقی کا ذریعہ قرار دیا اور تفسیر قرآن کے نام پر معجزات وکرامات کے انکار کا ایک عجیب وغریب سلسلہ شروع کردیا۔

سرسید کی اسی فکری غلطی کا نتیجہ تھا کہ ان کا ادارہ آجتک دو حصوں پر بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ صرف مغرب زدہ ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ایک حصہ کے پاس "ریش دراز" تو ہے لیکن سارا اسلام اسی میں اُلجھ کر رہ گیا ہے۔

پروردگار تمام مسلمانوں کو ہر طرح کے فکری زوال اور استعماری جال سے محفوظ رکھے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الهدیٰ

زیارت وارثہ

• پروردگار عالم نے اپنے حبیب کو شاہد بھی بنایا ہے اور شہید بھی۔ "انا ارسلناک شاھدا" ـــــ "جئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شہیدا"۔

ـــ شاہد عام طور سے اسے کہا جاتا ہے جو ظواہر کی گواہی دیتا ہے۔ اور شہید وہ ہوتا ہے جو باطنی حالات سے بھی باخبر ہوتا ہے اور بظاہر غیبی امور کی بھی شہادت دے سکتا ہے۔

ـــ انبیاء کرام کو امت کے لئے اور خیر امت کو تمام عالم انسانیت کے لئے شہید بنایا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کا علم و ادراک عام امت سے بالاتر ہے اور خیر امت سے مراد تمام افراد امت نہیں ہیں۔ تمام افراد شہید بننے کے قابل نہیں ہیں بلکہ خود ہی ایک شہید کے محتاج ہیں۔

ـــ انبیاء کرام اور رسول اکرمؐ کا نمایاں فرق یہ ہے کہ انبیاء کرام امت کے لئے شہید بنائے گئے ہیں اور رسول اکرمؐ کو ان کے اعمال و کردار کا شہید بنایا گیا ہے۔

• شہید راہ خدا اگرچہ جان قربان کر دینے کے اعتبار سے شہید کہا جاتا ہے لیکن پروردگار اسے گواہی کے اعتبار سے بھی شہادت کا حق عنایت کر دیتا ہے اور اس کے علم و ادراک میں شہادت کی برکت سے بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

ـــ اس مسئلہ کی فلسفیانہ توجیہ یہ ممکن ہے کہ انسان کے پاس پروردگار کا عطا کیا ہوا ایک طاقت کا خزانہ ہے جو مختلف اعضاء و جوارح پر تقسیم ہوتا رہتا ہے اور جب کوئی عضو کام کرنا چھوڑ دیتا ہے تو طاقت میں کمی نہیں آتی ہے بلکہ اس کا رُخ بدل جاتا ہے اور وہ دوسرے رُخ پر صَرف ہونے لگتی ہے۔

عرف عام میں کہا جاتا ہے کہ "اندھے کا حافظہ قوی ہوتا ہے"۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ نابینائی سے کوئی طاقت پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ آنکھ پر صَرف ہونے والی اِنرجی بچ جاتی ہے تو اسے قدرت دماغ پر صَرف کر دیتی ہے اور اس کا رُخ حافظہ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔

ـــ شہید راہ خدا کے پاس زندگی کی تمام توانائیاں موجود ہوتی ہیں جو بظاہر ایک طویل مدت حیات تک کام آنے والی ہوتی ہیں لیکن اسے جوانی میں میدان جہاد میں بھیج دیا جاتا ہے اور وہ راہ خدا میں شہید ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شہادت سے جسم و روح کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے لیکن روح کی توانائیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور وہ اپنے مقام پر محفوظ رہتی ہیں۔ اب یہ عین ممکن ہے کہ پروردگار عالم شہادت کے طفیل اس روح کو ایک "برزخی جسم" سے وابستہ کر دے اور یہ اپنی توانائیوں کو اس کے ذریعہ استعمال کرے۔ اور یہ کھُلی ہوئی بات ہے کہ برزخی آنکھ کا مشاہدہ اِس مادی آنکھ سے یقیناً قوی تر ہوگا اور اس طرح وہ ان مناظر کو بھی دیکھ لے گا جن کو حیات دنیا میں نہیں دیکھ سکتا تھا اور جہاں تک مادی آنکھوں کی رسائی نہیں تھی۔

ـــ دوسری تفسیر یہ کی جا سکتی ہے کہ آنکھ جس قدر پستی میں رہتی ہے اس کا مشاہدہ محدود رہتا ہے اور جس قدر بلند ہوتی جاتی ہے اس کے مشاہدات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ زمین پر رہنے والا اپنے پورے گھر کو بھی بیک وقت نہیں دیکھ سکتا ہے اور ہوائی جہاز میں بیٹھنے والا پورے شہر کو ایک نظر سے دیکھ لیتا ہے۔ جو اس امر کی دلیل ہے کہ بلندی، علم و ادراک اور مشاہدہ میں وسعت پیدا کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ انسان شہادت کے طفیل اس بلندی پر پہونچ جائے کہ ماضی، ماضی نہ رہ جائے بلکہ حال ہو جائے اور وہ اسے اسی طرح دیکھ لے جس طرح ہم زمانہ حال کو دیکھ رہے ہیں اور اس طرح ہم صرف اِس امت کے ایک حصہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور وہ گذشتہ امتوں کے حالات کا بھی مشاہدہ کر لے اور اسے کتابوں اور روایتوں سے یہ علم حاصل نہ ہو بلکہ اپنے ذاتی مشاہدہ سے حاصل ہو اور شہادت کی بلندی سے تمام حالات کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

• روایات میں وارد ہوا ہے کہ روز قیامت جب انبیاء کرام سرکار دو عالمؐ سے اپنی تبلیغ

اور خدمات کی گواہی دینے کا مطالبہ کریں گے تو آپ حمزہ وجعفر کو گواہی کے لئے پیش کردیں گے اور وہ انبیاء کرام کی تبلیغ کی گواہی دیں گے۔ جس کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہو گیا کہ حضرت علیؑ کو اس گواہی کے لئے کیوں نہیں پیش کیا گیا اور جواب دیا گیا کہ ابھی مرسل اعظمؐ کی تبلیغ کی گواہی کا مرحلہ باقی ہے اور انھیں اس گواہی کے لئے بچا کر رکھا گیا ہے کہ وہ جس طرح دنیا میں حضرتؐ کی رسالت کے گواہ تھے۔ اسی طرح آخرت میں حضرت کی تبلیغ کی گواہی دیں گے۔

۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ حمزہ وجعفر کوئی انبیاء و مرسلین یا ائمہ طاہرینؑ میں نہیں ہیں کہ ان کے لئے ایک غیبی علم کا اعتقاد پیدا کر لیا جائے اور اسی کی بنیاد پر ان کی گواہی کی تفسیر کی جائے۔ یہ حضرات امت اسلامیہ کے افراد تھے اور امت کے پاس یقیناً ایسا ادراک نہیں ہوتا ہے کہ انبیاء سابقین کے خدمات کا مشاہدہ کر سکے اور روز قیامت اس کی گواہی دے سکے۔

اس شہادت کی ایک ہی تفسیر ممکن ہے کہ ان حضرات کو راہ خدا میں قربانی کے عوض وہ بلندی حاصل ہو گئی ہے جہاں سے ماضی کے حالات کا جائزہ لے کر انبیاء کرام کے خدمات کی گواہی دے سکتے ہیں۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے بھی عظیم ترین اصحاب کرام کو گواہی میں نہیں پیش کیا ہے بلکہ انھیں مجاہدین کو پیش کیا ہے جو راہ خدا میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے تھے کہ شہادت ہی میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ انسان کو انبیاء کرام کے تبلیغات کی شہادت کے قابل بنا دے۔

• امیر المومنینؑ کو پروردگار عالم نے اس پیغمبرؐ کے لئے شہید کا درجہ دیا ہے جس کو سارے انبیاء و مرسلین کا شہید بنایا ہے "قل کفیٰ باللہ شہیداً بینی وبینکم ومن عندہٗ علم الکتاب" جس کا مطلب یہ ہے کہ امیر المومنینؑ کے پاس رسالت پیغمبرؐ کے سارے خصوصیات کا علم بھی ہے اور سارے انبیاء کی رسالتوں کا مکمل علم بھی ہے اور یہ علم درجۂ شہادت کے طفیل نہیں ہے کہ پروردگار نے انھیں زندگی میں رسالت کا شہید قرار دیا ہے۔

۔ اسی درجۂ کمال کی طرف سرکار دو عالمؐ نے اشارہ کیا ہے کہ اگر آدمؑ کا علم، نوحؑ کا تقویٰ، ابراہیمؑ کی خلت، موسیٰؑ کی ہیبت اور عیسیٰؑ کا زہد دیکھنا ہے تو علیؑ بن ابی طالب کے چہرہ پر نظر کرو

کہ اس میں جملہ کمالات کا پرتو نظر آتا ہے اور ان کی ذات تمام کمالات انبیاء کی آئینہ دار ہے۔

۔ اس کا ثبوت اُس روایت سے بھی ملتا ہے جس میں ولادت کے بعد صحف سماویہ کی تلاوت کا ذکر ہے اور جو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ میں صرف رسول اکرمؐ کی رسالت کا وارث نہیں ہوں بلکہ تمام انبیاء کے صحیفوں کا محافظ اور ان کی رسالتوں کا وارث بن کر آیا ہوں۔

• ظاہر ہے کہ جب امیر المومنینؑ تمام انبیاء کے کمالات کے وارث ہیں تو جو ان کا وارث ہو گا۔ اس کا حق ہو گا کہ اسے آدمؑ۔ نوحؑ۔ ابراہیمؑ۔ موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ اور سرکار دو عالمؐ کا وارث قرار دیا جائے اور اس میں کوئی تعجب کی جگہ نہیں ہے۔

۔ زیارت وارثہ میں انبیاء کے ناموں کے ساتھ ان کے صفات کا بھی تذکرہ ہے جو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ امام حسینؑ ذات انبیاء کے وارث نہیں بلکہ صفات و کمالات انبیاء کے وارث ہیں اور جس نبی کے جس کمال کا مشاہدہ کرنا ہو۔ حسینؑ کی ذات پر نظر کرنا ہو گی۔

• واضح رہے کہ زیارت وارثہ میں جناب خدیجہ کی وراثت کا ذکر ہے لیکن جناب ابوطالبؑ کی وراثت کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ درمیان میں مولائے کائناتؑ کا ذکر موجود ہے جس کے بعد جناب ابوطالب کے تذکرہ کی ضرورت نہیں ہے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ ابوطالبؑ کی قربانیاں براہ راست مشاہدہ میں آچکی تھیں۔ اس کے اظہار کے لئے امام حسینؑ کی قربانی کے حوالہ کی ضرورت نہیں تھی کہ حسینؑ ابوطالب کے وارث ہیں لیکن جناب خدیجہ کی قربانیاں منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ لوگوں نے صرف ان کے مالی ایثار کو دیکھا تھا لہٰذا ضرورت تھی کہ ان کے جذبۂ قربانی کے اظہار کے لئے اس امر کا حوالہ دیا جائے کہ امام حسینؑ خدیجۃ الکبریٰ کے فرزند ہیں اور ان کی قربانی سے خدیجہ کے جذبۂ قربانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

• امام حسینؑ کے وارث انبیاء ہونے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ شریعت کے چند متفق علیہ احکام ہیں جو ہر دور شریعت میں تھے۔ کفر ہر دور میں حرام تھا۔ شراب ہر دور میں

حرام تھی۔ قتل ہر دَور میں حرام تھا۔ زنا ہر دَور میں حرام تھا۔ غصب ہر دَور میں حرام تھا اور یزید نے خلافت پیغمبرؐ اور وراثتِ رسالت کا دعویٰ کر کے ان تمام امور کو جائز بنا دیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ تمام شریعتوں کو بیک وقت تباہ کرنا چاہتا تھا اور تمام انبیاء کی ریاضت کو بیک وقت برباد کرنا چاہتا تھا۔ ضرورت تھی کہ کوئی شخص قیام کر کے تمام انبیاء کی رسالتوں، شریعتوں اور زحمتوں کا تحفظ کر لے اور ان کے بنیادی احکام کو برباد نہ ہونے دے۔

امام حسینؑ نے یہ فرض انجام دے دیا لہٰذا انھیں تمام انبیاء کے کمالات اور پیغامات کا وارث قرار دیا جائے گا اور یہ ان کی قربانی کا سب سے بڑا بنیادی اثر ہوگا۔!

زندگانی امام زین العابدینؑ

اسم گرامی علیؑ، لقب سجاد۔ زین العابدین۔ سید الساجدین اور ذو الثفنات وغیرہ۔

مادر گرامی کا نام شاہ زنان تھا جو امیر المومنینؑ کے دور حکومت میں ایران سے لائی گئی تھیں اور وہاں کے بادشاہ یزدجرد بن شہریار بن کسریٰ کی دختر تھیں۔ آپ کے ساتھ آپ کی ایک بہن اور تھیں جن کا عقد مولائے کائناتؑ نے اپنے عزیز شاگرد محمد بن ابی بکر سے کر دیا تھا۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ مولائے کائنات نے شاہ زنان کا نام بدل کر شہربانو کر دیا تھا کہ شاہ زنان کا مفہوم "سیدۃ النساء" ہوتا ہے اور یہ لقب معصومہ عالمؑ کے علاوہ کسی کے لئے سزاوار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جب پیغمبر اسلامؐ نے آپ کو اس لقب سے یاد کیا تو آپ نے عرض کی کہ بابا مریم بھی تو سیدۃ النساء تھیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے دور کی عورتوں کی سردار تھیں اور تم "سیدۃ نساء العالمین" ہو۔ (السیرۃ النبویۃ احمد زینی دحلان)

علامہ ابن شہر آشوب کا بیان ہے کہ مولائے کائناتؑ نے آپ کا نام مریم بھی رکھ دیا تھا۔

۱۵؍ جمادی الاولیٰ یا ۵؍ شعبان ۳۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی جس کی خبر سن کر مولائے کائناتؑ نے سجدۂ شکر کیا اور آپ کا نام علیؑ رکھا جس کی طرف سرکار دو عالمؐ نے اشارہ کر دیا تھا جب جابر بن عبد اللہ انصاری سے اولی الامر کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اول علیؑ بن ابی طالب۔ اس کے بعد حسنؑ۔ اس کے بعد حسینؑ۔ اس کے بعد علیؑ بن الحسین .... (کمال الدین صدوقؒ ص ۲۵۳)

واضح رہے کہ آپ کی والدہ گرامی کا انتقال ولادت کے دس روز کے اندر ہی ہوگیا تھا اور گویا قدرت نے ان کا انتخاب اسی کام کے لئے کیا تھا اور آپ کے وجود مقدس پر ان کا مقصدِ حیات مکمل ہوگیا۔

آپ کی شخصیت کے بارے میں زہری کا بیان ہے کہ اہلبیتؑ میں اس دور میں علیؑ بن الحسینؑ سے افضل کوئی نہ تھا۔

ابو حازم آپ کو افقہ زمانہ کہتے تھے اور امام مالک کے بیان کے مطابق آپ کثرت عبادت کی بنا پر زین العابدین کہے جاتے تھے۔

روحانی کمالات

یوں تو ہر امام پروردگار سے ایک خاص روحانی تعلق رکھتا ہے جس کی بنا پر اسے عہدۂ امامت سے سرفراز کیا جاتا ہے لیکن امام زین العابدینؑ کے روحانی امتیاز کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کو اس لقب سے رسول اکرمؐ نے یاد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اسی لقب سے روز قیامت پروردگار یاد کرے گا جب اولین و آخرین کے عبادت گذار جمع ہوں گے۔ (اہل البیت توفیق ابو علم)

طاؤس یمانی نے آپ کو خانۂ خدا میں مناجات کرتے اور گریہ کرتے دیکھا تو عرض کی کہ اس طرح تو ہم گنہگاروں کو رونا چاہیئے۔ آپ کے جد رسول اکرمؐ۔ بابا امام حسینؑ۔ مادر گرامی فاطمہ زہراؑ ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہیں۔

فرمایا طاؤس خبردار رشتہ داری کی بات نہ کرو۔ پروردگار نے جنت صاحبان کردار کے لئے بنائی ہے چاہے وہ غلام حبشی ہوں اور جہنم گنہگاروں کے لئے بنایا ہے چاہے وہ سید قرشی ہوں، قیامت کے دن نسب کام آنے والا نہیں ہے۔

اس طرح امام نے ہر انسان کو متوجہ کر دیا کہ اگر ایک معصوم خوف خدا میں اس طرح گریہ کر سکتا ہے تو غیر معصوم کا انداز گریہ کیا ہونا چاہیئے۔

اخلاقیات

۔ امت کے غرباء و فقراء کی کفالت اور پرورش میں آپ کا کردار یہ تھا کہ رات کی تاریکی میں چہرہ پر نقاب ڈال کر لوگوں کے گھر کھانا پہونچایا کرتے تھے تاکہ کسی کو یہ اندازہ نہ ہونے پائے کہ یہ کار خیر کون انجام دے رہا ہے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ مدینہ کے سیکڑوں گھر تھے جن کی کفالت کی ذمہ داری آپ نے اپنے سر لے رکھی تھی۔

۔ فقیروں کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ انہیں دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ وہ شخص ہے جو میرے سامان کو یہاں سے میدان قیامت تک پہونچانے والا ہے۔

۔ فقیر کو پیسہ دینے سے پہلے اس پیسہ کو بوسہ دیتے تھے اس کے بعد فقیر کے حوالہ کرتے تھے کہ اس راستہ سے خدا کی بارگاہ میں جا رہا ہے۔

حلم و تواضع :

حلم و تواضع کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی شخص نے گالیاں بھی دے دیں تو اسے ایک لباس اور ہزار درہم عطا فرما دئے جب کہ غلام اسے مارنے کے لئے تیار تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اعلان کر دیا کہ بے شک آپ فرزند رسولؐ ہیں۔ (تذکرۃ الخواص لابن الجوزی ص ۳۳۱)

۔ ایک کنیز آپ کے دست مبارک پر پانی ڈال رہی تھی۔ اچانک لوٹا گر گیا۔ اس نے فوراً آیت پڑھی "والکاظمین الغیظ"۔ فرمایا میں نے غصہ کو ضبط کر لیا۔ اس نے دوسرا ٹکڑا پڑھا "والعافین عن الناس"۔ فرمایا میں نے معاف کر دیا۔ اس نے کہا "واللہ یحب المحسنین"۔ فرمایا جا تجھے راہ خدا میں آزاد کر دیا۔

حسن بن حسن نے آپ کے دروازہ پر آکر بُرا بھلا کہا اور چلے گئے۔ غلام حیرت زدہ رہ گئے کہ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ چلو حسن بن حسن کی گالیوں کا جواب دینا ہے۔ آپ بیت الشرف سے یہ آیت پڑھتے ہوئے برآمد ہوئے "والکاظمین الغیظ"۔ اس کے بعد جب حسن کے دروازہ پر دق الباب کیا تو وہ یہ احساس لئے ہوئے برآمد ہوئے کہ آپ بدلہ لینے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن آپ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا کہ "میرے بارے میں اگر آپ کا بیان صحیح ہے تو میں اپنے بارے میں استغفار کرتا ہوں اور اگر صحیح نہیں ہے تو آپ کے بارے میں استغفار کرتا ہوں۔

یہ سُننا تھا کہ حسن نے بڑھ کر آپ کی پیشانی کا بوسہ دیا اور کہا کہ بیشک میں غلطی پر تھا اور آپ کا دامن پاک و پاکیزہ ہے۔ (مناقب ابن شہر آشوب ۴/ ۱۵۷)

افکار عالیہ

ائمہ معصومینؑ کے افکار عالیہ کا جائزہ لینے کے لئے وہ بلند ترین فکر درکار ہے جس سے سارا عالم بشریت خالی ہے لہٰذا اس سطح کا اندازہ کرنا انسان کے امکان سے باہر ہے۔ اس مقام پر صرف ایک حدیث کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جس سے امام کی بلندی فکر اور کردار سازی دونوں کا بیک وقت اندازہ ہو جاتا ہے۔

ابو خالد کابلی کا بیان ہے کہ آپ نے گناہوں کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "وہ گناہ جن سے نعمتیں بدل جاتی ہیں" ان سے مراد لوگوں پر زیادتی۔ نیکی کا ترک کر دینا۔ نعمتوں کی ناشکری اور ان کا انکار ہے۔

"وہ گناہ جن سے ندامت اور شرمندگی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے" لوگوں کا قتل۔ قرابت داروں سے ترک تعلقات۔ نماز کا قضا کر دینا۔ وصیت کے بغیر مر جانا۔ وقت مرگ تک زکوٰۃ کا ادا نہ کرنا وغیرہ ہیں۔

"جن گناہوں سے بلائیں نازل ہوتی ہیں" ان میں فریادی کی فریاد رسی نہ کرنا مظلوم کی مدد نہ کرنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا برباد کر دینا شامل ہے۔

"جن گناہوں سے اقتدار دشمن کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے" ان میں کھُلم کھُلا ظلم کرنا۔ علی الاعلان فسق و فجور میں مبتلا ہونا۔ محرمات کو مباح بنا لینا۔ نیکوں سے اختلاف کرنا اور اشرار کی پیروی کرنا شامل ہیں۔

"جن گناہوں سے دعائیں رد ہو جاتی ہیں" ان میں نیت کی خرابی۔ طینت کی خباثت۔ برادران ایمانی کے ساتھ منافقت۔ تاخیر نماز۔ ترک کار خیر۔ استعمال بد گوئی و بد زبانی وغیرہ شامل ہیں۔ (الامام زین العابدینؑ مقرمؒ ص ۱۴۹)

اس کے علاوہ آپ کی دعائیں اور آپ کا رسالہ حقوق بلندیٔ فکر کا اندازہ کرنے کا بہترین ذریعہ ہے جس میں ہر انسان پر عائد ہونے والے پچاس طرح کے حقوق اور پروردگار کے عالم انسانیت پر احسانات کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔

سماجی حالات

جس طرح امیر المومنینؑ کو اپنی زندگی میں تین طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دور رسول اکرمؐ کے زیر سایہ گذارا۔ ایک دور آپ کے بعد خلفاء کی حکومت کا رہا اور ایک دور خود آپ کی حکومت کا رہا۔

امام حسنؑ نے ایک دور نانا اور بابا کے زیر سایہ گذارا اور ایک دور آپ کا اپنا رہا جس میں مصالح اسلامی کے تحت شام کے حاکم سے صلح کرنا پڑی۔

امام حسینؑ کی زندگی کا ایک دور نانا اور باپ کے زیر سایہ گذارا۔ ایک دور بھائی کی صلح کے تحفظ میں گذرا اور ایک دور آپ کے اپنے جہاد کا رہا۔

اسی طرح امام زین العابدینؑ کی زندگی کا ایک دور کربلا سے پہلے کا ہے اور ایک دور کربلا کے بعد آپ کی اپنی امامت کا ہے۔

لیکن کھُلی ہوئی بات ہے کہ جس طرح کے سنگین حالات میں آپ کی حکومت کا آغاز ہوا ہے اس کی مثال کسی کی تاریخ حیات میں نہیں ہے لہذا آپ کو خداداد صلاحیت اور عصمت کی بنیاد پر ایک ایسا راستہ اختیار کرنا ہے جس کی کوئی مثال یا اس کا کوئی نمونہ نگاہ میں نہیں ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے دو طرح کے اقدامات اختیار کئے:

۱۔ امام حسینؑ کے اقدامات کی تکمیل

امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب و انصار نے اپنا فریضۂ اسلام ادا کر دیا — اور اپنی جان عزیز کو راہ خدا میں قربان کر دیا۔ آپ پر ہونے والے مظالم میں دو بڑی جماعتوں کا ہاتھ تھا۔ اہل کوفہ اور اہل شام۔

اور دونوں کا بنیادی فرق یہ تھا کہ اہل کوفہ آپ کے مرتبہ۔ آپ کی شخصیت و حیثیت اور آپ کے خاندانی حالات سے بخوبی واقف تھے۔ صرف مزاج کی بے اعتدالی اور فطرت کی طماعی نے بنی امیہ کی حمایت پر آمادہ کر دیا تھا جس کا صحیح نقشہ فرزدق نے ایک لفظ میں کھینچ دیا تھا کہ

اہل کوفہ کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں آپ کے خلاف ہی اٹھیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے کوفہ کے خطبوں میں اپنے تعارف سے زیادہ واقعہ کی اہمیت پر زور دیا اور کوفہ کے ضمیر کو بیدار کیا کہ تم نے کس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ "میں اس کا بیٹا ہوں جس کی بیحرمتی کی گئی۔ اس کا سامان چھین لیا گیا۔ اس کا مال لوٹ لیا گیا۔ اس کے گھر والوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ میں شط فرات کے شہید کا فرزند ہوں جسے بیگناہ مارا گیا اور چاروں طرف سے گھیر کر مارا گیا۔" (مقتل الحسینؑ مقرمؒ ص ۳۱۶)

— اور شام میں آپ کا لہجہ اس سے بالکل مختلف تھا وہاں مصائب سے پہلے فضائل کا ذکر ضروری تھا کہ شام واقعاً آپ کے گھرانے کی عظمت سے بے خبر تھا اور اس کے سامنے امام حسینؑ کو ایک خارجی بنا کر پیش کیا گیا تھا جس کا اندازہ اس مرد شامی کی گفتگو سے ہوتا ہے جس کے سامنے آپ نے آیات قربیٰ اور مودت وتطہیر کی تلاوت کر کے جب یہ ارشاد فرمایا کہ ان آیات سے مراد ہمارا گھرانہ ہے تو وہ مبہوت ہو گیا اور اس نے واضح طور پر یزید سے برائت کا اعلان کر دیا۔ (مقتل الحسین مقرمؒ ص ۳۴۹)

چنانچہ دربار یزید میں آپ کے خطبہ کا آغاز اس انداز سے ہوتا ہے: "ایہا الناس! ہمیں چھ کمالات دیے گئے ہیں اور سات فضائل۔ ہمارے کمالات میں علم۔ حلم۔ سخاوت۔ فصاحت۔ شجاعت اور قلوب مومنین میں محبت شامل ہے۔ — اور ہمارے فضائل یہ ہیں کہ — رسول مختارؐ۔ صدیق اکبرؑ۔ جعفر طیارؑ۔ حمزہ شیر خدا۔ سیدۃ نساء العالمین اور سبطین امت سب ہمیں میں سے ہیں۔"

یہی انداز کوفہ وشام میں ثانی زہراؑ جناب زینبؑ۔ جناب ام کلثومؑ اور جناب فاطمہؑ کے خطبوں کا بھی ہے جن سے شام وکوفہ کے حالات کے فرق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ جدید اصلاحی عمل

ظاہر ہے کہ ذاتی علم امامت اور سابقہ تجربات کی بنا پر امامؑ کو اپنے واسطے ایک نئی حکمت عملی اختیار کرنا تھی جس میں سابقہ تجربات کا حصہ بھی ہو اور جدید حالات کا حصہ بھی ہو۔

چنانچہ آپ نے تجربات کی بنا پر یہ دیکھ لیا تھا کہ امت کے حالات کسی مسلح مقابلہ کے قابل نہیں ہیں اور اس کا نتیجہ قربانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس فریضہ کو والد محترم کما حقہ ادا کر چکے ہیں۔ اب کوئی دوسرا ہی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ اس راستہ میں آپ کو دو غیبی امدادوں کا سہارا مل گیا۔

ایک طرف — امت میں انقلابات کا سلسلہ — "مدینہ کا یزید کی خلافت سے انکار اور اس کے نتیجہ میں واقعہ حرّہ" — "مکہ میں عبداللہ ابن زبیر کی قیادت میں انقلابی تحریک" — "کوفہ میں ۶۵ھ میں سلیمان بن صرد خزاعی کی قیادت میں توابین کا قیام" — پھر "۶۶ھ میں جناب مختار ثقفی کا اقدام"۔

جس نے یزیدیت کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں لیکن پھر بھی کسی ایک مخالف یزید گروہ کی علانیہ حمایت کا مفہوم یہی سمجھا کہ اس طرح چند مخلصین اسلام وایمان کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور کوئی خاطر خواہ نتیجہ مذہب کے حق میں برآمد نہ ہو سکے گا۔ اسی لئے آپ نے مختار کی تحریک کی بھی کھلم کھلا حمایت نہیں فرمائی۔

دوسری طرف — امت میں ایک ایسے طبقہ کا وجود جس کے دل میں آل محمدؐ کی محبت ومعرفت موجود تھی اور وہ بالکل پامال ہو کر رہ گیا تھا۔

چنانچہ آپ نے تین طرح کے کاموں کا سلسلہ شروع کر دیا:

ا۔ اس طبقہ کو مزید وسعت دی جائے اور اس کے افراد میں اضافہ کیا جائے۔

ب۔ اسلامی فکر کو مزید پختہ بنایا جائے اور امت کے شعور کو کمال کی منزلوں تک پہونچایا جائے۔

ج۔ ایسی قیادت ایجاد کی جائے جس میں اسلامی اصالت اور واقعیت پائی جاتی ہو اور جسے سیاسی حالات اپنے بہاؤ میں نہ بہا لے جا سکیں۔

ان تینوں کے اثرات ونتائج اس شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں:

● ہشام بن عبدالملک نے اپنے باپ کے دور حکومت میں حج کیا اور امام زین العابدینؑ بھی تشریف لے آئے۔ ہشام کو حجر اسود تک جانے کا راستہ نہ ملا اور امام کے لئے مجمع خود بخود ہٹ گیا تو لوگوں نے ہشام سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟ اس نے بات پر پردہ ڈالنے کے لئے

انکار کر دیا کہ میں نہیں پہچانتا ہوں۔ جس پر فرزدق نے امامؑ کی شان میں مکمل قصیدہ پڑھ دیا اور ہشام نے انھیں جیل میں ڈال دیا۔ جس کے بعد امامؑ نے اس حوصلہ و ہمت کے انعام کے طور پر بارہ ہزار درہم عنایت فرما دئے۔

اور اس واقعہ نے واضح کر دیا کہ امامؑ نے ایسے افراد پیدا کر لئے تھے جو ایسے سنگین مواقع پر بھی اعلان حق سے نہیں گھبراتے تھے۔

● امامؑ نے شاگردوں کی ایک عظیم جماعت تیار کر دی تھی جو آجتک تاریخ شخصیات میں نمایاں حیثیت کی مالک ہے۔ مثال کے طور پر ابو حمزہ ثمالی ثابت بن دینار (۲) قاسم بن محمد بن ابی بکر (۳)، علی بن رافع (۴)، ضحاک بن مزاحم (۵) حمید بن موسیٰ الکوفی (۶) ابو الفضل سدید بن حکیم صیرفی (۷)، عبد اللہ البرقی (۸) یحییٰ بن ام الطویل (۹) حکیم بن جبیر (۱۰)، فرزدق (۱۱) فرات بن احنف (۱۲)، ایوب بن الحسن (۱۳) ابو محمد القرشی السدی (۱۴) طاؤس بن کیسان الہمدانی (۱۵) ابان بن تغلب بن رباح (۱۶) قیس بن رمانہ (۱۷) ابو خالد الکابلی (۱۸) سعید بن المسیب المخزومی (۱۹) عمر بن علی بن الحسین (۲۰) عبد اللہ بن علی بن الحسین (۲۱) جابر بن محمد بن ابی بکر وغیرہم۔

صحابہ کرام میں حسب ذیل حضرات نے آپ سے استفادہ کیا ہے:

جابر بن عبد اللہ الانصاری۔ عامر بن واثلہ الکنانی۔ سعید بن المسیب بن حزن۔ سعید بن جہان الکنانی۔

تابعین میں آپ کے رواۃ حسب ذیل حضرات ہیں:

سعید بن جبیر۔ محمد بن جبیر بن مطعم۔ قاسم بن عوف۔ اسماعیل بن عبد اللہ بن جعفر۔ ابراہیم بن محمد بن الحنفیہ۔ الحسن بن محمد بن الحنفیہ۔ حبیب بن ابی ثابت۔ ابو یحییٰ الاسدی۔ ابو حازم الاعرج۔ سلمہ بن دینار وغیرہ۔

اسالیب تربیت

امام سجادؑ نے اس جماعت کی تشکیل کے لئے چار طریق کار اختیار فرمائے تھے اور انھیں

ذریعہ امت کے شعور کو بیدار اور پائیدار بنانے کا کام انجام دیا تھا۔

۱۔ مجالس عزا کا قیام

ان مجالس میں فقط بنی امیہ کے مظالم اور آل محمدؐ کے مصائب کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے ذریعہ امت کے شعور کو بیدار کیا جاتا تھا اور ظلم سے نفرت اور ظالم کے خلاف قیام کا حوصلہ پیدا کیا جاتا تھا۔

۲۔ ادعیہ

یہ دعائیں بظاہر عبد و معبود کے رشتہ کو مستحکم بنانے کا ذریعہ تھیں لیکن ان کے مضامین میں عبادت کے علاوہ اخلاقیات اور اجتماعیات کا ایک ذخیرہ تھا جس کے ذریعہ امت کی ذہنی تربیت کی جاتی تھی۔

۳۔ حل مشاکل

اس اسلوب سے قوم کو محسوس کرایا جاتا تھا کہ اسلام کی قیادت کیسے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے اور قائد امت کا کیا کردار ہوتا ہے۔ چنانچہ بے پناہ مصائب و آلام کے باوجود بھی مدینہ کے تقریباً سو گھر تھے جن کا کھانا آپ خود اپنے دست مبارک سے پہونچایا کرتے تھے۔

(مناقب ابن شہر آشوب ۴/۱۵۴)

۔ ابن اعرابی کا بیان ہے کہ واقعہ حرّہ میں جب لشکر یزید نے مدینہ پر حملہ کیا تھا اور مدینہ والوں کی حرمت کو حلال بنا لیا تھا تو آپ نے چار سو عورتوں کو اپنے گھر میں پناہ دے دی تھی اور ان کے جملہ اخراجات کا انتظام فرمایا کرتے تھے۔

۔ نافع بن جُبیر نے آپ کی کفالت اور انکساری کو دیکھ کر اعتراض کر دیا کہ آپ پست طبقہ کے ساتھ معاشرت رکھتے ہیں اور یہ آپ کی شان کے خلاف ہے تو آپ نے فرمایا کہ "میں ان کے ساتھ بیٹھتا ہوں جن کے ساتھ بیٹھنا میرے دین کے لئے مفید ہے۔

۴۔ تاسیس مدرسہ دینیہ

آپ نے اپنے گھر اور مسجد پیغمبرؐ کو ایک دینی مدرسہ کی شکل دے دی تھی اور امت کے باصلاحیت افراد کو مسلسل تعلیم و تربیت دے رہے تھے جس کا نتیجہ مذکورہ بالا افراد کی شکل میں

ظاہر ہوا اور درحقیقت یہی مدرسہ اس عظیم مدرسہ کی بنیاد تھا جس کی سرپرستی امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کو حاصل تھی اور جس میں چار ہزار اہل علم و فضیلت تحصیل علم کر رہے تھے۔

ردّ عمل

امام علیہ السلام کے ان زحمات کا بہترین نتیجہ برآمد ہوا اور بنی امیہ کے خلاف بہترین فضا تیار ہو گئی۔ حکام وقت نے امامؑ کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی کہ آپ نے کسی بھی انقلابی تحریک میں براہ راست حصہ نہیں لیا تھا لیکن امامؑ کی عوامی شخصیت اور مرجعیت حکام وقت کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی اور بالآخر سلیمان بن عبدالملک نے ولید کے دور حکومت میں زہر دے کر امامؑ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا اور آپ کی عوامی عظمت کا آخری مظاہرہ آپ کی مشایعت جنازہ میں ہو گیا۔ والسلام علیہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امام محمد باقر علیہ السّلام

اسم گرامی محمد اور لقب باقر تھا اور ارشاد مفیدؒ ص ۲۶۲ اور فصول مہمہ ابن صباغ مالکی ص ۲۱۱ کی روایت کی بنا پر یہ نام اور لقب دونوں رسول اکرمؐ نے طے کر دیئے تھے جب جابر بن عبداللہ انصاری سے فرمایا تھا کہ تم علیؑ بن الحسینؑ کے فرزند محمدؑ سے بھی ملاقات کرو گے جو علم میں موشگافیوں اور تدقیقات کا مظاہرہ کرے گا۔ اس سے میرا سلام کہہ دینا۔

آپ کا سب سے پہلا نسبی امتیاز یہ ہے کہ آپ کے ماں باپ دونوں ہاشمی اور علوی سادات ہیں کہ باپ امام علیؑ بن الحسینؑ ہیں اور ماں فاطمہ بنت الحسنؑ۔ گویا قدرت نے اکبر تبہ پھر علیؑ اور فاطمہؑ کا رشتہ دُہرا دیا اور جس طرح پہلے رشتہ سے دو معصوم عالم وجود میں آئے تھے کہ طرفین معصوم تھے اسی طرح اس رشتہ سے ایک معصوم وجود میں آیا کہ باپ معصوم ہے اور ماں معصومہ نہیں ہے۔ اگرچہ امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ وہ بھی اولاد حسنؑ میں بے مثال صدیقہ تھیں۔

(اصول کافی ۱/۴۶۹)

یکم رجب ۵۷ھ کو ولادت ہوئی اور تقریباً ساڑھے تین سال اپنے جد بزرگوار امام حسینؑ کے زیر سایہ زندگی گزاری اور کربلا کے عظیم ترین حادثہ کا سامنا کیا اور سارے مصائب میں اہل حرم کے ساتھ رہے اور پدر بزرگوار کے ہمراہ تحفظ اسلام کی راہ میں قربانیاں دیتے رہے۔

۵۷ھ کے عدد میں یہ حسن پایا جاتا ہے کہ اس میں ۵ بھی شامل ہے جو امام کا درجہ امامت ہیں اور وہ ۷ بھی شامل ہے جو ترتیب معصومینؑ میں درجۂ عصمت ہے اور اس طرح اس عدد میں امامت اور عصمت دونوں کا اشارہ پایا جاتا ہے اور پروردگار نے اس اشارہ کو اس وقت دائمی بنا دیا جب امام کی عمر مبارک بھی کل ۵۷ سال قرار دے دی۔

عظمت وجلالت

امامؑ کی عظمت وجلالت کا یہ عالم تھا کہ عبد اللہ بن عطار مکی کہا کرتے تھے کہ میں نے کسی کے سامنے علمار کو اس قدر چھوٹا اور حقیر نہیں دیکھا ہے جس قدر امام محمد باقرؑ کے سامنے دیکھا ہے کہ بڑے بڑے علمار بے حقیقت نظر آتے تھے۔ (ارشاد مفیدؒ ص ۲۶۳)

ابن العماد الحنبلی کا قول تھا کہ ابوجعفر محمدؑ الباقر فقہار مدینہ میں شمار ہوتے تھے اور انھیں ان کی علمی وسعتوں اور باریکیوں کی وجہ سے باقر کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

(الامام الصادق والمذاہب الاربعہ ۲/۲۳۶)

ابوالفدار اسماعیل بن کثیر دمشقی نے اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ "ابوجعفر الباقر جلیل القدر تابعی تھے۔ علم وعمل۔ سیادت وشرف میں اعلام امت میں شمار ہوتے تھے استنباط احکام اور توسعہ علوم کی بنا پر باقر کہے جاتے تھے۔ ذکر خدا۔ خشوع۔ صبر آپ کا شعار تھا خاندان رسالت کی فرد تھے لہٰذا رفیع النسب بھی تھے اور علیُّ الحسب بھی۔ حالات پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ خوف خدا میں گریہ کرتے رہتے تھے اور ہر جنگ وجدل سے دور رہتے تھے

(البدایۃ والنہایۃ)

جابر بن یزید الجعفی کا طریقہ تھا کہ جب امامؑ سے کوئی روایت نقل کرتے تھے تو کہتے تھے کہ مجھ سے وصی الاوصیار۔ وارث علم انبیار محمدؑ بن علیؑ الباقر نے بیان کیا ہے۔

(بحار ۴۶/۲۸۶)

مالک بن اعین الجہنی کا بیان ہے امام علیؑ بن الحسینؑ نے محمدؑ باقر کو وصیت کی کہ تم میرے خلیفہ ہو اور میرے تمھارے درمیان اگر کوئی خلافت کا دعویٰ کرے گا تو روز قیامت اس کے گلے میں آگ کا طوق ڈال دیا جائے گا۔ بیٹا! اس نعمت پر شکر خدا کرو۔ شکر سے نعمت کو دوام حاصل ہوتا ہے اور کفران نعمت سے زوال۔ نیک بندوں کی نگاہ میں شکر کی لذت اصل نعمت سے زیادہ ہوتی ہے کہ شکر نعمتوں میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

(بحار ۴۶/۲۳۱)

شخصیت امامؑ

امام محمد باقرؑ ائمہ اہلبیتؑ میں سے ایک امام ہیں لہٰذا ان کی زندگی میں بھی شخصیت کے وہ تمام پہلو پائے جاتے ہیں جو دیگر ائمہ اطہارؑ کی زندگی میں دیکھے گئے ہیں۔ سر دست صرف تین پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جس سے ان کی مکمل شخصیت اور سیرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ارتباط خدا

امام صادقؑ کا بیان ہے کہ میرے پدر بزرگوار بیحد ذکر خدا کیا کرتے تھے۔ راستہ چلتے تھے تو ذکر خدا کرتے تھے۔ کھانا کھاتے تھے تو ذکر خدا کرتے تھے۔ لوگوں سے بات کرتے رہتے تھے لیکن ذکر خدا سے غافل نہ ہوتے تھے۔ نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک مسلسل گھر والوں کو ذکر خدا اور قرارت قرآن میں مشغول رکھتے تھے۔ (بحار ۴۶/۲۹۷)

آپ کے غلام افلح کا بیان ہے کہ میں سفر حج میں آپ کے ساتھ تھا جیسے ہی خانۂ کعبہ پر نگاہ پڑی آپ نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے عرض کی میرے ماں باپ قربان۔ لوگ آپ پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اسقدر بلند آواز سے نہ روئیں۔ فرمایا خدا تیرا بھلا کرے، میں کیسے نہ روؤں جب کہ خیال ہے کہ اس حالت پر پروردگار کو رحم آسکتا ہے اور روز قیامت عاقبت بن سکتی ہے۔ طواف کے بعد جب نماز پڑھ کر سجدہ سے سر اٹھایا ہے تو زمین آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی۔

(بحار ۴۶/۲۹۰)

جابر بن یزید جعفی نے خیریت دریافت کر لی تو فرمایا میں بہت رنجیدہ ہوں۔ عرض کی خیر تو ہے خدانخواستہ کوئی حادثہ؟ — فرمایا کہ آخرت کا خیال پریشان کئے ہوئے ہے۔ اے جابر! جس کے دل میں خالص ایمان ہوتا ہے وہ دنیا کی زینتوں میں دل نہیں لگاتا ہے کہ یہ سب لہو ولعب ہیں اور صرف آخرت ہی باقی رہنے والی ہے۔

اے جابر! مالدار صرف اہل تقویٰ ہیں کہ تھوڑے سے مال پر قناعت کر لی ہے اور سب سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ تم خیر کو بھول جاؤ گے تو یاد دلائیں گے اور خیر کرو گے تو تمھاری مدد کریں گے۔ شہوات ولذّات کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اطاعت الٰہی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا

ہے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ کارِ خیر اور ولایت محبان الٰہی پر رہتی ہے لہٰذا تم بھی ان سے محبت کرو اور ان کا اتباع کرو۔ (تحف العقول حرّانیؒ ص ۲۸۶)

۲۔ اجتماعیات

امام صادقؑ کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن میں ۸ ہزار دینار خرچ کرتے دیکھا ہے اور ایک گھر کے گیارہ غلاموں کو آزاد کرتے دیکھا ہے۔ (بحار ۴۶/۳۰۲)

حسن بن کثیر کہتے ہیں کہ میں نے غربت اور دوستوں کی بے رخی کا شکوہ کیا فرمایا کہ بدترین بھائی وہ ہے جو مالداری میں رشتہ رکھے اور غربت میں رشتہ توڑ لے اور اس کے بعد غلام کو حکم دیا اور اس نے سات سو درہم کی ایک تھیلی مجھے دے دی اور پھر فرمایا کہ جب ختم ہو جائے تو اطلاع کرنا۔ (ارشاد مفیدؒ ص ۲۶۶)

عمر ابن دینار اور عبید اللہ بن عبید کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب بھی ملاقات کرتے تھے ہمارے لئے سامان خورد و نوش اور لباس پہلے سے تیار رکھتے تھے۔ (ارشاد مفیدؒ ص ۲۶۶)

اس سیرت و کردار کے ہمراہ مسلسل اپنے چاہنے والوں کو برادران ایمانی کی مواساتؑ ہمدردی پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور فرماتے تھے کہ "دنیا و آخرت کی تمام بزرگی کا راز تین چیزوں میں مضمر ہے۔ جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کر دو۔ جو قطع تعلق کرے اس سے رابطہ کو برقرار رکھو اور کوئی جہالت کرے تو اسے برداشت کر لو"۔ (تحف العقول ص ۲۵۳)

اپنے جد بزرگوار رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی برابر نقل کیا کرتے تھے کہ "دنیا میں تین کام سب سے زیادہ مشکل ہیں۔ برادران ایمانی سے مالی ہمدردی کرنا۔ اپنے مقابلہ میں لوگوں سے انصاف کرنا اور ہر حال میں خدا کو یاد رکھنا"۔

ایک عیسائی نے گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا نام بقر ہے؟

فرمایا۔ باقر!

اس نے کہا کہ آپ کھانا پکانے والی کے فرزند ہیں؟

فرمایا اگر ایسا ہے تو وہ اس کا مشغلہ تھا۔

اس نے کہا کہ آپ سیاہ فام بدزبان عورت کے فرزند ہیں؟

فرمایا اگر یہ بات صحیح ہے تو خدا اسے بخشے ورنہ تجھے معاف کرے۔

یہ سننا تھا کہ عیسائی بدحواس ہو گیا اور امامؑ کی عظمت کا اقرار کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح کی بدزبانی اور غلط بیانی کا اس قدر شرافت اور متانت کیساتھ جواب دیا جائے گا۔

۳۔ علمی افادات

علامہ ابن شہر آشوبؒ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے عبد اللہ بن عمر سے مسئلہ پوچھا۔ انھیں جواب معلوم نہ تھا تو انھوں نے امام باقرؑ کے پاس بھیجدیا اور کہا کہ واپس آ کر مجھے جواب سے باخبر کرنا۔ وہ شخص امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو گویا کہ جواب پہلے سے تیار تھا۔ پلٹ کر ابن عمر کو باخبر کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ اس گھرانے کے ہیں جنھیں شریعت کا شعور دے کر بھیجا گیا ہے۔ (مناقب ۴/۱۹۷)

محمد بن المنکدر اپنے وقت کے مشہور صوفی تھے۔ ترک دنیا کر کے مشغول عبادت رہا کرتے تھے۔ ایک دن امامؑ کو دوپہر کے وقت غلاموں پر تکیہ کئے ہوئے باغ کی طرف جاتے دیکھا تو یہ سوچ کر آگے بڑھے کہ امامؑ کو نصیحت کریں گے اور کہنے لگے کہ اس گرمی میں طلب دنیا کے لئے نکل پڑے۔ موت آگئی تو کیا ہوگا؟۔ فرمایا یہ موت کسب معاش اور اطاعت الٰہی میں ہوگی۔ اُس موت کا کیا ہوگا جو معصیت خدا میں آجائے (جس کی طرف رسول اکرمؐ نے اشارہ کیا ہے کہ جو اپنا بوجھ دوسروں کے سر پر ڈال دے وہ ملعون ہے اور اسی انداز زندگی کا نام تصوف ہے جو تقدّس کے پردہ میں مفت خوری کا دوسرا انداز ہے)۔

ابن المنکدر یہ سُن کر مبہوت رہ گیا اور کہنے لگا کہ میں انھیں موعظہ کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے خود ہی مجھے نصیحت کر دی۔ (ارشاد مفیدؒ ص ۲۱۴)

ایک موقع پر شیعہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا شیعہ صرف وہی ہے جو خوف خدا رکھتا ہو اور اس کی اطاعت کرتا ہو۔ اس کی پہچان تواضع۔ خشوع۔ ادا امانت اور ذکر خدا کی کثرت کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کی ادائیگی ہے۔ وہ والدین کے ساتھ نیکی کرتا ہے اور ہمسایہ کا خیال رکھتا ہے۔ فقراء، مساکین۔ ایتام پر نگاہ رکھتا ہے۔ سچ بولتا ہے۔ قرآن کی تلاوت کرتا

ہے۔ زبان پر سوائے خیر کے کوئی کلمہ نہیں لاتا ہے اور ساری قوم میں امانتداری سے پہچانا جاتا ہے۔ (تحف العقول ص ۲۹۵)

عمر بن عبدالعزیز بنی امیہ کے "بادشاہ عادل" کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو حکومت کرنا ہے تو مسلمانوں کے چھوٹے افراد کو اپنا فرزند۔ برابر والے کو بھائی اور بڑے کو اپنے باپ جیسا سمجھنا۔ فرزند پر رحم کرنا۔ بھائی کے ساتھ تعلقات رکھنا اور باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا اور جب بھی کوئی نیکی کرنا تو اسے مکمل کرنا۔ (الامام الصادقؑ ۲/۲۵۵)

آپ کے شاگرد محمد بن مسلم کا بیان ہے کہ میں نے ہر مسئلہ کا حل امامؑ سے حاصل کیا ہے۔ اس لئے میرے پاس تیس ہزار حدیثیں ہیں۔ (رجال کشی ص ۱۶۷)

جابر بن یزید جعفی کہتے ہیں کہ میں نے امام باقرؑ سے ۷۰ ہزار حدیثیں سنی ہیں۔ (اختصاص مفیدؒ ص ۶۶)

تلامذہ

آپ کے نمایاں شاگردوں میں حسب ذیل نام کافی شہرت رکھتے ہیں۔ جابر بن عبداللہ انصاری۔ جابر بن یزید جعفی۔ حمران بن اعین۔ زرارہ بن اعین۔ معروف بن خربوذکی۔ ابوبصیر اسدی۔ فضیل بن یسار۔ محمد بن مسلم۔ یزید بن معاویہ عجلی۔ عبداللہ بن شریک۔ محمد بن اسماعیل بن بزیغ۔ عبداللہ بن میمون القداح۔ اسماعیل بن الفضل۔ سعید بن طریف۔ اسماعیل بن جابر خثعمی۔ ابوبصیر لیث المرادی۔ ابوالجارود زیاد بن منذر۔ کیمت بن زید اسدی۔ معاذ بن مسلم الفرار النحوی۔ عبداللہ بن ابی یعفور۔ ابان بن تغلب۔ ابوحمزہ ثمالی۔ زید بن علیؑ بن الحسینؑ وغیرہم۔

سیاسیات

۹۵ھ میں امام سجادؑ کی شہادت واقع ہوئی اور زمام قیادت اسلام امام محمد باقرؑ کے ہاتھ میں آگئی۔ زمانہ ولید بن عبدالملک کا تھا۔ تقریباً دوسال اس کا دور رہا۔ اس کے بعد دوسال سلیمان بن عبدالملک کا دور رہا اور یہ سارا زمانہ بنی ہاشم کے مصائب کا دور تھا۔

یہانتک کہ عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھ میں حکومت آئی تو اس نے قدرے انصاف کا مظاہرہ کیا اور خطبۂ نماز سے سب علیؑ کی منحوس رسم کا خاتمہ کیا۔ خلفاء سابقین کو غاصب قرار دے کر فدک امام باقرؑ کو واپس کیا۔ بنی ہاشم کے لئے وظائف مقرر کئے اور اس کی یہ دلیل قرار دی کہ پیغمبرؐ نے فاطمہؑ کو اپنا ایک جزو قرار دیا ہے اور پیغمبرؐ کی رضا رضائے فاطمہؑ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

لیکن یہ صورت حال ۲ ½ سال سے زیادہ نہ رہ سکی اور بنی امیہ کی فاسد اور معاند سرشت نے اس برتاؤ کو برداشت نہ کیا اور آخر کار حکومت یزید بن عبدالملک کے ہاتھ میں آگئی جو انتہائی عیاش اور بدکار انسان تھا اور اس کے نتیجہ میں اختیار ہشام بن عبدالملک کے ہاتھ میں آگیا جو بدمزاج۔ بخیل۔ بے رحم اور متعصب سب کچھ تھا اور اس نے یزید و حجاج کے دور کی یاد تازہ کرادی۔ جناب زید کی لاش کو سولی سے اُتار کر نذر آتش کرادیا۔ جناب جابر بن یزید جعفی کے قتل کا حکم دے دیا جو حکم امام باقرؑ سے مجنون بن گئے اور اس طرح اپنی زندگی کا تحفظ کیا۔

ہشام نے آپ کو مدینہ سے دمشق طلب کر کے دربار میں خوب بُرا بھلا کہا اور پھر درباریوں نے بھی حسب ہدایت گالیاں دیں۔ آخر میں امامؑ کھڑے ہو گئے۔ فرمایا تم لوگ کہاں بھٹک رہے ہو۔ تمہاری حکومت چند روزہ ہے۔ ہماری حکومت دائمی ہے۔ عاقبت صرف متقی افراد کے لئے ہے۔ جس کے بعد ہشام نے قید میں ڈال دیا اور جب قید خانہ کے نگراں متاثر ہونے لگے تو مدینہ واپس کر دیا اور آخر میں ۷ صفر ۱۱۴ھ کو زہر دے کر شہید کرادیا۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

زندگانی امام جعفر صادق علیہ السّلام

اسم گرامی جعفرؑ۔ لقب صادق۔

والد محترم امام محمد باقرؑ بن علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب۔

والدہ محترمہ جناب فاطمہ (ام فروہ) بنت قاسم بن محمد بن ابی بکر۔ ام فروہ کی مادر گرامی اسماء بنت عبدالرحمان بن ابی بکر۔ گویا نانیہال سے امامؑ کا سلسلہ خلیفہ اوّل سے دو طریقوں سے مل جاتا ہے جس طرح کہ دادیہال سے آپ کا سلسلہ رسول اکرمؐ تک پہونچتا ہے۔

مدینہ منورہ میں ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ میں ولادت ہوئی اور مدینہ ہی میں شوال ۱۴۸ھ میں شہادت پائی۔ جنت البقیع میں آپ کی قبر مطہر آجتک موجود ہے۔

علماء اسلام نے عام طور سے آپ کی علمی شخصیت اور اجتماعی عظمت کا اقرار کیا ہے یہانتک کہ سبط ابن جوزی نے عطار کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "میں نے علماء کو کسی کے سامنے اسقدر چھوٹا نہیں دیکھا ہے جس قدر امام باقرؑ کے سامنے دیکھا ہے"۔ اور امام جعفر صادقؑ انھیں کے وارث اور جانشین تھے۔

خود منصور دوانیقی نے جب محمد بن عبداللہ نفس زکیہ کے خط کا جواب لکھا ہے تو اسمیں یہی لکھا ہے کہ حضرت جعفر بن محمدؐ تم سے بہر حال بہتر ہیں۔

(کامل ابن اثیر ۵/۵۳۹)

بلکہ تاریخ یعقوبی (۳/۳۸۳) میں تو یہانتک نقل کیا گیا ہے کہ منصور کو گریاں دیکھ کر اسماعیل بن علی بن عبداللہ بن عباس نے سبب دریافت کیا تو اس نے کہا کہ خاندان بنی ہاشم کے سردار، عالم اور یادگار اخیار کا انتقال ہو گیا ہے، یعنی امام جعفر صادقؑ۔

دور امامت

امامؑ کا دور سیاسی اعتبار سے انتہائی اضطراب و انتشار کا دور تھا۔ بنی امیہ کا اقتدار جارہا تھا۔ بنی عباس اقتدار کی فکر میں لگے ہوئے تھے اور ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ جس سے تین باتوں کا اندازہ ہوتا ہے:

۱۔ اسلام میں ہر علمی۔ عملی۔ سیاسی میدان میں قدم جمانے کی صلاحیت موجود تھی۔

۲۔ حکّام اسلامی خطوط سے یکسر منحرف ہو گئے تھے۔

۳۔ امت میں اتنی غیرت موجود تھی کہ حکام کے خلاف اقدام کیا جاسکے۔

امام صادق علیہ السلام نے ان تینوں امور کا مکمل طور پر مشاہدہ کیا۔ آپ کی زندگی میں تقریباً ۴۹ سال بنی امیہ کی حکومت رہی جس میں آپ نے عبدالملک بن مروان۔ ولید بن عبدالملک۔ سلیمان بن عبدالملک۔ عمر بن عبدالعزیز۔ ولید بن یزید۔ یزید بن ولید۔ ابراہیم بن ولید اور مروان الحمار کے مظالم کا مشاہدہ کیا اور اس کے بعد جب ۱۳۲ھ میں اس حکومت کا جنازہ نکل گیا تو ابوالعباس سفاح اور اس کے بعد اس کے بھائی منصور کے مظالم کا سامنا کیا۔ لیکن کسی انقلابی تحریک میں باقاعدہ حصہ نہیں لیا۔ اگرچہ سب کا شعار اور نعرہ آل محمدؐ ہی کے حق میں ہوا کرتا تھا اور اس کے غالباً تین اسباب تھے:

۱۔ امامؑ اپنی علمی اور خاندانی وجاہت کی بنا پر مسلسل حکومتوں کے زیر نگرانی رہے اور آپ کی ایک ایک جنبش زبان کا محاسبہ ہوتا رہا اور آپ کوئی اقدام نہیں کر سکے۔

۲۔ آپ نے مسلسل دیکھ لیا تھا کہ امت کا شعور آل محمدؐ کے افکار کی منزل تک پہونچنے کے قابل نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ راستہ میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور آخر تک انقلاب میں ساتھ نہیں رہتے ہیں۔

۳۔ حکام وقت کے سامنے کوئی قانون۔ قاعدہ۔ اخلاق یا مذہب نہیں ہے۔ وہ مقصد کے حصول کی راہ میں کسی منزل تک بھی جا سکتے ہیں۔

○

انقلابات

آپ نے اپنے دور میں تین عظیم انقلابات کا مشاہدہ کیا :

۱۔ انقلاب زید بن علی (۱۲۱ھ) ۔ جناب زید فقیہ مشہور تھے ۔ امام جعفر صادقؑ کے چچا اور امام باقرؑ کے بھائی تھے ۔ حالات سے عاجز آ کر قیام کے لئے تیار ہو گئے تھے ۔ امامؑ ان کا بیحد احترام کرتے تھے لیکن علم امامت سے انقلاب کے انجام سے باخبر تھے لہٰذا تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا اور زید کو بھی انجام سے باخبر کر دیا اور بالآخر وہی ہوا کہ انھوں نے کوفہ کو مرکز بنایا اور کوفہ نے اپنی قدیم روش کا مظاہرہ کیا اور بالآخر جناب زید شہید ہو گئے اور دفن کے بعد ان کی لاش کو قبر سے نکال کر سولی پر لٹکا دیا گیا۔

واضح رہے کہ جناب زید کے دور کے حالات واقعاً ایک غیرت دار انسان کو بے چین کر دینے والے تھے جس کے نتیجہ میں جناب ابوحنیفہ نے بھی آپ کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا اور مال زکوٰۃ کا ایک مصرف زیدؒ کے انقلاب کو قرار دے دیا تھا جس کے نتیجہ میں والی کوفہ ابن ہبیرہ نے انھیں سخت سزا دی اور جیل میں ڈال دیا جہاں سے وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور مکہ میں جا کر مقیم ہو گئے اور پھر بنی عباس کے دور میں کوفہ واپس آئے ۔

۲۔ سقوط بنی امیہ ۔ ۱۳۲ھ میں بنی امیہ کے اقتدار کا جنازہ نکل گیا اور حکومت بنی عباس کی طرف منتقل ہو گئی ۔ بنی عباس نے ابتدائی طور پر بنی ہاشم کی حمایت کا نعرہ دیا تھا اور کربلا سے لے کر شہادت زید تک کے تمام مصائب کو اس کا ثبوت قرار دیا تھا لیکن جیسے ہی اقتدار ہاتھ میں آیا حالات یکسر تبدیل ہو گئے ۔

امام صادقؑ کو اس مستقبل کا مکمل اندازہ تھا اسی لئے ابوسلمہ خلال جو عباسی تحریک کا قائد اعظم تھا جب اس نے دیکھا کہ سارا کام ابراہیم بن محمد کے لئے انجام دیا گیا اور اسے قتل کر دیا گیا ہے اور جگہ ابوالعباس عبداللہ بن محمد کو مل گئی ہے تو فوراً امام صادقؑ کو خط لکھ دیا کہ آپ بیعت قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیں ۔ آپ نے خط کو پڑھ کر پھاڑ کر پھینک دیا لیکن اس نے دوسرا خط احتیاطاً عبداللہ بن الحسن کو بھی لکھ دیا تھا ۔ انھوں نے قیادت و ریاست

کا نام سنا تو خوش ہو گئے لیکن امام صادق سے مشورہ ضروری سمجھا ۔ آپ نے اپنے جواب کا حوالہ دے کر فرمایا کہ اس قیادت کا انجام ناکامی اور قتل کے علاوہ کچھ نہیں ہے ۔ لیکن عبداللہ نے اسے قبول نہ کیا اور حضرت کے حسد پر محمول کیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قیادت کے لئے تیار ہو گئے اور قاصد کے ابوسلمہ تک واپس آنے سے پہلے ابوالعباس کی بیعت مکمل ہو گئی اور اس نے ایسا قتل عام شروع کر دیا کہ لقب ہی سفاح ہو گیا ۔

اس نے امام صادقؑ کو بھی مدینہ سے حیرہ طلب کیا لیکن قتل کا کوئی بہانہ نہ مل سکا تو واپس کر دیا ۔ اس کے بعد منصور کے ہاتھ میں حکومت آئی تو اس نے بھی حضرت کو متعدد بار مدینہ سے عراق طلب کیا لیکن قتل کا کوئی بہانہ نہ پا سکا ۔ یہاں تک کہ حضرت کو حکومت میں شامل کرنے کی پالیسی کے بارے میں سوچنے لگا اور آپ کو ایک خط روانہ کر دیا :

"آپ میرے پاس اس طرح کیوں نہیں آتے ہیں جس طرح دوسرے لوگ حاضری دیتے ہیں"۔

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا :

"نہ میرے پاس دنیا ہے کہ جس کے ڈر سے حاضری دوں اور نہ تیرے پاس آخرت ہے کہ جس کی امید میں حاضری دوں ۔ نہ یہ خلافت کوئی نعمت ہے کہ اس کی مبارکباد کے لئے آؤں اور نہ تو اسے مصیبت سمجھتا ہے کہ اس کی تعزیت کے لئے حاضری دوں "۔

منصور نے نہایت ہوشیاری سے دوسرا رخ اختیار کیا " آپ نصیحت کے لئے میرے ساتھ رہا کریں "۔

فرمایا "جسے دنیا عزیز ہو گی وہ نصیحت نہ کرے گا اور جسے دین عزیز ہو گا وہ تیرے ساتھ نہ رہے گا "۔ (الامام الصادقؑ محمد ابوزہرہ ص ۱۳۹)

۳۔ محمد بن عبداللہ بن الحسن "النفس الزکیہ" کا انقلاب ۱۴۵ھ ۔ ۱۳۶ھ میں حکومت منصور کے ہاتھ میں آئی تو اس نے مظالم کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا جس سے عاجز آ کر نفس زکیہ نے انقلاب کا ارادہ کر لیا ۔ امام صادقؑ نے ان کے والد کو بھی روکا تھا اور انجام سے باخبر کر دیا تھا اور انھیں بھی متوجہ کیا لیکن انھوں نے مدینہ کو مرکز بنا کر انقلاب کا اعلان کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھی قتل ہوئے اور ان کے فرزند علی مصر میں مارے گئے ۔ دوسرے فرزند عبداللہ سندھ

میں قتل ہوئے۔ ان کے فرزند علی یمن میں گرفتار ہوئے اور ختم کر دئیے گئے۔ ان کے بھائی ادریس کو بلاد مغرب میں زہر دیا گیا اور اس طرح پورے خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

علمی کارنامے

۔ امام صادقؑ کا دور تاریخ اسلام کا نمایاں ترین دور ہے جس میں علمی تحریکات کو بے پناہ ترقی حاصل ہوئی تھی۔ دوسرے ممالک اور مذاہب کے علوم اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ یونانی فلسفہ ترجمہ کی شکل میں عربی زبان میں منتقل ہو رہا تھا اور اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اُبھر رہے تھے۔ مذاہب تشکیل پا رہے تھے اور ایک علمی ہنگامہ سے گھر کی رونق میں اضافہ ہو رہا تھا۔

۔ ایسے حالات میں ایک ایسے شخص کی ضرورت کا احساس فطری تھا جو تمام مسائل کو حل کر سکے۔ تمام اعتراضات کے جوابات دے سکے۔ تمام اختلافات میں صحیح فکر اور رائے کی نشاندہی کر سکے اور عالم اسلام میں امام صادقؑ کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی شخصیت کو اُبھر کر سامنے آنے کا موقع ملا اور لوگوں نے آپ کی عظمت کو باقاعدہ طور پر پہچان لیا جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر بڑے سے بڑا عالم آپ کی شاگردی کے لئے بیچین تھا اور مدینہ سے کوفہ تک آپ کے علوم و معارف کا ایک عظیم شہرہ تھا۔

ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں آپ کے راویوں میں مالک بن انس۔ شعبہ بن الحجاج۔ سفیان ثوری۔ ابن جریح۔ عبداللہ بن عمرو۔ سفیان بن عیینہ۔ سلیمان بن بلال۔ حاتم بن اسماعیل جیسے افراد کا شمار کیا ہے۔

اور یعقوبی نے آپ کو افضل الناس اور اعلم الناس کے لقب سے یاد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگ آپ کی روایات کو "عالم" کے نام سے نقل کرتے تھے۔ (تاریخ یعقوبی ۲/ ۳۸۱)

فرید وجدی نے دائرۃ المعارف میں جابر بن حیان کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے اور اسے آپ کے علم و فضل کی بہترین دلیل قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ ابوحنیفہ۔ مالک وغیرہ کے اقوال آپ کے بارے میں عام شہرت رکھتے ہیں اور سب نے آپ کے عظیم علمی مقام کا اعتراف کیا ہے۔

۔ انھیں حالات سے فائدہ اٹھا کر آپ نے ایک عظیم علمی مدرسہ کی بنیاد رکھ دی جس میں بقول

حافظ ابن عقدہ چار ہزار اکابر علماء و محدثین تحصیل علم کر رہے تھے اور اس کے فارغ التحصیل نو سو شیوخ مسجد کوفہ میں آپ کے علوم و معارف کی اشاعت کر رہے تھے۔ (اعیان الشیعہ ۱/ ۶۶۱)

۔ امام صادقؑ کے اس مدرسہ کے دو بنیادی مقاصد تھے:

۱۔ اسلامی عقائد و افکار کا تحفظ اور اس پر ہونے والے حملوں کا جواب۔

۲۔ اسلامی حقائق و معارف کی اشاعت۔

چنانچہ آپ نے وہ شاگرد بھی تیار کئے جو علم مناظرہ کے ماہر تھے اور ان کا کام دشمنوں کے تمام حملوں کا مکمل دفاع تھا اور وہ افراد بھی تیار کئے جو استنباط احکام کے ماہر اور مسجد میں بیٹھ کر فتویٰ دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اور یہ اس لئے بھی ممکن ہو گیا کہ آپ کی حیثیت ایک مجتہد کی نہیں تھی جس کے افکار میں غلطی کا امکان ہو اور جس سے اختلاف بھی ممکن ہو۔ بلکہ آپ ایک محافظ شریعت اور عالم احکام واقعیہ تھے۔ آپ تک اسلام کے حقیقی احکام سرکار دو عالمؐ اور آپ کے آباء و اجداد کے ذریعہ پہنچے تھے۔ اسی لئے لوگ آپ کے علوم پر مکمل اعتماد رکھتے تھے اور ان میں کسی طرح کے شک اور شبہ کی گنجائش نہ پاتے تھے۔

کلمات طیبہ

علم۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان انسان پر واجب ہے اور یاد رکھو کہ پروردگار علم کے طلبگاروں کو دوست رکھتا ہے۔ (کافی ۱/ ۳۰)

حدیث۔ ہر شئے کا مرکز کتاب و سنت ہے اور حدیث بھی کتاب خدا سے مطابقت نہ رکھتی ہو تو مہمل ہے۔ (کافی ۱/ ۶۹)

• ہر حق سے بالاتر ایک حقیقت ہے اور ہر راہ صواب پر ایک نور ہے لہٰذا جو چیز کتاب خدا کے مطابق ہو اسے لے لو اور جو کتاب خدا کے خلاف ہو اسے ترک کر دو۔ (کافی ۱/ ۶۹)

رویت خدا۔ ایک شخص امیر المومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ کیا آپ نے اس خدا کو دیکھا ہے جس کی عبادت کرتے ہیں؟ فرمایا کہ میں اس خدا کی عبادت کس طرح کر سکتا ہوں جس کو دیکھا نہ ہو۔ عرض کی کہ آپ نے کس طرح دیکھا ہے؟ فرمایا کہ اسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتی ہیں بلکہ دل ایمان کے حقائق

کے ذریعہ دیکھتے ہیں۔

تربیت۔ • جہاد کرو تاکہ اپنے اولاد کو بزرگی کا وارث بنا سکو۔ (وسائل الشیعہ ۹/۶)

• جو اپنے نفس کے بارے میں انصاف کر سکے وہ دوسروں کے معاملات میں حکم بن سکتا ہے۔ (تحف العقول ص ۳۵۷)

• دنیا کی رغبت کا نتیجہ صرف غم و حزن ہوتا ہے اور دنیا میں زہد کا اثر جسم و قلب دونوں کی راحت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ (تحف العقول ص ۳۵۸)

• امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دو الٰہی اخلاقیات ہیں جو ان کی مدد کرے گا خدا اس کی مدد کرے گا اور جو انہیں چھوڑ دے گا خدا اسے چھوڑ دے گا۔ (وسائل ۶/۴۱۶)

• مخلوقات کی رضا کی خاطر خالق کو ناراض نہ کرو اور خدا کی دوری کے ذریعہ لوگوں کا قرب اختیار نہ کرو۔ (وسائل ۶/۴۲۲)

• اپنے بزرگوں کیساتھ اچھا برتاؤ کرو تاکہ تمھاری اولاد تمھارے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور تم لوگوں کی عورتوں کو مت دیکھو تاکہ لوگ تمھاری عورتوں کا احترام کریں۔ (مشکوٰۃ الانوار طبرسی)

• بہترین عبادت معرفت خدا اور تواضع ہے۔ (تحف العقول ص ۳۶۱)

• بہترین برادر وہ ہے جو عیوب کی نشاندہی کرے۔ (تحف العقول ص ۳۶۴)

• حسن اخلاق دین کا ایک حصہ ہے اور اس سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔ (تحف العقول ص ۳۷۵)

• جو شخص بُرے آدمی کے ساتھ رہتا ہے وہ بُرائی سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے اور جو اپنے الفاظ پر قابو نہیں رکھتا ہے اسے شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور جو غلط مقامات پر جاتا ہے وہ ایک دن بدنام ضرور ہو جاتا ہے۔

• ابو عمر شیبانی کا بیان ہے کہ میں نے امام صادقؑ کو باغ میں کام کرتے ہوئے دیکھا اور حضرت کے جسم اقدس سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ میں نے عرض کی کہ حضور لائیے یہ کام میں کر دوں گا۔ فرمایا کہ میں اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ انسان طلب معاش کے لئے حرارت آفتاب کی اذیت برداشت کرے۔ (کافی ۵/۷۶)

حیاتِ امام موسیٰ بن جعفرؑ

ولادت باسعادت ۷ صفر ۱۲۸ھ۔ شہادت ۲۵ رجب ۱۸۳ھ

• مادر گرامی کا اسم مبارک حمیدہ خاتون تھا جن کی روایت ہے کہ امام نے ولادت کے بعد سر سجدہ معبود میں رکھا اور کلمۂ شہادتین زبان پر جاری کیا اور اس طرح اسلام و ایمان کا قولی اور عملی مظاہرہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ نمائندہ پروردگار اپنے تعلیمات مذہب اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور کسی کی تعلیم و تربیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔ وہ کلمہ سکھانے کے لئے آتا ہے سیکھنے کے لئے نہیں آتا ہے۔ اس کا کام سجدۂ معبود کے ذریعہ مخلوقات کو خالق کی طرف جذب کرنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے سجدہ سے صرف فریضۂ بندگی کو نہیں ادا کرتا ہے۔

• آپ کے داہنے بازو پر قلم قدرت نے یہ آیت مبارکہ نقش کر دی تھی "تمت کلمة ربك صدقا وعدلا"۔

• آپ کی ولادت باسعادت کے موقع پر امام صادقؑ نے باقاعدہ ولیمہ کیا تاکہ لوگوں کو حجت پروردگار کی آمد کا علم ہو جائے اور بات اسماعیل کی ولادت تک محدود نہ رہنے پائے۔ (جلاء العیون)

• آپ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ آپ کا لقب کاظم ہے اور یہ لقب بطور اسم بھی استعمال ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی اولاد کو موسوی بھی کہا جاتا ہے اور کاظمی بھی۔ یہ اور بات ہے کہ لفظ موسیٰ آپ کی ہیبت و جلالت کا اعلان کرتا ہے اور لفظ کاظم آپ کے صبر و تحمل کا اعلان کرتا ہے۔

• آپ کا ایک لقب باب الحوائج بھی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حاجتوں

میں خدا تک پہونچنے اور اس کی بارگاہ سے مراد حاصل کرنے کا دروازہ امام معصوم ہی ہوتا ہے اور امام موسیٰ کاظم ؑ کی زندگی میں یہ پہلو کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوگیا ہے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور آپ کو اہل کاظمین اسی لقب سے یاد کرتے ہیں اور اسی کے ذریعہ مخاطب کرتے ہیں۔

• آپ کے حکام وقت میں ۱۲۸ھ میں مروان الحمار تھا جو بیک وقت مروان بھی تھا اور حمار بھی اور آخر میں خلیفۃ المسلمین بھی (گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا است کارِ طفلاں تمام خواہد شد) ۱۳۲ھ میں سفاح حاکم ہوا اور ۱۳۶ھ میں منصور تخت حکومت پر بیٹھا ۱۵۸ھ سے منصور کے بیٹے مہدی کی حکومت شروع ہوئی اور ۱۶۹ھ میں اس کے بھائی ہادی کا دور ہوگیا جو صرف ایک سال رہ سکا اور ۱۷۰ھ سے ہارون کی حکومت کا آغاز ہوگیا اور اسی نے امامؑ کو زہر دغا سے شہید کرا دیا۔

واضح رہے کہ بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ حمار پر ہوا اور بنی عباس کی حکومت کا آغاز سفاح سے ہوا (حمار کے معنی گدھا اور سفّاح کے معنی خونریز یا بدکار)۔

• مقام ولادت مقام ابواء ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے اور اس مقام پر ولادت کا راز یہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ جناب حمیدہ کو اپنے ہمراہ حج میں لے گئے تھے اور واپسی میں مدینہ پہونچنے سے پہلے آپ کی ولادت باسعادت ہوئی جو اس بات کی دلیل ہے کہ ائمہ طاہرینؑ سخت ترین حالات میں بھی حج کو نظرانداز نہیں کرتے تھے اور حج کا تعلق جس طرح مردوں سے ہے، اُسی طرح عورتوں سے بھی ہے، بلکہ عورت کا ایام حمل میں ہونا حج سے مانع بھی نہیں ہے ورنہ امام صادقؑ ہرگز آپ کو اپنے ہمراہ نہ لے جاتے۔ (اعیان الشیعہ)

• جناب حمیدہ کے وطن کے بارے میں اختلاف ہے بعض نے آپ کو بربر کا بتایا ہے بنت صالح البربری یا اخت صالح بربری اور بعض نے اندلس یا روم کا لکھا ہے۔ بہرحال یہ طے شدہ ہے کہ آپ حدود عربستان کے باہر سے تعلق رکھتی تھیں اور یہ ایک عظیم نکتہ ہے کہ ائمہ معصومینؑ نے اپنی شادیوں میں کبھی قومیت یا علاقائیت کو معیار نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ کردار پر نگاہ رکھی اور اسی لئے جناب حمیدہ کو "حمیدہ مصفاۃ" کہا جاتا ہے۔

• آپ کی کنیت ابوالحسن الاول۔ ابوالحسن الماضی۔ ابو ابراہیم۔ ابوعلی ابو اسماعیل تھی۔

• انگوٹھی کا نقش "الملک للہ وحدہ" تھا جو وقت کی حکومتوں کو خاموش طریقہ پر چیلنج کر رہا تھا کہ مالک پروردگار ہے لہذا حاکم کا انتخاب بھی اسی کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ دنیا میں کسی آدمی کو حاکم بننے یا منتخب کرنے کا حق نہیں ہے۔

• امام شافعی آپ کی قبر مبارک کو "تریاق مجرب" کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے جو آپ کے باب الحوائج ہونے کا بہترین ثبوت ہے۔ (تحفۃ المعالم ۲/۲۰)

آپ کی عمر مبارک تین برس کی تھی جب صفوان جمال نے امام صادقؑ سے سوال کیا کہ آپ کا وارث کون ہوگا؟ اور آپ نے فرزند کی طرف اشارہ کر دیا جو اس وقت ایک بکری کے بچہ کو کھلا رہے تھے اور اس سے مسلسل سجدہ کا تقاضا کر رہے تھے تاکہ دیکھنے والے انسان ہوش میں آجائیں کہ سجدہ نہ کرنے والا انسان جانور سے بدتر ہوتا ہے۔

پانچ برس کی عمر تھی جب ابوحنیفہ امام صادقؑ سے مسئلہ جبر پر بحث کرنے کے لئے آئے اور امام کاظمؑ نے پہلے ہی یہ سوال اٹھا دیا کہ اس کی تین صورتیں ہیں، یا معصیت کا ذمہ دار پروردگار ہوگا اور بندہ مجبور محض ہوگا تو عذاب کرنا ظلم صریح ہے یا دونوں شریکِ معصیت ہوں گے تو دونوں کو شریک عذاب بھی ہونا چاہیئے۔ اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ پروردگار نے اسے اختیار دے کر چھوڑ دیا ہے اور اب جس طرح کے اعمال کرے گا اسی کے اعتبار سے جزا یا سزا کا حقدار ہوگا۔

• ابوحنیفہ نے آپ کو نماز پڑھتے دیکھا جب لوگ سامنے سے گذر رہے تھے تو فوراً اعتراض کر دیا کہ یہ شان نماز نہیں ہے۔ فرمایا کہ میرا خدا رگِ گردن سے زیادہ قریب ہے۔ راہگیر میرے اور اس کے درمیان حائل نہیں ہو سکتے ہیں۔

• ہارون آپ کے کمالات کی شہرت سے بیحد پریشان تھا۔ چنانچہ حج کے موقع پر بھرے مجمع میں یہ سوال کر لیا کہ آپ اپنے کو اولادِ رسول میں کس طرح شمار کرتے ہیں؟۔ آپ نے برجستہ جواب دیا کہ جس طرح قرآن مجید نے جناب عیسیٰ کو اولاد ابراہیمؑ میں شمار کیا ہے حالانکہ ان کا کوئی باپ نہ تھا اور ان کا ہر رشتہ ماں کی طرف سے ہے۔ (صواعق محرقہ ابن حجر)

• ہارون حج بیت اللہ کے بعد قبر پیغمبرؐ کی زیارت کو گیا اور مجمع کو مرعوب کرنے کے لئے

قبر کے پاس کھڑے ہو کر رسول کہنے کے بجائے بھائی کہہ کر سلام کیا "السّلام علیکَ یا ابن العم" آپ نے یہ منظر دیکھا تو فوراً قبرِ پیغمبرؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا "السّلام علیکَ یا ابتاہ" جس کے بعد ہارون نے آپ کی گرفتاری کا حکم دے دیا کہ آپ نے حکومت کے سارے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا۔ (وفیات الاعیان)

• ہارون نے قید خانہ میں ایک عورت کو بھیجدیا تاکہ امام کو عبادتِ خدا سے غافل بنائے اور لوگوں پہ یہ واضح کیا جائے کہ بنی فاطمہؑ مجبوراً عبادتِ خدا میں مصروف رہتے ہیں۔ ورنہ ان کا نفس بھی دنیا کے عام انسانوں سے مختلف نہیں ہوتا ہے۔ لیکن عورت نے قید خانہ میں امام کی شانِ عبادت دیکھی تو خود بھی سجدہ میں گر پڑی۔ اور اس وقت تک سر نہ اُٹھایا جب تک حکومت کے کارندوں نے جبراً سجدہ ختم نہیں کرادیا۔

عورت امامؑ کے خضوع و خشوع کو دیکھ کر حیران و پریشان تھی تو آپ نے فرمایا کہ اسقدر حورانِ جنّت کے اختیار میں ہونے کے بعد تیرے حُسن و جمال کی کیا حیثیت ہے۔ (مناقب)

• ہارون نے علی بن یقطین کو اپنا وزیر بنا رکھا تھا حالانکہ وہ محبِّ اہلبیتؑ تھے۔ ایک مرتبہ ہارون نے علی بن یقطین کو ایک خلعت عنایت کیا تو انھوں نے امامؑ کے پاس بھیجدیا۔ آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اپنے پاس رکھو کبھی کام آسکتا ہے۔ اُدھر لوگوں نے علی بن یقطین کی شکایت کی کہ یہ امام موسیٰ کاظمؑ کے فدائی ہیں اور سارا سرکاری سامان انھیں بھیجدیا کرتے ہیں۔ ہارون نے تحقیقات کا حکم دے دیا اور جب خلعت علی بن یقطین کے گھر سے برآمد ہو گیا تو جھوٹی شکایت والوں کو سخت سزا دی اور علی بن یقطین کے اعتبار میں اضافہ ہو گیا جس کا وسیلہ امام موسیٰ کاظمؑ کا علمِ امامت تھا کہ آپ نے خلعت کو واپس کر دیا۔

اسی دوران علی بن یقطین نے امام کو خط لکھا کہ یہاں وضو کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، آپ کا حکم کیا ہے؟۔ آپ نے برادرانِ اسلام کے طریقہ سے وضو کرنے کا حکم دیدیا۔ علی بن یقطین سخت حیران تھے کہ امام نے یہ کیسے فرمادیا ہے جب کہ ان کے آباء و اجداد کا طریقہ واضح اور معلوم ہے۔ لیکن جب ہارون نے لوگوں کی شکایت کی بنا پر چھُپ کر علی بن یقطین کو اپنی طرح وضو کرتے دیکھ لیا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ شیعہ نہیں ہیں اور یہ سب امام موسیٰ کاظمؑ کے وجودِ مقدس اور آپ کے

بابُ الحوائج ہونے کی برکت تھی۔

• مہدی عباسی نے اپنے دورِ حکومت میں فدک کی واپسی کا ارادہ کیا اور امام سے اس کے حدود اربعہ دریافت کر لئے۔ امامؑ نے پورے عالم اسلام کا رقبہ بتادیا کہ فدک ایک علامت ہے اس حق کی جو امیر المومنینؑ سے سلب کر لیا گیا ہے اور جس کا ان کے علاوہ نہ کوئی اہل تھا اور نہ ہے۔ باغ اور جاگیر تو اس نکتہ کے اظہار کے لئے تھی کہ غاصب کو تختِ اسلامی پر متمکن نہیں ہونا چاہیئے۔

• محمد بن اسماعیل حکومت کے جاسوس تھے جب امامؑ کی شکایت لے کر حاکم کے پاس جانے لگے تو آپ نے بڑے احترام سے رخصت کیا۔ لیکن ایک جملہ یہ کہہ دیا کہ خبردار! اپنے ہاتھوں کو میرے خون سے رنگین نہ کیجیے گا۔ لیکن خدا بُرا کرے مالِ دنیا کا کہ یہ انسان کو بیہوش اور بدحواس بنا دیتا ہے اور انسان تمام قدروں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

• آپ نے قید خانہ سے ہارون کو خط لکھا کہ ہم دونوں ایک مقررہ عمر لے کر آئے ہیں اور ہر گذرنے والا دن تیری راحت کا ایک دن کم کر رہا ہے اور میری مصیبت کا ایک دن کم کر رہا ہے۔ اس کے بعد سرحدِ موت پر پہونچ کر تیرے پاس صرف مصیبتیں رہ جائیں گی اور میرے پاس صرف راحتیں رہ جائیں گی جس کے بعد ہارون بدحواس ہو گیا لیکن حکومت پھر حکومت ہوتی ہے۔ ہارون نے آپ کو مختلف قید خانوں میں رکھا یہاں تک کہ سندی بن شاہک کے قید خانہ میں آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا اور وہاں سے جنازہ زنجیروں سمیت برآمد ہوا۔ (صواعق محرقہ)

سلیمان بن جعفر نے جنازہ کی بیحرمتی دیکھ کر احتجاج کیا اور پھر نہایت درجہ اہتمام و احترام سے جنازہ کو اُس مقام پر دفن کرادیا جہاں آج قبرِ مطہر پائی جاتی ہے اور مرجعِ خلائق بنی ہوئی ہے۔

"السّلام علیکَ یا بابَ الحوائجؑ!"—

نقشِ حیات امام علی رضا علیہ السلام

اسم مبارک علیؑ تھا اور لقب رضا۔ صابر۔ زکی اور ولی۔

۱۱ ذی قعدہ سنہ ۱۴۸ھ میں ولادت ہوئی اور ۲۳ ذی قعدہ سنہ ۲۰۳ھ میں شہادت۔ جس کی بنا پر آپ کی کل عمر شریف ۵۵ سال تھی۔

امام جعفر صادقؑ کا انتقال اسی سنہ ۱۴۸ھ میں ۱۵ یا ۲۵ شوال کو ہوا ہے یعنی امام رضاؑ کی ولادت سے ۱۵ یا ۲۵ دن قبل۔ اسی بنا پر آپ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں اپنے فرزند کو دیکھ لیتا جو عالم آل محمدؐ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ عالم اسلام کے سب سے بڑے معلم اور چار ہزار جیّد علمار کے استاد کی طرف سے یہ سند ایک بے پناہ عظمت کی حامل ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سات پشتیں گذر جانے کے بعد بھی علیؑ کے کمالات میں فرق نہیں آیا ہے۔ پہلا علیؑ بھی باب مدینۃ العلم تھا اور یہ علیؑ بھی "عالم آل محمدؐ" ہے۔

آپ کے دَور کا حاکم اور خلیفۃ المسلمین آپ کو "اعلم اہل الارض" کہا کرتا تھا اور یا سیدی کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ سنہ ۲۰۱ھ میں جب آپ کی ولیعہدی کا اعلان کیا ہے تو ان لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ علی بن موسیٰ الرضا افضل، اعلم اور اورع ہیں لہذا یہ اس منصب کے زیادہ حقدار ہیں اور اسی بات پر ۳۳ ہزار کے مجمع میں آپ کی بیعت کا عہد ہوا تھا۔

اس سے قبل بھی آپ کے علم و فضل کی یہ شہرت تھی کہ جب نیشاپور سے گذرے ہیں تو ۲۴ ہزار محدثین قلم و دوات لے کر اکٹھا ہو گئے تھے کہ آپ سے حدیث نقل کریں گے اور آپ نے ایک مخصوص سلسلۂ عصمت کے حوالے سے اس حدیث کو بیان کیا تھا کہ "کلمۂ لا الٰہ

الا اللہ میرا قلعہ ہے جو اس قلعہ میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا" اور جس کے سلسلۃ الذہب کو دیکھ کر امام احمد بن حنبل نے کہا تھا کہ یہ سلسلہ کسی دیوانے پر دم کر دیا جائے تو ہوش میں آجائے۔

افسوس کہ کتنے دیوانے آج بھی ہیں جن کی نظر سے یہ سلسلۂ عصمت گذرتا رہتا ہے لیکن انھیں ہوش نہیں آتا ہے اور جاہل آبار و اجداد کے طریقۂ کار پر جمے ہوئے ہیں۔ جیسے عقل و منطق کا دنیا میں کوئی کام ہی نہیں ہے اور اسلام کا امتیاز بھی مال و دولت ہی ہے۔

ہارون رشید کی دو بیویاں تھیں۔ ایک عرب جس سے امین پیدا ہوا اور ایک کنیز جس سے مامون پیدا ہوا۔ دونوں میں باپ کے زمانے ہی سے اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو گئی اور ایک کے ساتھ عرب ہو گئے اور ایک کے ساتھ عجم۔ جس کی بنا پر ہارون نے حکومت کو دو حصّوں پر تقسیم کر کے دونوں کو ایک ایک حصہ دے دیا۔ لیکن اس کے بعد بھائیوں میں جنگ ہوئی اور مامون نے میدان جیت لیا۔ لیکن عربوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہو گیا جس کو دبانے کیلئے اس نے ایک نیا حربہ استعمال کیا کہ امام رضاؑ کو ولیعہد یا بادشاہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ آپ کو مدینہ سے بُلا کر پہلے حکومت کی پیشکش کی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تیری خلافت اللہ کی طرف سے ہے تو تجھے دوسرے کو دینے کا حق نہیں ہے اور اگر عوام کی طرف سے ہے تو مجھے لینے کا حق نہیں ہے۔

مامون نے مجبور ہو کر ولیعہدی کی پیشکش کی اور اصرار کیا کہ یہ عہدہ تو قبول ہی کرنا پڑے گا ورنہ زندگی خطرہ میں ہے۔ جس کی بنا پر امامؑ نے اس منصب کو اس شرط کیساتھ قبول کر لیا کہ امور مملکت میں کوئی دخل نہ دیں گے۔

۷ رمضان سنہ ۲۰۱ھ میں یہ بیعت ولیعہدی ہوئی اور یکم شوال کو مامون نے نماز عید پڑھانے کا مطالبہ کر دیا۔ جس کے بعد امامؑ شان رسالت سے نماز کے لئے برآمد ہوئے تو ساری فضا میں تکبیر کے نعرے گونجنے لگے اور مامون نے آپ کو واپس بُلا لیا کہ اب حقیقتاً حکومت کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہے۔

آپ کے ولیعہد ہو جانے کا اثر یہ ہوا کہ عالم اسلام میں آپ کی شہرت ہو گئی اور

آپ کے بعد کے ائمہ اطہارؑ کو "ابن الرضاؑ" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ بلکہ انکی اولاد کو بھی رضوی سادات میں شمار کیا جانے لگا۔ اس لئے کہ آپ کی اولاد ذکور میں امام محمد تقیؑ کے علاوہ کوئی نہ تھا اور ان کی اولاد تقوی یا جوادی کہی جانے والی تھی۔

اسبابِ ولیعہدی

بعض مامون پرست مورخین کا کہنا ہے کہ مامون کو حکومت کے بارے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ ایک طرف ائمہ اہلبیتؑ کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا کہ ان کا سارا تقویٰ اور تقدّس مجبوری کی پیداوار ہے ورنہ حکومت مل جائے تو نہ کوئی تقویٰ رہ جائے گا اور نہ تقدّس۔

دوسری طرف فضل بن سہل جیسے خراسانیوں کو مطمئن کرنا تھا کہ ہمارے تعلقات اولاد رسولؐ سے بہتر ہیں اور ہم ان کا مکمل احترام کرتے ہیں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ مامون معتزلی ہونے کی بنا پر تفضیلی تھا اور تفضیلیت تشیع سے قریب تر ہے جس کے حسب ذیل شواہد ہیں:

ا۔ مامون حضرت علیؑ کی افضیلت کا قائل تھا جو عقیدہ تشیع کی بنیاد ہے۔

ب۔ مامون امام رضاؑ کی فضیلت اور افضلیت ظاہر کرنے کے لئے برابر لوگوں سے آپ کے مناظرے کرایا کرتا تھا جو بات تشیع کے مقاصد سے قریب تر ہے۔

ج۔ مامون قرآن مجید کے مخلوق ہونے کا قائل تھا جو شیعوں کا عقیدہ ہے اور وہ خدا کے علاوہ کسی کو قدیم اور ازلی نہیں تسلیم کرتے ہیں۔

د۔ مامون متعہ کو جائز سمجھتا تھا اور یہ حضرت عمر کے دور کے بعد سے تشیع کا امتیاز بن گیا ہے۔

ہ۔ مامون نے فدک کی واپسی کا منصوبہ بنایا تھا جو جناب فاطمہؑ اور ان کے گھر والوں کے حقدار ہونے کا عقیدہ اور تشیع کی بنیاد ہے۔

و۔ مامون نے امامؑ کو اپنی بیٹی دی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ائمہ اہلبیتؑ سے بیحد متاثر تھا۔

ظاہر ہے کہ ان تمام اسباب میں کوئی سبب ایسا نہیں ہے جسے انسان کے تشیع کی دلیل

قرار دیا جا سکے۔ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

ا۔ تشیع ایک مکمل مذہب ہے جس میں کسی امام کے ولیعہد ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ امام امام ہوتا ہے وہ کسی حاکم وقت کا نائب نہیں ہو سکتا ہے۔

ب۔ دربار کے مناظرے امام کی فضیلت کے اظہار کے لئے نہیں تھے بلکہ دربار کی فضیلت کے اظہار کے لئے تھے کہ یہاں ایسے ایسے قابل افراد پائے جاتے ہیں۔

ج۔ قرآن کے مخلوق ہونے کا مسئلہ شیعوں سے قربت کی بنا پر نہیں اختیار کیا گیا تھا۔ بلکہ عوام الناس کو ایک مسئلہ میں الجھا کر بہلانے کے لئے اٹھایا گیا تھا۔

د۔ متعہ کا مسئلہ بھی اس دور میں اسی سیاسی مقصد کے لئے اٹھایا گیا تھا اور تنہا ایک مسئلہ سے کسی انسان کا عقیدہ نہیں طے ہوتا ہے ورنہ عبداللہ بن عمر بھی اس مسئلہ میں اپنے باپ سے اختلاف رکھتے تھے جب کہ ان کا شیعیت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا۔

ہ۔ فدک کی واپسی کا منصوبہ بھی حالات کی مجبوری کی بنا پر تھا جس کا اظہار مہدی عباسی کے دور حکومت میں ہو چکا تھا۔

و۔ شادی کا مسئلہ عقیدہ سے تعلق نہیں رکھتا ہے اس میں بیشمار مصالح کام کرتے ہیں جس کا مشاہدہ روز اوّل سے اسلام کی تاریخ میں کیا جا سکتا ہے اور اس کا بہترین ثبوت امام محمد تقیؑ سے انتہائی کمسنی کے باوجود شادی کا اصرار ہے۔

ز۔ فضل بن سہیل جیسے افراد کو مطمئن کرنے کا خیال بھی عجیب و غریب ہے کہ وہ خود بھی ولیعہدی کا مخالف تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ بنی فاطمہؑ کا حکومت میں کوئی دخل ہو جائے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ مامون کے پیش نظر حسب ذیل قسم کے مصالح تھے جن کی بنا پر اس نے یہ اقدام کیا تھا اور اس کا مذہب اور عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں تھا:

۱۔ امامؑ کی عوامی شخصیت کے خطرہ سے تحفظ حاصل کر لیا جائے ورنہ عوام الناس کسی وقت بھی ان کے حق میں آواز اٹھا سکتے ہیں۔

۲۔ ولیعہدی کے ذریعہ امامؑ کو زیر نظر رکھا جائے اور ان کے تمام اعمال پر نگاہ رکھی جائے۔

۳۔ امامؑ کو معاشرہ سے الگ کر لیا جائے اور لوگوں سے انکی ملاقات کے راستے تقریباً بند کر دیے جائیں۔

آپ کے بعد کے ائمہ اطہارؑ کو "ابن الرضاؑ" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ بلکہ انکی اولاد کو بھی رضوی سادات میں شمار کیا جانے لگا۔ اس لئے کہ آپ کی اولاد ذکور میں امام محمد تقیؑ کے علاوہ کوئی نہ تھا اور ان کی اولاد تقوی یا جوادی بھی جانے والی تھی۔

اسبابِ ولیعہدی

بعض مامون پرست مورخین کا کہنا ہے کہ مامون کو حکومت کے بارے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ ایک طرف ائمہ اہلبیتؑ کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا کہ ان کا سارا تقویٰ اور تقدس مجبوری کی پیداوار ہے ورنہ حکومت مل جائے تو نہ کوئی تقویٰ رہ جائے گا اور نہ تقدس۔

دوسری طرف فضل بن سہل جیسے خراسانیوں کو مطمئن کرنا تھا کہ ہمارے تعلقات اولاد رسولؐ سے بہتر ہیں اور ہم ان کا مکمل احترام کرتے ہیں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ مامون معتزلی ہونے کی بناپر تفضیلی تھا اور تفضیلیت تشیع سے قریب تر ہے جس کے حسب ذیل شواہد ہیں:

ا۔ مامون حضرت علیؑ کی افضیلت کا قائل تھا جو عقیدہ تشیع کی بنیاد ہے۔

ب۔ مامون امام رضاؑ کی فضیلت اور افضلیت ظاہر کرنے کے لئے برابر لوگوں سے آپ کے مناظرے کرایا کرتا تھا جو بات تشیع کے مقاصد سے قریب تر ہے۔

ج۔ مامون قرآن مجید کے مخلوق ہونے کا قائل تھا جو شیعوں کا عقیدہ ہے اور وہ خدا کے علاوہ کسی کو قدیم اور ازلی نہیں تسلیم کرتے ہیں۔

د۔ مامون متعہ کو جائز سمجھتا تھا اور یہ حضرت عمر کے دور کے بعد سے تشیع کا امتیاز بن گیا ہے۔

ھ۔ مامون نے فدک کی واپسی کا منصوبہ بنایا تھا جو جناب فاطمہؑ اور ان کے گھر والوں کے حقدار ہونے کا عقیدہ اور تشیع کی بنیاد ہے۔

و۔ مامون نے امامؑ کو اپنی بیٹی دی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ائمہ اہلبیتؑ سے بیحد متاثر تھا۔

ظاہر ہے کہ ان تمام اسباب میں کوئی سبب ایسا نہیں ہے جسے انسان کے تشیع کی دلیل

قرار دیا جا سکے۔ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

ا۔ تشیع ایک مکمل مذہب ہے جس میں کسی امام کے ولیعہد ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ امام امام ہوتا ہے وہ کسی حاکم وقت کا نائب نہیں ہو سکتا ہے۔

ب۔ دربار کے مناظرے امام کی فضیلت کے اظہار کے لئے نہیں تھے بلکہ دربار کی فضیلت کے اظہار کے لئے تھے کہ یہاں ایسے ایسے قابل افراد پائے جاتے ہیں۔

ج۔ قرآن کے مخلوق ہونے کا مسئلہ شیعوں سے قربت کی بناپر نہیں اختیار کیا گیا تھا۔ بلکہ عوام الناس کو ایک مسئلہ میں اُلجھا کر بہلانے کے لئے اُٹھایا گیا تھا۔

د۔ متعہ کا مسئلہ بھی اس دور میں اسی سیاسی مقصد کے لئے اٹھایا گیا تھا اور تنہا ایک مسئلہ سے کسی انسان کا عقیدہ نہیں طے ہوتا ہے ورنہ عبداللہ بن عمر بھی اس مسئلہ میں اپنے باپ سے اختلاف رکھتے تھے جب کہ ان کا شیعیت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا۔

ھ۔ فدک کی واپسی کا منصوبہ بھی حالات کی مجبوری کی بناپر تھا جس کا اظہار مہدی عباسی کے دور حکومت میں ہو چکا تھا۔

و۔ شادی کا مسئلہ عقیدہ سے تعلق نہیں رکھتا ہے اس میں بیشمار مصالح کام کرتے ہیں جس کا مشاہدہ روز اوّل سے اسلام کی تاریخ میں کیا جا سکتا ہے اور اس کا بہترین ثبوت امام محمد تقیؑ سے انتہائی کمسنی کے باوجود شادی کا اصرار ہے۔

ز۔ فضل بن سہیل جیسے افراد کو مطمئن کرنے کا خیال بھی عجیب و غریب ہے کہ وہ خود بھی ولیعہدی کا مخالف تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ بنی فاطمہؑ کا حکومت میں کوئی دخل ہو جائے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ مامون کے پیش نظر حسب ذیل قسم کے مصالح تھے جن کی بناپر اس نے یہ اقدام کیا تھا اور اس کا مذہب اور عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں تھا:

۱۔ امامؑ کی عوامی شخصیت کے خطرہ سے تحفظ حاصل کر لیا جائے ورنہ عوام الناس کسی وقت بھی ان کے حق میں آواز اُٹھا سکتے ہیں۔

۲۔ ولیعہدی کے ذریعہ امامؑ کو زیر نظر رکھا جائے اور ان کے تمام اعمال پر نگاہ رکھی جائے۔

۳۔ امامؑ کو معاشرہ سے الگ کر لیا جائے اور لوگوں سے انکی ملاقات کے راستے تقریباً بند کر دیئے جائیں۔

۴۔ عوام الناس میں اہلبیتؑ دشمنی کا جو تصور پیدا ہو گیا ہے اسے ذہنوں سے محو کر دیا جائے۔

۵۔ لوگوں کو حکومت کی عظمت سے آشنا کرایا جائے کہ امام علی رضاؑ جیسے افراد اس میں بطور وزیر کام کر رہے ہیں۔

۶۔ عوام کو ایک نیا موضوع بحث دیدیا جائے اور ان کی توجہ حکومت کے مسائل سے ہٹادی جائے۔

۷۔ عوام کو یہ تاثر دیدیا جائے کہ حاکم وقت اسلام کا اسقدر مخلص ہے کہ اپنے بھائی کو قتل کر دیتا ہے اور باہر کے افراد کو حکومت دینے کے لئے تیار ہے۔

۸۔ ملک میں چاروں طرف علویین کے جو احتجاجات ہو رہے ہیں اور حکومتی مظالم کے خلاف جو آواز اُٹھ رہی ہے اُسے نہایت درجہ حکمت عملی سے دبا دیا جائے۔

۹۔ امام رضاؑ کی ولیعہدی کو حکومت کے شرعی ہونے کی دلیل بنا دیا جائے (اور یہی وجہ ہے کہ امام رضاؑ نے ولیعہدی پانے کے بعد یہ دعا کی تھی کہ خدایا! میں نے یہ عہدہ اسی طرح قبول کیا ہے جس طرح یوسفؑ نے عزیز مصر کے یہاں عہدہ لیا تھا کہ اس سے عزیز مصر کے اسلام و ایمان کا کوئی اثبات نہیں ہو سکتا تھا۔)

۱۰۔ حکومت کے تصرّفات کو جائز بنا دیا جائے کہ اس میں ایک فرزند رسولؐ کی بھی شرکت ہے۔

۱۱۔ بنی عباس کے خون کو علویین سے محفوظ کر لیا جائے کہ کسی وقت بھی ان کے گذشتہ مظالم کی بنا پر یہ آگ بھڑک سکتی ہے۔

۱۲۔ بنی عباس کو ہوشیار کر دیا جائے کہ اگر تم لوگوں نے ذرا شرارت کی تو ہم حکومت کو اولاد علیؑ کے حوالے کر سکتے ہیں اور اس طرح تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خلافت سے محروم ہو جاؤ گے اور یہ عہدہ اس خاندان سے نکل کر اولاد علیؑ میں چلا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ان تمام اسباب میں کسی ایک سبب کا بھی نہ تشیع سے کوئی تعلق ہے اور نہ اخلاص نیّت سے۔ یہ تمامتر سیاسی اقدام تھا جس کے مضمرات سے امام علی رضاؑ باخبر تھے اور اسی لئے آپ نے روز اول یہ کہدیا تھا کہ میرا امور مملکت سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور نہ میں حکومت کے اقدامات کی ذمہ داری لے سکتا ہوں۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

امام محمد تقی علیہ السلام

(۱)

ولادت باسعادت ۱۰ رجب ۱۹۵ھ / ۸۱۱ء روز جمعہ۔ مقام مدینہ منورہ

والد محترم امام علی رضاؑ۔ والدہ محترمہ جناب خیزران جن کا تعلق جناب ماریہ قبطیہ کے خاندان سے تھا اور جن کی جلالت قدر کا یہ عالم تھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ نے سفر عمرہ کے دوران اپنے صحابی یزید بن سلیط سے کہا تھا کہ عنقریب تمھاری ملاقات میرے فرزند علی رضاؑ سے ہوگی اور اسے پروردگار ماریہ قبطیہ کے خاندان کی ایک دختر سے ایک فرزند عنایت کرے گا۔ تم میرے فرزند کو اس فرزند کی بشارت دے دینا اور ممکن ہو تو اس خاتون تک میرا سلام پہونچا دینا جس کے بطن سے میرے فرزند کا وارث پیدا ہونے والا ہے۔ (الانوار البہیہ)

امام رضاؑ کی بہن جناب حکیمہ راوی ہیں کہ شب ولادت امام رضاؑ نے مجھے اپنے گھر میں روک لیا۔ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ چراغ کی روشنی مدھم پڑ گئی اور تھوڑی دیر میں نور الٰہی زمین پر جلوہ گر ہو گیا۔ امام رضاؑ تشریف لائے۔ میں نے بچہ کو ان کی گود میں دے دیا۔ انھوں نے پیار کیا اور مجھے حفاظت کی تاکید کر کے تشریف لے گئے۔ تیسرے دن میں نے دیکھا کہ بچہ نے آسمان کا رُخ کر کے زبان پر کلمہ شہادتین جاری کیا۔ میں حیرت زدہ رہ گئی اور میں نے امام رضاؑ سے بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابھی بہت سے عجائب و کرامات سامنے آنیوالے ہیں۔ (الانوار البہیہ ۲۰۹)

۔ وقت ولادت امین کی حکومت تھی۔ ۱۹۸ھ میں مامون حاکم ہوا اور ۲۱۸ھ میں معتصم تخت حکومت پر بیٹھا اور اسی نے ۲۲۰ھ میں زہر دے کر شہید کر دیا۔

۔ شہادت ۲۹ ذی قعدہ ۲۲۰ھ کو ۲۵ سال کی عمر میں ہوئی اور قبر مطہر جد بزرگوار امام موسیٰ کاظمؑ کے پہلو میں کاظمین میں ہے جس کی بنا پر اسے اہل بغداد کے لئے باعث امن و امان

قرار دیا گیا ہے۔

۔ امام رضاؑ نے مدینہ سے خراسان کا سفر کیا ہے تو امام محمد تقیؑ کی عمر صرف پانچ سال کی تھی اور پھر اس کے بعد بظاہر کوئی ملاقات نہیں ہوئی جو اس بات کی دلیل ہے کہ امامؑ کے جملہ کمالات وہبی اور عطائے پروردگار سے تھے۔ ان کا کوئی تعلق تعلیم و تربیت وغیرہ سے نہیں تھا۔

۔ امام رضاؑ کی شہادت کے بعد آپ کو جبراً مدینہ سے بغداد طلب کر لیا گیا تاکہ اپنی مظلومیت کا اعلان نہ کر سکیں اور پھر رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے مامون نے اپنی دختر سے عقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اہل دربار نے دبے الفاظ میں اعتراض کیا کہ یہ کام تعلیم و تربیت کے بعد ہونا چاہیئے۔ مامون نے جواب دیا کہ یہ خدائی بارگاہ کے تعلیم یافتہ ہیں، انھیں تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ شک ہو تو آزما کر دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ یحییٰ بن اکثم کو بلایا گیا اور اس نے مسئلہ دریافت کیا کہ حالت احرام میں شکار کرنے کا کفّارہ کیا ہے۔؟

آپ نے فرمایا کہ پہلے مسئلہ کی وضاحت درکار ہے کہ شکار پرندہ تھا یا چرندہ؟۔ چھوٹا تھا یا بڑا؟۔ شکاری بالغ تھا یا نابالغ؟۔ شکار پہلی مرتبہ کیا ہے یا دوبارہ؟۔ شکار حرم کے حدود کے اندر ہوا ہے یا حرم کے حدود کے باہر؟۔ عمداً شکار کیا ہے یا سہواً؟۔ احرام حج کا تھا یا عمرہ کا؟۔ شکاری آزاد تھا یا غلام؟۔

یحییٰ ان سوالات کو سن کر گھبرا گیا اور اپنے سوال کی وضاحت بھی نہ کر سکا تو حضرت نے تمام شقوق کے جوابات ارشاد فرمائے کہ اگر شکار حدود حرم سے باہر کیا ہے اور جانور بڑا پرندہ ہے تو ایک بکری کفّارہ ہے اور جانور چھوٹا ہے تو بکری کا بچہ۔ اور اگر یہ واقعہ حدود حرم کے اندر پیش آیا ہے تو کفّارہ دُگنا ہے۔

شکار چوپایہ ہے اور وحشی گدھا ہے تو کفارہ گائے۔ اور شُتر مرغ ہے تو کفارہ اونٹ اور ہرن ہے تو کفارہ بکری ہے۔

کفّارہ میں عالم اور جاہل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ عمداً شکار کیا ہے تو کفارہ کے علاوہ گناہ بھی ہے لیکن سہو و نسیان میں گناہ نہیں ہے۔ صرف کفارہ ہے۔

شکاری بالغ ہے تو کفّارہ ہے اور نابالغ ہے تو کفّارہ نہیں ہے۔ اپنے گناہ پر مُصر ہے تو کفّارہ کے علاوہ عذاب بھی ہے اور مُصر نہیں ہے تو صرف کفارہ ہے عذاب نہیں ہے۔ آزاد کا کفّارہ خود اس کے ذمہ ہے اور غلام کا کفارہ آقا کے ذمّہ ہے۔ عمرہ کا کفارہ مکہ میں ذبح ہوگا اور حج کا کفّارہ منیٰ میں۔

اس کے بعد امامؑ نے اس عورت کے بارے میں سوال کیا جو بار بار حلال و حرام ہو جاتی ہے اور جب یحییٰ جواب نہ دے سکا تو فرمایا کہ یہ ایک شخص کی کنیز ہے جو دوسرے پر حرام ہے لیکن خریدنے سے جائز ہوگئی پھر دوسرے کو بخش دینے سے حرام ہوگئی۔ پھر عقد کرنے سے جائز ہوگئی۔ پھر صیغہ ظہار پڑھ دینے سے حرام ہوگئی۔ پھر کفارہ دینے سے حلال ہوگئی۔ پھر طلاق دینے سے دوبارہ حرام ہوگئی۔

۔ مامون نے بھرے دربار میں عقد کر دیا۔ امامؑ ایک سال کے بعد ام الفضل کو لے کر مدینہ چلے آئے اور یہاں عقد ثانی فرمالیا کہ ایسے گھرانوں کی عورتوں سے منصب الٰہی کی نسل نہیں چلتی ہے۔ ام الفضل نے باپ سے شکایت کی لیکن اس نے ڈانٹ دیا۔ اس کے بعد جب مامون کا انتقال ہوگیا تو معتصم سے شکایت کی اور اس نے آپ کو بلا کر زہر دے دیا۔

۔ قاسم بن الحسن نے مکہ و مدینہ کے درمیان صدقہ دیا۔ اس کے بعد ایک آندھی آئی اور ان کی پگڑی اُڑ گئی۔ امام کی خدمت میں آئے تو آپ نے پگڑی پیش کر دی اور فرمایا کہ صدقہ دینے والے کا مال برباد نہیں ہوتا ہے۔

۔ ازواج میں ام الفضل اور جناب سمانہ از خانوادہ عمّار یاسرؓ۔ اور اولاد میں امام علی نقیؑ۔ موسیٰ مبرقع۔ فاطمہ اور امامہ وغیرہ ہیں۔ (ارشاد مفید)

امام محمد تقی علیہ السّلام

(۲)

اسم گرامی محمد۔ کنیت ابوجعفر اور القاب زکی۔ مرتضیٰ۔ تقی۔ قانع۔ رضی مختار متوکل اور جواد۔ (دلائل الامامۃ ص ۲۰۹)

شیخ مفیدؒ نے صرف منتجب اور مرتضیٰ کا ذکر کیا ہے اور طبرسیؒ نے تقی۔ منتجب۔ جواد اور مرتضیٰ کا۔ کشف الغمۃ اربلی میں ہے کہ لقب قانع اور مرتضیٰ تھا اور کنیت اپنے جد بزرگوار امام محمد باقرؑ کی طرح ابوجعفرؑ۔

ابن شہر آشوبؒ نے مناقب میں مذکورہ بالا القاب کے علاوہ عالم ربّانی۔ ابن الرضا وغیرہ کا اضافہ کیا ہے اور اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جُمل و اسطرلاب وغیرہ کے جملہ حسابات کی بنیاد نو (۹) کا عدد ہے اور آپ نویں امام ہیں جس سے آپ کی بنیادی حیثیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

پدر بزرگوار امام علی رضاؑ تھے اور مادر گرامی کا نام سبکیہ اور خیزران نقل کیا گیا ہے جو کہ جناب ماریہ قبطیہ کے خاندان سے تھیں۔ (کافی ۱/۴۹۲)

تاریخ ولادت کے بارے میں عام شہرت ۱۰ رجب ۱۹۵ھ کی ہے حالانکہ کافی کلینیؒ۔ تہذیب طوسیؒ۔ دلائل الامامہ طبریؒ۔ ارشاد مفیدؒ۔ روضۃ الواعظین فتال نیشاپوری۔ اعلام الوریٰ طبرسیؒ۔ کشف الغمہ اربلی۔ بحار مجلسی۔ اثبات الوصیۃ مسعودیؒ۔ وفیات الاعیان ابن خلکان میں ماہ رمضان کا ذکر کیا گیا ہے ۱۵ رمضان یا ۱۷ رمضان یا ۱۹ رمضان یا ۵ رمضان۔

۱۰ رجب کا ذکر صرف مناقب ابن شہر آشوب اور کشف الغمہ اربلی میں ہے اور اس کی تائید اس دعائے رجب سے ہوتی ہے جس کی روایت ابن عیاش نے حسین بن روحؒ سے کی ہے۔

دلائلِ امامت

امام رضاؑ نے تین برس کی عمر میں آپ کی امامت کا اعلان کیا تو لوگوں نے یہ سوال اٹھا دیا کہ اس عمر کا بچہ امام کس طرح ہوسکتا ہے۔ فرمایا کہ جس طرح گہوارہ کا بچہ (حضرت عیسیٰؑ) نبی ہوسکتا ہے۔

محمد بن سنان کہتے ہیں کہ میری آنکھوں میں شدید تکلیف تھی۔ میں نے امام رضاؑ سے شکایت کی۔ آپ نے اپنے فرزند کے نام ایک خط لکھ دیا۔ میں حضرت کی خدمت میں آگیا۔ آپ نے خط پڑھ کر دعا کر دی اور مجھے شفاء کامل ہوگئی۔ میں نے عرض کی کہ آپ تو شبیہ صاحب فطرس ہیں اور اللہ نے اس کمسنی میں آپ کو اسقدر بزرگی عنایت کی ہے۔

امام رضاؑ نے اس واقعہ کے پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا۔ لیکن ایک شخص نے پوچھ لیا کہ ابن سنان آخر صاحب فطرس کا کیا مطلب ہے؟ ۔ فرمایا کہ ایک فرشتہ فطرس عتاب الٰہی میں آگیا تھا۔ جزیرہ میں پڑا ہوا تھا۔ ولادت امام حسینؑ کے موقع پر فرشتے مبارکباد کے لئے جارہے تھے۔ جبریلؑ نے اسے ساتھ لے لیا اور خدمت پیغمبرؐ میں لے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے بازوؤں کو گہوارہ حسینؑ سے مَس کردو۔ چنانچہ اسے دوبارہ بال و پر نصیب ہوگئے اور فضائے قدس میں پرواز کرنے لگا۔ امام جوادؑ نے مجھے اسی طرح شفا دی ہے جس طرح امام حسینؑ نے فطرس کو شفا دی تھی۔

کرامات وکمالات

علیؒ بن ابراہیم بن ہاشم نے اپنے والد بزرگوار سے نقل کیا ہے کہ ہم لوگ حج کے زمانہ میں امام محمد تقیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کی محفل میں بہت سے بزرگانِ قوم موجود تھے۔ اچانک آپ کے چچا عبداللہ بن موسیٰؑ وارد ہوئے جن کی بزرگی پیشانی پر سجدہ کے نشان سے واضح تھی لیکن انھوں نے امامؑ کی پیشانی کا بوسہ لیا اور انھیں کرسی پر جگہ دی۔ لوگ حیرت میں پڑ گئے کہ اس کمسنی میں اسقدر احترام کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے جناب عبداللہ

سے مسئلہ پوچھا کہ اگر کوئی شخص کسی جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو اس کی سزا کیا ہے؟ عبداللہ نے کہا کہ اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے اور اس پر حد جاری کی جائے گی۔

امامؑ نے فرمایا کہ چچا خدا سے ڈریں۔ بغیر علم کے فتویٰ نہ دیں۔

عبداللہ نے کہا کہ کیا آپ کے بزرگوں نے یہی فیصلہ نہیں کیا ہے؟

فرمایا ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تھا کہ اگر کوئی شخص قبر کھود کر لاش کے ساتھ بدفعلی کرے تو اس کی سزا کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ قبر کھودنے کی بنا پر ہاتھ کاٹے جائیں گے اور بدکاری کی بنا پر حد جاری ہوگی۔ یہاں ہاتھ کاٹنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

لوگ یہ منظر دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے اور کہنے لگے فرزند رسولؐ! کیا ہم لوگ بھی سوال کر سکتے ہیں؟

فرمایا۔ بے شک!

لوگوں نے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا اور ایک جلسہ میں تیس ہزار سوالات کئے گئے اور امامؑ نے سب کے جوابات دیدیئے جب کہ عمر مبارک صرف ۹ سال تھی۔ (اختصاص ص ۱۰۲)

امیہ بن علی ناقل ہیں کہ ایک دن امامؑ نے کنیز سے فرمایا کہ گھر والوں سے کہہ دے کہ ماتم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس نے عرض کی مولا! کس کا ماتم؟ فرمایا بہترین اہل زمین کا ماتم! ۔ اس کے بعد چند دن نہ گذرے تھے کہ امام علی رضاؑ کی خبر شہادت آگئی اور بیت الشرف میں کہرام برپا ہو گیا۔

شہادت

ذی قعدہ ۲۲۰ھ کی آخری تاریخ تھی جب امام محمد تقیؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا جبکہ آپ کی عمر مبارک صرف ۲۵ سال تھی۔ اسی سال معتصم نے آپ کو مدینہ سے بغداد طلب کیا تھا اور بالآخر ام الفضل کے ذریعہ زہر دے دیا۔ آپ کو اس زہر سے اس قدر اذیت ہوئی کہ آپ نے ام الفضل کے حق میں بددعا کر دی اور اس کے بدن کے مخفی ترین حصہ میں ناسور ہو گیا اور اس کی ساری دولت نذر علاج ہو گئی اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔

آپ کی قبر مبارک مقابر قریش میں جد بزرگوار امام موسیٰ کاظمؑ کے پہلو میں بنائی گئی۔

آپ کا دور امامت تقریباً ۱۹ سال رہا۔

اولاد

مورخین نے آپ کی چار اولاد کا ذکر کیا ہے۔ امام علی نقیؑ۔ موسیٰ مبرقع۔ فاطمہ۔ امامہ۔ ابن شہر آشوب نے حکیمہ۔ خدیجہ۔ ام کلثوم نام نقل کئے ہیں۔ عمدۃ الطالب کے حاشیہ پر بریہہ کا ذکر بھی ہے اور الشجرۃ الطیبہ میں زینب۔ ام محمد۔ میمونہ۔ خدیجہ۔ حکیمہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ مبرقعؒ کے بارے میں صاحب شجرہ طیبہ نے نقل کیا ہے کہ مدینہ میں پیدا ہوئے اور باپ کی شہادت کے بعد بغداد آگئے وہاں سے کوفہ منتقل ہو گئے اور ایک مدت کے بعد ۲۵۲ھ میں قم آکر وہاں ساکن ہو گئے۔

یہ بزرگوار ہمیشہ چہرہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔ اسی لئے ان کا لقب مبرقع ہو گیا تھا۔ ربیع الآخر ۲۹۶ھ میں انتقال ہوا اور اپنے گھر ہی میں دفن کئے گئے جس کا مشہور نام در بہشت ہے۔ سادات رضوی کا سلسلہ انھیں بزرگوار سے ملتا ہے اور ان کی اولاد ایران سے لے کر ہندوستان پاکستان۔ افغانستان۔ ترکستان اور عراق و شام تک پھیلی ہوئی ہے۔

روایات وافادات

● ۔ پروردگار کے بارے میں سوال کیا گیا کہ لا تدرکہ الابصار کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا کہ وہم کا دائرہ نگاہ سے کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ جب اوہام وافکار کی رسائی اسکی ذات اقدس تک نہیں ہے تو ابصار اور نگاہوں کا کیا ذکر ہے۔

● ۔ سوال کیا گیا کہ رسول اکرمؐ کو اُمّی کیوں کہتے ہیں؟ ۔ فرمایا لوگوں کا کیا خیال ہے؟ کہا گیا کہ چونکہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لہٰذا اُمّی کہے جاتے تھے۔ فرمایا کہ یہ کہنے والے جھوٹے اور ملعون ہیں۔ پروردگار نے انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا تو ان کے جاہل ہونے کا کیا امکان ہے۔ اُمّی کے معنی ہیں ام القریٰ کے

رہنے والے ورنہ وہ ۷۲ یا ۷۳ زبانوں میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

(بصائر الدرجات ص ۲۲۵، معانی الاخبار ص ۵۲)

• ۔عرض کیا گیا کہ آپ کے پدر بزرگوار کو رضا کا لقب مامون نے دیا تھا کہ اس نے انھیں ولیعہدی کے لئے پسند کیا تھا؟ ۔ فرمایا جھوٹے ہیں یہ کہنے والے۔ انھیں پروردگار نے رضا قرار دیا تھا اور ان کی شخصیت سے دوست و دشمن دونوں راضی تھے۔

• ۔معتصم کے دربار میں چور کے ہاتھ کاٹنے پر بحث شروع ہوئی۔ بعض لوگوں نے کلائی سے کاٹنے کا فتویٰ دیا کہ آیت تیمم میں ہاتھ سے کلائی تک مراد ہے اور بعض نے کہنیوں سے کاٹنے کا حکم دیا کہ آیت وضو میں ہاتھ سے مراد کہنیوں تک ہے۔ آپ نے فرمایا کہ صرف انگلیاں کاٹی جائیں گی اور بس۔ کہ رسول اکرمؐ نے ہتھیلی کو اعضاء سجدہ میں شمار کیا ہے اور قرآن مجید نے مساجد (اعضائے سجدہ) کو اللہ کے نام وقف کر دیا ہے جس میں کسی کا دخل نہیں ہو سکتا ہے۔

• ۔یحییٰ بن اکثم نے دریافت کیا کہ جناب یعقوب اور برادرانِ یوسفؑ نے یوسفؑ کو سجدہ کس طرح کر لیا۔ کیا غیر خدا کا سجدہ حرام نہیں ہے؟ ۔ فرمایا بیشک۔ لیکن یہ سجدہ پروردگار ہی کے لئے تھا اور اس نعمت کے تشکر کی بنیاد پر تھا کہ مالک نے ایک مدت کے بعد پھر سب کو جمع کر دیا ہے۔

• ۔محمد بن الولید الکرمانی کا بیان ہے کہ ہم نے امام جوادؑ کے ہمراہ کھانا کھایا اور جب سب فارغ ہو گئے تو غلام نے ریزے چننا شروع کر دئے۔ آپ نے فرمایا کہ گھر میں یہ طریقہ صحیح ہے لیکن صحرا میں ان ٹکڑوں کو وہیں چھوڑ دینا کہ وہاں کی مخلوقات کا بھی ایک حق ہوتا ہے۔

(من لا یحضرہ الفقیہ ۳/۳۵۶)

• ۔محمد بن سلیمان نے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ شوہر اگر عورت پر زنا کی تہمت لگائے تو اس کی گواہی کو چار قسم کے بعد چار گواہوں کے برابر شمار کر لیا جاتا ہے اور دوسرے افراد کی قسم کو گواہی کا مرتبہ حاصل نہیں ہے بلکہ انھیں گواہ فراہم کرنا پڑیں گے اور گواہ فراہم نہ ہوئے تو ان پر تہمت کی حد جاری کی جائے گی۔ ؟

فرمایا کہ شوہر کو عورت کے پاس ہر حالت میں جانے کا حق ہے لہٰذا وہ گواہ بن سکتا ہے

لیکن دوسرا شخص داخل ہو گیا تو اس سے پہلا سوال یہی ہوگا کہ تمھارے اس مقام پر داخلہ کا کیا جواز تھا اور جب یہی جواز مشکوک ہے تو تمھاری بات کا اعتبار کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ تم نے گواہ فراہم نہ کئے تو تم پر تہمت کی حد جاری کی جا سکتی ہے۔ (کافی ۷/۴۰۳)

• ۔ایک شخص نے امامؑ کی خدمت میں اپنے فرزند کی موت کی فریاد کی اور اپنے شدید ترین غم کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ پروردگار جب بہترین اجر دینا چاہتا ہے تو انسان کے سرمایہ میں سے بہترین مال لے لیتا ہے۔ (کافی ۳/ ۲۱۸)

مواعظ و نصائح

• ۔ایک شخص نے نصیحت کی فرمائش کی۔ فرمایا صبر پر تکیہ کرو۔ فقر کو گلے سے لگاؤ۔ خواہشات کو ٹھکرا دو اور یہ بات نگاہ میں رکھو کہ خدا تمھیں بہر حال دیکھ رہا ہے۔ اب تم کس حالت میں اس کے سامنے پیش ہونا چاہتے ہو۔ (تحف العقول ۳۳۵)

• ۔فرمایا کہ پروردگار نے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ تمھارا زہد تو دنیا میں تمھیں آرام دیتا ہے اور تمھاری عبادت تمھاری اپنی عزت کا سبب ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے ہمارے کسی دوست سے محبت اور ہمارے کسی دشمن سے عداوت بھی کی ہے یا نہیں۔ ؟

• ۔فرمایا کہ جو کسی کام کے وقت حاضر رہے اور اسے ناپسند کرے اس کا حکم غائب کا ہے اور جو غائب رہ کر بھی پسند کرے اس کا حکم حاضر کا ہے۔

• ۔فرمایا کہ جو کسی بولنے والے کی بات کو غور سے سُنے تو گویا اس کا بندہ ہو گیا۔ اب اگر وہ خدائی بات کہہ رہا ہے تو انسان بندۂ خدا ہے ورنہ بندہ ابلیس ہو جائے گا۔

• ۔ایک شتربان امامؑ کو مدینہ سے کوفہ لے آیا تو آپ نے ۴۰۰ دینار دیدئے۔ اس نے حسب عادت مزید تقاضا کیا۔ فرمایا کیا تمھیں یہ نہیں معلوم ہے کہ انسان شکر خدا چھوڑ دیتا ہے تو خدا نعمتوں کا سلسلہ قطع کر دیتا ہے۔

• ۔فرمایا کہ جنّت کے ایک دروازہ کا نام معروف ہے جس سے اہل کار خیر ہی داخل ہوتے ہیں۔ میں لوگوں کی احتیاج کو دیکھ کر اور ان کی حاجت برآری کر کے خوش ہوتا ہوں کہ اس دروازہ

سے داخلہ کا انتظام ہو گیا اس لئے کہ آخرت میں اہل معروف وہی ہوں گے جو دنیا میں اہل معروف ہیں۔

● ۔ اللہ پر بھروسہ ہر قیمتی سرمایہ کی قیمت ہے اور ہر بلندی کا زینہ ہے۔

● ۔ جو تمھاری خواہشات کے احترام میں تمھیں ہدایت نہ دے سمجھو کہ تمھارا دشمن ہے۔

(صاحب مسند الامام الجواد نے اس قسم کے ۸۰ فقرات کا ذکر کیا ہے جن سے زندگی کا ایک بہترین نظام مرتب کیا جا سکتا ہے۔)

رواۃ احادیث واصحاب

اگرچہ امام محمد تقیؑ نے صرف ۲۵ سال زندگی پائی ہے لیکن اس مختصر سے عرصہ میں بھی تقریباً ۱۲۱ مختلف قسم کے افراد ہیں جنھوں نے آپ سے روایات نقل کی ہیں اور آپ کے علوم سے استفادہ کیا ہے۔

اس کے علاوہ آپ کے واقعی اصحاب اور تلامذہ میں چند نمایاں افراد کے نام ذکر کئے گئے ہیں جن میں سر فہرست ہشام بن الحکم۔ زکریا بن آدم۔ صفوان بن یحییٰ۔ محمد بن سنان۔ علی بن مہزیار۔ یونس بن عبدالرحمان۔ احمد بن حماد المروزی۔ محمد بن ابراہیم الحضینی۔ ابوطالب القمی۔ حکم بن بشار المروزی۔ خیران الخادم وغیرہ ہیں۔

● ۔ ابن صباغ المالکی کا بیان ہے کہ آپ کے شاعر دربار حماد تھے اور آپ کے دربان عمر بن الفرات۔ (الفصول المہمہ ص ۲۶۶)

امام علی نقی علیہ السّلام

(۱)

اسم گرامی علیؑ اور کنیت ابوالحسن تھی جس کا اعلان خود امام تقی علیہ السلام نے کیا تھا اور اس طرح آپ آخری دور کے تیسرے ابوالحسن تھے۔ ابوالحسن الاول امام موسیٰ کاظمؑ۔ ابوالحسن الثانی امام علی رضاؑ تھے اور ابوالحسن الثالث امام علی نقی علیہ السلام ہیں۔

ولادت باسعادت ۵ رجب ۲۱۴ھ کو مقام صریا میں ہوئی جسے امام موسیٰ کاظمؑ نے آباد کیا تھا اور مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ (اتحاف ص ۶۷)

پدر بزرگوار امام محمد تقیؑ تھے اور والدہ گرامی جناب سمانہ خاتون تھیں جن کا تعلق ارض مغرب سے تھا اور ان کی مکمل تعلیم و تربیت خود امام محمد تقیؑ کے زیر سایہ ہوئی تھی۔

تقریباً سات برس کی عمر تھی جب امام محمد تقیؑ کو شہید کیا گیا اور آپ پر امامت کی تمام ذمہ داریاں عائد ہو گئیں۔ آپ اپنے صفائے نفس کی بنا پر نقی تھے تو کار ہدایت کی بنا پر ہادی۔ امت کو نصیحت کر کے ناصح کہلائے تو امانتداری کی بنا پر امین۔ علم میں آپ عالم تھے تو فقہ میں فقیہ۔ نفس میں طیب تھے تو کردار میں رشید۔ وعدوں کے حق میں وفی تھے تو اعمال کے حق میں خالص۔ کتاب وسنت کے لئے موضح تھے تو امت کے لئے مرتضیٰ۔ سکونت کے اعتبار سے عسکری تھے تو شہادت کے اعتبار سے شہید۔ اور تاریخ میں آپ کے انھیں چودہ القاب کا ذکر پایا جاتا ہے۔

چھ برس کی عمر تھی جب امام جوادؑ نے عراق کا ارادہ فرمایا اور سوال کیا کہ فرزند تمھارے لئے عراق سے کیا تحفہ لے آؤں؟ عرض کی چمکتی ہوئی تلوار۔ اس کے بعد دوسرے فرزند سے سوال کیا اور تمھارے لئے؟ عرض کی گھر کا فرش۔ امام جوادؑ کو امام نقیؑ کا جواب اس قدر

پسند آیا کہ گلے سے لگا کر فرمایا بیشک یہ فرزند ابوالحسن کی شبیہ ہے۔

امام جوادؑ کو شہید کرنے کے بعد معتصم نے اپنے ظلم کی پردہ پوشی کے لئے امام نقیؑ پر توجہ دی اور ایک دشمن اہلبیتؑ جنیدی نام کا معلم طے کر دیا تاکہ وہ تعلیم کے بہانے دشمنی اہلبیتؑ کے جراثیم بچہ کی فطرت میں داخل کر دے لیکن چند دنوں کے بعد جب محمد بن جعفر نے جنیدی سے بچہ کی صورت حال کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ اسے بچہ نہ کہو۔ واللہ میں ایک حرف بتاتا ہوں تو یہ علم کے دروازے کھول دیتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ میں اسے تعلیم دیتا ہوں۔ خدا گواہ ہے میں اس سے سیکھتا ہوں۔

تھوڑے دنوں کے بعد دوبارہ یہی سوال کیا تو اس نے کہا کہ یہ تمام اہل زمین سے افضل ہے۔ میں نے ایک سورہ پڑھنے کے لئے کہا تو اس نے پورا قرآن سُنا دیا اور اس کی تنزیل و تاویل کا بھی فرق واضح کر دیا۔ اس کی قرارت لحن داؤدی سے بہتر ہے اور یہ خود تمام مخلوقات خدا سے برتر ہے۔ یہ کہہ کر جنیدی نے اپنی شیعیت کا اعلان کر دیا۔

(حیاۃ الامام

اعترافات

علماء اسلام اور مورخین نے آپ کی شخصیت اور عظمت کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے۔

۔ ابوالفلاح حنبلی نے آپ کو امام فقیہ متعبد قرار دیا ہے۔ (شذرات الذہب ۲/۱۲۸)

۔ یافعی نے متعبد۔ فقیہ اور امام کے القاب سے یاد کیا ہے۔ (مرأۃ الجنان ۲/۱۶۰)

۔ ابوالفدار نے علی تقی زکی کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ (تاریخ ابوالفدار ۲/ ۴۷)

۔ ابن حجر کا کہنا ہے کہ وہ علم اور سخاوت میں اپنے والد بزرگوار کے وارث تھے۔ (صواعق محرقہ)

۔ ابن صباغ مالکی نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آپ ہر منقبت کا مرکز۔ ہر فضیلت کا مصدر اور ہر شرافت کے اجمال و تفصیل کے مالک تھے۔ (فصول مہمہ ص ۲۶۸)

واضح رہے کہ امام کے یہ سارے فضائل و مناقب صرف خداداد تھے اور ان کا دنیا کی تعلیم و تربیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ والد محترم کا چھ سات برس کی عمر میں انتقال ہو چکا تھا اور

دوسرے کسی معلم کی نشاندہی بقولے تاریخ نے بھی نہیں کی ہے۔ جنیدی کا حشر پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔

لطف و کرم

صاحب اتحاف بحب الاشراف (ص ۲۷) نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ آپ سامرہ کے باہر ایک دیہات میں تھے۔ ایک اعرابی کوفہ سے آپ کی تلاش میں آیا اور گاؤں میں جا کر ملاقات کی کہ میں محب اہلبیتؑ ہوں اور قرض سے پریشان ہوں۔ آپ نے ایک پرچہ پر اقرار نامہ لکھ کر دے دیا کہ جب سامرہ پہونچ جاؤں تو بھری محفل میں یہ پرچہ دکھلا کر قرض کا مطالبہ کرنا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے حالات کا عذر کیا۔ اس نے اصرار کیا۔ خبر متوکل تک پہونچی۔ اس نے ۳۰ ہزار درہم بھیج دئے۔ آپ نے سب اعرابی کے حوالہ کر دیا۔ اس نے کہا کہ میرا قرض صرف دس ہزار درہم ہے۔ فرمایا باقی اہل و عیال پر خرچ کر دینا۔ اس نے کہا کہ بیشک پروردگار جانتا ہے کہ اپنا عہدہ کسے دینا چاہیئے۔

اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ائمہ طاہرینؑ اپنے اوپر چاہنے والوں کا ایک حق تصوّر کرتے تھے اور اسی بنا پر آپ نے اپنے مقروض ہونے کا اقرار نامہ لکھ کر دے دیا ورنہ امامؑ نے اس سے کوئی قرض نہیں لیا تھا اور نہ اس کی حیثیت قرض دینے کی تھی۔

اہلبیتؑ اپنی محبّت کے ایسے قدر دان ہیں کہ صاحبان محبت کو اپنے واسطے صاحبان حق تصوّر کرتے ہیں جس طرح کہ پروردگار اپنے نیک اور مخلص بندوں کا اپنے اوپر حق قرار دیتا ہے اور ہم اس حق کا واسطہ دے کر دعا کرتے ہیں۔

محنت و مشقت

علی بن جعفر کا بیان ہے کہ میں نے امام علی نقیؑ کو زمین میں کام کرتے دیکھا اس عالم میں کہ آپ کے ہاتھ میں پھاوڑا تھا اور آپ پسینہ میں غرق تھے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کام کرنے والے سب کہاں چلے گئے کہ آپ محنت کر رہے ہیں؟ فرمایا کہ یہ محنت و مشقت ان افراد نے بھی کی ہے جو مجھ سے بہتر تھے۔ یہ کام رسول اکرمؐ۔ مولائے کائنات اور تمام انبیاء و مرسلین نے

کیا ہے تو مجھے کیا تکلیف ہے۔ (سیرت انبیاء کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں اور قوم سے بیکاری اور
کاہلی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں۔) (من لایحضرہ الفقیہ)

احترام علم

امامؑ جس طرح خود ساری کائنات کے افراد سے علم میں افضل و برتر تھے اسی طرح
صاحبانِ علم وفضل کا احترام بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ علوی اور عباسی حضرات کی نسل میں ایک
غیر ہاشمی عالم آگیا آپ نے اس کا احترام کیا اور اسے صدر محفل میں جگہ دے دی۔ جس پر بنی عباس
جل گئے اور کہنے لگے کہ آپ نے سادات بنی ہاشم پر غیر سید کو کیوں مقدم کر دیا؟

فرمایا کہ میں نے تعلیم قرآن پر عمل کیا ہے۔ کیا تم قرآن کے بیان سے متفق نہیں ہو؟
ان لوگوں نے کہا کہ یہ قرآن میں کہاں لکھا ہے؟ فرمایا سورۂ مجادلہ میں ارشاد ہوتا ہے
کہ "اگر مجالس میں وسعت دینے کے لئے کہا جائے تو دوسروں کو جگہ دے دو۔ اللہ تمہیں وسعت
عنایت کرے گا اور دیکھو پروردگار صاحبان ایمان وعلم کے درجات کو بلند رکھنا چاہتا ہے۔"
یہ آیت کریمہ علم کی برتری کا اعلان کرتی ہے اور اس کے مقابلہ میں نسب کی برتری کا کوئی قائل
نہیں ہے لہٰذا غیر سید عالم، سید غیر عالم پر بہرحال مقدم اور اس سے افضل ہے۔

امامؑ نے قرآن مجید سے جواب دے کر مسئلہ کو واضح کر دیا تھا لیکن اس کے بعد بھی بعض
عباسیوں کو اطمینان نہیں ہوا اور کہنے لگے کہ صدر اسلام سے اب تک سادات بنی ہاشم کو مقدم
رکھا گیا ہے۔ آپ نے سیرت اصحاب کے خلاف عمل کیا ہے۔

فرمایا یہ بھی غلط ہے۔ ابوبکر بنی ہاشم میں نہ تھے مگر تمہارے دادا عباس نے انکی بیعت
کر لی۔ عمر بنی ہاشم میں نہ تھے مگر ابن عباس ان کی خدمت میں لگے رہے اور انھوں نے جب
مجلس شوریٰ تیار کی تو اس میں عباس کا نام تک نہیں لیا اور عباس نے کوئی احتجاج نہیں کیا جس کا
مطلب یہ ہے کہ تمہارے باپ دادا ہمیشہ غیر سادات کو سادات پر مقدم کرتے رہے ہیں۔
(احتجاج طبرسیؒ)

امام علیہ السلام نے یہ بھی واضح کر دیا کہ میں نے غیر سید کو مقدم کیا ہے تو اس غیر سیدؑ کو

مقدم کیا ہے جو صاحب علم تھا۔ عباس اور ابن عباس نے تو ان غیر سادات کو مقدم کیا ہے
جن کے پاس کمال علم بھی نہیں تھا لہٰذا اس بات پر اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو تمھارے باپ
دادا پر ہو سکتا ہے۔ مجھ پر نہیں۔

زہد اور تصوّف

امام علی نقی علیہ السلام نے ہمیشہ زہد و تقویٰ کی زندگی گذاری اور اسباب دنیا پر کوئی
توجہ نہیں دی۔ حد یہ ہے کہ آپ کے مکان کی مدینہ میں بھی تلاشی لی گئی اور سامرہ میں بھی۔ لیکن
مکان سے مصلیٰ اور کتب علمیہ کے علاوہ کچھ برآمد نہ ہوا۔

لیکن اس کے باوجود آپ کو تصوّف سے سخت نفرت تھی اور ایک مرتبہ مسجد میں صوفیوں
کے ایک گروہ نے آکر لاالٰہ الا اللہ کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تو آپ نے ابوہاشم جعفری
سے خطاب کر کے فرمایا "خبردار ان کی طرف توجہ نہ کرنا۔ یہ سب شیطان کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے
دین کی بنیادوں کو تباہ کیا ہے۔ ان کا زہد جسم کو آرام دینے کے لئے ہے اور ان کی عبادت
عوام کو شکار کرنے کے لئے ہے۔ ان کے سارے کاموں کی بنیاد ریاکاری اور دنیاداری پر
ہے۔ ان کی زیارت کو جانے والا گویا شیطان کی زیارت کو گیا اور بت پرستی میں مبتلا ہو گیا۔
ان کی مدد کرنے والا معاویہ۔ یزید اور ابوسفیان کا مددگار ہے۔

سوال کیا گیا کہ اگر صوفی آپ کا چاہنے والا اور آپ کے حقوق کا معترف ہو؟
فرمایا کہ ہمارے حقوق کا معترف ہمارا نافرمان نہیں ہوتا ہے اور یہ سب ہمارے طریقہ
کے خلاف اور ہمارے مسلک کے مخالف ہیں۔ یہ امت کے نصاریٰ یا مجوس ہیں اور نور خدا
کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں جب کہ خدا اپنے نور کو بہرحال مکمل کرنے والا ہے چاہے
کفار کو کسی قدر ناگوار کیوں نہ ہو۔ (روضات الجنات ۲/۱۳۴)

علمی مباحثہ

یوں تو امام علیہ السلام کی زندگی میں بیشمار واقعات ہیں جہاں آپ نے مختلف مذاہب کے

علماء اور مفکرین سے بحث کر کے اسلام کے صحیح عقائد کا دفاع کیا ہے اور باطل کے خیالات کو بے بنیاد ثابت کیا ہے۔ لیکن سب سے دلچسپ واقعہ متوکل عباسی کے زمانے کا ہے جب اس نے اپنے زعم ناقص میں امامؑ کو میدان علم میں شکست دینے کا ارادہ کیا اور اپنے دربار کے دو بڑے علماء کو آمادہ کیا کہ وہ سخت ترین سوالات تیار کر کے امام علی نقیؑ کے سامنے پیش کریں اور پھر انھیں سر دربار رسوا کریں۔

چنانچہ دونوں افراد سوالات تیار کر کے لے آئے اور امام کو دربار میں طلب کر لیا گیا۔ سب سے پہلے ابن السکیت یعقوب بن اسحاق نے سوال کیا کہ جب سنت الٰہیہ میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے تو پروردگار نے سارے انبیاء کو الگ الگ معجزات کیوں دیئے ہیں کہ موسیٰ کو عصا اور ید بیضا دیدیا، عیسیٰ کو دست شفا اور احیاء موتی کا کمال دے دیا اور ہمارے پیغمبرؐ کو قرآن اور ذوالفقار دیدی؟

آپ نے فرمایا کہ سنت الٰہیہ معجزہ کے ذریعہ عہدہ کو ثابت کرتا ہے۔ معجزہ کی کوئی خاص شکل نہیں ہے اور معجزہ اسی وقت معجزہ کہا جاتا ہے جب وہ اپنے دور کے تمام باکمال افراد کو عاجز بنا دے اور یہ کام اسی وقت ممکن ہے جب معجزہ اس دور کے کمال سے ہم آہنگ ہو۔ چنانچہ پروردگار نے جادو کے دور میں عصا اور ید بیضا دے دیا اور طبابت کے دور میں دست شفا اور احیاء موتی کا کمال دے دیا اور فصاحت و بلاغت و شجاعت کے دور میں قرآن اور ذوالفقار کا معجزہ عنایت کر دیا اس میں کوئی بات حیرت انگیز اور سنت الٰہیہ کے خلاف نہیں ہے۔

ابن السکیت نے سکوت اختیار کیا اور اپنی شکست تسلیم کر لی لیکن یحییٰ بن اکثم بول اٹھا کہ میرے پاس اس سے دقیق تر سوالات ہیں جن کا جواب کسی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اور یہ کہہ کر سوالات کا دفتر کھول دیا۔ امامؑ نے بھی برجستہ جوابات کا سلسلہ شروع کر دیا اور بالآخر ابن اکثم کو بھی منہ کی کھانا پڑی۔ اس کے چند سوالات یہ تھے۔

۱۔ جناب سلیمان نے آصف کے ذریعہ تخت بلقیس کیوں منگوایا۔ کیا آصف کا کمال سلیمان سے زیادہ تھا؟

آپ نے فرمایا کہ سلیمان اپنے وصی کے کمال کا اظہار کرنا چاہتے تھے (تاکہ کسی نبی کی جگہ پر کوئی نااہل جانشینی کا دعویٰ نہ کر دے) ورنہ سلیمان کا اقتدار آصف سے یقیناً زیادہ تھا۔

۲۔ جناب یعقوب اور ان کی اولاد نے یوسف کو سجدہ کیسے کر لیا؟

جواب: یہ سجدہ یوسف کے لئے نہیں تھا بلکہ پروردگار کے شکر کے لئے تھا کہ اس نے ایک مدت کے بعد باپ بیٹے کو ملا دیا اور بیٹے کو صاحب عظمت و جلالت بنا دیا۔

۳۔ کیا وجہ ہے کہ حضرت علیؑ نے جنگ جمل میں نہ مال غنیمت لیا۔ نہ زخمیوں کا خاتمہ کیا اور نہ بھاگنے والوں کا پیچھا کیا اور صفین میں یہ سب روا ہو گیا۔ کیا یہ سیرت کا اختلاف نہیں ہے۔

جواب: جمل میں سردار لشکر مولاؑ کے اختیار میں آ گئی تھی لہٰذا دشمنوں کے دوبارہ حملہ کرنے کا کوئی خطرہ نہ تھا اور صفین میں دوبارہ فتنہ کے زندہ ہونے کا امکان تھا لہٰذا آپ نے ظالموں کا خاتمہ ہی مطابق مصلحت اسلام و ایمان سمجھا۔

واضح رہے کہ جمل میں مال غنیمت تقسیم نہ کرنے کا راز یہ بھی تھا کہ غنیمت میں ام المومنین بھی شامل تھیں اور امامؑ کی غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ ناموس رسولؐ کو کنیز بنا کر تقسیم کر دیں۔

علمی یادگار

امام علی نقیؑ کے شاگردوں کی طویل فہرست اور آپ کے کلمات حکمت کے علاوہ آپ کی دو عظیم علمی یادگاریں ہیں۔ زیارت جامعہ کبیرہ اور زیارت غدیریہ۔ ان دونوں زیارتوں سے امامؑ کی علمی جلالت اور آپ کے فضل و کمال کی عظمت و وسعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

امام علی نقی علیہ السلام
(۲)

ـ ولادت باسعادت ۵ رجب ۲۱۴ھ سہ شنبہ قریہ صریا (مدینہ منورہ)

ـ والد محترم امام محمد تقیؑ جن کی ۲۵ سالہ زندگی تھی لیکن کرامات و کمالات کے اعتبار سے یہ زندگی صدیوں پر بھاری تھی۔ آپ کی عمر ۱۹ سال تھی جب امام علی نقیؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

ـ والدہ محترمہ جناب سمانہ جو مغرب کی رہنے والی تھیں اور ایک قافلہ کے ساتھ اشارۂ پروردگار کی بناپر مدینہ تک آگئی تھیں۔ یہ امام جوادؑ کی دوسری زوجہ تھیں جن سے آپ نے ام الفضل دختر مامون کے ہوتے ہوئے عقد کیا تھا اور یہی بات ام الفضل کے لئے زہر دلوانے کا بہانہ بن گئی۔ لیکن امامؑ نے اپنے کردار سے واضح کر دیا کہ اصول اسلام کو زندہ رکھنے والے دنیا کے مصائب سے گھبرایا نہیں کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ عقد ثانی بھی ۱۶-۱۷ سال کی عمر میں ہو گیا تھا جب کہ ہمارے ملکوں میں اس عمر میں عقد کے بارے میں سوچنا بھی جُرم تصوّر کیا جاتا ہے۔

سلاطین وقت میں، وقت ولادت مامون کی حکومت تھی ۲۱۸ھ میں معتصم تخت نشین ہوا۔ ۲۲۷ھ میں اس کا بیٹا واثق اور ۲۳۲ھ میں متوکل ہوا۔ ۲۴۷ھ میں منتصر باللہ کو حکومت ملی۔ ۲۴۸ھ میں مستعین حاکم بنا۔ ۲۵۲ھ میں معتز باللہ تخت حکومت پر بیٹھا اور ۲۵۴ھ میں اسی ظالم نے امامؑ کو زہر دغا سے شہید کرادیا۔

ـ امام جوادؑ مدینہ سے روانہ ہوئے تو آپ کی عمر مبارک صرف چھ سال تھی جو اس بات کی دلیل ہے کہ امامت کے کمالات کسی تعلیم و تربیت کے محتاج نہیں ہوتے ہیں۔

ـ لوگوں نے عبیداللہ جنیدی کو آپ کا معلم بنا دیا۔ اس نے آپ کی صلاحیت کا جائزہ لیا تو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں ان کا معلم ہوں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں خود ان سے سیکھتا ہوں۔ (اثبات الوصیۃ)

ـ ابو ہاشم جعفری جو جناب عبداللہ بن جعفر طیار کے پرپوتے تھے۔ انھوں نے امامؑ کے متعدد حالات بیان کئے ہیں کہ ایک مرتبہ ۲۲۷ھ میں ترکوں کی فوج کا گذر ہوا تو آپ نے ایک شخص کو اُس نام سے پکارا جو اس کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا اور پھر اس سے ترکی زبان میں بات کی جسے سن کر وہ قدموں پر گر پڑا۔ یہ واقعہ واثق باللہ کے دور کا ہے جب امامؑ مدینہ میں تھے اور ترک فوج کا سردار بغا تھا۔ (الانوار البہیہ ۲۲۷)

ـ ابو ہاشم ہی کا بیان ہے کہ حضرت نے مجھ سے ہندی زبان میں گفتگو کی۔ میں جواب نہ دے سکا تو ایک کنکری میں لعاب دہن لگا کر مجھے دے دیا۔ میں نے اس کو زبان پر رکھا تو ۷۳ زبانوں کا ماہر ہو گیا۔ (الانوار البہیہ ۲۷)

ـ امامؑ کا ارشاد تھا کہ آصف بن برخیا کو ایک اسم اعظم ملا تھا جس کی بناپر تخت بلقیس کو ملک سبا سے چشم زدن میں لے آئے تھے اور مجھے ۷۲ اسم اعظم کا علم عطا کیا گیا ہے۔

ـ اسحاق بن عبداللہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ چاسے سال کے اہم روزوں کے بارے میں بحث کرکے جواب لینے آئے ہو تو سنو۔ سال کے اہم ترین روزے چار ہیں۔ ۱۷ ربیع الاول۔ ۲۷ رجب۔ ۲۵ ذی قعدہ۔ ۱۸ ذی الحجہ۔ (غالباً اس کا راز یہ ہے کہ ۲۵ ذی قعدہ کو زمین کا فرش بچھایا گیا۔ ۱۷ ربیع الاول کو مالک ارض نے زمین پر قدم رکھے۔ ۲۷ رجب کو کام شروع کیا۔ اور ۱۸ ذی الحجہ کو کام مکمل کرکے "الیوم اکملت لکم دینکم" کی سند لے لی۔

ـ رفیق اساطی عراق سے امامؑ کی خدمت میں وارد ہوا تو آپ نے عراق کا حال پوچھا اور واثق اور ابن الزیات کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے کہا کہ سب بخیریت ہیں۔ فرمایا تمھارے عراق سے نکلنے کے چھ روز کے بعد واثق مر چکا ہے اور فی الحال متوکل بادشاہ ہو گیا ہے اور ابن الزیات کا بھی خاتمہ کیا جا چکا ہے۔

۔ ابن حمزہ قمی نے لکھا کہ مجھے معتصم سے خطرہ ہے۔ آپ کوئی دعا تعلیم فرمائیں تو آپ نے "یا من تحل بہ عقد المکارہ" کی تعلیم دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر خود آکر گھر سے لے گیا اور دربار میں خاصا احترام کیا گیا۔ (یہ دعا مفاتیح الجنان میں امام سجادؑ کی مناجاتوں سے پہلے درج ہے۔)

۔ متوکل ایسا جلاد اور بے رحم انسان تھا کہ اس نے ابن السکیت جیسے باکمال انسان سے دریافت کیا کہ میرے دونوں فرزند موید اور معتز اور علیؑ کے لال حسنؑ و حسینؑ میں کون افضل ہے؟ ۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ علیؑ کے غلام قنبر کی جوتیوں کا تسمہ تجھ سے بہتر ہے۔ تیرے فرزندوں کا کیا ذکر ہے۔ جس کے نتیجہ میں اُس نے اُن کی زبان گدّی سے کھنچوالی لیکن مردِ حق نے حق کا اعلان کر دیا۔

۔ ۲۴۳ھ میں آپ کو مدینہ سے طلب کیا گیا۔ تین سو کی فوج لے کر سردار لشکر روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک افسر اور ایک محبِ اہلبیتؑ میں بحث ہو گئی۔ افسر نے مذاق اُڑایا کہ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کہ ہر زمین سے ۷۰ مُردے اٹھائے جائیں گے اور اس صحرا میں کوئی آبادی نہیں ہے تو مُردے کہاں سے آئیں گے؟ ۔ مدینہ سے روانگی کے وقت امامؑ نے سردی کا سامان ساتھ لیا۔ لوگوں نے اس کا بھی مذاق اُڑایا۔ لیکن جب واپسی میں اس صحرا میں پہونچے تو زبردست بارش ہوئی کہ سردی سے ۸۰ افراد مر گئے اور اسی صحرا میں دفن ہو گئے۔ میر کارواں یحییٰ بن ہرثمہ نے اعتراف کیا کہ کلامِ علیؑ غلط نہیں ہو سکتا ہے۔

۔ متوکل بیمار ہوا تو اس نے شفا پانے کے بعد مالِ کثیر راہِ خدا میں خرچ کرنے کی نذر کر لی۔ پروردگار نے بطور اتمام حجت صحت دے دی۔ لیکن اب مالِ کثیر کے مفہوم میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ سارے علما مصروف بحث تھے کہ امامؑ کو طلب کیا گیا اور آپ سے دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ پروردگار نے پیغمبرؐ کی "مواطن کثیرۃ" میں مدد کی ہے اور یہ مقامات کُل ۸۰ تھے لہٰذا قرآن کریم میں کثیر کا مصداق ۸۰ ہے۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں لفظ کثیر متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے جن میں سے ایک یہ مورد بھی ہے لیکن امامؑ کا منشا یہ تھا کہ متوکل پر یہ واضح کر دیں کہ تم لوگ خلافت الٰہیہ

کا دعویٰ کرنے کے بعد بھی قرآن کو نظر انداز کر کے لغت عرب سے مسائل طے کرتے ہو جب کہ روزِ اول ہمارے خلاف قرآن کے کافی ہونے کا ہی نعرہ لگایا گیا تھا اور اسی بنا پر ہماری ضرورت کا انکار کیا گیا تھا۔ اب واضح ہو گیا کہ ہمارے بغیر قرآن کا واقعی ادراک ناممکن ہے اور قرآن مجید کے واقعی مفسر ہم ہی ہیں۔

۔ ایک عیسائی شخص نے ایک مسلمان عورت سے زنا کی اور جب حد جاری کرنے کا وقت آیا تو کلمہ پڑھ لیا۔ لوگ پریشان ہوئے کہ اب کس طرح حد جاری ہو گی۔ حضرتؑ نے فوراً آیت قرآنی کا حوالہ دیا کہ موت کے سامنے آجانے کے بعد کوئی توبہ قابل قبول نہیں ہوتی ہے۔

۔ بادشاہ روم نے خلیفہ کو لکھا کہ ہم نے سُنا ہے کہ جس سورہ میں ث۔ ج۔ خ۔ ز۔ ش۔ ظ۔ ف سات حروف نہ ہوں اس کی تلاوت میں جنّت کا ثواب ہے تو وہ کون سا سورہ ہے۔ بادشاہ نے علما سے دریافت کیا۔ علما حیرت میں پڑ گئے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ یہ سورۂ حمد ہے۔ افسوس کہ تمھیں اتنی سامنے کی باتیں بھی معلوم نہیں ہے اور اس کے بعد عالم ہونے کا دعویٰ ہے۔ یاد رکھو ان حروف کے نہ ہونے کی مصلحت یہ ہے کہ سورۂ حمد مکمل رحمت کا سورہ ہے اور ث سے ثبور (ہلاکت)۔ ج سے جحیم۔ خ سے خیبت (مایوسی)۔ ز سے زقوم۔ ش سے شقاوت۔ ظ سے ظلمت اور ف سے فرقت ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ ایسا ہی واقعہ خلافت دوم میں بھی پیش آچکا تھا اور امیر المومنینؑ نے اسی طرح مسئلہ کو حل کیا تھا۔ اس روایت کا ایک خاص مفہوم ہے جسے صرف بادشاہ روم جانتا تھا ورنہ سورۂ رحمٰن جیسے سورہ رحمت میں بھی ایسے حروف موجود ہیں۔ امامؑ کا ظاہری مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ امتِ قرآن، قرآن سے مکمل طور پر جاہل ہے اور حسبنا کتاب اللہ کا دعویٰ ایک سیاسی اعلان تھا جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۔ متوکل نے آپ کو دعوت میں بلا کر ایک ہندی جادوگر کے ذریعہ آپ کی توہین کرنا چاہی کہ آپ ہاتھ بڑھائیں تو لقمہ فضا میں اُڑ جائے۔ آپ نے دو ایک مرتبہ صبر کیا۔ اس کے بعد دیوار پر شیر کی تصویر کو ہاتھ مار کر فرمایا کہ اس دشمن خدا کو لے لے۔ چنانچہ وہ شیر مجسّم ہو کر اس جادوگر کو ہضم کر گیا اور متوکل کی ہزار گذارش کے بعد بھی امام نے اُسے یہ کہہ کر واپس کرنے

سے انکار کر دیا کہ تو اولیاء خدا پر دشمنانِ خدا کو مسلّط کرنا چاہتا ہے۔ یہ صرف میری توہین نہیں ہے۔ یہ دین خدا اور اولیاء خدا کی توہین ہے جو کسی خلیفہ کو زیب نہیں دیتی ہے۔

ــ آپ کے دور میں ایک عورت نے دعویٰ کیا کہ میں زینب بنت علیؑ ہوں۔ اور ہر پچاس سال کے بعد میری جوانی پلٹ آتی ہے۔ بادشاہ وقت نے امامؑ سے مدد مانگی۔ آپ نے فرمایا کہ اولادِ رسولؐ کا گوشت و پوست درندوں پر حرام ہے۔ اسے برکۃ السباع میں بھیج دو۔ ابھی حال معلوم ہو جائے گا۔

اس عورت نے توبہ کر لی لیکن اہل دربار کو موقع مل گیا کہ یہ بھی تو اولاد رسولؐ میں ہونے کے دعویدار ہیں۔ چنانچہ حضرت کو بھیج دیا گیا۔ آپ جیسے ہی تشریف لے گئے۔ درندوں نے سر قدموں پر رکھ دیا اور یہ اعلان ہو گیا کہ حقیقی وارث رسولؐ۔ امام علی نقیؑ ہیں۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے رشتہ داری اور قرابت داری کا اعلان کرے۔

(واضح رہے کہ یہ قانون براہ راست اولاد پیغمبرؐ کا ہے جو جناب فاطمہ زہراؑ کی چار اولاد تک محدود ہے۔ اس کے بعد اس قانون کا اطلاق ائمہ طاہرینؑ پر ان کے کمال ایمان کی بنیاد پر ہوتا ہے جہاں ساری کائنات تابع فرمان ہوتی ہے ــ ورنہ ہر سید کو ایسے مقام پر بھیج کر تجربہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔)

ــ آپ کی زوجہ محترمہ جناب حدیثہ خاتون تھیں اور اولاد میں امام حسن عسکریؑ، حسین بن علی۔ محمد بن علی۔ جعفر اور عائشہ بنت علی کے نام بیان کئے گئے ہیں۔ (جن میں حضرت سید محمدؑ کے کرامات شہر بلد میں آج تک شہرت عام رکھتے ہیں اور جعفر کے کذاب یا تواب ہونے کی داستان آج تک دہرائی جا رہی ہے۔

(ارشاد مفید)

ــ آپ کی شہادت معتز باللہ کے ہاتھوں ۳ رجب ۲۵۴ھ میں چالیس سال کی عمر میں شہر سامرہ میں ہوئی اور وہیں آپ کو سپرد خاک کیا گیا جہاں آپ کا روضۂ مبارک آج تک موجود ہے۔

ــ آپ کے جنازہ میں امام عسکری نے گریبان چاک کیا۔ جس پر لوگوں نے

اعتراض کیا۔ تو جواب ملا کہ یہ بدعت نہیں ہے۔ اس سے پہلے جناب موسیٰ جناب ہارون کے جنازہ میں گریبان چاک کر چکے ہیں۔

ــ جنازہ میں ایک کنیز کی آواز گونج رہی تھی کہ اس گھر میں دوشنبہ کا دن بڑی مصیبت کا دن ہے۔ (جس کا اشارہ وفاتِ پیغمبرؐ کی طرف تھا کہ امت نے جنازہ کو دفن کرنے کے بجائے گھر پر حملہ کر دیا۔ اور جناب زینبؑ نے اپنے مرثیہ میں یہ فریاد کی کہ میرے ماں باپ قربان اس مظلوم پر جس کا لشکر دوشنبہ کے دن لوٹ لیا گیا۔)

(الانوار البہیہ ۲۴۷)

حیات امام حسن عسکریؑ

۔ اسم گرامی حسنؑ اور کنیت ابو محمد تھی۔ القاب میں خالص۔ ہادی۔ عسکری۔ زکی۔ خاص۔ صامت۔ سراج اور نقی کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے۔

۔ مادر گرامی کا اسم مبارک سلیل۔ سوسن۔ حدیثہ اور حربیہ بیان کیا جاتا ہے۔

۔ مقام ولادت اخبار الدول نے یثرب اور جواہر الاحکام نے کتاب الحج میں سامرہ بیان کیا ہے۔

۔ سنہ ولادت ۲۳۰ھ، ۲۳۱ھ، ۲۳۲ھ یا ۲۳۳ھ ہے۔

۔ بچپنے میں بچوں کو سرراہ کھیلتے دیکھ کر رو رہے تھے کہ کسی شخص نے تسکین دیتے ہوئے کہا کہ میں تمہارے واسطے بھی کھلونے لائے دیتا ہوں۔ فرمایا کہ ہم لہو و لعب کے لئے نہیں پیدا ہوئے ہیں بلکہ بحکم قرآن عبادت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

کہا پھر اس کمسنی میں رونے کا سبب کیا ہے؟

فرمایا، مادر گرامی آگ روشن کرتی ہیں تو پہلے چھوٹی لکڑیوں کو استعمال کرتی ہیں۔

(دائرۃ المعارف بستانی ۴۵/۷)

۔ آپ کے ایک بھائی جناب سید محمد تھے جن کا مزار سامرہ کے قریب بلد میں ہے، آپ ان سے بیحد مانوس تھے۔ یہانتک کہ ان کے انتقال پر اپنا گریبان تک چاک کر لیا۔

۔ امام علی نقیؑ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر ۲۲ یا ۲۳ سال کی تھی۔ اسی وقت سے امت کی تمام ذمہ داریوں کو سنبھال لیا اور مکمل طور پر انھیں پورا کیا۔

دلائلِ امامت

مذہب شیعہ نے آپ کی امامت کا اقرار اس لئے کیا ہے کہ آپ اہلبیتؑ کی ایک نمایاں فرد ہیں اور اہلبیتؑ کے بارے میں رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ میں قرآن اور اہلبیتؑ چھوڑے جاتا ہوں۔ جو ان دونوں سے وابستہ رہے گا وہ ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتا۔ (صحیح ترمذی ۳۰۸/۲)

اہلبیتؑ کی مثال کشتیٔ نوح کی ہے کہ جو کشتی پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا۔ (مستدرک حاکم ۳۴۳/۲، تاریخ بغداد ۱۹/۲)

آپ کی امامت کے بارے میں امام علی نقیؑ نے بار بار وصیت اور وضاحت فرمائی ہے اور لوگوں کو اس اعلان کا گواہ بھی قرار دیا ہے۔ (اصول کافی ۳۲۴/۱، ۳۲۵/۱، ۳۲۷/۱)

خطوط

تاریخ میں آپ کے دس مختلف خطوط کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن سے آپ کے کمالِ علم اور اہتمام ہدایت امت کا مکمل طور پر اندازہ ہوتا ہے۔

۱۔ اسحاق نیشاپوری کے نام، ۲۔ اہل قم کے نام، ۳۔ فقیہ اعظم علی بن الحسین کے نام، ۴۔ بعض شیعوں کے نام، ۵۔ ایک مرد شیعی کے نام، ۶۔ عبداللہ البیہقی کے نام، ۷۔ ابراہیم وکیل کے بارے میں، ۸۔ بعض غلاموں کے نام، ۹۔ بعض دوسرے غلاموں کے نام، ۱۰۔ بعض شیعوں کے نام۔

مواعظ و نصائح

روایات میں آپ کے مواعظ وارشادات۔ وصایا و نصائح کے علاوہ تقریباً پچاس کلمات قصار کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن کے ایک ایک لفظ میں ہدایت وارشاد کا ایک دریا ہے جو کوزہ کے اندر بند کر دیا گیا ہے:

۱۔ جب امور ارادہ الٰہی کے مطابق انجام پاتے ہیں تو فریاد کس بات کی ہے۔

۲۔ مومن کا وجود مومن کے حق میں برکت اور کافر کے حق میں پروردگار کی حجّت ہوتا ہے۔

۳۔ احمق کا دل اس کی زبان پر اور عقلمند کی زبان اس کے دل میں ہوتی ہے۔

۴۔ غضب ہر شر کی کلید ہے۔

۵۔ سب سے کم آرام حسد کرنے والے کے مقدر میں ہوتا ہے۔

۶۔ واقعاً متقی وہ ہے جو شبہات میں احتیاط سے کام لے۔

۷۔ خبردار! جس رزق کی ضمانت دی جا چکی ہے اس کی تلاش فرائض سے غافل نہ کر دے۔

۸۔ جو ظہور میں حد سے بڑھ جاتا ہے وہ خود بخود کمزور ہو جاتا ہے۔

۹۔ جس صاحبِ عزّت نے حق کو چھوڑ دیا وہ ذلیل ہو گیا اور جس ذلیل نے اسے لے لیا وہ صاحبِ عزّت ہو گیا۔

۱۰۔ جاہل کا دوست خستہ حالی ہے۔

۱۱۔ دو باتوں سے بالاتر کوئی شے نہیں ہے۔ اللہ پر ایمان اور برادرانِ ایمانی کی حاجت روائی۔

۱۲۔ بچپنے میں بیٹے کی باپ کے حق میں جسارت آگے چل کر اسے عاق بنا دیتی ہے۔

۱۳۔ رنجیدہ کے سامنے خوشی کا اظہار بے ادبی ہے۔

۱۴۔ جس کے بغیر زندگی بُری لگے وہ زندگی سے بہتر ہے اور جس کے آنے پر موت اچھی لگے وہ موت سے بدتر ہے۔

۱۵۔ کسی عادی شخص کا عادت سے الگ کر دینا ایک طرح کا معجزہ ہے۔

۱۶۔ تواضع وہ نعمت ہے جس پر حسد نہیں کیا جاتا ہے۔

۱۷۔ کسی کا احترام اس طرح نہ کرو کہ وہ زحمت محسوس کرے۔

۱۸۔ جس نے خاموشی سے نصیحت کی اس نے انسان کی عزّت کی اور جس نے علی الاعلان نصیحت کی اس نے اسے عیب دار بنا دیا۔

۱۹۔ مومن کے لئے بدترین بات یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسی رغبت ہو جو اسے ذلیل کر دے۔

۲۰۔ ادب کے لئے یہ کافی ہے کہ جس چیز کو دوسرے کے لئے بُرا سمجھو اس سے خود بھی پرہیز کرو۔

۲۱۔ خاموش ہوشمند سے ہوشیار رہو۔

۲۲۔ اگر تمام اہل دنیا ہوشیار ہو جاتے تو دنیا تباہ ہو جاتی۔

۲۳۔ وہ دشمن تدبیر میں کمزور ہے جو دشمنی کا اظہار کر دے۔

۲۴۔ بہترین جُدائی وہ ہے جو تمہاری بُرائی کو نظر انداز کر دے اور تمہارے احسانات کو یاد رکھے۔

۲۵۔ صورت کا حسن ظاہری جمال ہے اور عقل کا حُسن باطنی جمال ہے۔

۲۶۔ جو خدا سے مانوس ہو جاتا ہے وہ انسانوں سے مانوس نہیں ہوتا ہے۔

۲۷۔ جو بندوں سے نہیں ڈرتا ہے وہ خدا کا خوف بھی نہیں رکھتا ہے۔

۲۸۔ تمام خبائث کو ایک گھر میں بند کر دیا جائے تو اس کی کنجی جھوٹ ہے۔

۲۹۔ جب دل آمادہ ہو تو اسے باتیں بتاؤ اور جب بیزار ہو جائے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔

۳۰۔ جس سے خیر کی امید ہے اس سے ملحق ہو جانا اس بات سے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ پڑا رہے جس کے شر سے محفوظ نہیں ہے۔

۳۱۔ جس نے غصہ کو پینے کا مزہ نہیں حاصل کیا وہ دل کی راحت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

۳۲۔ جہالت دشمن ہے اور بُردباری حکمت۔

۳۳۔ کریم کا انعام محبوب بناتا ہے اور ذلیل کا احسان ذلیل بنا دیتا ہے۔

۳۴۔ جس کی عادت تقویٰ ہو اور جس کا زیور فضل و کرم ہو وہ ہمیشہ دشمنوں پر بہترین تعریف کے ذریعہ فاتح رہے گا۔

۳۵۔ جس نے غیر مستحق کی مدح کی اس نے اپنے کو متہم کر دیا۔

۳۶۔ نعمت کا عرفان صرف شکر گذار کو ہوتا ہے اور نعمت کا شکر یہ صرف صاحب عرفان ادا کرتا ہے۔

۳۷۔ بیداری سے نیند کی لذّت بڑھ جاتی ہے اور بھوک سے کھانے کے مزہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۳۸۔ خدا کی بارگاہ میں حاضری ایک سفر ہے جس کے لئے رات میں راستہ طے کرنا ضروری ہے۔

۳۹۔ جسے منع کرنا نہیں آتا ہے اسے عطا کرنا بھی نہیں آتا ہے۔

۴۰۔ اس سے خلوص کا مطالبہ نہ کرو جس سے تمھیں خود خلوص نہیں ہے اور اس سے نصیحت کی توقع نہ کرو جس سے بدظنی رکھتے ہو۔ اس لئے کہ دوسرے کا قلب بھی تمھارا ہی جیسا ہے۔

۴۱۔ بلا سبب ہنسنا جہالت کی علامت ہے۔

۴۲۔ کلام خدا کا کلام بشر پر وہی شرف ہے جو خود خدا کا تمام کائنات کے مقابلہ میں ہے۔

۴۳۔ تواضع کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جس کے پاس سے گذرو اسے سلام کرو اور مجلس میں بلند ترین مقام پر نہ بیٹھو۔

۴۴۔ محبت کے لئے سب سے زیادہ حقدار وہ ہے جس سے سب سے زیادہ امید رکھی جائے۔

۴۵۔ سب سے زیادہ کمر توڑ وہ ہمسایہ ہوتا ہے جو نیکی کو چھپا دیتا ہے اور بُرائی کا اعلان کر دیتا ہے۔

۴۶۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم اسم اعظم سے اتنا ہی قریب ہے جس قدر آنکھ کی سیاہی سفیدی سے قریب ہوتی ہے۔

۴۷۔ جھگڑا مت کرو کہ حسن چلا جائے اور زیادہ مذاق نہ کرو کہ لوگ جری ہو جائیں۔

۴۸۔ جو کسی مجلس میں اپنے مقام سے کم پر راضی ہو جائے اس پر اللہ اور ملائکہ کی طرف سے مسلسل رحمت کا نزول رہتا ہے جب تک مجلس برخاست نہ ہو جائے۔

۴۹۔ شرک لوگوں کے دلوں میں اندھیری رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کی رفتار سے زیادہ آہستہ چلتا ہے۔

۵۰۔ مقدرات زور آوری سے نہیں ٹلتے ہیں اور رزق طمع اور لالچ سے نہیں حاصل ہوتا ہے۔ اپنے نفس کو مقدرات کے لئے ہموار کرو اور یہ سمجھ لو کہ حاصل اتنا ہی ہوگا جتنا لکھ دیا گیا ہے۔

اصحاب و تلامذہ

امام عسکریؑ کا دور حیات انتہائی شدائد و مصائب اور حکومت کی طرف سے سخت ترین نگرانی کا دور تھا لیکن اس کے باوجود آپ کے تقریبًا ۱۵۰ اصحاب اور تلامذہ کا ذکر کتب تاریخ و رجال میں پایا جاتا ہے۔ جن کی اجمالی فہرست یہ ہے:

۱۔ ابراہیم بن ابی حفص، ۲۔ ابراہیم بن حبیب انباری، ۳۔ ابراہیم بن عبدہ، ۴۔ ابراہیم بن علی، ۵۔ ابراہیم بن محمد ابن فارس نیشاپوری، ۶۔ ابراہیم بن مہزیار ابو اسحاق اہوازی، ۷۔ ابراہیم بن یزید، ۸۔ احمد بن ابراہیم، ۹۔ احمد بن ابراہیم ابو احمد المراغی، ۱۰۔ احمد بن ادریس القمی، ۱۱۔ احمد بن اسحاق الاشعری، ۱۲۔ احمد بن الحسن بن علی بن محمد بن فضال، ۱۳۔ احمد بن حماد المحمودی، ۱۴۔ احمد بن محمد بن یسار، ۱۵۔ احمد بن عبداللہ بن مروان الانباری، ۱۶۔ احمد بن محمد بن مطہر، ۱۷۔ احمد بن محمد الحضینی، ۱۸۔ احمد بن ہلال العبرتائی، ۱۹۔ اسحاق بن اسماعیل النیشاپوری، ۲۰۔ اسحاق بن محمد البصری، ۲۱۔ اسماعیل بن محمد بن علی، ۲۲۔ جعفر بن سہیل الصیقل، ۲۳۔ جابر بن یزید الفارسی، ۲۴۔ جعفر بن ابراہیم بن نوح، ۲۵۔ الحسن بن احمد المالکی، ۲۶۔ الحسن بن شکیب المروزی، ۲۷۔ الحسن بن جعفر ابو طالب الفاغانی، ۲۸۔ الحسن بن علی بن نعمان الکوفی، ۲۹۔ الحسن بن محمد ابن بابا القمی، ۳۰۔ الحسن بن موسیٰ الخشاب، ۳۱۔ الحسن بن النضر ابو عون الابرش، ۳۲۔ الحسن بن نضر القمی، ۳۳۔ الحسین بن الحسن ابن ابان، ۳۴۔ حفص بن عمرو العمری، ۳۵۔ حمدان بن سلیمان نیشاپوری، ۳۶۔ حمزہ بن محمد، ۳۷۔ داؤد بن ابی زید نیشاپوری،

۳۸۔ داؤد بن عامر اشعری، ۳۹۔ داؤد بن القاسم ابوہاشم جعفری، ۴۰۔ سعد بن عبداللہ القمی، ۴۱۔ سندی بن الربیع الکوفی، ۴۲۔ سہل بن زیاد الرازی، ۴۳۔ شاہویہ بن عبداللہ الجلاب، ۴۴۔ صالح بن ابی حماد، ۴۵۔ صالح بن عبداللہ الجلاب، ۴۶۔ عبدالعظیم الحسنی، ۴۷۔ عبداللہ بن جعفر الحمیری، ۴۸۔ عبداللہ بن حمدویہ البیہقی، ۴۹۔ عبداللہ بن محمد بن خالد الطیالسی، ۵۰۔ عبداللہ بن محمد الشامی، ۵۱۔ عثمان بن سعید العمری، ۵۲۔ عروہ الوکیل، ۵۳۔ العکری بن علی، ۵۴۔ علی بن بلال، ۵۵۔ علی بن جعفر بن العباس الخزاعی، ۵۶۔ علی بن جعفر الہمانی البرمکی، ۵۷۔ علی بن الحسن بن فضال الکوفی، ۵۸۔ علی بن سلیمان بن داؤد الرقی، ۵۹۔ علی بن الریان بن الصلت الاشعری، ۶۰۔ علی رمیس، ۶۱۔ علی بن زید بن علی علوی، ۶۲۔ علی بن شجاع نیشاپوری، ۶۳۔ علی بن محمد الصیمری، ۶۴۔ علی بن محمد بن الیاس، ۶۵۔ عمر بن ابی مسلم، ۶۶۔ عمرو بن سوید، ۶۷۔ الفضل بن الحارث، ۶۸۔ فضل بن شاذان، ۶۹۔ قاسم بن ہشام، ۷۰۔ محمد بن ابراہیم بن مہزیار، ۷۱۔ محمد بن ابی الصہبان، ۷۲۔ محمد بن احمد بن جعفر القمی العطار، ۷۳۔ محمد بن احمد بن مطہر، ۷۴۔ محمد بن احمد بن نعیم، ۷۵۔ محمد بن احمد الجعفری، ۷۶۔ محمد بن بلال، ۷۷۔ محمد بن الحسن ابن شمون، ۷۸۔ محمد بن الحسن الصفار، ۷۹۔ محمد بن الحسین بن ابی الخطاب، ۸۰۔ محمد بن جعفر العمری، ۸۱۔ محمد بن الربیع، ۸۲۔ محمد بن زیاد، ۸۳۔ محمد بن صالح الارضی، ۸۴۔ محمد بن صالح بن محمد الہمدانی، ۸۵۔ محمد بن صالح الخثعمی، ۸۶۔ محمد بن عبدالحمید بن سالم، ۸۷۔ محمد بن عثمان العمری، ۸۸۔ محمد بن علی ابن بلال، ۸۹۔ محمد بن علی التستری، ۹۰۔ محمد بن علی الزراع، ۹۱۔ محمد بن علی القسری، ۹۲۔ محمد بن علی الکاتب، ۹۳۔ محمد بن عیسیٰ ابن عبید الیقطینی، ۹۴۔ محمد بن موسیٰ السریعی، ۹۵۔ محمد بن موسیٰ ابن فرات، ۹۶۔ محمد بن موسیٰ النیشاپوری، ۹۷۔ محمد بن یحییٰ ابن زیاد، ۹۸۔ محمد بن یحییٰ المعاذی، ۹۹۔ محمد بن یزداد، ۱۰۰۔ ہارون بن مسلم بن سعدان کوفی، ۱۰۱۔ یحییٰ البصری، ۱۰۲۔ یعقوب بن اسحاق، ۱۰۳۔ یعقوب بن منقوش، ۱۰۴۔ یوسف بن السخت، ۱۰۵۔ ابو خلف العجلی، ۱۰۶۔ ابو محمد الاسکافی، ۱۰۷۔ ابو البحتری۔ (حیاۃ الامام العسکری باقر شریف القرشی)

واضح رہے کہ اس فہرست میں وہ سرآمد روزگار شخصیات بھی شامل ہیں جنھوں نے

امام علیہ السلام سے علمی استفادہ کیا اور اسے صحیح مواقع پر صرف کرتے ہوئے دین و مذہب کی واقعی خدمت کی جیسے ابوہاشم الجعفری، عبدالعظیم الحسنی، عثمان بن سعید العمری، علی بن الحسن بن فضال الکوفی، فضل بن شاذان وغیرہ۔

اور وہ نالائق افراد بھی شامل ہیں جن سے حقیقی علم آل محمدؐ ہضم نہ ہوسکا اور بعد میں مخالفت یا دشمنی کا راستہ اختیار کرلیا اور اس طرح ان کا علم ہی ان کے واسطے وبال جان بن گیا اور خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق ہوگئے جیسے محمد بن الحسن بن شمون، الحسن بن محمد بن بابا القمی وغیرہ۔

علامہ الشیخ جواد الطبسی نے درج ذیل افراد کا مزید تذکرہ کیا ہے جس سے یہ تعداد دوسو تک پہونچ جاتی ہے:

۱۔ ابراہیم بن ادریس، ۲۔ ابن ابی رمثہ، ۳۔ ابراہیم بن محمد الہمدانی، ۴۔ ابراہیم بن علی، ۵۔ احمد بن ابراہیم بن اسماعیل، ۶۔ احمد بن الحارث، ۷۔ احمد بن الحسان، ۸۔ احمد بن الحسن الحسینی، ۹۔ احمد بن صالح، ۱۰۔ احمد بن عبیداللہ السبیعی، ۱۱۔ احمد بن عبداللہ بن خانبہ، ۱۲۔ احمد بن محمد بلاذری، ۱۳۔ احمد بن محمد بن ابراہیم بن ہاشم، ۱۴۔ احمد بن قصیر البصری، ۱۵۔ احمد بن یزید، ۱۶۔ ادریس بن زیاد، ۱۷۔ اسحاق بن الربیع، ۱۸۔ اسماعیل بن علی نوبختی، ۱۹۔ اسحاق بن جعفر، ۲۰۔ اسحاق بن محمد البلخی، ۲۱۔ اشجع بن اقرع، ۲۲۔ بشر بن سلیمان، ۲۳۔ بکر بن احمد القصری، ۲۴۔ بہلول، ۲۵۔ بورق بوشنجانی، ۲۶۔ جعفر بن محمد قلانسی، ۲۷۔ جعفر بن شریف جرجانی، ۲۸۔ حجاج بن سفیان عبدی، ۲۹۔ حجاج بن یوسف عبدی، ۳۰۔ حسن بن اسماعیل، ۳۱۔ حسن بن خالد، ۳۲۔ حسن بن راشد، ۳۳۔ حسن بن ظریف، ۳۴۔ حسن بن محمد اشعری، ۳۵۔ حسن بن محمد البزاز، ۳۶۔ حسن بن محمد العقیقی، ۳۷۔ حسن بن مسعود، ۳۸۔ حسن بن موسیٰ الخشاب، ۳۹۔ حسین بن غیاث، ۴۰۔ حسین بن مالک، ۴۱۔ حلبی، ۴۲۔ رجار بن یحییٰ، ۴۳۔ ریان بن الصلت، ۴۴۔ سفیان بن محمد، ۴۵۔ سلیمان بن حفص، ۴۶۔ طالب بن حاتم، ۴۷۔ عباس الناقد

کمالات و کرامات

امام حسن عسکریؑ کی تاریخ حیات شاہد ہے کہ آپ کے دور میں مختلف قسم کے باطل

مذاہب سر اٹھائے ہوئے تھے اور عالم اسلام میں کوئی ایسا صاحب علم وفضل نہ تھا جو ان تمام فتنوں کا مقابلہ کرسکتا لہٰذا یہ ذمہ داری بھی امام عسکریؑ کے ذمہ تھی اور آپ نے اسے بخوبی ادا کیا۔ مثال کے طور پر چند باطل مذاہب کا تذکرہ کیا جا رہا ہے :

صوفیت

یہ ظاہری تقدس والوں کی ایک جماعت ہے جو دوسری صدی میں ابوالہاشم کوفی کی قیادت میں پیدا ہوئی اور اس نے اپنے تقدس سے قوم کو اس قدر گمراہ کیا کہ محرمات کو حلال بنالیا اور واجبات وفرائض کو یکسر نظر انداز کردیا۔

امام عسکریؑ نے ابوہاشم جعفری کو خطاب کرکے اس فرقہ کی پوری حقیقت کو بے نقاب کردیا ہے۔ "ان کے چہرے روشن ہیں اور دل تاریک وخبیث۔ سنت ان کے نزدیک بدعت ہے اور بدعت سنت۔ مومن ان کے درمیان حقیر ہے اور فاسق محترم۔ ان کے امراء جاہل ہیں اور علماء درباری۔ ان کے مالدار چور ہیں اور بچہ بڑوں سے مقدم۔ جاہل ان کے یہاں باخبر شمار ہوتا ہے اور حیلہ گر فقیر۔ انھیں مخلص ومنافق اور بکری اور بھیڑیے کا فرق بھی نہیں معلوم ہے۔ یہ ہمارے دشمنوں کی محبت رکھتے ہیں اور ہمارے دوستوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ دراصل مومنین کے رہزن ہیں اور ملحدین کے داعی۔ ان سے پرہیز کرنا اور اپنے دین کا بچا کر رکھنا واجب ہے۔"

واقفیہ

اس فرقہ نے ساتویں امام کے بعد امام رضاؑ کی امامت کا انکار کردیا اور اس کا راز یہ تھا کہ اس کے سربراہ کے پاس امام کاظمؑ کے ۷۰ ہزار دینار تھے۔ اس نے چند افراد کو ملاکر امام رضاؑ کی امامت کا انکار کردیا تاکہ رقم واپس نہ کرنا پڑے۔ ان کا سربراہ زیاد بن مروان تھا اور اس کے ساتھی علی بن ابی حمزہ اور عثمان بن عیسیٰ وغیرہ تھے۔ عثمان بن عیسیٰ کے پاس بھی ۳۰ ہزار دینار۔ پانچ کنیزیں اور ایک مکان مصر میں تھا جس کا مطالبہ امام رضاؑ نے

کردیا تھا اور ظالم نے خیانت کے جواز کے لئے امام کی امامت ہی سے انکار کردیا۔ امام عسکریؑ نے اس فرقہ سے صریحی برائت اور بیزاری کا اعلان کیا ہے۔

(کشف الغمہ ۳/۲۱۹)

ثنویہ

مجوسیوں کا ایک فرقہ ہے جو کائنات کے لئے دو خداؤں کا قائل ہے۔ ایک نے نور کو پیدا کیا ہے اور دوسرے نے ظلمت کو۔ امام عسکریؑ نے اس فرقہ کے بارے میں شدید ترین بیانات ارشاد فرمائے ہیں یہاں تک کہ ایک شخص نے اپنے والدین کے بارے میں دعائے خیر کا مطالبہ کیا جن میں ماں مومنہ تھی اور باپ ثنوی، تو حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا: "خدا تمھاری والدہ پر رحمت نازل کرے"۔ "رحم اللہ والدتک والتاء منقوطۃ" یعنی میں نے لفظ والدتک لکھا ہے والدیک نہیں لکھا ہے۔

مفوضہ

مدعیان محبت اہلبیتؑ میں ایک جماعت ایسی بھی پیدا ہوئی جس کا دعویٰ تھا کہ پروردگار نے کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اپنے کو معطل بنا لیا ہے اور سارا کاروبار اہلبیتؑ کے حوالے کردیا ہے۔ اب نظام کائنات کا چلانا ان کا کام ہے اور اس میں پروردگار کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس عقیدہ کا ایک حامل ادریس بن زیاد کفرتائی امام عسکریؑ کی خدمت میں آیا تو آپ نے دیکھتے ہی قرآن مجید کی آیت پڑھ دی "بل عباد مکرمون" "ہم اللہ کے باعزت بندے ہیں۔ اس پر کسی طرح سبقت نہیں کرتے ہیں اور اسی کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔"

دوسرے موقع پر لوگوں نے کامل بن ابراہیم مدنی کو اس عقیدہ کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ تفویض کا عقیدہ رکھنے والے جھوٹے ہیں۔ ہمارے دل مشیت الٰہی کا مرکز ہیں۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے ہم وہی چاہتے ہیں۔ اس نے صاف اعلان کردیا

ہے کہ اہلبیتؑ تم وہی چاہتے ہو جو خدا چاہتا ہے۔

اسحاق کندی

یہ اپنے دور کا ایک فلسفی تھا جس نے اپنے علم وفضل کے زعم میں قرآن میں تضاد اور تناقض کے اثبات کے لئے پوری کتاب تالیف کردی تھی۔ امام عسکریؑ نے اس کے ایک شاگرد سے فرمایا کہ اپنے استاد سے فقط یہ سوال کر لینا کہ تضاد خدائی مراد میں ہے یا اس کے سمجھے ہوئے معانی میں۔ خدائی مراد میں ہے تو اس کا علم اسے کہاں سے ہوا ہے اور اس کی سمجھ میں ہے تو اس کی ذمہ داری پروردگار پر کیا ہے؟

شاگرد نے اسحاق سے یہ سوال کیا تو حیران ہو گیا اور پوچھا کہ یہ سوال کہاں سے لائے ہو؟ اس نے بتانے سے انکار کیا۔ آخر میں اقرار کر لیا کہ امام عسکریؑ نے بتایا ہے تو اسحاق نے کہا یہ بات اس گھر والوں کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے اور یہ کہہ کر سارے کاغذات نذر آتش کر دئے۔ (مناقب ابن شہر آشوب ۴/ ۴۲۴)

جاثلیق نصرانی

معتمد بن متوکل کے زمانہ میں سامرہ میں شدید قحط پڑا مسلمانوں نے نماز استسقار بھی ادا کی لیکن بارش نہ ہوئی تو ایک عیسائی نے صحرا میں آکر دعا کی اور بارش ہو گئی۔ مسلمان سخت پریشان تھے اور عوام گمراہ ہوئے جا رہے تھے کہ معتمد نے امام عسکریؑ کو قیدخانہ سے طلب کیا اور کہا کہ اپنے جد کی امت کو بچائیے۔ حضرت نے عیسائی سے دعا کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس کی انگلی کے درمیان سے ایک شے نکال لی اور بادل منتشر ہو گئے۔ فرمایا کہ یہ ایک ولی خدا کی استخوان ہے جس کی برکت سے بارش ہو جاتی ہے۔ اس کا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس واقعہ کی برکت سے امامؑ کو بھی رہا کر دیا گیا اور آپ کے تمام چاہنے والے بھی قید سے رہا ہو گئے۔ (فصول مہمہ ابن صباغ مالکی ص ۲۶۸۔ صواعق محرقہ ص ۲۰۷)

حکام وقت

امام عسکریؑ کو اپنے دور حیات میں بنی عباس کے مختلف حکام اور سلاطین کا سامنا کرنا پڑا ہے جن میں ایک دوسرے سے بڑا ظالم اور بدکار تھا اور کسی ایک کا بھی دین و مذہب سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔

متوکل

• ۲۳۲ھ میں تخت حکومت پر قابض ہوا اور اسی سال ایسا تاریخی طوفان آیا جسکی کوئی مثال نہیں ہے۔

• متوکل لہو ولعب کا ایسا دلدادہ تھا کہ اس کی محفل پر ہیجڑوں اور مسخروں کا قبضہ رہا کرتا تھا۔ (الدیارات ص ۲۶)

• اس کے دربار میں رقاصاؤں اور گلوکاروں کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ چنانچہ ایک غلام بنان اور ایک زنام ہمہ وقت ساتھ رہتے تھے اور انھیں کے گانوں کی دھنوں پر دور جام چلتا تھا۔ (ثمار القلوب ص ۱۲۲)

• عیاشی کا یہ عالم تھا کہ پانچ ہزار کنیزیں تھیں اور سب سے جنسی تعلقات رکھتا تھا یہاں تک کہ ایک غلام کا کہنا تھا کہ متوکل قتل نہ ہوتا تو کثرت جماع سے مر جاتا۔
(مرأۃ الزمان ۶/ ۶۹)

• بیحیائی کا یہ حال تھا کہ دربار میں رقص و رنگ کا دور چلا کرتا تھا اور یہ نعرہ اسی نے دیا تھا کہ خدا سے ڈر نہیں تو بندوں کا کیا ڈر ہے۔ (زہر الآداب ۴/ ۳۱)

• ایک مرتبہ اپنی زوجہ ریطہ سے تقاضا کیا کہ بال سنوار کر سر بازار نکل پڑے تو اس نے انکار کر دیا اور اس بات پر اسے طلاق دے دی۔ (مرأۃ الزمان ۶/ ۱۶۹)

• اولاد علیؑ پر ظلم کا یہ عالم تھا کہ سادات کی خواتین کے پاس لباس تک نہ تھے اور ایک ہی لباس کو متعدد خواتین یکے بعد دیگرے پہن کر نماز ادا کرتی تھیں۔
(مقاتل الطالبین ص ۵۹۹)

• امیر المومنینؑ کا اسقدر دشمن تھا کہ مسخروں کو آپ کی نقل بنانے کا حکم دیتا تھا اور اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ جس سے عاجز آ کر اس کے بیٹے منتصر نے اسے قتل کرا دیا۔

• آثار اولاد رسولؐ کا اسقدر دشمن تھا کہ نشان قبر حسینؑ مٹا دینے کے لئے یہودیوں کو ٹھیکہ دے دیا کہ مسلمان یہ کام نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کامیاب نہ ہو سکا اور نشان قبر باقی رہ گیا۔

• امام علی نقیؑ کو مدینہ سے سامرہ اسی نے طلب کیا۔ پھر آپ کو خانہ نشین کر دیا۔ اور کھانے پینے پر بھی پابندی عائد کر دی۔ متعدد بار گھر پر حملہ کرا کے تلاشی بھی لی اور جب امام نے سر دربار بے ثباتی دنیا کے اشعار پڑھ کر ہوش دلایا۔ تب قدرے ہوش آیا اور آپ کو چار ہزار دینار دے کر گھر واپس کر دیا۔ (مروج الذہب ۴/ ۴۴)

• متوکل کے مظالم و معاصی سے عاجز آ کر اس کے فرزند منتصر نے ترکوں کے ساتھ سازش کر کے اسے قتل کرا دیا اور لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دئے۔

منتصر

متوکل کے بعد تخت حکومت پر بیٹھا اور حسب ذیل نیک اقدامات بھی کئے:

۱۔ فدک کو اولاد علیؑ کے حوالہ کر دیا۔
۲۔ سادات کے اوقاف کو آزاد کر دیا۔
۳۔ والی مدینہ صالح بن علی (دشمن اہلبیتؑ) کو معزول کر دیا۔
۴۔ زیارت امام حسینؑ اور زیارت امیر المومنینؑ کی عام اجازت دے دی۔

لیکن ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ترکوں نے زہر دے کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ ابن طیفور طبیب نے اس کام کے لئے تیس ہزار دینار اُجرت حاصل کی۔
(تاریخ الخلفا ص ۴۵۷)

مستعین

۵ ربیع الثانی ۲۴۸ھ کو تخت حکومت پر قابض ہوا اور متوکل کے مظالم کی یاد تازہ کرا دی یہانتک کہ امامؑ کو گرفتار کرا کے قید خانہ میں ڈال دیا اور علی احمد تامش کو نگراں بنا دیا جو

امامؑ کے اخلاق کریمانہ اور عبادات سے متاثر ہو گیا تو امامؑ کو قدرے سکون نصیب ہوا۔
ترکوں ہی نے اس کے خلاف بھی بغاوت کی اور آخر میں معتز کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ معتز نے بھی شرائط پر عمل نہیں کیا اور اسے جیل میں ڈال دیا۔ اور آخر میں ایک غلام کے ذریعہ قتل کرا دیا۔

معتز

زبیر بن جعفر المتوکل نام۔ جوانی کا عالم۔ ناتجربہ کاری کی زندگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کے ہاتھ کا آلہ کار بن گیا اور سعید حاجب کو حکم دیا کہ امامؑ کو قصر ابن ہبیرہ کی طرف لیجا کر قتل کر دے لیکن مشیت الٰہی سے کامیاب نہ ہو سکا۔
(دلائل الامامۃ ص ۲۲۵)

امام عسکریؑ کو اس قدر اذیت دی کہ آپ بد دعا کرنے پر مجبور ہو گئے اور امامؑ کی بد دعا کے تیسرے دن معزول ہو گیا۔
(دلائل الامامۃ ص ۲۲۵)

مہتدی

ترکوں نے معتز کو تخت سے اتار دیا تو اس کی جگہ مہتدی کو حکومت ملی جس کی عمر ۲۷ سال تھی۔ اس نے بھی امامؑ کو قید کرا دیا تھا۔ لیکن چند دنوں کے بعد خود ہی قتل ہو گیا۔

معتمد

مہتدی کے بعد پچیس ۲۵ سال معتمد کو حکومت ملی جس کا کل شغف ناچ گانے کا تھا اور اسی کے زہر دینے سے امام علیہ السلام کی شہادت واقع ہوئی۔
زہر کا اثر عام ہوا تو لوگوں کو بُلا کر شہادت دلوائی کہ زہر نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن بالآخر زہر نے اپنا کام کر دیا اور امامؑ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

سرکاری اور عوامی دونوں سطح پر سوگ منایا گیا اور بے مثال و نظیر مشایعت جنازہ دیکھنے میں آئی اور قبر مطہر مزار خواص و عوام بن گئی۔

ایک مرتبہ عباسی خلیفہ نے امام علی نقیؑ و امام عسکریؑ کی قبر کی زیارت کی اور آباء واجداد کی ویران قبروں کو بھی دیکھا۔ لوگوں نے ان قبروں کو آباد کرانے کا تقاضا کیا تو کہا یہ کام ناممکن ہے۔ اہلبیتؑ نے اللہ کے لئے جان دی ہے اور میرے آباء و اجداد نے شیاطین کے لئے۔ اللہ والے باقی رہنے والے ہیں شیاطین والے نہیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

غیبت، انتظار، ظہور

امام عصرؑ کے وجود اقدس سے متعلق تین طرح کے مسائل زیر بحث آتے ہیں:

۱۔ آپؑ کی غیبت اور اس کا مفہوم۔
۲۔ آپؑ کا ظہور اور اس کا تصوّر۔
۳۔ آپؑ کا انتظار اور اس کا طریقہ۔

گو ان تین مسائل میں دو کا تعلق امامؑ سے ہے اور ایک کا تعلق قوم سے ہے۔ امامؑ کے مسائل ابتدار و انتہار کی حیثیت رکھتے ہیں اور قوم کا مسئلہ درمیانی وقفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ غیبت سے انتظار کا تصوّر پیدا ہوتا ہے اور انتظار سے بعدِ ظہور کے حالات کا فیصلہ ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے درمیانی وقفہ میں انتظار کا فریضہ انجام دیا ہے وہ ظہور کے بعد اس کے فیوض سے فیضیاب ہوں گے اور جن لوگوں نے انتظار کے بجائے استہزار سے کام لیا ہے انھیں اس کا بھی انجام دیکھنا ہوگا۔

ذیل میں ان تینوں الفاظ کے مفاہیم کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ عام طور سے استعماری سازشوں نے اسلام کے تمام مثبت مفاہیم کو منفی بنا دیا ہے اور اسلام کو معاشرہ میں ایک عضو معطل بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ انتظار بھی ایک منفی کام ہو گیا ہے ـــــ اور غیبت معاشرہ سے قطع تعلق اور اس کے حالات سے باخبری کا نام پڑ گیا ہے جب کہ اسلام کا کوئی تصور منفی نہیں ہے اور اس کے ہر عقیدہ و عمل میں ایک مثبت پہلو اور ایک عملی تحریک پائی جاتی ہے۔

ضرورت ہے کہ پہلے ان تینوں الفاظ کے مفاہیم کو واضح کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کی مثبت حیثیت کا جائزہ لیا جائے۔

غیبت:

غیبت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ غیبت شخص اور غیبت شخصیت۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے اور اسی بنا پر اسے غائب کہا جاتا ہے جیسے وجود اقدس الٰہی ہماری نگاہوں کے لئے ایک غیب ہے۔ اور قیامت بھی ہمارے عقائد میں ایک غیب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شخص اور وجود نگاہ کے سامنے ہوتا ہے لیکن اس کی شخصیت اور حیثیت غائب ہوتی ہے جو حال ہر قوم میں اس کے نبی کا رہا ہے اور تقریباً ۴۰ سال سرکار دو عالمؐ کا رہا ہے کہ آپ کا وجود مقدس نگاہوں کے سامنے تھا لیکن آپ کی حیثیت رسالت و نبوت غائب تھی جس کی بنا پر آپ باعتبار فرزند عبد اللہ حاضر تھے اور باعتبار رسول اللہ غائب تھے۔

امام عصرؑ کی حیثیت بھی روایات کی بنا پر ایسی ہی ہے۔ آپ کی غیبت کا تصور یہ نہیں ہے کہ دنیا کے حالات سے بے خبر کسی دور دراز علاقہ میں حجرہ کے اندر زندگی گذار رہے ہیں اور کسی شخص کی نگاہ بصارت آپ تک پہونچ نہیں سکتی ہے بلکہ آپ کی غیبت درحقیقت شخصیت کی غیبت ہے۔ آپ معاشرہ کے اندر رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً لوگوں کے سامنے بھی آتے رہتے ہیں لیکن چونکہ شخصیت کا عرفان نہیں ہوتا ہے اور نگاہوں سے غائب ہو جانے کے بعد یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ شائد یہی امام عصرؑ تھے۔ اس لئے آپ کو غائب تصور کیا جاتا ہے اور آپ کے بارے میں غیبت کا عقیدہ رکھا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اکثر افراد کے اعتبار سے آپ نگاہوں سے بھی غائب ہیں اور حفاظت نفس و دین کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کی نگاہ کے سامنے نہ آئیں لیکن بیشمار افراد ایسے ہیں جن کے اعتبار سے آپ کی غیبت صرف شخصیت کی غیبت ہے ورنہ وجود مقدس اکثر اوقات نگاہوں کے سامنے رہتا ہے جس کا اندازہ ان بیحساب واقعات سے ہو سکتا ہے

جو ملاقات اور زیارت امامؑ کے بارے میں نقل کئے جاتے ہیں اور جن سے بات بحد یقین پہونچ جاتی ہے۔

ظہور:

غیبت ہی کے اعتبار سے ظہور کا مفہوم بھی طے ہوگا۔ اگر غیبت نگاہوں سے غیبت کے معنی میں ہے تو جس دن جزیرہ خضرا سے نکل کر آبادی میں آجائیں گے اور لوگوں کی نگاہوں کے پردے اٹھ جائیں گے اس دن کو روز ظہور کا نام دے دیا جائے گا۔ اور اگر غیبت شخصیت کی غیبت ہے تو جس دن اپنی شخصیت کے اعلان کے ساتھ کام شروع کر دیں گے اور اپنی انقلابی مہم کا آغاز کر دیں گے وہی دن ظہور کا دن کہا جائے گا۔

انتظار:

انتظار کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ انتظار کچھ نہ کرنے کا نام ہے۔ ذاکر کا انتظار کرنے والا مجلس نہیں شروع کرتا ہے۔ پیش نماز کا انتظار کرنے والا جماعت کا آغاز نہیں کرتا ہے۔ بارش کا انتظار کرنے والا پانی نہیں برساتا ہے اور قیامت کا انتظار کرنے والا قیامت نہیں اٹھاتا ہے۔ انتظار ایک منفی تصور ہے جس میں کام کا شروع کر دینا شان انتظار کے منافی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انداز فکر ایک فریب نظر کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ذاکر کا انتظار کرنے والا مجلس نہیں شروع کر دیتا ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ فرش ضرور بچھا دیتا ہے اور مائک ضرور لگا دیتا ہے ورنہ اسے انتظار کرنے والا نہ کہا جائے گا۔

پیش نماز کا انتظار کرنے والا نماز جماعت کا آغاز نہیں کرتا ہے لیکن کم از کم فرش تو بچھا دیتا ہے۔ صفیں تو درست کر دیتا ہے۔ انتظار امامؑ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ انتظار کرنیوالا اس کام کی زمین ہموار کرے جس کے لئے انتظار ہو رہا ہے۔ اگر امامؑ کے ظہور کا مقصد ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دینا ہے تو انتظار کرنیوالے کا فریضہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ ظلم کی طاقت کو کمزور بنائے اور عدل و انصاف کی زمین کو ہموار کرے۔ دور حاضر کا اسلامی انقلاب یا ہر دور کی واقعی اسلامی تحریکات کا مقصد یہی رہا ہے کہ

انسان اپنے امکان بھر ظہور کی زمین کو ہموار کرنے اور عملی طور پر منتظرین امام عصرؑ میں شامل
ہوجائے ۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ انسان خود امام زمانہ بن جائے یا اس کام کو مکمل
کردے جس کے لئے زمانہ کے امام کو بچاکر رکھا گیا ہے ۔ امام کا کام امام کو انجام دینا ہے لیکن
قوم کو بہرحال اپنا فریضہ ادا کرنا ہے اور امامؑ کا انقلاب قوم کو اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ
نہیں کرسکتا ہے ۔

عناصر انتظار

ایسے مثبت انتظار کے تین ارکان ہیں جن کے بغیر یہ انتظار مکمل نہیں ہوسکتا ہے عقائد
کے اعتبار سے اس انتظار کی ضرورت اس لئے ہے کہ پروردگار نے جن وانس کو عبادت کیلئے
پیدا کیا ہے اور یہ مقصد ابھی تک کلّی طور پر حاصل نہیں ہوا ہے لہٰذا کسی ایسے انسان کا انتظار
ضروری ہے جو اس مقصد کو مکمل کردے اور ساری دنیا راہ بندگی پر آجائے ۔
عمل کے اعتبار سے اس کا لازمہ یہ ہے کہ انسان مسلسل مصروف عمل رہے اور اس
دور کی زمین ہموار کرتا رہے جس کا انتظار کر رہا ہے ۔
نفسیاتی اعتبار سے انتظار کی شرط یہ ہے کہ انسان ہر وقت اس مستقبل پر نظر رکھے جس کا
وہ انتظار کر رہا ہے اور حالات زمانہ کی ابتری کی بنا پر کسی مایوسی اور لاوارثی کا شکار نہ ہو ۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

انتظار اور اعتبار

کھُلی ہوئی بات ہے کہ دنیا میں کسی شخص کا انتظار اسی وقت ہوتا ہے جب اس کا اعتبار
ہوتا ہے ۔ اعتبار ختم ہوجائے تو انتظار کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے ۔ سرکار دو عالمؐ کی آمد سے پہلے
مختلف اقوام عالم آپ کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں ۔ اس لئے کہ سب نے اپنی مذہبی کتابوں اور
اپنے رہنماؤں سے سُن رکھا تھا کہ سرزمین مکّہ پر ایک مصلح اعظم آنے والا ہے جو عالم انسانیت
کے دور جاہلیت کا علاج کردے گا اور اسے علم وعرفان کی بلندترین منزلوں سے آشنا بنادے گا ۔
امام عصرؑ کا انتظار بھی درحقیقت اسی اعتبار کی علامت ہے کہ صاحبانِ ایمان کو دنیا کی
آخری اصلاح کا اعتبار ہے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ کام پورا عالم انسانیت مل کر بھی انجام
نہیں دے پا رہا ہے تو ضرورت ہے کہ قدرت ایک ایسے انسان کا انتظام کرے جس کی
طاقت اس عالم انسانیت سے زیادہ ہو تاکہ وہ اس آخری کام کو بھی انجام دے سکے جسے
دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی انجام نہیں دے سکا ہے ۔

اسباب انتظار واعتبار

سوال یہ ہے کہ اس آنے والا کا اعتبار کیسے پیدا ہو کہ اس کے نتیجہ میں انتظار کی کیفیت
پیدا ہوجائے ۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ دنیا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے ۔ اسے آخر ایک
دن فنا ہونا ہے اور فنا ہوجائے گی ۔ اس کے لئے کسی مصلح کی کیا ضرورت ہے کہ اسکے اعتبار
پر اس کا انتظار کیا جائے ۔ ؟
لیکن اس سوال کا کھُلا ہوا جواب یہ ہے کہ ہمارے پاس بہت سے مذہبی عقائد وافکار

ہیں جو اس اعتبار و انتظار کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔

۱۔ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" مالک کائنات کا ارشاد ہے کہ ہم نے انسان اور جنات کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے مقصد تخلیق سے اسی وقت آشنا ہو گی جب انسان اور جنات سب منزل عبادت پر آجائینگے اور یہ وہ کام ہے جو ہزار ہا سال میں آج تک انجام نہیں پا سکا ہے اور نہ عصر حاضر میں کوئی انسان اس کا اہل نظر آ رہا ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ پروردگار اس مقصد کی تکمیل کے لئے کسی انسان کو منظر عام پر لائے گا جو جن و انس کو منزل عبادت تک پہونچا سکے اور تخلیق کائنات کے مقصد کی تکمیل کر سکے۔

۲۔ "یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون"

"یہ لوگ نور خدا کو بھی اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں جب کہ خدا اپنے نور کو بہر حال مکمل کرنے والا ہے چاہے کافروں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔"

یہ آیت کریمہ علامت ہے کہ نور الٰہی ناتمام نہیں رہ سکتا ہے اور اسے ایک دن مکمل ہونا ہے۔ لہٰذا جب تک اس کی تکمیل کا منظر سامنے نہ آجائے، اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب وہ نور مکمل ہو جائے اور وعدۂ الٰہی پورا ہو جائے۔

۳۔ "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون"۔ "اس خدا نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کے دین کو تمام ادیان عالم پر غالب بنائے چاہے یہ بات مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔"

ظاہر ہے کہ چودہ صدیوں میں ابھی تک دین اسلام عملی طور پر تمام ادیان عالم پر غالب نہیں آیا بلکہ روز بروز عالم اسلام ادیان عالم کا غلام بنتا جا رہا ہے اور اس سے اپنے وجود کی بھیک مانگ رہا ہے تو کیا ایسے حالات میں کسی ایسے شخص کا انتظار لازم نہیں ہے جو دین اسلام کو تمام ادیان عالم پر غالب بنا دے اور وہ رسول اکرمؐ ہی کے سلسلہ کی ایک فرد ہو تاکہ اس کے کام کو رسول اکرمؐ کی طرف منسوب کیا جا سکے اور وہ دین حق کے ساتھ الٰہی ہدایت کا بھی حامل

ہو، اور اسی کی رہنمائی میں یہ عظیم کام انجام دے۔

شائد یہی راز ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اس فرزند کو مہدی کے لقب سے نوازا ہے کہ یہ خدائی ہدایات کا حامل ہے اور ان ہدایات کے بغیر کوئی شخص اتنا عظیم عمل انجام نہیں دے سکتا ہے۔

۴۔ "ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین"۔ "ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں روئے زمین پر کمزور بنا دیا گیا ہے اور انھیں دنیا کا امام و قائد اور اپنی زمین کا وارث قرار دیدیں۔"

آیت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ زمین کا وارث اور دنیا کا امام اور قائد مستضعفین کو ہونا ہے اور مستکبرین عالم کے سلسلہ کو فنا ہونا ہے اور یہ کام ابھی تک نہیں ہو سکا ہے لہٰذا اس تابناک مستقبل کا انتظار ضروری ہے جب دنیا کی زمام اقتدار مستضعفین عالم کے ہاتھ میں آجائے اور مستکبرین کا سلسلہ تمام ہو جائے۔

شائد یہی راز ہے کہ زمانہ کے امامؑ نے ولادت کے بعد سب سے پہلے اسی آیت کریمہ کی تلاوت کی تھی اور گویا دنیا پر واضح کر دیا تھا کہ آیت کا واقعی مصداق اور زمین کا واقعی وارث آگیا ہے۔ اب مستکبرین عالم کا خاتمہ ہونے والا ہے اور وعدۂ الٰہی تکمیل کی منزلوں تک پہونچنے والا ہے۔

آیات مذکورہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ جس شخص کو مقصد تخلیق، غلبۂ دین الٰہی۔ اتمام نور پروردگار اور وراثت مستضعفین کا اعتبار ہے اسے اس تابناک مستقبل کا انتظار کرنا ہوگا۔ البتہ کوئی شخص اعتبار ہی سے محروم ہو جائے تو اس کی زندگی میں انتظار کا کوئی سوال نہیں ہے۔

۔ اس کے علاوہ انتظار مطابق فطرت بھی ہے۔ زراعت کرنے والے کو اپنے مستقبل کے لئے بارش کا انتظار رہتا ہے اور تجارت کرنے والے کو خریدار کا۔ ملازمت پیشہ اپنی تنخواہ کا انتظار کرتا ہے اور صنعت کار اپنے بازار کا۔ جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جس کی زندگی اور جس کا مستقبل جس چیز سے وابستہ ہوتا ہے وہ اس کا انتظار بہر حال کرتا ہے۔ تو اگر مسلمان کو اسلام کے غلبہ اور بندگی کے رواج سے دلچسپی ہے تو اسے بھی اس فرد کا انتظار کرنا پڑے گا جس کے

دم سے یہ سارا کام انجام پانے والا ہے۔

انتظار کا ایک فلسفہ یہ بھی ہے کہ انسان کو انتظار اسی کا ہوتا ہے جسے مفید سمجھتا ہے ورنہ جس کا خطرہ ہوتا ہے اس کا خوف ہوتا ہے انتظار نہیں ہوتا ہے۔ عالم اسلام کا حال بھی یہی ہے۔ جو مظلوم و بیکس ہیں۔ وہ اپنے دادرس اور فریادرس کا انتظار کر رہے ہیں اور جن کی زندگی ظلم و ستم سے بھری ہوئی ہے وہ آنے والے کی آمد سے خوفزدہ ہیں۔ اس کے منتظر نہیں ہیں۔

انتظار کی ایک عظمت یہ بھی ہے کہ اس سے اسلام اور یہودیت کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ جناب موسیٰ ۳۰ دن کے وعدہ پر کوہ طور پر گئے اور پروردگار نے مزید دس دن روک لیا تو قوم انتظار نہ کر سکی اور گوسالہ بنا کر گمراہ ہوگئی۔ جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہودیت میں طاقت انتظار نہیں ہے۔ اب مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے قائد کا انتظار کرے تاکہ اس کا کردار یہودیت سے الگ ہو جائے۔ وہ مذہب یہودیت کی فرع ہے جس میں طاقت انتظار نہیں ہے اور اس کا یہودیت سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کی بنیاد انتظار پر قائم ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

عصرِ ظہور

امام عصرؑ کے ظہور سے متعلق دو مسائل بیحد اہمیت کے مالک ہیں :

ایک مسئلہ یہ ہے کہ ظہور کے دور کے حالات کیا ہوں گے اور زمانہ کے ظلم و جور سے بھر جانے کا مطلب کیا ہوگا؟

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ظہور کے بعد کیا ہوگا اور امام کا طرزِ حکومت یا زمانۂ حکومت کتنا اور کیسا ہوگا؟

جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس دور میں ظلم ہی ظلم ہوگا اور ظالموں کے علاوہ کوئی نہ رہ جائے گا جس کا لازمہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ظہور سے پہلے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے یا ظلم کے مقابلہ میں جہاد کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ظہور کی راہ میں دیوار کھڑی کر رہا ہے اور ظہور کی زمین کو ناہموار بنا رہا ہے۔ اور اس کے برخلاف اگر کوئی شخص ظلم و جور کر رہا ہے تو گویا وہ محسنِ انسانیت ہے کہ مصلح اعظم کے ظہور کی زمین تیار کر رہا ہے اور ان کی آمد کی راہ کو ہموار بنا رہا ہے۔

بعینہ یہی تصور ظہور کے بعد کے حالات کے بارے میں ہے کہ ظہور کے بعد دُنیا عدل و انصاف سے بھر جائے گی اور ظلم و ستم کا خاتمہ ہو جائے گا جس کے بعد یہ قہری سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں امام زمانہؑ کی شہادت کے کیا معنی ہیں اور عدل و انصاف سے بھری ہوئی دنیا میں اتنا بڑا ظلم کس طرح ہو سکتا ہے۔؟

لیکن ان دونوں باتوں کا مختصر سا حل یہ ہے کہ ظلم ایک ایسا مفہوم ہے جس کا تحقق دو افراد یا دو اطراف کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے جس طرح کھانا ایک غذا کا طلبگار ہے اور ایک

کھانے والے کا۔ قتل ایک قاتل چاہتا ہے اور ایک مقتول۔ اسی طرح ظلم بھی دو اطراف کا متقاضی ہے
ایک ظالم اور ایک مظلوم۔

دنیا سے مظلوموں کا خاتمہ ہو جائے گا تو بھی ظلم نہیں ہو سکتا ہے اور ظالموں کا خاتمہ ہو جائے تو بھی ظلم کا امکان نہیں ہے۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا میں مظلوم نہ ہوں گے ایک غیر منطقی فکر ہے اور اسی طرح یہ تصوّر کرنا کہ عدل و انصاف سے بھری ہوئی دنیا سے ظالموں کا خاتمہ ہو جائے گا ایک غیر معقول تصور ہے۔ اس دنیا میں روز اول سے ظلم رہا ہے اور روز آخر تک رہے گا۔ قابیل نے اس ظلم کی بنیاد ڈالی ہے اور صور اسرافیل ہی سے اس سلسلہ کا خاتمہ ہو گا۔ اس سے پہلے نہ ظلم کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ ظالم و مظلوم کا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر زمانہ کے ظلم و جور یا عدل و انصاف سے بھر جانے کا تصور کیا ہے اور روایات نے کس مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے تو اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ ہر شے کے بھرنے کا تصور اس کے مناسب ماحول سے طے کیا جاتا ہے اور اس ماحول سے ہٹ کر اس کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر بازار کے کسی کپڑے یا گھڑی سے مملو ہو جانے کا اعلان کیا جائے تو اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ یہ کپڑا یا گھڑی سبزی کی دکان پر بھی موجود ہے۔ بلکہ اس کا واضح سا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہر کپڑے کی دکان پر یہ کپڑا موجود ہے اور ہر گھڑی کی دکان پر یہ گھڑی موجود ہے۔ اس سے زیادہ اس بیان میں وسعت نہیں ہوتی ہے۔

یہی حال ظلم و جور اور عدل و انصاف کا بھی ہے کہ ان کا بھی ایک میدان اور ایک بازار ہے۔ عدل و انصاف کے اپنے محکمہ معین ہیں جن کا نام ہی عدالت رکھا گیا ہے اور اسی طرح ظلم و ستم کے اپنے میدان ہیں جن کا کام ہی ظلم و ستم کرنا ہے تو اگر اول الذکر محکموں میں ظلم و ستم پیدا ہو جائے اور ناانصافی سے مسائل طے ہونے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ظلم و ستم سے مملو ہو گیا ہے اور اسی طرح اگر آخر الذکر میں عدل و انصاف رائج ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ عدل و انصاف سے معمور ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مقامات پر عدل و انصاف پایا جاتا ہے یا ظلم و ستم۔ اس کا دنیا کے بھر جانے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس پر عدل و انصاف یا ظلم و جور سے بھرنے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

ظہور امامؑ کا زمانہ وہ ہو گا جب عدل کے مراکز تک ظلم کی رسائی ہو جائیگی اور مظلوم کی آواز عدلیہ میں بھی قابل سماعت نہ ہو گی اور یہی تصور دنیا کے ظلم و جور سے بھر جانے کا ہو گا کہ مظلوم موجود ہوں گے لیکن ان کی آواز کسی مرکز انصاف پر نہ سُنی جائے گی اور امامؑ کے انقلاب کا مفہوم یہ ہو گا کہ مظلومین اور مستضعفین کی آواز ہر طرف سُنی جائے گی اور ظالموں کو کسی مرکزی مقام پر سانس لینے کا موقع نہ دیا جائے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہو گا کہ وہ صفحہ ہستی سے فنا ہو جائیں گے اور ان کا کوئی وجود نہ رہ جائے گا بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہو گا کہ وہ پہلے ہی کی طرح آزاد۔ صاحب اقتدار و اختیار اور منظر عام پر نہ ہوں گے اور شائد اسی نکتہ کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہے جس میں امامؑ کا قاتل ایک عورت کو قرار دیا گیا ہے جس کے چہرہ پر ڈاڑھی بھی ہو گی کہ یہ انسان یا واقعاً عورت ہو گا کہ مردوں میں ظلم کرنے کے حوصلے پست ہو جائیں گے یا واقعاً مرد ہو گا لیکن اپنے اعمال و حرکات کے اعتبار سے عورت شمار کیا جائیگا کہ اس میں علانیہ عمل کرنے کی ہمّت نہ ہو گی۔

عدل و انصاف یا ظلم و جور سے بھر جانے کے اس مفہوم کی وضاحت کے بعد اس نکتہ پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے کہ امامؑ کا کام ظلم و جور سے مقابلہ کرنا اور اس کو منظر عام سے ہٹا دینا یا اس کی شوکت کو کمزور بنا دینا ہے لہٰذا غیبت امامؑ میں جس قدر بھی اصلاحی تحریکیں چلائی جاتی ہیں یہ درحقیقت امامؑ کے عمل میں ان کی نصرت و امداد کے مرادف ہیں اور ان کا ظہور کی راہ میں رکاوٹ سے تعبیر کرنا ایک جہالت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

درحقیقت یہ جاہلانہ تصوّر ظالموں کی سازش سے پیدا ہوا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ہر طرح کے انقلابی اقدام سے غافل رہے اور اسے اپنے اسلام اور ایمان کے خلاف قرار دے کر ہر طرح کے ظلم پر سکوت اور خاموشی سے کام لے اور ظالموں کو کچھ دنوں اور آرام کرنے کا موقع مل جائے۔

ائمہ طاہرینؑ نے ہر دور میں اپنے چاہنے والوں کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حکم دیا ہے اور تقیہ کے حدود میں رہتے ہوئے ظالم سے اختلاف رائے کے اظہار کو ضروری قرار دیا ہے یہانتک کہ امام رضاؑ کے دور سے مسلسل یہ دیکھا گیا ہے کہ قوم کو ظہور امامؑ کے دور

کے لئے برابر تربیت دی گئی ہے اور ظلم سے ٹکرانے کا حوصلہ فراہم کیا گیا ہے۔

امام رضا علیہ السلام کا طریقہ تھا کہ جب اپنی اولاد میں آخری امامؑ کا ذکر کیا کرتے تھے اور انہیں لفظ "قائم" سے یاد کرتے تھے تو خود بھی کھڑے ہوجاتے تھے اور اپنا ہاتھ سر مبارک پر رکھ لیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قیام کی بنیاد احترام نہیں ہے ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اپنے آباء و اجداد کے ذکر پر قیام نہ کیا جائے اور چوتھی پشت میں آنے والے فرزند کے تذکرہ پر سروقد تعظیم کی جائے۔

یہ درحقیقت قوم کی ذہنی تربیت تھی اور اسے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی تعلیم دی جارہی تھی کہ آج میں اپنے فرزند کو لفظ "قائم" سے یاد کرتا ہوں تو کھڑا ہوجاتا ہوں اسلئے کہ میرے پیش نظر اس کے قیام کا تصور ہے قیام نہیں ہے۔ کل اگر تم لوگ زندہ رہ گئے اور تمہارے سامنے اس نے قیام کر لیا تو تمہارا فرض ہے کہ اس کے قیام کا ذکر سنتے ہی کھڑے ہوجانا اور اپنا ہاتھ سر پر رکھ کر اشارہ کرنا کہ فرزند رسولؐ! یہ سر حاضر ہے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ سر بھی کٹ جائے تو گوارا ہے لیکن ظلم کے خلاف قیام سے غفلت گوارا نہیں ہے۔

اسی ذہنی تربیت کی ایک کڑی غیبت صغریٰ کی سفارت اور غیبت کبریٰ کی نیابت عامہ بھی ہے کہ امامؑ نے غیبت صغریٰ کے زمانے میں قوم کو قائدین کی اطاعت پر آمادہ کیا اور غیبت کبریٰ کے لئے ساری قوم کو ایسے علماء کے حوالے کر دیا جو اپنے نفس کو بچانے والے، اپنے دین کے خطرات سے حفاظت کرنے والے، اپنے نفس کے دشمن اور اپنے مولا کے اطاعت گذار ہوں تاکہ قوم ان پر اعتماد کرے اور وہ وقتاً فوقتاً اسے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی تربیت دیتے رہیں اور اس طرح وقت ظہور کے لئے ایک فوج پہلے سے تیار رہے۔ ایسا نہ ہو کہ رہبر انقلاب عالم قیام کر دے اور قوم سوچتی ہی رہ جائے کہ اب اسے کیا کرنا ہے یا اس قدر بے تربیت ہو کہ قیام کرنا بھی چاہے تو قیام کا سلیقہ نہ معلوم ہو اور لشکر امامؑ میں سپاہی بننے کے بجائے انقلاب امامؑ کی تماشائی بن جائے۔

دورحاضر کی اسلامی بیداری اسی آمادگی کی ایک کڑی ہے اور اسی نسلی تربیت کا ایک اثر ہے کہ لاکھوں خطرات کے مقابلہ میں بھی منتظرین امامؑ سر بکف کھڑے رہتے ہیں اور کوئی ظلم ان کے

حوصلوں کو پست نہیں کرسکتا ہے۔

ظہور کے بعد

امام عصرؑ کی حکومت کے بارے میں مختلف روایات پائی جاتی ہیں جن میں آپ کے دور حکومت کا ذکر کیا گیا ہے اور آپ کے انداز حکومت کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ اس دور کی حکومت صرف ظاہری حالات کے اعتبار سے نہ ہوگی بلکہ آپ باطن کو بھی نگاہ میں رکھ کر فیصلہ کریں گے اور نفاق کا جنازہ نکل جائے گا۔

۲۰ سال کا کوئی نوجوان احکام شریعت اور حلال و حرام سے بے خبر نظر آگیا تو اسے تہ تیغ کر دیں گے اور کسی طرح کی مہلت نہ دی جائے گی کہ بالغ ہونیکے بعد ۵ سال کی مہلت مل چکی ہے۔ اس عرصہ میں اپنے دین کے احکام کیوں نہیں سیکھے ہیں اور حلال و حرام شریعت سے آگاہی کیوں نہیں حاصل کی ہے۔

یہ زمانۂ حکومت ۹ سال ہو یا ۱۹ سال۔ بات اس منزل پر تمام ہونے والی نہیں ہے بلکہ ائمہ طاہرینؑ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور ان کے دور حکومت کا آغاز ہوگا جس میں امام عصرؑ کی اولاد مختلف علاقوں کی حاکم ہوگی اور دین و ایمان کا پرچم ساری دنیا پر لہرائے گا۔

گویا جس طرح ابتداء میں ائمہ طاہرینؑ نے آخری امامؑ کے انقلاب کے لئے زمین ہموار کی ہے اسی طرح زمانہ کے امام ان سب کے دور اقتدار کی زمین ہموار کریں گے اور پروردگار کا یہ وعدہ مکمل طریقہ سے پورا ہو جائے گا کہ "ہم مستضعفین پر احسان کرنا چاہتے ہیں اور انہیں قیادت دے کر روئے زمین کا وارث بنانا چاہتے ہیں"۔

روایات میں امام زمانہؑ کی خلافت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ مولائے کائناتؑ کی طرح کوفہ آپ کا دارالحکومۃ ہوگا اور مسجد سہلہ کی حیثیت مرکز حکومت کی ہوگی۔ مکہ، کوفہ، دمشق کو فتح کرنے کے بعد ایک لشکر روم کی طرف روانہ کریں گے جو افریقہ اور مصر وغیرہ کے علاقوں کو فتح کرے گا اور دوسرا لشکر ایران، کابل اور چین کی طرف جائے گا۔ مکہ سے نکلتے وقت دس ہزار افراد کا لشکر ساتھ ہوگا۔ مدینہ کا رخ کریں گے تو راستہ میں شدید جنگ ہوگی۔

اُدھر سفیانی کوفہ تک پہونچ جائے گا تو حضرت کا قیام شروع ہوگا اور وہ ایک ۱۲ ہزار کا لشکر مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ کرے گا جو راستہ میں ایک صحرا میں دھنس جائے گا۔ آپ کا ایک قافلہ بحری راستہ سے روانہ ہوگا جس میں ۵۰ کشتیاں ہوں گی اور وہ طرطوس۔ انطاکیہ قسطنطنیہ وغیرہ کو فتح کرتا ہوا روم تک پہونچ جائے گا اور وہ تمام علاقے جو عالم اسلام کے ہاتھوں سے نکل گئے ہیں دوبارہ بھی اسلام کے زیر نگیں آجائیں گے اور اب حقیقی اسلام کی حکومت ہوگی جس کے پرچم پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ساتھ اس ولایت علیؑ کا اعلان بھی ہوگا جس کے سبب دین کے اکمال اور نعمت کے اتمام کا اعلان ہوا تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ کے پاس تین پرچم ہوں گے۔ ایک پر الیوم اکملت لکم دینکم اور دوسرے پر یوفون بالنذر کی آیت۔ تیسرا پرچم مکمل کلمہ کا اعلان کریگا جس میں توحید و رسالت کے ساتھ ولایت علیؑ ابن ابی طالب کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

تاریخ انبیاءِ کرامؑ

- جناب آدمؑ کو پروردگار نے دو فرزند ہابیل و قابیل عنایت کیے۔ پھر جناب شیث جیسا فرزند عنایت کیا جسے صحیفے بھی عطا کیے گئے۔ اس کے بعد اولاد آدمؑ کے ازدواج کے لئے دو مخلوقات اور نازل کیں۔ ایک حوریہ اور ایک جنّیہ۔ ان دونوں سے اولاد آدم کا عقد ہوا اور پھر اولاد پیدا ہوئی اور اولاد میں ماں کا اثر باقی رہ گیا۔ حوریہ کی اولاد میں نرم مزاجی آگئی اور جنّیہ کی اولاد میں شعلہ مزاجی داخل ہوگئی۔
- جناب ذوالکفل کا اصلی نام عدیا بن ادارین تھا۔
- جناب یعقوبؑ کی اولاد کے نام لاوی۔ یہوذا۔ ریاون۔ یشجر۔ شمعون (ان سب کی ماں لیّا تھیں)۔ یوسفؑ۔ بنیامین (ان دونوں کی والدہ راحیل)۔ دان۔ نفتالی۔ حاد۔ آشر (ان کی ماں زلفہ۔ بلہہ)
- جناب یعقوبؑ ایک سو تیس برس کی عمر میں جناب یوسفؑ سے ملے اور ۱۷ سال وہاں مقیم رہے۔ ۱۴۷ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔
- جناب یوسفؑ ۱۷ سال کی عمر میں باپ سے جُدا ہوئے۔ تین دن کنویں میں رہے۔ ۲۰ سال باپ سے دور رہے۔ پھر ۱۷ سال باپ کے ساتھ رہے۔ زلیخا سے عقد کے بعد تین اولاد پیدا ہوئیں افرایم۔ میشا۔ رحمہ (یہ جناب ایوبؑ کی زوجہ تھیں)
- جناب یوسفؑ اور جناب موسیٰؑ میں ۴۰۰ سال کا فاصلہ ہے۔
- جناب موسیٰؑ کے والد محترم عمران بن یصہر بن فاہث بن لاوُس بن یعقوب۔
- جناب موسیٰؑ کی والدہ کا نام عبرانی میں یوخابید اور سریانی میں یوکابید تھا۔

● ۔ فرعون کی عمر ۴۰۰ سال تھی۔ پستہ قد تھا خضاب دار ڈاڑھی رکھتا تھا حضرت موسیٰؑ کی کل عمر صرف ۱۲۰ سال تھی۔

● ۔ جناب خضرؑ کا نام یلیا بن عکان بن عامر بن ارفخشد بن سام بن نوح تھا جس جگہ بیٹھ جاتے تھے وہ جگہ سرسبز و شاداب ہو جاتی تھی اسی لئے خضر کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔

● ۔ جناب مریم کے والد کا نام عمران بن ماثان تھا جن کا سلسلہ ۲۷ پشت کے بعد یہوذا ابن یعقوب سے مل جاتا ہے۔

● ۔ جناب مریم ۱۰ برس کی عمر میں حاملہ ہوئیں اور جناب عیسیٰؑ صرف ۶ ماہ ان کے شکم اطہر میں رہے، ان کی ولادت عام انسانوں سے مختلف بغیر باپ کے ہوئی ہے۔

● ۔ رسول اکرمؐ نے بنفس نفیس ۲۶ یا ۲۷ غزوات میں شرکت فرمائی ہے:

ابوار۔ بواط۔ عشیرہ۔ بدر اولیٰ۔ بدر کبریٰ۔ غزوہ بنی سلیم۔ سویق۔ ذی امر۔ احد۔ اسد۔ بنی نضیر۔ ذات الرقاع۔ بدر اخیر۔ دومۃ الجندل۔ بنی قریظہ۔ بنی لحیان۔ بنی قرد۔ بنی مصطلق۔ حدیبیہ۔ خیبر۔ فتح مکہ۔ طائف۔ تبوک۔ خندق۔

● ۔ فتح مکہ کے موقع پر سرکار دو عالمؐ نے عام مجرمین کو معاف کر دیا تھا لیکن چند افراد کو اس معافی سے الگ رکھا تھا کہ بعض جرائم قابل معافی نہیں ہوتے ہیں۔

مردوں میں عبداللہ بن ابی سرح۔ عبداللہ بن خطل۔ عکرمہ بن ابی جہل۔ وحشی قاتل جناب حمزہ۔ کعب بن زہیر۔ عبداللہ بن ابی ربیع۔ حرث بن ہشام۔ حبار بن اسود۔ عبداللہ بن ختم۔ حویرث بن نفیل۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرہ۔ صفوان بن امیہ۔ حارث بن طلالہ۔ عبداللہ بن زبعریٰ۔

عورتوں میں ہند بنت عبشہ اور سارہ (یہ دونوں معروف گلوکار تھیں)

قریبہ اور قرثنا (ان کا پیشہ بھی ایسا ہی تھا)

(تاریخ ابوالفدا۔ تاریخ الخمیس)

حضرت ہودؑ

یمن میں ایک قوم آباد تھی جس کا نام تھا قوم عاد۔ اسی قوم کی ایک فرد تھے جناب ہودؑ جنھیں پروردگار نے پیغمبری سے سرفراز کیا تھا اور انھوں نے اپنی بُت پرست قوم کو توحید پروردگار کی دعوت دی تھی لیکن قوم نے ازراہ حماقت ان کی دعوت کو سفاہت کا نام دے دیا اور یہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ خدائے وحدہ لاشریک کی بندگی کی دعوت دینے والا بے عقل نہیں ہوتا ہے۔ پتھروں کی خدائی کا عقیدہ پیدا کرکے انھیں سجدہ کرنے والا احمق اور بے وقوف ہوتا ہے۔

بہر حال اس قوم کو اپنی طاقت کا غرور تھا اور قوی ہیکل ہونے کی بنا پر کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے افراد سو سو گز کے طویل القامۃ ہوتے تھے اور اس قدر قوی ہیکل تھے کہ پتھر پر پیر مار دیتے تھے تو زمین میں دھنس جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد بھی اپنے کو بندہ اور پتھر کو خدا سمجھتے تھے۔

جناب ہودؑ کے مخلصین اس صورت حال میں تقیہ کی زندگی گذار رہے تھے اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ علی الاعلان ان کی حمایت کا اعلان کر سکے۔

ایک مرتبہ قوم والے جناب ہودؑ کے پاس قحط کی فریاد لے کر آئے۔ وہ اتفاق سے گھر پر موجود نہ تھے۔ زوجہ نے ان لوگوں کو یہ کہہ کر بہکا دیا کہ ان کے جانور خود ہی مرے جا رہے ہیں وہ تمھاری مشکل کیا حل کریں گے؟ حضرت ہودؑ کو یہ بات معلوم ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ہر شخص کا دنیا میں کوئی نہ کوئی دشمن ہوتا ہے جو اسے اذیت دیتا رہتا ہے اور میرا دشمن یہ میری زوجہ ہی ہے۔

زوجہ کی اس بات کا قوم پر اس قدر اثر ہوا کہ جناب ہودؑ کو چھوڑ کر براہ راست دُعا

کرنے کے لئے مکہ چلے گئے اور جب بارش کے آثار دکھائی دئے تو بیحد خوش ہوئے۔ لیکن
ابر سے پانی کے بجائے آگ کی بارش شروع ہوگئی اور سب جھلس کر مر گئے۔
اس عذاب کا ایک راز یہ بھی تھا کہ قوم کے بیشتر افراد نے مکہ پہونچ کر وہاں عیاشی
شروع کردی اور خدا سے غافل ہوگئے تو اس نے بھی عذاب سے دوچار کر دیا۔ قوم عاد پر آنے
والا عذاب اس قدر سخت آندھی کی شکل میں تھا کہ ایک بوڑھی عورت غار میں گھس گئی تو ہوا
اسے بھی نکال لے آئی۔ اور ایک بزرگ غار میں چلے گئے اور بڑے بزرگ کے کہنے پر راہ راست
پر نہ آئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باد صرصر نے انھیں بھی ہلاک و برباد کر دیا۔ اور یہ کام سات
دن تک برابر ہوتا رہا۔

جنّتِ شدّاد

بزرگِ قبیلہ عاد کے دو فرزند تھے : شدید اور شدّاد۔ حضرت ہودؑ نے دونوں کو
ہدایت دی اور سمجھایا لیکن دونوں نے انکار کر دیا اور شدّاد نے تو الگ جنت بنوانا شروع
کردی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اس طرح انبیار کرام سے بے نیاز ہو جائے گا اور قوم کے راہ راست
پر آنے کا راستہ کھل جائے گا۔ چنانچہ جنّت تیار ہوگئی اور اس نے صاف صاف لفظوں میں کہدیا
کہ ہمیں آپ کی جنّت کی ضرورت نہیں ہے ہمارے پاس بہترین جنّت موجود ہے۔ لیکن پروردگار
نے اسے بھی تباہ و برباد کر دیا۔ جب کہ شداد ۲۶۰ بادشاہوں کا بادشاہ تھا اور اس نے جنت کی
تعمیر تین سو سال خرچ کئے تھے۔ تین لاکھ مزدوروں نے کام کیا اور تمام حکام نے امداد کی۔ لیکن
آخری نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنّت کے دیدار سے بھی محروم رہ گیا جس کی تعمیر کا اس قدر اہتمام کیا تھا اور
بعض علمار کے مطابق مزدوروں نے جنّت دیکھ لی اور مالک اس کی زیارت سے بھی محروم رہ گیا۔
بعض روایات کی بنا پر ملک الموت سے سوال کیا گیا کہ تعمیل ارشاد الٰہی اور قبض روح میں
کبھی کسی زحمت کا احساس ہوا ہے؟ — ملک الموت نے جواب دیا صرف دو مواقع پر۔ ایک
مرتبہ جب شدّاد کی روح قبض کرنے کا حکم دیا گیا جب کہ وہ اپنی بنائی ہوئی جنّت کی زیارت کرنا
چاہتا تھا اور سواری کا ایک قدم جنت کے اندر تھا اور ایک باہر۔ کہ مالک کائنات نے حکم دیدیا

کہ اسی حالت میں روح قبض کرلی جائے۔ ظاہر ہے کہ ارشاد الٰہی کی تعمیل تو کرنا ہی تھی لیکن اس
بیچارہ کے حال پر رحم بھی آیا کہ اسقدر محنت سے بنوائی ہوئی جنت کی زیارت بھی نہ کر سکا۔
اور اس سے پہلے ایک مرتبہ اس وقت رحم آیا تھا جب ایک ماں اپنے بچہ کے ساتھ کشتی کا سفر
کر رہی تھی اور عین دریا میں حکم ہوا کہ ماں کی روح قبض کرلی جائے۔ میں نے روح تو قبض کرلی
لیکن لرز گیا کہ آخر اس بحر بے پایاں میں اس کمسن بچہ کا کیا حشر ہوگا اور اسکی زندگی کا کیا سہارا ہوگا۔
ملک الموت کے اس جواب پر آواز غیب آئی۔ ملکوت الموت! یہ دونوں واقعات ایک
ہی انسان کے ہیں۔ شدّاد وہی بچہ ہے جس کی ماں دریا میں مر گئی تھی اور وہ بالکل بے سہارا
ہوگیا تھا۔ یہ ہمارا کرم تھا کہ ہم نے اس بیکسی کے عالم میں اس کی تربیت کا انتظام کر دیا اور یہ
اس کی نالائقی ہے کہ بڑے ہونے کے بعد خدائی کا دعویدار بن گیا اور ہماری جنت کے مقابلہ میں
جنت کی تعمیر میں مصروف ہوگیا۔ ہم نے چاہا کہ اسے اس کی احسان فراموشی کا مزہ چکھا دیا جائے
اور دوسرے بندوں کے لئے عبرت کا سامان فراہم کر دیا جائے۔

کواکب یوسفؑ

قرآن مجید نے قصۂ جناب یوسفؑ کو احسن القصص قرار دیا ہے جب کہ اس میں بظاہر ایک عورت اور ایک مرد کی داستان پائی جاتی ہے اور نازک ترین حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

•۔ راز یہ ہے کہ اس واقعہ میں اصلاح انسانیت کے تمام اسباب جمع کر دئے گئے ہیں اور انسانی زندگی کے سنگین ترین خطرہ کا علاج بتا دیا گیا ہے۔

۔ ابتدا میں حسد کی تباہ کاری کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کو اس منزل پر پہونچا دیتا ہے جہاں بھائی بھائی کے قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قصۂ ہابیل وقابیل نگاہ کے سامنے موجود ہوتا ہے۔

۔ آخر میں جناب یوسفؑ کی فراخدلی کا ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے غلہ بھی دیدیا اور خطا کو بھی معاف کر دیا تاکہ انسان پر یہ واضح کر دیا جائے کہ شرارت کا جواب شرارت نہیں ہے بلکہ شرافت بھی ہے۔

۔ درمیان میں جناب یوسف کی خرید و فروخت اور غلامانہ کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ سخت ترین حالات انسان کی قدر و قیمت کو کم نہیں کر سکتے ہیں۔

۔ برادران یوسف کی طرف سے جناب یعقوب کو گمراہ قرار دینے کا راز یہ ہے کہ ظالم مظلوم کے گریہ کو پسند نہیں کرتا ہے اور اسے یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں ہمارے مظالم کا راز کھل نہ جائے۔

۔ زلیخا کی طرف سے جناب یوسفؑ کی سزا کا مطالبہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت ہمیشہ اپنی پوزیشن کو بچانے کے لئے مرد کو مورد الزام قرار دیتی ہے اور اس کا دعویٰ قبول بھی کر لیا جاتا ہے۔

۔ قدرت کی طرف سے بچہ کی گواہی کا انتظام اس بات کی دلیل ہے کہ پروردگار جسے عزت دینا چاہے اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا ہے اور وہ جسے ذلیل کرنا چاہے اُسے کوئی باعزت نہیں بنا سکتا ہے۔

۔ جناب یوسفؑ کا خزائن مصر کا مالک ہونا اور برادران یوسف کا سائل بن کر آنا دلیل ہے کہ ظلم مظلوم کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے مظلوم ظالم کا دست نگر نہیں ہوتا ہے۔

۔ جناب یوسفؑ کا بھائیوں کو چور قرار دینا اپنی سرگذشت کی طرف اشارہ ہے۔ اس کا موجودہ واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۔ جناب یوسفؑ کا یہ انداز کہ چوری کا سامان جس کے پاس سے برآمد ہو جائے گا اسی کو سزا دی جائے گی۔ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو قوم جس قانون کی قائل ہوتی ہے اس کو اسی قانون کی روشنی میں مجبور کیا جا سکتا ہے۔

• جناب یوسفؑ نے ابتدائی منزل پر خواب دیکھا کہ مجھے گیارہ ستارے سجدہ کر رہے ہیں۔ ان ستاروں کے نام کیا ہیں۔ اس کے بارے میں بستان یہودی نے سرکار دو عالمؐ سے سوال کیا۔ آپ نے جواب دینے سے انکار کر دیا کہ جب تک وحی پروردگار نہ آجائے میں کوئی جواب نہیں دے سکتا ہوں۔ دوسرے دن جبریل امین نازل ہوئے تو آپ نے اسے طلب کیا اور فرمایا کہ اگر میں ان ستاروں کے نام بتا دوں تو کیا تو اسلام قبول کر لے گا۔ اس نے وعدہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کواکب کے نام یہ تھے:

جربان۔ طارق۔ ذیال۔ ذوالکتفان۔ قابس۔ وثاب۔ عمودان۔ فیلق۔ مصبح۔ ضروح۔ ذوالقرح۔

اس نے آپ کے بیان کی تصدیق کی اور اسلام قبول کر لیا۔ اس واقعہ سے حسب ذیل امور کا اندازہ ہوتا ہے:

۔ غالباً یہودی نے اپنی کتاب میں علائم نبوت میں یہ بھی دیکھا تھا کہ نبی کو ان ستاروں کے نام معلوم ہوں گے اور اسی بنا پر مسلمان ہو گیا۔

۔ سرکار دو عالمؐ کا جواب نہ دینا یہودی کو اس نکتہ سے آگاہ کرنا تھا کہ میں پیغمبر ہوں

اور پیغمبرؐ اپنی طرف سے کوئی کلام نہیں کرتا ہے اور اسی بنا پر اس سے اسلام لانے کا وعدہ لے لیا۔

۔ اسلام کا وعدہ لینا علامت ہے کہ آپ کا مقصد اظہار علم و فضل نہیں تھا بلکہ دعوت اسلام تھا ورنہ فرما دیتے کہ ان مسائل سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے اور انسان کو ایسے غیر متعلق قسم کے سوالات نہیں کرنا چاہئیں۔

۔ انتظار وحی نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ستاروں کے نام کتب سابقہ میں موجود بھی ہوں تو میں نے ان کتب سے نہیں لیا ہے بلکہ اس مرکز سے حاصل کیا ہے جہاں سے یہ کتابیں نازل ہوئی ہیں۔

- واقعۂ جناب یوسفؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ "ستارہ" منصب دار نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کا کام منصب دار کے سامنے خضوع و خشوع کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔
- اسی قصہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جن کو قرآن مجید نے کواکب قرار دیا ہے یعنی برادران یوسف ۔ وہ ایک خدائی منصب دار کے قاتل بھی ہو سکتے ہیں۔
- اسی واقعہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ستارہ ہونا انسان کو حسد سے نہیں بچا سکتا ہے بلکہ ستارے حسد بھی کر سکتے ہیں۔ نبی خدا کو گمراہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ خدائی منصب دار کو اذیت بھی دے سکتے ہیں۔
- برادران یوسف بظاہر بھائی تھے اور چھوٹے بھائی کو دل بہلانے کے لئے لے گئے تھے لیکن واقعاً قصد کچھ اور تھا۔ مرزا غالبؔ نے سچ کہا ہے:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ۔۔۔ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

- جب خدائی کواکب کا کوئی اعتبار نہیں ہے تو نبوتی نجوم کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔

زمزم

وہ تاریخی کنواں جو خانۂ کعبہ کے نزدیک پایا جاتا ہے اور جس کا تاریخی تعلق حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ سے ہے کہ جب جناب ابراہیمؑ پہلی مرتبہ خانۂ خدا کے قریب آئے اور جناب اسماعیلؑ وہاجرہ کو چھوڑ کر چلے گئے تو اگلے سال ان کی آمد پر جناب اسماعیلؑ نے پانی کی قلت کی شکایت کی۔ تو جناب ابراہیمؑ نے اس کنویں کا انتظام کیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے جبرئیل امین نے کنواں کھود کر زمین سے پانی نکال دیا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اس کے اطراف آپ زمین کھود دیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کے رقبہ کو وسیع کر دیا اور باقاعدہ کنواں تیار ہو گیا۔

اس کے بعد جب قبیلہ خزاعہ قبیلہ جرہم پر غالب آگیا تو اس نے انتقام لینے کے لئے کنویں کو بند کر کے بالکل پاٹ دیا اور خانۂ کعبہ کے ہرن اور تلواریں سب اسی میں پھینک دیں۔ ایک مدت تک یہ صورت حال برقرار رہی اور قوم آب زمزم سے محروم رہی۔ یہانتک کہ جب قصیٰ نے خزاعہ پر غلبہ حاصل کیا تو بہت تلاش کیا لیکن اس کی جگہ نہ مل سکی اور صورت حال یوں ہی قائم رہی۔ اس کے بعد عبدالمطلبؑ نے اپنے دور میں خواب دیکھا کہ فلاں مقام پر زمین کھود دو ۔ چشمۂ زمزم برآمد ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے فرزند حارث کی معاونت سے زمین کو کھودنا شروع کیا اور بالآخر زمزم کو دوبارہ پیدا کر لیا۔ ہر طرف صدائے تکبیر بلند ہو گئی اور قریش نے کہا کہ یہ ہمارا آبائی ترکہ ہے اس میں ہمارا حصہ بھی ہوگا۔ جناب عبدالمطلبؑ نے فرمایا کہ تم نے کھدائی میں حصہ نہیں لیا ہے لہٰذا تمھارا حق نہیں ہے۔ اختلاف بڑھ گیا اور طے ہوا کہ بنی سعد کے کاہن سے فیصلہ کرایا جائے۔ چنانچہ فریقین روانہ ہوئے اور راستہ میں پانی ختم ہو گیا اور ہلاکت کی نوبت آگئی تو جناب عبدالمطلب کے قدموں کے پاس ایک چشمہ جاری ہو گیا اور قریش نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا کہ یہ قدرتی فیصلہ ہے کہ پانی صرف عبدالمطلب اور ان کی اولاد کا حصہ ہے۔ (معجم البلدان)

تفسیر درِ منثور میں سرکار دو عالمؐ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا گیا ہے کہ آب زمزم جس مقصد کے لئے بھی پی لیا جائے گا اسی مقصد میں کام آئے گا۔ بھوکا پیئے گا تو سیر ہو جائے گا۔ پیاسا پیئے گا سیراب ہو جائے گا۔ بیمار پیئے گا شفایاب ہو جائے گا۔ حاجت مند پیئے گا حاجت پوری ہو جائے گی۔

جلال الدین سیوطی کے بارے میں یہانتک نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے حج کے موقع پر آب زمزم اس نیت سے پیا تھا کہ علم حدیث میں حافظ ابن حجر جیسے اور علم فقہ میں شیخ سراج الدین بلقینی جیسے ہو جائیں۔

چشمۂ زمزم کو خصال صدوقؒ میں گیارہ ناموں سے یاد کیا گیا ہے:

رکضۃ جبرئیل۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ چشمہ کو کنواں بنانے میں سب سے پہلے جبرئیل امینؑ نے زمین کھودی تھی۔

حفیرۃ اسماعیل۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ چشمہ کے جاری کرنے میں جناب اسماعیلؑ کا دخل ہے۔

حفیرۃ عبدالمطلب۔ بنی خزاعہ کے چشمہ زمزم کو پاٹ دینے کے بعد دوبارہ کھودنے کا عمل جناب عبدالمطلب نے انجام دیا ہے۔

زمزم۔ مرکب اعتبار سے زمزم کے معنی کثیر کے ہیں یعنی اس کا پانی تاقیامت ختم ہونے والا نہیں ہے۔

برہ۔ یہ تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔

مضمونہ۔ اس کے وجود کی بھی ضمانت ہے اور اس کے ذریعہ بھی ضمانت حاصل کیجا سکتی ہے۔

رواء۔ یہ لوگوں کے سیراب کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

شبعہ۔ یہ بھوکے کو سیراب بھی کر سکتا ہے۔

طعام۔ یہ غذائی حیثیت کا بھی مالک ہے۔

مطعم۔ یہ لوگوں کو شکم سیر بنا دیتا ہے۔

شفاء سقم۔ یہ ہر مرض کی دوا بھی ہے۔

آب زمزم کا پینا مستحبات میں ہے اور اس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

اصنام عرب

انسانی تاریخ میں بُت پرستی کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔ انبیاء کرام کا مقابلہ ہر دور میں اسی رجحان اور نظریہ سے رہا ہے۔ جناب نوحؑ کی ۹½ سو سال کی محنت اسی مہمل نظریہ سے نجات دلانے پر صرف ہوئی تھی۔ جناب ابراہیمؑ نے اس سلسلہ کو تمام کرنے کیلئے بُت شکنی کا فرض انجام دیا تھا۔ جناب موسیٰؑ کو اسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا تھا جب ان کی قوم نے گوسالہ کو خدا ماننا شروع کر دیا تھا اور جناب عیسیٰؑ کے سامنے یہی مصیبت عظمیٰ تھی۔

سرکار دو عالمؐ کی تبلیغ کا آغاز بھی اسی مرحلہ جہاد سے ہوا تھا جہاں سارا جزیرۃ العرب بُت پرستی میں غرق تھا اور سرکارؐ عالم انسانیت کو اس بلا سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں لا الٰہ الا اللہ کی آواز کا بلند کرنا کس قدر مشکل کام تھا اس کا اندازہ ہر شخص کو نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی اور اس راہ میں ہر طرح کی مصیبت کا سامنا کر لیا۔ کانٹوں پر چلنا پڑا۔ پتھر کھانا پڑے۔ گالیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سر پر کوڑا پھینکا گیا اور نہ جانے کس کس طرح کی روحانی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس کے باوجود آپ اپنے فرض منصبی کو ادا کرتے رہے۔ یہانتک کہ ایک دن مکہ کو فتح کر کے خانۂ خدا سے بُت پرستی کا خاتمہ کر دیا اور اپنے دوش اقدس پر علیؑ کو بلند کر کے طاق کعبہ سے سارے بُت اُتار کر پھینک دئے اور اللہ کا گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کثافت سے پاک ہو گیا۔

اسلام نے بُت پرستی کے خلاف اس قدر شدید اقدام اس لئے کیا کہ بُت پرستی ہر اعتبار سے ایک حقارت آمیز نظریہ اور ذلت آمیز عمل ہے۔

● ۔ بُت پرستی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا رشتہ مالک حقیقی سے ٹوٹ گیا ہے اور وہ خودساختہ تصویروں سے دل بہلا رہا ہے۔

● ۔ بُت پرستی کا مطلب یہ ہے کہ انسان ذہنی طور پر اس قدر مفلوج ہو گیا ہے کہ خالق اور مخلوق کے فرق سے بھی آشنا نہیں رہ گیا ہے۔

● ۔ بُت پرستی حلول کے معنی میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس فہم سے بھی محروم ہو گیا ہے کہ کائنات کا خالق ایک پتھر میں حلول نہیں کر سکتا ہے اور اگر بُتوں کی خدائی کے معنی میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس قدر جاہل ہو گیا ہے کہ کائنات ہی کے ایک ذرہ کو اس کا خالق تصوّر کر رہا ہے۔

● ۔ بُت پرستی انسانیت کے لئے ذلّت کا سبب ہے کہ اشرف المخلوقات اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے جو ہمیشہ اس کی ٹھوکروں میں رہتا ہے۔

● ۔ بُت پرستی فکر کی پستی۔ شعور کی بربادی۔ ضمیر کی موت اور انسانیت کی تباہی ہے لہٰذا اسلام اس لعنت کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

بُت پرستی کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس نے انسان کو اس فکر سے بھی محروم کر دیا ہے کہ خدا بندوں کا خالق ہوتا ہے۔ بندوں کا مخلوق نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنی کائنات کو خود بناتا ہے کائنات اس کی صنعت گری کا فرض انجام نہیں دیتی ہے۔

انسانی زندگی سے بُت پرستی کو الگ کر کے اسے خدائے وحدہٗ لاشریک کے سامنے جُھکا دیا جائے تو اس میں ایک عالمی وحدت اور اکائی پیدا ہو سکتی ہے لیکن اسے خدا ساز قرار دیدیا جائے تو کبھی ایک خدا پر اتفاق نہیں ہو سکتا ہے اور ہر شخص الگ فنکاری کا مظاہرہ کرے گا اور ہر قبیلہ الگ خدا بنائے گا۔ چنانچہ عربستان کی یہی صورت حال تھی جس سے اسلام مقابلہ کر رہا تھا۔

یوں تو عربستان بلکہ خود خانۂ خدا میں چھوٹے بڑے سیکڑوں خداؤں کا وجود پایا جاتا تھا لیکن خصوصیت کے ساتھ دس بُت تھے جو ساری عرب ذہنیت پر حکومت کر رہے تھے۔

وُدّ ۔ قبیلہ کلب کا بُت تھا جس کی غلامی کا شرف اس عمرو کے باپ کو حاصل تھا جو

جنگ خندق میں اسلام کے مقابلہ میں کل کفر بن کر آیا تھا اور جس کا خاتمہ کل ایمان حضرت علیؑ نے کیا تھا۔

سُواع ۔ یہ بنی ہذیل کا بُت تھا۔

یَغُوث ۔ یہ بنی مذحج کا بُت تھا۔

یَعُوق ۔ یہ قبیلہ ہمدان کا بُت تھا۔

نسر ۔ یہ بنی الکلاع کا بُت تھا۔

لات ۔ یہ طائف میں بنی ثقیف کا بُت تھا۔

منات ۔ یہ یثرب میں خزرج کا بُت تھا۔

عُزّیٰ ۔ یہ اطراف مکہ میں بنی کنانہ کا بُت تھا اور اسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ مشرکین مکہ میدان جنگ میں اسی کے نام سے رجز پڑھا کرتے تھے کہ ہم "بنو العُزّیٰ" ہیں اور تمھارے پاس کوئی عُزّیٰ نہیں ہے جس کا جواب سرکار دو عالمؐ نے یہ دیا تھا کہ ہمارے پاس اللہ ہے جو ربّ العزّت ہے۔

اساف ونائلہ ۔ یہ دونوں بُت صفا و مروہ پر رکھے گئے تھے اور اس طرح جناب ابراہیمؑ کی ساری ریاضت کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا لیکن فتح مکہ میں سب کا صفایا ہو گیا۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

جنگِ بدر

کفّار مکہ کے مظالم کی بنا پر حکم پروردگار سے سرکار دو عالمؐ کو ہجرت کرنا پڑی تو کفّار نے مسلمانوں کے تمام اموال پر قبضہ کر لیا اور جب ابوسفیان کے قافلہ تجارت کا وقت آیا تو سارا مالِ مسلمین قافلہ میں شامل کر دیا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

ابوسفیان قافلۂ تجارت کو لے کر چلا گیا اور جب واپس آنے لگا تو اس نے سوچا کہ ایک مرتبہ مسلمانوں کو مدینہ میں بھی اپنی طاقت کا احساس دلا دیا جائے۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ کفار مسلمانوں کو وطن سے نکال چکے ہیں اور ان کے اموال پر قبضہ کر چکے ہیں لہٰذا اب کسی قیمت سے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے تیار نہ ہوں گے اور بلاوجہ اپنے کو مصیبت میں نہ ڈالیں گے۔ لہٰذا اس نے ایک نیا ڈھونگ رچایا کہ ایک مقام پر قافلۂ تجارت کو روک کر مکہ میں یہ خبر بھیجدی کہ مسلمان تمہارے مالِ تجارت کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ اپنے مال کو بچانا ہے تو جلدی پیشقدمی کرو۔ ابوسفیان کا نمائندہ باحال پریشان مکہ میں وارد ہوا اور اس نے یہ وحشت ناک خبر سنائی کہ مسلمان مالِ تجارت کو لوٹنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کفار کی نگاہ میں مالِ دنیا سے زیادہ قیمتی کیا شے ہو سکتی ہے اور پھر انھیں مسلمانوں کے ہجرت کر جانے کے بعد طاقت کا غرور بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک لشکر جرار ۹۵۰ افراد کا روانہ ہو گیا جس میں قریش کے تمام تر رؤسا شامل تھے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان مالِ تجارت کو نہیں لوٹنا چاہتے تھے بلکہ ابوسفیان نے یہ ایک ڈھونگ رچایا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ابوسفیان کے مالِ تجارت بچا کر نکل جانے کے بعد بھی کفّار کا اصرار جنگ باقی رہا۔

سرکار دو عالمؐ نے ابوسفیان کے اس ڈھونگ کو دیکھ کر مقابلہ کا فیصلہ کر لیا — اگرچہ

لشکرِ اسلام میں انتہائی بے سروسامانی تھی لیکن دفاع بہرحال ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ کفّار مکہ کی طرح مدینہ پر بھی قبضہ کر لیں اور مسلمانوں کے لئے کوئی ٹھکانا نہ رہ جائے۔

حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے مالِ تجارت لوٹنے کا کوئی حکم نہ دیا تھا اور نہ آپ کا مقصد اموال کفار پر قبضہ کرنا تھا۔ اگرچہ یہ آپ کا حق تھا اس لئے کہ کفّار نے مسلمانوں کے اموال پر قبضہ کر لیا تھا لیکن آپ ایسا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے دین و مذہب کی بدنامی کا اندیشہ ہو — لیکن جب ابوسفیان نے سازشی پروگرام بنا لیا تو آپ پر اس کا جواب دینا واجب ہو گیا اور آپ نے پیشقدمی کا حکم دے دیا۔

— ابوسفیان کے قافلہ تجارت سمیت نکل جانے کے بعد ابوجہل نے بدر میں جشن کا اہتمام کیا تاکہ مسلمانوں پر رعب قائم ہو جائے۔ مسلمانوں نے ایک حوض کے قریب پڑاؤ ڈالا۔

— بدر کے قریب پہونچ کر مسلمانوں میں قدرے اختلاف پیدا ہو گیا۔ حضرت عمر نے کفار کی طاقت کا تذکرہ شروع کر دیا۔ سعد بن معاذ نے کہا کہ ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ایمان کی طاقت اسلحہ کی طاقت سے بڑی ہے۔ اُدھر ابوجہل نے عمیر بن وہب کو روانہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ کرے۔ چنانچہ اس نے حالات کا جائزہ لے کر اس طرح رپورٹ دی کہ:

"مسلمانوں کا اعتماد ان کی تلواروں پر ہے اور وہ دشمن کو قتل کئے بغیر واپس نہیں جا سکتے ہیں۔ ان کا ہل کھانا دلیل ہے کہ وہ بھاگنے والے نہیں ہیں"۔

ابوجہل نے عمیر کو بزدل قرار دے کر جنگ کا فیصلہ صادر کر دیا۔

— ابولہب اس معرکہ میں شریک نہیں ہوا اس لئے کہ جناب عاتکہ بنت عبدالمطلب نے ایک خواب کا تذکرہ کر کے کفار کو تباہی سے آگاہ کر دیا تھا اور ابولہب کو ان کے خواب پر اعتماد تھا۔

— اسود بن عبدالاسد نے یہ عہد کیا کہ جس حوض کے قریب مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا ہے اس سے پانی پئے گا یا اُسے تباہ کر دے گا اور اس ارادہ سے چلا لیکن جناب حمزہ نے اس کے پیر قطع کر دئے۔ وہ گھسٹتا ہوا آگے بڑھا تو اس کا کام تمام کر دیا تاکہ مسلمان پیاس کی شدت کا سامنا نہ کریں۔

— جنگ کی تیاری کے بارے میں ابن ہشام اور طبری نے لکھا ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے

ایک عریش بنوالیا تھا اور اسی پر تشریف فرما تھے تاکہ دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رہیں اور ضرورت پڑے تو فرار کر جائیں۔ لیکن یہ کھلی ہوئی توہین رسالت یا تائید صحابیت ہے ورنہ سرکار دو عالمؐ کے بارے میں فرار کا تصور بھی جرم ہے۔ عریش کی بنیاد یہ ہے کہ بلند مقام سے جنگ کے حالات کی نگرانی کی جاسکتی ہے اور مجاہدین کو صالح ترین ہدایت دی جاسکتی ہے۔

— جنگ کا آغاز اس انداز سے ہوا کہ لشکر کفار سے تین سربراہ عتبہ، شیبہ اور ولید برآمد ہوئے اور لشکر اسلام سے تین انصار میدان میں آئے۔ قریش انصار کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے لہٰذا ان سے مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا تو عبیدہ بن الحارث جناب حمزہ اور حضرت علیؑ برآمد ہوئے اور مقابلہ شروع ہوگیا۔ عبیدہ کا مقابلہ عتبہ سے تھا۔ ولید حضرت علیؑ کے مقابل تھا اور شیبہ بن ربیعہ جناب حمزہ کے مقابلہ پر تھا۔

جناب حمزہ اور حضرت علیؑ نے اپنے مقابل کا خاتمہ ایک ایک ضرب میں کر دیا۔ لیکن عبیدہ ایسا نہ کر سکے تو حضرت علیؑ نے ان کی مدد کی اور عتبہ کا کام تمام کر دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ پہلے کمک کے لئے جناب حمزہ آئے اور دونوں میں تا دیر مقابلہ جاری رہا۔ اتفاق سے دونوں طویل القامہ تھے تو حضرت علیؑ نے آواز دی کہ چچا ذرا سر کو جھکائیے، جناب حمزہ نے سر جھکایا اور عتبہ زد پر آگیا تو حضرت علیؑ نے ایک ضرب میں اس کا خاتمہ کر دیا۔

بدر سے مکہ واپسی پر کفار سخت مایوسی کا شکار تھے۔ ان کے تمام سربراہ کام آچکے تھے اور اسلحہ و عدد کے باوجود شکست کھا چکے تھے۔ اس لئے عمیر بن وہب نے صفوان بن امیہ سے کہا کہ اگر کوئی شخص میرے قرض کی ادائیگی اور میرے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری لے لے تو میں مدینہ جا کر محمدؐ کا خاتمہ کر سکتا ہوں۔

صفوان نے یہ ذمہ داری لے لی اور وہ روانہ ہوگیا۔ مسجد پیغمبرؐ میں تلوار لے کر داخل ہوا تو حضرت عمر نے پکڑ لیا اور حضرتؐ کے پاس لے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ تو تلوار لے کر کیوں آیا ہے؟ — اس نے کہا کہ میں اپنے اسیروں کی رہائی چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ صفوان سے کیا معاہدہ طے ہوا ہے؟ — وہ گھبرا گیا اور حضرت کے علم غیب کو دیکھ کر ایمان لے آیا۔ آپ نے قرآن مجید کے بعض احکام کی تعلیم دے کر اسے واپس کر دیا اور وہ مکہ میں مبلغ اسلام ہوگیا اور

اس طرح اسلام بزور شمشیر پھیلنے کے بجائے بزور علم آگے بڑھ گیا۔

— ابو رافع کا بیان ہے کہ بدر سے واپسی پر ابولہب نے حارث سے پوچھا کہ جنگ کا انجام کیا ہوا؟ — اس نے کہا کہ ہم ہار گئے۔ اس لئے کہ مقابلہ انسانوں سے نہیں تھا، ساری فضا میں لشکر ہی لشکر نظر آرہے تھے۔ ابو رافع نے برجستہ کہہ دیا کہ وہ ملائکہ تھے۔ ابولہب یہ سن کر جل گیا اور اس نے ابو رافع کو زمین پر پٹک دیا۔ ام الفضل نے یہ منظر دیکھ لیا اور ایک عمود ابولہب کے سر پر دے مارا جس کے نتیجہ میں وہ ایک ہفتہ کے اندر واصل جہنم ہوگیا۔ بعض روایات کی بنا پر وہ طاعون میں مبتلا ہو کر راہی جہنم ہوا۔

(ابو رافع عباس ابن عبدالمطلب کے غلام تھے اور ام الفضل ان کی زوجہ تھیں۔ ابو رافع کا کام زمزم کے قریب تیر سازی وغیرہ کا تھا اور یہ گفتگو اسی مقام پر ہو رہی تھی)

جنگ کے خاتمہ کے بعد سرکار دو عالمؐ نے عبداللہ بن رواحہ اور زید بن حارثہ کو مدینہ بھیجا کہ وہاں جا کر مسلمانوں کو فتح کی خبر سنا دیں۔ زید پیغمبرؐ کے ناقہ قصواء پر سوار تھے، منافقین نے ناقہ کو دیکھا تو آواز بلند کر دی کہ محمدؐ مارے گئے ہیں اور ان کا ناقہ واپس آیا ہے۔ اسامہ بن زید نے فوراً باپ سے صورت حال کی تحقیق کی اور مدینہ میں اعلان کر دیا کہ سرکار واپس تشریف لا رہے ہیں اور اس کے بعد حضورؐ آگئے تو سارے مدینہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور فضا تکبیر کے نعروں سے گونجنے لگی۔

— بدر میں ستّر مشرکین مارے گئے اور ستّر قیدی بنائے گئے۔ قیدیوں کے ساتھ آپ نے حکم الٰہی کے مطابق تین طرح کے برتاؤ کئے۔ بعض کو قتل کر دیا۔ بعض کو فدیہ لیکر آزاد کر دیا اور بعض کو صرف کمزور مسلمانوں کو تعلیم کتابت و قرات پر مامور کر کے آزاد کر دیا۔ فدیہ کی مقدار دو ہزار درہم سے چار ہزار درہم تک تھی۔

— اسیروں کے درمیان پیغمبرؐ کی پروردہ بیٹی زینب کا شوہر ابوالعاص بھی تھا۔ زینب نے اس کی رہائی کے لئے بطور فدیہ وہ گلوبند بھیج دیا جو جناب خدیجہ نے دیا تھا۔ حضرت نے فدیہ لے کر ابوالعاص کو آزاد کر دیا اور مسلمانوں سے خواہش کی کہ زینب کا گلوبند واپس کر دیا جائے اس لئے کہ یہ خدیجہ کی یادگار ہے اور خدیجہ کا عالم اسلام پر احسان ہے۔ مسلمانوں

نے اس خواہش کا احترام کیا اور گلوبند کو واپس کر دیا۔ جس کے بعد حضورؐ نے زینب کو ابوالعاص سے الگ کر دیا کہ مسلمان عورت کافر کی زوجیت میں نہیں رہ سکتی ہے۔

(سیرت المصطفےٰ ہاشم معروف الحسنی)

(افسوس کہ زینب کے گلوبند کا اس قدر احترام کیا گیا اور جناب فاطمہؑ کے فدک کا کوئی احترام نہ کیا گیا۔ زینب کی زوجیت کا خاتمہ ایمان ابوطالب کی بہترین دلیل ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے جناب فاطمہؑ بنت اسد کی زوجیت کے خاتمہ کے بارے میں کوئی اقدام نہیں کیا۔

— بدر کے فوراً بعد یہ اطلاع ملی کہ بنی سلیم نے حملہ کی تیاری کر لی ہے۔ آپ نے جوابی کارروائی کا ارادہ کر لیا اور حضرت علیؑ کو علمبردار قرار دے کر میدان کا رُخ فرما لیا۔ مقام عین الکدر پر تین دن قیام کیا اور دشمن نے خوف زدہ ہو کر فرار اختیار کر لیا جس کے بعد آپ بہ سلامتی واپس آ گئے۔ یہ واقعہ ماہ مبارک کی ۲۴ تاریخ کا ہے۔

— اس کے بعد نصف شوال کو یہود بنی قینقاع نے معاہدہ توڑ کر حملہ کا ارادہ کر لیا تو آپ نے حمزہ اور علیؑ کو ساتھ لے کر ان کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ دن محاصرہ جاری رہا اور آخر میں ان لوگوں نے شکست تسلیم کر لی اور سارا مال دے کر شام کی طرف کوچ کر گئے۔

— نصف محرم کو یہ اطلاع ملی کہ بنی سلیم اور غطفان نے قرقرۃ الکدر پر اجتماع کر لیا ہے اور اب حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ نے دو سو افراد کو لے کر مقابلہ کا ارادہ کیا۔ حضرت علیؑ کو علمبردار لشکر بنایا اور آگے بڑھنا تھا کہ وہ لوگ خوف زدہ ہو کر فرار کر گئے۔ پانچ سو اونٹ آپ کے قبضہ میں آئے جس کا خمس نکال کر آپ نے باقی مال مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔

جنگِ اُحد

— جنگ بدر میں شکست فاش اور کفار کے سربراہوں کے قتل کے بعد جذبۂ انتقام کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ اس پر مزید یہ اہتمام کیا گیا کہ مقتولین پر گریہ نہ کیا جائے تاکہ جوش انتقام کم نہ ہونے پائے اور ہر شخص کو اس امر کا احساس رہے کہ سارا میدان بدر ہی نہیں ہے بلکہ زندگی میں بہت سے میدان باقی ہیں جہاں بدر کی شکست کا بدلہ لیا جا سکتا ہے۔

— لشکر کی تیاری کا کام عمرو عاص کے حوالے کیا گیا اور اس نے اپنی شاطرانہ چالوں سے مختلف قبائل کو بھی ہموار کر لیا اور قریش کے ساتھ بنی کنانہ و تہامہ بھی شامل ہو گئے اور اس طرح تین ہزار سوار، سات سو زرہ پوش اور کثیر تعداد میں پیدل افراد کی فوج تیار ہو گئی۔ اس قافلہ میں عورتیں بھی شامل کی گئیں اور ان کا مصرف یہ قرار دیا گیا کہ گانے بجانے کے ذریعہ سپاہیوں کے حوصلے بڑھائیں گی اور اس کے بعد غلاموں کو بھی ساتھ لیا گیا جن میں سے نمایاں نام وحشی کا ہے جو مطعم بن جبیر کا غلام تھا اور جس نے ہندہ کے اشارہ پر جناب حمزہ کی لاش سے بے ادبی کی تھی۔

— لشکر کفر کی تیاری میں ایک بڑا رول کعب بن اشرف کا تھا۔ یہ اپنے وقت کا نامی شاعر تھا اور اس کی ماں بنی نضیر کی یہودیہ تھی لہٰذا اس نے مسلمانوں کی عورتوں کی ہجو شروع کر دی اور کفار کو انتقام بدر پر آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ سرکار دو عالمؐ نے محمد بن مسلمہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس فتنہ کو فرو کیا جائے۔ محمد بن مسلمہ نے نہایت ہی ہوشیاری سے اس کے رضاعی بھائی ابونائلہ کو ملا لیا۔ ابونائلہ نے کعب کے پاس جا کر مسلمانوں کی بُرائی شروع کر دی اور جب اسے مطمئن کر لیا تو کہا کہ ہمارے ساتھ ہمارے ہم خیال بہت سے افراد ہیں لیکن بھوک سے پریشان ہیں آپ نے انھیں بطور قرض غلہ دے دیں تو وہ محمدؐ کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں رکھنے کیلئے

تیار ہیں۔

کعب نے پوچھا کہ وہ رہن کیا ہوگا۔؟

ابونائلہ نے کہا ہمارے اسلحے۔

کعب مطمئن ہوگیا اور ایک دن ابونائلہ اس کے پاس رات کے وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہونچا اور اسے قلعہ سے باہر نکالنا چاہا۔ اس کی تازہ شادی ہوئی تھی۔ زوجہ نے بہت روکا لیکن اس نے کہا میں وعدہ کر چکا ہوں۔ چنانچہ قلعہ سے باہر نکل آیا اور دونوں باتیں کرتے کرتے دور نکل گئے۔ اس دوران ابونائلہ بار بار اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کو پھیر کر سونگھتا تھا کہ بہترین خوشبو ہے۔ یہانتک کہ جب مقررہ مقام پر پہونچ گئے تو ابونائلہ نے حسب دستور اس کے سر کو جھکا کر سونگھنا چاہا اور گردن پکڑ کر ساتھیوں کو آواز دی۔ محمد بن مسلمہ کے سپاہی نکل آئے اور کعب کا خاتمہ ہوگیا۔ واپس آکر لوگوں نے بقیع میں تکبیر کہی۔ سرکار دوعالمؐ نے آواز سُنی تو فرطِ مسرت سے صدائے تکبیر بلند کی کہ الحمد للہ ایک فتنہ فرو ہوگیا۔

— عباس بن عبدالمطلب اگرچہ اسلام لاچکے تھے لیکن مصلحتاً کفار قریش کے ساتھ تھے۔ جب عمروعاص نے لشکر تیار کرلیا تو انھوں نے پوری رپورٹ ایک مرد غفاری کے ہاتھوں مدینہ روانہ کی اور یہ شرط کی کہ تین دن کے اندر مدینہ پہونچ جائے تاکہ لشکر کفار سے پہلے رسول اکرمؐ کو اطلاع ہوجائے۔ وہ شخص پہونچا تو حضور مدینہ کے باہر تھے۔ اس نے خط دیا۔ آپ نے پڑھا اور پھر مدینہ کے اندر آکر مضمون سے اصحاب کو باخبر کیا کہ چار ہزار کا لشکر مکہ سے نکل چکا ہے۔

— کفار کے لشکر نے پہلے مقام ابوار میں قیام کیا جہاں رسول اکرمؐ کی والدہ جناب آمنہ کی قبر تھی اور ابوسفیان کی زوجہ ہندہ نے چاہا کہ ان کی قبر کھود کر بے ادبی کرے کہ لشکر کے سمجھدار افراد نے روک دیا کہ اس طرح مسلمان ہماری عورتوں کی قبریں کھود ڈالیں گے۔

— کفار کے لشکر نے بیرون مدینہ پر پڑاؤ ڈالا۔ سرکار دوعالمؐ نے فضالہ کے دو فرزند انس اور مونس کو حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ انھوں نے آکر خبر دی کہ لشکر مدینہ کے قریب آگیا ہے اور اس کے جانور مدینہ کی چراگاہ میں چر رہے ہیں۔ یہ واقعہ جمعرات کی شام ۵ شوال ۳ھ کا ہے۔

اُدھر رسول اکرمؐ نے بحکم پروردگار مسلمانوں سے مشورہ کیا کہ جنگ کا طریقہ کیا ہوگا۔؟ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول نے کہا کہ ہم لوگ گھر کے اندر بیٹھ جائیں تاکہ دشمن علاقہ کے اندر آجائے اور ہم مرد و عورت سب مل کر مقابلہ کریں۔ لیکن بعض سپاہیوں نے جناب حمزہ کی قیادت میں اس کی شدید مخالفت کی کہ آبادی کے اندر دشمن کا داخلہ ذلّت کو دعوت دینا ہے اور ہم ذلّت برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔

— رسول اکرمؐ کے ایک باوفا صحابی ابوسعد خیثمہ بن خیثمہ تھے۔ انھوں نے جنگ بدر میں شرکت کرنا چاہی لیکن بیٹے نے اصرار کیا کہ میں جاؤں گا اور بالآخر قرعہ اندازی ہوئی جس میں بیٹے کا نام نکل آیا اور وہ میدانِ بدر میں شہید ہوگیا۔ خیثمہ نے اس مجمع میں ایک فصیح و بلیغ تقریر کی اور کہا کہ کس قدر شرم کی بات ہے کہ کفار سیکڑوں میل سے یہاں تک آگئے ہیں اور ہم گھر سے باہر نہیں نکل سکتے ہیں۔

یارسول اللہؐ! میں بدر کی شہادت سے محروم رہ گیا تو اب محروم نہیں رہ سکتا۔ رات میں نے اپنے فرزند کو جنت میں بہترین حالت میں دیکھا اور وہ مجھے بھی رفاقت کی دعوت دے رہا تھا لہذا آج جہاد ضروری ہے۔ حضورؐ نے اطمینان دلایا کہ تم شرف شہادت سے محروم نہ رہوگے۔

— مشاورت کے خاتمہ کے بعد حضور بیت الشرف کے اندر گئے اور زرہ پہن کر تلوار لے کر برآمد ہوگئے۔ جنگ کا مشورہ دینے والوں نے خیال کیا کہ شائد حضور ناراض ہیں عرض کی کہ اختیار سرکارؐ کے ہاتھ ہے۔ ہم نے تو صرف رائے دی ہے۔ فرمایا نہیں، نبیؐ زرہ پہن لیتا ہے تو اُتارتا نہیں۔ اب جنگ مدینہ سے باہر ہی ہوگی اور اس طرح منافقین اپنی سازش میں کامیاب نہ ہوسکے اور جنگ مدینہ کے باہر طے ہوگئی۔

— عبداللہ بن اُبی نے یہودیوں سے سازباز کر رکھی تھی۔ اس نے تین سو سپاہی ساتھ لئے تاکہ بروقت کفار کی مدد کرسکے یا راستہ سے فرار کرکے مسلمانوں کے حوصلے پست کرسکے۔ لیکن سرکار دوعالمؐ نے یہ کہہ کر سب کو واپس کردیا کہ ہم شرک کے مقابلہ میں شرک سے مدد نہیں لے سکتے ہیں۔

۔ میدان احد میں حضورؐ نے اس طرح لشکر کو منظم کیا کہ سب سے خطرناک درّہ کوہ پر عبداللہ بن جُبیر کی سرکردگی میں ٥٠ تیر اندازوں کو معین کردیا اور یہ وضاحت کردی کہ جنگ میں فتح ہو یا شکست یہ لوگ اپنی جگہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے بعد ایک مفصّل تقریر کے ذریعہ سپاہیوں کے حوصلے بلند کئے اور انھیں صبر و ثبات کی تلقین فرمائی۔

اس کے بعد اپنی تلوار کے بارے میں فرمایا کہ اس کا حق کون ادا کرے گا؟ زبیر بن عوام نے مطالبہ کیا۔ آپ نے انکار کردیا۔ اس کے بعد ابودُجانہ نے طلب کیا اور آپ نے انھیں دیدیا۔ جس استحقاق کا راز یہ کُھلا کہ ایک شخص مقابلہ پر آیا اور جب ابودُجانہ نے حملہ کیا تو انکشاف ہوا کہ عورت ہے۔ انھوں نے تلوار کو روک لیا کہ رسول اکرمؐ کی تلوار عورت پر نہیں چل سکتی ہے۔

اس موقع پر تلوار پاکر ابودُجانہ بڑے فخر کے ساتھ چلے تو لوگوں نے اعتراض کردیا کہ غرور خدا کو پسند نہیں ہے۔ سرکارؐ نے فرمایا بے شک یہ انداز رفتار خدا کو پسند نہیں ہے لیکن آج دشمن کے مقابلہ میں یہی انداز پسند ہے۔ (سیرۃ نبویہ ۲/٦٦-٦٧)

۔ ابوسفیان نے لشکر کفار کو یوں منظم کیا کہ میمنہ پر خالد بن ولید کو رکھا اور میسرہ پر عکرمہ بن ابی جہل کو۔ پرچم لشکر بنی عبدالدار کو دیا اور یہ ہدایت دی کہ یہ لشکر کی کل عزت ہے۔ سرکار دو عالمؐ نے بھی ابتدا میں پرچم اسلام کو اسی قبیلہ کے ایک مسلمان سپاہی مصعب بن عمیر کو دیا۔ لیکن جب ان کی شہادت ہوگئی تو لوا بھی حضرت علیؑ کو دے دیا جس طرح کہ مرکزی پرچم رایت روز اول سے ان کے پاس رہا کرتا تھا۔ (ارشاد مفید ص ۴۳)

ابن عباس کا بیان ہے کہ لشکر اسلام کا پرچم ہر جنگ میں حضرت علیؑ کے پاس رہا کرتا تھا اور یہ ان کے امتیازات میں شامل تھا۔ (تاریخ ابن عساکر ۱/۱۴۲)

قتادہ نے بھی اس امر کو حضرت علیؑ کے امتیازات میں شمار کیا ہے۔ (تاریخ ابن عساکر ۱/۱۴۲)

۔ بنی عبدالدار کا پہلا علمدار طلحہ بن طلحہ عبدری تھا۔ حضرت علیؑ نے اس کا کام تمام کردیا تو دوسرے شخص نے پرچم سنبھالا اور اس طرح نو افراد علمدار بنتے رہے اور فی النار ہوتے رہے جسے حضرت علیؑ نے خلیفہ دوم کی مجلس شوریٰ میں اپنے امتیازات میں بیان فرمایا تھا۔ (خصال صدوق ص۵٦٠)

۔ جنگ کا آغاز ہوا۔ پرچم دار مارے گئے۔ فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ میدان فتح ہوگیا۔

مسلمانوں نے مال غنیمت جمع کرنا شروع کردیا۔ اُدھر درہ کے تیر اندازوں نے یہ منظر دیکھا تو منھ میں پانی آگیا اور پچاس میں سے چالیس افراد نے عبداللہ بن جُبیر سے بغاوت کردی اور درہ کو خالی کردیا۔ خالد بن ولید نے موقع غنیمت دیکھ کر دوبارہ حملہ کردیا اور باقیماندہ دس افراد کو تہ تیغ کر کے میدان پر قبضہ کرلیا اور مسلمانوں نے فرار کا راستہ اختیار کرلیا۔

۔ بعض مخلصینِ صحابہ نے فرار کا انکار کرنا چاہا ہے لیکن سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۳ کے ہوتے ہوئے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور اسی آیت سے تقدیس صحابہ کا طلسم چُور چُور ہوجاتا ہے۔

۔ سیرت ابن ہشام میں یہ واقعہ بھی ہے کہ عمر بن الخطاب اور طلحہ بن عبیداللہ مہاجرین وانصار کے ساتھ خاموش بیٹھے تھے اور قتل پیغمبرؐ کی آواز فضا میں گونج رہی تھی تو انس بن نضر نے کہا کہ تم لوگ خاموش کیوں بیٹھے ہو؟ تو انھوں نے کہا کہ رسول اللہؐ مارے گئے اب کیا کریں۔

انس نے کہا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو اب زندگی کا فائدہ کیا۔ اور یہ کہہ کر حملہ کردیا اور بالآخر شہید ہوگئے۔ بعض روایات کی بنا پر ان کے الفاظ یہ تھے کہ "محمدؐ مارے گئے ہیں تو ان کا پروردگار تو زندہ ہے۔ تم بھی اسی راہ میں مرجاؤ جس پر وہ شہید ہوئے ہیں اور یہ کہہ کر ان لوگوں کے عمل سے بیزاری کا اعلان کیا۔

انس بن نضر کے بھتیجے، انس بن مالک کا بیان ہے کہ ہم نے انس کے بدن میں ستّر زخم دیکھے ہیں اور ایسے زخم کہ لاش کی شناخت صرف انگلیوں سے ہوسکی۔ (سیرت نبویہ ۲/۸۳)

واقدی کا بیان ہے کہ احد کے موقع پر آٹھ آدمیوں نے مرجانے کی بیعت کی تھی۔ تین مہاجرین میں سے علیؑ، طلحہ، زبیر۔ اور پانچ انصار میں سے تھے اور یہی باقی رہے۔ باقی سب نے فرار کا راستہ اختیار کرلیا۔ (مغازی ۲/۲۴۰)

ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ میں محمد بن احمد علوی کے پاس موجود تھا اور ایک شخص مغازی واقدی پڑھ رہا تھا۔ جب اس موقع کا ذکر آیا کہ رسول اکرمؐ آواز دے رہے تھے کہ دونوں نے فرار اختیار کیا تو انھوں نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ دونوں کون تھے؟ میں نے کہا کوئی ہوں گے۔ فرمایا کہ اگر ان دو کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو واقدی

نام ضرور بیان کرتا۔

ــ نام کا ذکر نہ کرنا علامت ہے کہ بڑی شخصیتوں کا ذکر ہے۔ (شرح النہج ۱۵/۲۳،۲۴)

ــ واقدی نے یہ بات صراحتاً بیان کی ہے کہ عثمان بہرحال میدان میں ثابت قدم نہیں رہ گئے تھے۔ (مغازی ۱/۲۷۸)

ــ اگرچہ مورخین نے ثابت قدم رہنے والوں کی تعداد ۳۶ بتائی ہے لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ آخر میں صرف تین افراد رہ گئے تھے۔ حضرت علیؑ۔ ابو دُجانہ اور جناب حمزہ۔

ــ ابن ہشام نے (سیرت ۲/۱۲۷پر) نقل کیا ہے کہ کفار کے کل ۲۲ افراد قتل ہوئے جن میں سے ۱۲ حضرت علیؑ کی تلوار کے مارے ہوئے تھے اور اسی جنگ میں یہ آواز بلند ہوئی تھی" لافتیٰ الا علیؑ لا سیف الا ذوالفقار"۔ (سیرت ابن ہشام ۲/۱۰۰)

ــ ابو دُجانہ کا عالم یہ تھا کہ سب کے فرار کے بعد رسول اکرمؐ نے انھیں بھی اجازت دے دی لیکن وہ حضرت سے دفاع کرتے رہے یہاں تک زخموں سے چوُر ہو گئے۔ حضرت علیؑ اُٹھا کر رسول اکرمؐ کی خدمت میں لائے تو آنکھ کھول کر پوچھا کیا میں نے بیعت کا حق ادا کر دیا ہے ؟ ـ فرمایا بے شک !۔ (بحار الانوار ۲۰/۱۰۷)

ــ جناب حمزہ اسلام کے عظیم ترین سپاہی تھے۔ ابوسفیان کی زوجہ ہندہ نے اپنے خاندان والوں کا انتقام لینے کے لئے وحشی غلام جُبیر بن مطعم سے طے کیا کہ اگر بدر کا انتقام لیلے گا تو اسے خوش کر دے گی۔ اس نے کہا کہ محمدؐ پر میرا اختیار نہیں ہے۔ علیؑ بہت ہوشیاری سے جنگ کرتے ہیں۔ حمزہ غیظ و غضب میں آکر ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ انھیں قتل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ احد کے میدان میں ایک کمین گاہ سے چھپ کر حملہ کر دیا اور انھیں شہید کر دیا۔ جس کے بعد لاش کی بیحرمتی بھی کی گئی اور ہندہ نے کلیجہ بھی چبانے کا ارادہ کیا۔

ــ بعض مورخین نے وحشی کو دورِ ابوبکر میں مسیلمہ کذاب کے مقابلہ کا سپاہی بنا کر اس کے جُرم کو ہلکا بنانا چاہا ہے لیکن ابن ہشام نے صاف لکھا ہے کہ اس پر شراب کی حد برابر جاری ہوتی رہی۔ (سیرت نبویہ ۲/۷۲)

ــ مجاہدین احد میں ایک اہم نام عمرو بن الجموح کا ہے جو لنگڑے تھے اور ان کے چار بیٹے

میدان میں جا رہے تھے لیکن انھوں نے اصرار کیا۔ بیٹوں نے روکا۔ رسول اکرمؐ نے فیصلہ کیا کہ اگرچہ ان سے جہاد ساقط ہے لیکن انھیں اجازت دی جا رہی ہے۔ میدان میں قدم رکھا دعا کی" خدایا! مجھے واپس نہ کرنا" اور آخر میں شہید ہو گئے۔ زوجہ لاش اونٹ پر لے کر چلی تو اونٹ نے چلنے سے انکار کر دیا۔ سرکارؐ نے فرمایا کہ یہ دعا کا اثر ہے۔

ــ دوسرا ۲۴ سالہ جوان حنظلہ جس کا باپ ابو عامر لشکر کفار کا سردار تھا۔ نئی شادی ہوئی۔ زوجہ عبداللہ بن اُبی منافق کی بیٹی ـ مگر اسی رات احد کا قافلہ چل پڑا۔ سرکار نے مراسم شادی کی اجازت دیدی۔ صبح سویرے حالت جنابت میں میدان میں پہونچ گئے اور شہید ہو گئے تو سرکار نے فرمایا کہ انھیں زمین و آسمان کے درمیان ملائکہ نے غسل دیا ہے۔ اسی لئے ان کا نام" غسیل الملائکہ" ہو گیا۔

ــ احد کی ایک مجاہد خاتون ام عمارہ نسیبہ مازنیہ۔ سب کے فرار کے بعد عظیم مقابلہ کیا۔ سخت زخمی ہو گئی۔ مگر جب بیٹا قتل ہوا تو قاتل پر پھر حملہ کر دیا۔ سرکار نے تعریف کی اور دعائیں دیں اور عیادت کی۔

ــ دوسری خاتون دینار یہ تھی جس کا باپ۔ بھائی۔ شوہر سب قتل ہو گئے لیکن میدان میں رسول اکرمؐ کو تلاش کر رہی تھی۔ جب حضورؐ کو زندہ دیکھا۔ آواز دی۔ اس کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔ اصل حضورؐ کی زندگی ہے۔!

فتح مبین

سنہ ۶ھ یا ۷ھ میں جنگ احزاب کو فتح کرنے اور کل کفر کا خاتمہ کرنے کے بعد سرکار دو عالمؐ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا اس لئے کہ مسلمان روز ہجرت سے خانۂ کعبہ کی زیارت سے محروم ہو گئے تھے اور انھیں ترک وطن کے ساتھ اس محرومی کا صدمہ کھائے جا رہا تھا اور وہ برابر اصرار کیا کرتے تھے کہ آخر ہم لوگ اپنے وطن کب جائیں گے اور ہمیں خانۂ کعبہ کی زیارت کب نصیب ہوگی۔

سرکار دو عالمؐ امر الٰہی کا انتظار کر رہے تھے۔ یہانتک کہ امر الٰہی آگیا اور آپ عمرہ کے ارادہ سے چودہ سو انصار و مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکل پڑے۔ ابھی کفار کے دل و دماغ سے خندق کی شکست کا خیال نکلنے نہیں پایا تھا کہ اس عظیم لشکر کے عازم مکہ ہونے کی خبر سُن لی۔ سارے عالم کفر میں ایک ہلچل مچ گئی کہ مسلمانوں کے رسولؐ اب مکہ کو واپس لینا چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک عظیم لشکر ہے جس کے افراد مسلح ہیں اور ان کے ساتھ ستّر اونٹ بھی ہیں۔ کفار مکہ نے فوراً حضور کی پیشقدمی کو روکنے کے لئے ایک لشکر روانہ کر دیا لیکن آپ کا ارادہ جنگ کا نہیں تھا لہٰذا آپ نے فوراً راستہ تبدیل کر دیا اور دوسرے راستہ سے مکہ کی طرف چل پڑے۔ دونوں لشکروں کا مقابلہ مقام حدیبیہ میں ہو گیا۔ آپ نے بنی خزاعہ کے ایک شخص کو مکہ بھیجا کہ کفار کو مطمئن کر دے کہ ہمارا ارادہ جنگ کا نہیں ہے۔ ہم صرف خانۂ خدا کی زیارت کرنا چاہتے ہیں اور اپنے جانور ذبح کر کے واپس چلے جائیں گے۔ لیکن کفار کو اطمینان نہ ہوا تو آپ نے کفار کے لئے قابل اطمینان شخصیت عثمان بن عفان کو بھیجدیا۔ کفار مکہ کو یہ بات سخت ناگوار گذری کہ ہماری برادری کا آدمی ہمارے دشمن کی وکالت کرنے آیا ہے۔

چنانچہ انھوں نے عثمان کو گرفتار کر لیا اور مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ عثمان کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا اور سرکار نے واقعہ کی اہمیت کے اظہار کے لئے مسلمانوں سے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر جنگ کے واسطے بیعت لینا شروع کر دی جس کی بنا پر اسے بیعت شجرہ کہا جاتا ہے اور پروردگار نے بھی مسلمانوں کے اس کردار کو پسند فرما لیا کہ اس طرح کفار کے دلوں پر اسلام کا رعب قائم ہو جائے گا کہ مسلمان اپنے دین و مذہب کے لئے جان قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس کے بعد مسلمان اس عہد پر قائم نہ رہیں گے اور بیعت توڑ دیں گے تو ناراضگی کا اعلان کر دیا جائے گا کہ کسی ایک عمل سے رضامندی ساری زندگی کی ضمانت نہیں ہوتی ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے اب جو بیعت لینے کے بعد آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تو کفار کے ہوش ٹھکانے لگ گئے اور انھوں نے سہیل بن عمرو کو صلح کا پیغام دے کر بھیجدیا۔ سرکار نے اپنے بنیادی اصولوں کے تحت فوراً اس پیغام کو قبول کر لیا اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت علیؑ کو صلحنامہ کی کتابت کا کام سپرد کر دیا گیا کہ کل تک یہی ہاتھ تلوار کے فاتح تھے تو آج قلم کا فاتح بھی اسی دست مبارک کو ہونا چاہیئے۔

صلحنامہ کی کتابت کا کام شروع ہوا اور سہیل نے رخنہ ڈالنا شروع کر دیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھا جائے گا۔ محمد رسول اللہ نہیں لکھا جائے گا۔ فلاں شرط منظور کی جائے گی فلاں شرط منظور نہ کی جائے گی ..... سرکار دو عالمؐ نے تمام باتوں کو نہایت فراخدلی سے منظور کر لیا اور صلحنامہ اس شکل میں تیار ہو گیا:

"تیرے نام سے اے خدا — یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ اور قریش کی ایک سرکردہ جماعت اور سہیل بن عمرو کے درمیان ہوا ہے — موضوع صلح یہ ہے کہ دونوں فریق کے درمیان دس سال تک کوئی جنگ نہیں ہوگی۔ نہ کوئی تلوار نکالے گا نہ کسی کو گرفتار کرے گا۔ ایک دوسرے کی برائی بھی نہ ہوگی۔ اگر کوئی محمدؐ کے معاہدہ میں داخل ہونا چاہے گا تو وہ بھی آزاد ہوگا اور اگر کوئی قریش سے معاہدہ کرنا چاہے گا تو وہ بھی آزاد ہوگا۔ البتہ اگر

قریش کا کوئی آدمی محمدؐ کی طرف آجائے گا تو اسے واپس کرنا ہوگا لیکن محمدؐ کا کوئی آدمی قریش کی طرف چلا گیا تو واپس نہ کیا جائے گا۔ اسلام مکہ میں آزاد رہے گا اور کوئی کسی کے دین پر کوئی دباؤ نہ ڈالے گا نہ کسی کو اذیت کرے گا۔ محمدؐ امسال واپس جائیں گے اور اگلے سال دوبارہ زیارت کعبہ کے لئے آئیں گے اور صرف تین دن قیام کریں گے اور مسافروں کے عمومی اسلحہ کے علاوہ کوئی اسلحہ لے کر نہ آئیں گے۔"

(تفسیر علی بن ابراہیم قمی ۲/۳۱۳، تاریخ یعقوبی ۲/۵۴ لیکن مدت عدم قتال تین سال)

مصالحت کے خاتمہ کے بعد سرکار دو عالمؐ نے جانور قربان کر کے احرام تمام کر دیا لیکن بہت سے مسلمان اصل معاہدہ کی دفعات ہی سے مطمئن نہ تھے تو احرام کے خاتمہ کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے چنانچہ عمر بن الخطاب نے رسالت کے خلاف ہی تحریک شروع کر دی کہ خدا کا رسول ذلیل! کمزور اور بزدل نہیں ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول خدا نہیں ہیں۔ لیکن صاحب ذوالفقار نے معاہدہ لکھ دیا اور طرفین نے منظور کر لیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے بخوشی قبول بھی کر لیا اور اس طرح ایک جماعت کے اسلام کا بھی اظہار ہو گیا اور ایک جماعت کے عقیدہ کا بھی بھرم کھل گیا۔

پروردگار عالم نے اس اقدام صلح کو فتح مبین کا نام دیدیا اور اس کے متعدد بنیادی اثرات و نتائج اور فوائد و مصالح کا بھی ذکر کر دیا اور اس طرح واضح کر دیا کہ اسلام مسلمانوں کے جذبات کا پابند نہیں ہے۔ وہ دین الٰہی ہے اور مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے احکام کا اتباع کرے۔ اپنی رائے کو مسلّط کرنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا ہے۔ مسلمان اللہ و رسولؐ کا تابع فرمان ہوتا ہے۔ رسالت میں شک کرنے والا، یا رسولؐ سے بحث کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر صاحب ذوالفقار کا حوصلہ دیکھنے کے قابل تھا کہ بے پناہ طاقت و قوت رکھنے کے باوجود اور کل کفر کا سر قلم کرنے کے بعد بھی ہر دفعۂ صلح پر سر تسلیم خم کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ اسلام تسلیم ہے، انانیت اور جذباتیت نہیں ہے۔

نتائج صلح

جب پروردگار نے اس صلح کو فتح مبین کا نام دیا ہے تو اس میں اسلام کی کامیابی کے اسرار یقیناً ہوں گے چاہے مسلمان اس کا ادراک کر سکیں یا نہ کر سکیں۔ براء بن عازب تو یہاں تک کہتے تھے کہ فتح مکہ یقیناً ایک فتح ہے لیکن بیعت رضوان خود بھی ایک فتح ہے (مجمع البیان طبرسی ۹/۱۱۰) اور یہ بات بڑی حد تک قرین قیاس ہے کہ اتنی بڑی جماعت کو موت کے لئے آمادہ کر لینا اور ان سے اسلام کی پالیسیوں پر بیعت لے لینا ایک عظیم ترین کامیابی ہے جس کے بعد کوئی بیعت توڑ دے گا تو اس کی حقیقت کا اظہار بھی ایک عظیم کامیابی ہے۔

اس صلح کے ذیل میں حسب ذیل امور پر توجہ دینا ضروری ہے اور اس کے بغیر اسلام کے فلسفۂ صلح اور صلح کے فتح مبین ہونے کا اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔

● اسلام میں صلح تبدیل حق بہ حق ہے۔ باطل کی بیعت یا اس سے رضامندی نہیں ہے۔ سرکار دو عالمؐ نے اگر بسم اللہ ۔۔۔۔ کے بجائے باسمک اللّٰھم منظور کر لیا تو اس لئے کہ وہ کلمہ بھی برحق ہے اور یہ کلمہ بھی برحق ہے۔ اسی طرح اگر محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبداللہ منظور کر لیا تو اس لئے کہ محمدؐ رسول اللہ بھی ہیں اور ابن عبداللہ بھی ہیں ورنہ کفار نے کسی حرف باطل کا مطالبہ کیا ہوتا تو اسلام کسی قیمت پر صلح نہیں کر سکتا تھا حرف باطل پر صلح کے بارے میں اس کا واضح ترین موقف ہے لا اعبد ما تعبدون ۔۔۔

● اسلام نے چار اقوام کے ساتھ صلح کی ہے اور سب میں فتح مبین حاصل کی ہے۔ حدیبیہ میں مشرکین سے صلح۔ فدک میں یہودیوں سے صلح۔ مباہلہ میں عیسائیوں سے صلح اور بعد رسول امام حسنؑ کے ذریعہ منافقین سے صلح۔

● خندق کے موقع پر مسلمانوں نے عمرو کی طاقت کا اظہار کر کے جنگ کو روکنا چاہا لیکن سرکارؐ نے جہاد کا حکم دے دیا اور حدیبیہ میں مسلمانوں نے جنگ کا ارادہ ظاہر کیا اور حضور نے صلح کر لی اور اس طرح اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ اسلام میں ان اصحاب کی کوئی اوقات نہیں ہے اور نہ ان کی کوئی فکر اسلامی مزاج کے مطابق ہوتی ہے کہ انھیں سرکار کے مشیر کا

درجہ دیا جاسکے۔

•۔ کفار نے اگلے سال مکہ خالی کرنے اور اسلامی تبلیغ کے آزاد رہنے کا اقرار کرکے اسلام کی حقانیت کا بھی اقرار کرلیا اور اپنے مفسد ہونے کا بھی اعتراف کرلیا اور یہ بھی ایک فتح مبین ہے۔

•۔ سرکار دو عالمؐ نے مکہ کے تخلیہ کی شرط کرکے واضح کر دیا کہ اسلام علاقہ کا تخلیہ بھی صلح ہی کے ذریعہ کرالیتا ہے وہ ہر مسئلہ میں جنگ کا محتاج نہیں ہے۔

•۔ عمرۃ القضاء میں سرکار نے مکہ کو باطل خداؤں سے بندوں کو آزاد کرایا تھا۔ اس کے بعد ایک سال کے بعد جب فتح مکہ میں آئے تو باطل خداؤں سے خانۂ خدا کو بھی آزاد کرالیا۔

•۔ اسلام کے جملہ معرکے ایک مولائے کائنات کے دست مبارک سے انجام پائے ہیں۔ خندق میں کل کفر کا خاتمہ علیؑ کی تلوار نے کیا۔ خیبر میں مرحب و عنتر کا قتل علیؑ کے ہاتھوں ہوا۔ حدیبیہ میں صلحنامہ علیؑ کے ہاتھ سے لکھا گیا۔ عمرۃ القضاء میں مکہ کے تخلیہ کا کام علیؑ کے ہاتھوں انجام پایا اور فتح مکہ میں بت شکنی کا کام علیؑ نے انجام دیا جو اس امر کی دلیل ہے کہ اسلام کی کوئی فتح علیؑ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور تاریخ اسلام سے اس نام کو نکال دیا جائے تو اسلام میں ذلت۔ رسوائی۔ ہزیمت۔ فرار۔ بزدلی۔ کج بحثی۔ شرک و نفاق اور ریب و شک کے علاوہ کچھ نہ رہ جائے گا۔ اسلام کی آبرو بچانا ہے تو علیؑ کے خدمات کا اعتراف کرنا ہوگا اور انھیں فہرست اسلام میں سر فہرست رکھنا ہوگا۔

•۔ صلح حدیبیہ کی ایک فتح یہ بھی ہے کہ سرکار نے تبلیغ اسلام کو آزاد کرالیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس قدر افراد گذشتہ چھ سال کی مدت میں مسلمان نہیں ہوئے تھے، اس سے زیادہ افراد صلح حدیبیہ سے فتح مکہ کے درمیان مسلمان ہو گئے اور صلح حدیبیہ نے قبول اسلام کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا اور لوگ فوج در فوج داخل ہونے لگے۔

•۔ اسلام نے بدر و احد اور خندق و خیبر کو اپنی فتح قرار دیا ہے لیکن حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر کیا ہے کہ اسلام تلوار کی فتح کو وہ اہمیت نہیں دیتا ہے جو اہمیت صلح کی فتح کو حاصل ہے کہ صلح کی فتح میں طاقت کام نہیں کرتی ہے اصول کام کرتے ہیں اور اسلام اصول کا مذہب

ہے طاقت کا مذہب نہیں ہے۔

•۔ واضح رہے کہ رسول اسلامؐ کی صلح جس کی دفعات مسلمانوں کے لئے قابل برداشت نہیں تھیں۔ اگر اسے فتح مبین کہا جاسکتا ہے اور کسی اعتبار سے بزدلی یا ذلت کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے تو امام حسنؑ کی صلح تو بظاہر اس سے زیادہ فاتحانہ تھی کہ حاکم شام نے سادہ کاغذ دے دیا تھا اور صلح امام حسنؑ کے شرائط پر ہوئی تھی۔ حاکم شام کے شرائط پر نہیں اور دقت نظر سے دیکھا جائے تو اس کا فقط نام صلح ہے ورنہ درحقیقت یہ امام حسنؑ کے دست حق پرست پر حاکم شام کی بیعت ہے اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی جو کام صفین میں مولائے کائنات کی تلوار نہ کرسکی تھی وہ کام امام حسنؑ کے قلم نے انجام دے دیا اور واضح کر دیا کہ چاہے بابا کا قلم حدیبیہ میں چلے یا میرا قلم صلح معاویہ میں چلے دونوں کی فتح "فتح مبین" ہوتی ہے کہ اسلام قلم کا مذہب ہے تلوار کا مذہب نہیں ہے۔ اس نے قلم کا سورہ اُتارا ہے تلوار کا نہیں۔ اور شائد یہی وجہ ہے کہ اس نے عالم کی روشنائی کو شہید کے خون سے بہتر قرار دیا ہے کہ قلم کے اثرات تلوار کے مقابلہ میں زیادہ دیرپا ہوتے ہیں۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

جنگِ خیبر

۔خیبر یہودیوں کا ایک مرکزی علاقہ تھا جس کا فاصلہ مدینہ سے تقریباً ۱۷۵ کلومیٹر تھا۔ وہاں یہودیوں کی تقریباً ۲۰ ہزار کی آبادی تھی اور سات بڑے بڑے مضبوط اور مستحکم قلعے بنے ہوئے تھے۔

۔یہودیوں کی ایک بڑی تعداد آبادی کے اندر آباد تھی۔ جب سرکار دو عالمؐ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو آپ نے چاہا کہ مدینہ کے تمام باشندے امن و سکون کے ساتھ زندگی گذاریں اور کسی طرح کا اختلاف نہ پیدا ہو۔ اگرچہ مشرکین یا یہودی اس جدید دین کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے سب کو جمع کر کے ایک عہد نامہ تیار کیا جس میں بقائے باہمی کے جملہ اصول درج کر دئے اور سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اندر کوئی جھگڑا نہ ہوگا اور باہر سے کوئی حملہ آور ہوگا تو سب مل کر دفاع کریں گے۔

۔اُدھر مشرکین مکہ نے اسلام سے جنگ کا آغاز کر دیا۔ لیکن پہلا معرکہ مقام بدر میں ہوا جو مدینہ سے ۱۷۵ کلومیٹر دور تھا لہذا اہل مدینہ پر بظاہر دفاع کی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ قدرت کا یہ انتظام کہ اس کے بعد جب مشرکین نے بدر کی شکست کے انتقام کا پروگرام بنایا تو مقامِ احد تک آگئے اور اب وقت تھا کہ مدینہ کے تمام باشندے مل کر شہر کا دفاع کرتے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور سرکار دو عالمؐ نے یہ مقابلہ بھی شہر کے باہر کیا۔

۔اسلام و کفر کا تیسرا معرکہ شہر کے اندر ہوا اور اس کا راز یہ تھا کہ مقامی یہودیوں نے مشرکین سے سازش کر لی کہ تم باہر سے آکر حملہ کرو۔ ہم اندر سے تمھاری حمایت کریں گے۔ سرکار دو عالمؐ نے خندق کھدوا کر اس سازش کو بھی ناکام بنا دیا۔ لیکن یہودیوں کی حرکت واضح

ہو گئی اور کل ایمان کے ہاتھوں کل کفر کے خاتمہ نے واضح کر دیا کہ اب یہودیوں کا مدینہ میں رہنا آسان نہیں ہے۔ اب مسلمان عہد شکنی کی سزا بھی دیں گے اور مشرکین کے ساتھ سازش کرنے کا انتقام بھی لیں گے۔ چنانچہ ایک بڑی جماعت بھاگ کر خیبر کے یہودیوں سے مل گئی۔

۔خیبر کے جوار میں بنی غطفان کی آبادی تھی۔ ان لوگوں نے ان سے بھی طے کر لیا کہ اب ہم لوگ سب مل کر مدینہ پر حملہ کریں گے اور اس طرح اسلام کا خاتمہ کر دیں گے۔ سرکار دو عالمؐ کو اس نئی سازش کی اطلاع ملی تو آپ نے نہایت ہی رازدارانہ انداز سے لشکر تیار کر کے راتوں رات سفر شروع کر دیا۔ قافلہ کا رُخ غطفان کی طرف تھا۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ ہم پر حملہ ہونیوالا ہے چنانچہ دفاعی تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور گویا قلعہ بند ہو گئے۔ سرکارؐ نے اچانک قافلہ کا رُخ موڑ دیا اور خیبر کا رُخ کر لیا۔ اب غطفان کے پاس آنے سکت اور گنجائش نہیں رہ گئی کہ خیبر کی امداد کے لئے نکل سکتے۔ اور حضورؐ نے خیبر تک پہونچنے کے بعد قلعہ کے محاصرہ کا حکم دیدیا۔

۔خیبر کے مختلف قلعے مختلف حیثیت کے تھے۔ بعض میں غذا کا اسٹاک تھا بعض میں اسلحہ جمع تھے۔ بعض میں بڑے بڑے بہادروں کا جمگھٹ تھا۔ حضورؐ نے سب سے بڑے قلعہ ناعم پر حملہ کیا اور ایک محمود بن مسلمہ کی شہادت اور پچاس انصار کے زخمی ہونے کے زیر اثر قلعہ کو فتح کر لیا اور یہودیوں میں ہراس پھیل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قلعہ قموص بھی فتح ہو گیا۔ جہاں سے صفیہ بنت حیُ بن اخطب کو قیدی بنایا گیا۔ جنھیں اسلامی مصالح کے تحت زوجۂ رسولؐ بننے کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔

۔خیبر کے دو عظیم قلعے جنگجو سپاہیوں کا مرکز تھے سلالم اور وطیح۔ ان کی فتح کا کام آسان نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے پہلے ابو بکر کو علم لشکر دیا اور ان کے فرار نے کفار کے حوصلے اور بلند کر دئے۔ جس کے نتیجہ میں دوسرے دن عمر کو بھی فرار کا راستہ اختیار کرنا پڑا اور اب حضورؐ نے غصہ میں آکر یہ اعلان کر دیا کہ اب کل اسے علم دوں گا جو مرد ہوگا کرار غیر فرار ہوگا اور خدا و رسول کا محب و محبوب ہوگا۔ اس اعلان میں گذشتہ شوق علمداری رکھنے والوں پر کھلی تنقید بھی تھی اور یہودیوں کے لئے کھلا چیلنج بھی تھا کہ ابھی اسلام کے پاس وہ مرد کرار بھی موجود ہے جو میدان کو فتح کئے بغیر واپس نہیں آسکتا ہے۔

دوسرے دن قوم نے اپنے قد و قامت کا فائدہ اٹھانا چاہا اور حضرت علیؑ آشوب چشم کی بنا پر نہ آسکے لیکن حضورؐ نے انھیں طلب کرکے لعابِ دہن سے آشوب چشم کا علاج کرکے علم لشکر دے کر بھیجدیا۔ مرحب نے اپنے بھائی حارث کو مقابلہ پر بھیجا۔ جب لمحوں میں اس کا خاتمہ ہوگیا تو غیظ و غضب میں خود نکل آیا اور نتیجہ میں حضرت علیؑ نے ایسی تلوار ماری کہ خُود سے لے کر کمر تک جسم کے دو ٹکڑے ہوگئے۔

ـ دورانِ جنگ سپر کے گر جانے سے درِ خیبر کو اکھاڑ کر سپر بنالیا اور بعد میں اسی کو پُل بنا کر لشکر اسلام کو قلعہ میں اُتار دیا۔ جب کہ وہ دروازہ لمبائی میں چار گز اور چوڑائی میں دو گز کا تھا۔ (تاریخ یعقوبی)

ـ خیبر کے کل معرکہ میں ۲۰ مسلمان مجاہدین کام آئے جب کہ یہودیوں کے مقتولین میں ۹۴ افراد کے نام تاریخ میں درج ہیں۔

• اُدھر ہجرت حبشہ کی قیادت کرنے والے جناب جعفر بن ابوطالب حبشہ سے واپس مدینہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ حضورؐ خیبر کی مہم پر گئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ فوراً خیبر کے لئے روانہ ہوگئے اور اس وقت پہونچے جب علیؑ نے خیبر فتح کرلیا تھا۔ حضورؐ نے بڑھ کر جعفر کا استقبال کیا اور فرمایا کہ میں کس بات کی زیادہ خوشی مناؤں۔ جعفر کی واپسی یا خیبر کی فتح۔ بہرحال دونوں ہی اولاد ابوطالبؑ کے کارنامے تھے۔

ـ سرکار دو عالمؐ نے علیؑ کو فتح خیبر کے انعام میں مرد میدان، کرّار غیر فرار، محبّ خدا و رسولؐ کا لقب دیا اور جعفر کو فتح حبشہ کے انعام میں نماز جعفر طیار تعلیم کی جو تریاق اعظم کی حیثیت رکھتی ہے۔

ـ امیر المومنینؑ نے فتح خیبر کا راز یوں بیان کیا ہے کہ "یہ کام بشری طاقت کا نہیں تھا۔ اس میں الٰہی طاقت اور رضائے الٰہی پر مطمئن نفس کام کر رہا تھا" ورنہ خیبر کی فتح کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔!

فتح خیبر

"ولا تقولن لشیئ انی فاعل ذٰلك غداً ہ الا ان یشاء اللّٰہ واذکر ربك اذا نسیت وقل عسیٰ ان یھدین ربی لاقرب من ھٰذا رشداً ہ" (کہف ۲۳-۲۴)

"اور آپ کسی شے کے لئے یہ نہ کہیں کہ میں یہ کام کل کرنے والا ہوں۔ مگر جب تک خدا نہ چاہے اور بھول جائیں تو خدا کو یاد کریں اور یہ کہیں کہ عنقریب میرا خدا مجھے واقعیت سے قریب تر امر کی ہدایت کردے گا۔"

آیت مبارکہ سورۂ کہف کی آیت ہے جو ایک مکّی سورہ ہے اور اس کی یہ آیت بہرحال مکّہ میں نازل ہوئی ہے اگرچہ بعض دیگر آیات کے بارے میں اختلاف بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے ہجرت سے پہلے ہی پیغمبرؐ کو یہ ہدایت دے دی تھی کہ آئندہ کل کے لئے کوئی بات "انشاء اللہ" کے بغیر نہ کہیں گے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ خیبر کا معرکہ ہجرت کے تقریباً سات سال بعد ہوا ہے اور اس موقع پر سرکار دو عالمؐ نے اعلان کیا کہ میں "کل علم دوں گا"۔ اور پھر انشاء اللہ نہیں کہا اور قدرت نے بھی کوئی تنبیہ نہیں کی۔

سورۂ کہف میں یہ ہدایت بھی تھی کہ اگر کوئی انشاء اللہ کہنا بھول جائے تو جب یاد آجائے تب کہہ لے۔ سرکار دو عالمؐ کی زندگی میں اوّلاً تو سہو و نسیان کا امکان نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایسا ہوگیا تھا تو کم از کم بعد کی تاریخ میں کہیں انشاء اللہ کا ذکر ہوتا جب کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خیبر میں عَلَم دینے کا کام اگرچہ پیغمبرؐ کے ہاتھوں انجام پایا تھا لیکن یہ کام دراصل پیغمبرؐ کا نہیں تھا کہ انھیں انشاء اللہ کہنے کی ضرورت ہوتی۔ بلکہ یہ

براہ راست خدائی کام تھا جو پیغمبرؐ کے ہاتھوں انجام پا رہا تھا اور اسی لئے علمدار کے اوصاف میں اس امر کا بھی تذکرہ کیا گیا تھا کہ "وہ اس وقت تک واپس نہ آئے گا جب تک خدا اسکے دونوں ہاتھوں پر فتح نہ دیدے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیبیہ میں علیؑ کا قلم صلح چلا تو پروردگار نے فتح کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اور خیبر میں علیؑ کی تلوار چلی تو بھی خدا نے فتح کی نسبت اپنی ہی طرف قائم رکھی۔

خیبر کی تاریخ یہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تو مدینہ میں تین طرح کے افراد آباد تھے، مشرکین۔ یہودی اور مسلمان۔

اوس وخزرج کے دو بڑے قبیلہ تھے جن میں ۱۲۰ سال سے جنگ چل رہی تھی۔ پھر مہاجرین کے آتے ہی مواطن اور مہاجر کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ پیغمبر اسلامؐ نے مواخاۃ قائم کر کے اوس وخزرج اور انصار و مہاجرین کو بھائی بھائی بنا دیا اور ایک عظیم اختلاف ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد یہودیوں نے مشرکین سے اتحاد کر لیا اور اسلام کو فنا کرنے کی سازش تیار کر لی جس کا مشترکہ معرکہ جنگ خندق میں پیش آیا۔

اسلام کے پاس علیؑ جیسا مجاہد موجود تھا لہذا اس نے کل کفر سے مقابلہ کر لیا اور مسلمانوں کی عمرو بن عبدود کی مدح سرائی کے باوجود علیؑ پر کوئی دہشت طاری نہیں ہوئی اور انھوں نے کل کفر کا سر قلم کر لیا۔

خندق کی شکست کے بعد یہ طے ہوا کہ اب حملہ خیبر سے کیا جائے گا اور مدینہ کے مشرکین اور منافقین یہودیوں کا ساتھ دیں گے۔ لہذا سرکار دو عالمؐ نے پہلے ہی پیشقدمی فرمائی اور بارہ سو پیدل، دو سو سوار لے کر، صفر کو روانہ ہو گئے۔ خیبر تک پہونچکر مسلمانوں نے یہودیوں کا محاصرہ کر لیا لیکن قلعہ کو فتح نہ کر سکے اور برابر شکست کھا کر واپس آتے رہے یہانتک کہ لشکر، سردار کو بزدل کہتا تھا اور سردار لشکر کو۔ جس کے بعد سرکار دو عالمؐ نے اعلان کیا اور مولائے کائناتؑ نے میدان میں قدم جما کر مرحب و عنتر کا خاتمہ کر کے خیبر کو فتح کر لیا۔

ــ روایت کا انداز بتاتا ہے کہ سرکارؐ کا اعلان ۲۳ رجب کو ہوا تھا اور مسلمانوں

کی ہزیمت ۲۲ رجب کو تھی جس کے بعد یہ تاریخ ایک "تاریخ ساز" تاریخ بن گئی۔

ــ مرحب نام حیدرؑ سن کر واپس جا رہا تھا لیکن شیطان نے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا اور بالآخر قتل ہو گیا جو اس امر کی علامت ہے کہ شیطان اپنوں کے کام بھی نہیں آتا ہے اور عین وقت پر دھوکہ دیتا ہے۔

ــ خیبر کی فتح کو مولائے کائنات نے قوت ربّانیہ کا اثر قرار دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہودیوں سے مقابلہ اسلحہ اور لشکر کے زور پر نہیں ہوتا ہے بلکہ ربّانی قوت سے ہوتا ہے۔

ــ خیبر سے واپسی پر ردشمس کا واقعہ پیش آیا تاکہ یہودیوں کو معلوم ہو جائے کہ اگر وصی موسیٰ یوشع کے لئے نور آفتاب واپس آسکتا ہے تو وصی پیغمبر اسلامؐ کے لئے بھی سورج پلٹ سکتا ہے۔

ــ مسلمانوں میں جشن فتح خیبر کا رواج ہوتا تو حوصلے بلند رہتے اور یہودیوں کی غلامی کے لئے تیار نہ ہوتے لیکن ایک حیدر کرارؑ سے انحراف کی سزا نسلوں میں بھگت رہے ہیں۔!

آیت نجویٰ

• نجویٰ وہ رازدارانہ گفتگو ہے جو لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں۔ اس کے مخاطب بزرگ افراد بھی ہوسکتے ہیں اور برابر والے بھی۔ یہی گفتگو جب پروردگار کی بارگاہ میں کیجاتی ہے تو اسے مناجات کا نام دیا جاتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مناجات کرنے والا کسقدر معرفت پروردگار رکھتا ہے اور وہ اُس کی بارگاہ میں اپنے کو کس طرح پیش کرتا ہے۔

عوام الناس کے سامنے گفتگو کرنے سے انسان کی منزل معرفت کا اندازہ نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ اُس موقع پر بہرحال انسان کو اپنی بزرگی کا احساس رہتا ہے یا اس بزرگی کا اظہار کرنا پڑتا ہے اور لوگ یہ اندازہ نہیں کر پاتے ہیں کہ یہ شخص پروردگار کی بارگاہ میں اپنے کو کسقدر حقیر وفقیر سمجھتا ہے اور اس کی عظمت کا احساس رکھتا ہے۔

— روایات میں باہمی نجویٰ کے بہت سے آداب وارد ہوئے ہیں جن میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ اگر کسی مقام پر تین آدمی بیٹھے ہوں تو دو افراد کو آپس میں نجوی نہیں کرنا چاہیئے کہ اس طرح تیسرے کے ذہن میں بدظنی بھی پیدا ہوتی ہے اور اسے اپنی توہین کا بھی احساس ہوتا ہے۔ (رسول اکرمؐ ۔ کنزالعمال، امام صادقؑ ۔ اصول کافی)

• سرکار دو عالمؐ کے دور میں مسلمانوں میں ایسی ہی صورت حال پیدا ہوگئی تھی کہ لوگ اپنی برتری ظاہر کرنے کے لئے سرکار سے رازدارانہ گفتگو کیا کرتے تھے اور اکثر اوقات حضور کا وقت ضائع کیا کرتے تھے۔ جس کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوگئی کہ "اے ایمان والو! رسول سے راز کی باتیں کرنا ہیں تو پہلے صدقہ دے کر آؤ کہ اسی میں بھلائی اور پاکیزگی نفس کا سامان ہے" جس کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی اور غربا نے بربنائے غربت اور امراء

بربنائے بخل صدقہ دینے سے انکار کردیا اور رسول اکرمؐ تنہا بیٹھے رہ گئے۔ جس کے بارے میں دوسری آیت نازل ہوئی کہ "ہم نے تم سب کے نفس کو دیکھ لیا۔ اب اس حکم کو منسوخ کئے دیتے ہیں اور تم بغیر صدقہ بھی حاضری دے سکتے ہو۔

— اس درمیان آیت کریمہ پر صرف امیرالمومنینؑ نے عمل کیا اور فرمایا کہ میرے پاس ایک دینار تھا۔ میں نے اسے دس درہم میں تبدیل کیا اور ہر مرتبہ ایک درہم دے کر حاضری دیتا رہا یہانتک کہ حکم آیت منسوخ ہوگیا اور میرے علاوہ کوئی عمل کرنے والا نہ پیدا ہوا۔
(سفینۃ البحار ۲/۵۷۹)

— انتہائی افسوس کی بات ہے کہ اس مقام پر فخرالدین رازی نے یہ نوٹ لگا دیا ہے کہ صدقہ دینے میں غریبوں کے دل دکھانے کی بات تھی اور امیروں کے چڑھانے کا مسئلہ تھا لہٰذا مناسب یہی تھا کہ حضرت علیؑ بھی عمل نہ کرتے اور مناجات کی آیت یوں ہی منسوخ ہو جاتی۔ یہ حضرت علیؑ نے کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے اور نہ اس میں کوئی حسن کا پہلو ہے۔

— لیکن حُسن اتفاق کہ دوسرے عالم اہلسنت نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں اس نوٹ پر تبصرہ کیا ہے کہ اس کلام سے صاف تعصّب کی بُو آتی ہے اور ہمارے لئے کیا ضروری ہے کہ ہم حضرت علیؑ کی کسی افضلیت کا اقرار نہ کریں اور یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ بھی ہو جس میں ان کا مرتبہ تمام صحابۂ کرام سے افضل اور برتر ہو۔

— فخر رازی کے دونوں اعتراضات یوں بھی مہمل ہیں کہ غربار کے دل دکھانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ صدقہ انھیں کی جیب میں جارہا تھا۔ یہ رسول اکرمؐ کا کوئی نذرانہ نہیں تھا کہ حضور اسے لے کر رکھ لیتے اور فقراء و مساکین منھ دیکھتے رہ جاتے۔ یہ تو ابتدا سے صدقہ تھا جسے فقراء ہی کو ملنا تھا اور ان کے لئے بھی امکان تھا کہ اس صدقہ کو لے کر دوسرے فقیر کو دے دیتے، اور سرکار کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔

امرار کی دل شکنی کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لئے کہ حضرت علیؑ نے دس مرتبہ حاضری دی ہے اور آیت کا حکم تادیر باقی رہا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ "غنی حضرات" صدقہ دے کر اسی طرح حاضر ہو جاتے جس طرح حضرت علیؑ برابر دے رہے تھے۔

اور اگر یہ طے ہو جائے کہ کسی بدنصیب کی دل شکنی ہی ہو رہی تھی تو کیا نالائق افراد کی دل شکنی کی بنیاد پر حکم شریعت پر عمل نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ ایسا ممکن ہے تو ہر غریب آدمی کو نماز، روزہ بھی ترک کر دینا چاہیئے کہ جن امیروں کو نماز کی فرصت اور روزہ کی طاقت نہیں ہے ان کی دل شکنی ہو رہی ہے۔ ایسا تو اسلام میں کوئی قانون نہیں ہے۔

• حضرت علیؑ کے مسلسل نجویٰ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بزم پیغمبرؐ میں ایسے اوقات بھی آئے ہیں جب کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اور وہ اوقات رازدارانہ گفتگو کے تھے، خاموشی کے نہیں تھے جس کے بعد یہ بات ببانگ دہل کہی جاسکتی ہے کہ صحابی پیغمبرؐ کے پاس کوئی راز کا علم ہو یا نہ ہو۔ حضرت علیؑ کے پاس بہرحال ایسے اسرار موجود ہیں جن کا علم ان کے علاوہ کسی کو نہیں ہے لہٰذا امت میں کوئی شخص اسرار پیغمبرؐ کے بارے میں حضرت علیؑ کو چیلنج نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن حضرت علیؑ سارے عالم صحابیت کو چیلنج کر سکتے ہیں۔

• علامہ مفتی محمد عباس طاب ثراہ نے اپنی کتاب "روائح القرآن" ص ۵۹۱ پر تفسیر مدارک کے حوالہ سے ان سوالات کو بھی نقل کیا ہے جو مختلف رازدارانہ اجتماعات میں مولائے کائناتؑ نے سرکار دو عالمؐ سے کئے ہیں اور جنھیں خود حضرتؑ نے اپنے فضائل و امتیازات میں شمار کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ سے حسب ذیل سوالات کئے اور آپ نے یہ جوابات عنایت فرمائے:

۱۔ وفا کیا ہے؟ — فرمایا توحید پروردگار اور شہادت لا الٰہ الا اللہ (ظاہر ہے کہ جب پروردگار نے فطرت بشر سے عہد لے لیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی بندگی نہ ہوگی اور شیطان کی عبادت نہ کیجائے گی تو اس عہد کی وفا توحید پروردگار کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے۔)

۲۔ فساد کیا ہے؟ — فرمایا کفر و شرک۔ (اس کی وجہ بھی واضح ہے کہ خدا کی دنیا میں اُس کے خلاف آواز اٹھائی جائے تو اس سے بالاتر فساد کیا ہو سکتا ہے۔)

۳۔ حق کیا ہے؟ — فرمایا اسلام، ایمان اور وہ ولایت جس کا سلسلہ تم تک پہونچے۔

۴۔ حیلہ کیا ہے؟ — فرمایا حیلہ کو ترک کر دینا۔ (ہر حیلہ سے بچنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ انسان بہانہ بازی کو نظر انداز کر کے حقائق پر عمل کرے۔)

۵۔ میری ذمہ داری کیا ہے؟ — فرمایا خدا و رسول کی اطاعت۔

۶۔ خدا سے کیسے دعا کی جائے؟ — فرمایا صدق و یقین کے ساتھ۔

۷۔ خدا سے کیا مانگا جائے؟ — فرمایا عافیت۔

۸۔ نجات کے لئے کیا کام کیا جائے؟ — فرمایا مال حلال کھایا جائے اور سچی بات کی جائے۔

۹۔ سرور کیا ہے؟ — فرمایا جنّت۔

۱۰۔ راحت کیا ہے؟ — فرمایا لقائے پروردگار۔

— مذکورہ بالا سوالات و جوابات پر غور کیا جائے تو ایک مکمل نظام حیات سامنے آجاتا ہے۔ انسان کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ پروردگار کے عہد بندگی کو وفا کرے اور اس کا راستہ یہ ہے کہ فساد سے اجتناب کرے۔ حق کا اتباع کرے۔ بہانہ بازی سے الگ رہے۔ اپنی ذمہ داریوں کا خیال رکھے۔ خدا سے صدق و یقین کے ساتھ دعا کرے۔ عافیت کا سامان کرے۔ نجات کے لئے کام کرے۔ خوشی کا بندوبست کرے اور یہ خیال رکھے کہ مومن کی خوشی جنت ضرور ہے لیکن اصل راحت جنّت نہیں ہے بلکہ لقائے پروردگار ہے۔!

مجرمین فتح مکہ

صلح حدیبیہ کے موقع پر جو صلحنامہ مرتب ہوا تھا اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ تمام قبائل طرفین کے ساتھ معاہدہ کرنے میں آزاد ہیں اور ہر فریق کو اپنے حلیف کو مکمل امداد دینے کا اختیار رہے۔ چنانچہ قبیلہ خزاعہ نے سرکار دو عالمؐ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور ان کے قدیمی حریف بنی کنانہ نے مشرکین مکہ کے ساتھ۔ سرکار کے معاہدہ میں دس سال کی مدت تھی اور ہر طرح کے دفاع کا عہد و میثاق تھا۔

دو سال تک یہ معاہدہ مکمل طور پر برقرار رہا اور اسی کے نتیجہ میں سرکار نے عمرۃ القضاء انجام دے لیا لیکن اسی کے بعد جمادی الاولی ۸ھ میں جب آپ نے تین ہزار کا لشکر روم والوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اور اس کے تینوں سردار قتل کر دئے گئے تو مشرکین مکہ نے محسوس کیا کہ اب مسلمانوں کی طاقت کمزور ہو گئی ہے اور یہ بالکل بے بس ہو گئے ہیں۔ چنانچہ معاہدہ توڑنے کا ارادہ کر لیا اور بنی کنانہ کو خفیہ طور پر اسلحہ سپلائی کر کے بنی خزاعہ پر حملہ کرنے کی دعوت دیدی اور بالآخر یہ کام ہو گیا اور بنی خزاعہ کے بہت سے افراد قتل کر دئے گئے اور بعض رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر حرم خدا میں داخل ہو گئے اور بُدیل بن ورقا کے گھر میں پناہ لے لی جن کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا اور ان کی عمر تقریباً ۹۰ سال کی تھی۔ (امالی طوسیؒ ص ۲۳۹)

اس کے بعد عمرو بن سالم کو نامہ بر بنا کر مدینہ بھیجدیا تاکہ سرکار کو اس حادثہ اور عہد شکنی کی اطلاع پہونچا دے۔ اس نے مدینہ پہونچکر اشعار کے ذریعہ اپنی قوم کا مرثیہ پڑھا اور سرکار سے فریاد کی جس کے نتیجہ میں آپ نے نصرت کا وعدہ کر لیا۔ بنی خزاعہ نے بُدیل بن ورقا کو بھی احتیاطاً سرکار کے پاس بھیجدیا اور انھوں نے بھی مظالم کی تصدیق کر دی۔

ادھر قریش کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا اور ابوسفیان کو قاصد بنا کر بھیجدیا کہ رسول اکرمؐ سے معاہدہ صلح کی تجدید کرے اور ہونے والے واقعات کو نظر انداز کرنے کا مطالبہ کرے۔ ابوسفیان تیز رفتاری سے روانہ ہوا کہ بنی خزاعہ سے پہلے مدینہ پہونچ جائے لیکن راستہ میں بُدیل کو آتے دیکھ لیا۔ ان سے پوچھا کہ مدینہ سے آرہے ہو؟ انھوں نے توریہ کیا لیکن ابوسفیان کو شبہ ہو گیا اور اس نے مینگنیوں کو توڑ کر مدینہ کی غذا کے اثرات کو دیکھ لیا اور یقین کر لیا کہ بُدیل سرکار سے مل کر واپس آرہے ہیں۔

بہرحال مدینہ پہونچکر ابوسفیان نے خانۂ رسولؐ میں اپنی بیٹی ام حبیبہ سے ملاقات کرنا چاہی جو شوہر کے ہجرت حبشہ میں عیسائی ہو جانے یا مر جانے کی بنا پر رسول اکرمؐ کی زوجیت میں آچکی تھیں۔ انھوں نے باپ کو رسولؐ کے بستر سے یہ کہہ کر اُٹھا دیا کہ تو مشرک اور نجس ہے اور یہ رسول اللہ کا بستر ہے۔ ابوسفیان نے حیرت زدہ ہو کر اس بداخلاقی کا شکوہ کیا۔ ام حبیبہ نے کہا کہ پروردگار نے ہمیں اسلام کی ہدایت دے دی ہے اور تو ابھی تک پتھروں کی پوجا کر رہا ہے۔ بیحد شرم کی بات ہے؟

ابوسفیان ناراض ہو کر گھر سے باہر نکل آیا اور بعض صحابہ کے ذریعہ رسولؐ تک پہونچنا چاہا۔ جب سب نے معذرت کر لی تو حضرت علیؑ اور ان کے گھر والوں کو واسطہ بنانا چاہا۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت ایک ہی راستہ ہے کہ تو مکہ میں مسلمانوں کے لئے امان کا اعلان کر دے شاید اس طرح رسول اکرمؐ کا غصہ کم ہو جائے۔ اس نے اعلان کر دیا اور مکہ چلا آیا۔ یہاں آکر قصہ بیان کیا تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا رسولؐ سے بھی کوئی بات ہوئی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ احمق تجھے علیؑ نے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر لیا اور تجھے ہوش بھی نہیں آیا۔

اب قریش نے میٹنگ کر کے دوسرا راستہ نکالنا شروع کر دیا۔ اُدھر رسول اکرمؐ نے مکہ مکرمہ کے لئے دس ہزار کا لشکر تیار کر لیا اور پروردگار سے دعا کی کہ کسی کو اس تیاری کی اطلاع نہ ہونے پائے۔

اس لشکر کی تفصیلات کچھ یوں تھیں:

مہاجرین ۔ سات سو مجاہدین ۔ تین سو گھوڑے ۔ تین پرچم

انصار ۔ ۴ ہزار مجاہدین ۔ ۵۰۰ گھوڑے ۔ متعدد پرچم

قبیلہ مزینہ ـ ہزار سپاہی ـ ۱۰۰۰ گھوڑے ـ سو زرہ اور دو پرچم
قبیلہ جہینہ ـ ۸۰۰ سپاہی ـ ۵۰ گھوڑے ـ چار پرچم
قبیلہ بنی کعب ـ ۵۰۰ سپاہی ـ تین پرچم
ان کے علاوہ قبیلہ غفار ـ اشجع اور بنی سلیم کے افراد بھی تھے ـ

(مغازی واقدی ۲/۸۰۰)

ـ سرکار دو عالمؐ کی مکمل رازداری کے باوجود آپ کے ایک صحابی حاطب بن بلتعہ نے آپ کی تیاری کی اطلاع کفار قریش کو کر دی اور سارہ نامی ایک عورت کے ذریعہ ایک خط بھیجدیا ـ اِدھر وحی پروردگار نے آپ کو اس راز سے باخبر کر دیا اور آپ نے حضرت علیؑ، مقداد اور زبیر کو اس عورت کی گرفتاری کے لئے روانہ کر دیا ـ ان حضرات نے راستہ میں اسے روکا ـ اس نے ایسی قسمیں کھائیں کہ زبیر مطمئن ہو گئے لیکن حضرت علیؑ نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ غلط نہیں فرما سکتے ہیں اور یہ کہہ کر تلوار کھینچ لی جس کے بعد عورت نے سر کے جوڑہ سے پرچہ نکال کر دے دیا اور آپ سرکار دو عالمؐ کی خدمت میں لے آئے آپ نے مجمع اصحاب میں راز کو فاش کیا تو حاطب نے جُرم کا اقرار کر لیا اور یہ معذرت کی کہ میرے گھر والے مکہ میں اذیت کا شکار تھے تو میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں تاکہ وہ لوگ مصائب سے محفوظ ہو جائیں ـ عذر غیر معقول تھا لیکن اسلام معافی کے قانون میں ہمیشہ فراخدلی سے کام لیتا ہے لہٰذا سرکار دو عالمؐ نے صحابیت کے عمومی کردار کا بھی اظہار کر دیا اور حاطب کو معاف بھی کر دیا ـ

ـ ۱۰ رمضان ۸ھ کو بنی غفار کے ایک شخص کو مدینہ کا ذمہ دار بنا کر سرکار دو عالمؐ دس ہزار کے لشکر کے ساتھ روانہ ہو گئے ـ آبادی سے باہر نکل کر آپ نے روزہ توڑ دیا لیکن یہاں بھی بعض اصحاب نے آپ سے اختلاف کیا اور افطار نہ کیا تو آپ نے انھیں عاصی اور نافرمان کے لقب سے یاد فرمایا ـ (السیرۃ الحلبیہ ۳/۹۰، مغازی ۲/۸۰۲)

اُدھر ہجرت کے بعد بعض مصالح کی بنا پر عباس بن عبد المطلب مکہ میں رہ گئے تھے تاکہ وہاں کے حالات سے باخبر کرتے رہیں اور جب کام مکمل ہو گیا تو مدینہ کا رُخ کیا ـ اُدھر سرکار دو عالمؐ کا لشکر آ رہا تھا اور راستہ ہی میں ملاقات ہو گئی تو پھر دوبارہ حضور کے ساتھ آ گئے ـ

آپ مکمل رازداری سے سفر کرتے ہوئے مکہ کے قریب پہونچ گئے اور وہاں پڑاؤ ڈال کر اپنی ہیبت و جلالت کا اظہار کیا تو ابوسفیان وغیرہ دریافت حال کے لئے نکل آئے ـ عباس نے بڑھکر ابوسفیان کو ہیبت اسلام سے باخبر کیا اور امان دلانے کے وعدہ پر اپنے خچر پر سوار کر لیا حضرت عمر نے دیکھ کر قتل کا مشورہ دیا لیکن عباس امان کا حوالہ دے کر حضور کے پاس لے آئے ـ آپ نے صبح کے وقت حاضری کا حکم دے دیا اور صبح کو عباس دوبارہ لے کر آئے تو فرمایا :

ابوسفیان تجھے توحید خدا کا یقین آیا یا نہیں ؟
اس نے کہا بے شک کوئی دوسرا خدا ہوتا تو آج میرے کام آتا ـ
فرمایا، رسالت کے بارے میں کیا خیال ہے ؟
کہا، اس میں ابھی شک باقی ہے ـ
عباس نے فوراً بات کاٹ دی اور کہا ظالم جان کی فکر کر ؟
ابوسفیان نے صورت حال کا رُخ دیکھ کر اسلام قبول کر لیا اور اس طرح ایک بڑی جنگ کا خطرہ ٹل گیا ـ

ـ پھر عباس نے سفارش کی کہ ابوسفیان لالچی ہے ـ اسے اسلام کی کوئی قیمت دیدیجئے ـ آپ نے فرمایا کہ "جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے اس کے لئے امان ہے ـ جو اپنے دروازہ کو بند کر لے اس کے لئے امان ہے ـ جو اسلحہ رکھ دے اس کے لئے امان ہے اور جو مسجد میں پناہ لے لے اس کے لئے امان ہے" ـ تاکہ ابوسفیان خوش بھی ہو جائے اور یہ بھی اندازہ ہو جائے کہ آج کے نو مسلم خانۂ خدا کی پناہ میں رہنا چاہتے ہیں یا ابھی بھی ابوسفیان ہی کی پناہ میں رہنا چاہتے ہیں ـ

ـ اس کے بعد آپ نے عباس کو حکم دیا کہ ابوسفیان کو اپنے محاصرہ میں رکھیں اور اسے شوکت اسلام کا مشاہدہ کرائیں ـ

مسلمانوں کے لشکر گذرنے لگے اور ابوسفیان کا دم نکلنے لگا ـ یہاں تک کہ جب سرکار دو عالمؐ پانچ ہزار سپاہیوں کے حلقہ میں ناقہ قصویٰ پر سوار ہو کر گذرے تو ابوسفیان بدحواس ہو گیا اور کہنے لگا :

عباس! تمھارے بھتیجہ کا ملک کس قدر ترقی کر گیا ہے۔

عباس نے فرمایا بدبخت یہ ملک نہیں ہے نبوّت ہے۔

اس کے بعد سرکار دو عالمؐ مکہ کے اندر داخل ہوئے۔ خانۂ کعبہ کے قریب پہونچکر دیوار کعبہ پر نصب تمام بُتوں کو گرادیا اور بعض بُتوں کو گرانے کے لئے حضرت علیؑ کو اپنے کاندھوں پر بلند کیا اور انھوں نے ان بُتوں کو توڑ پھوڑ کر ان کی خدائی کو خاک میں ملا دیا۔ خانۂ کعبہ میں داخل ہوکر آپ نے شکر کا سجدہ کیا اور در کعبہ پر کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ پروردگار نے اپنے وعدہ کو پورا کر دیا ہے۔ اس موقع پر آپ نے طواف اپنے ناقہ قصوا پر سوار ہوکر کیا ہے اور برابر تکبیر کی آوازیں فضا میں گونجتی رہی ہیں۔

اسی موقع پر آپ نے کفار کے مجمع سے خطاب کر کے فرمایا کہ مجھ سے کیا توقع کرتے ہو؟ سب نے کہا کہ آپ کریم ابن کریم ہیں۔ آپ سے سوائے خیر کے کیا امید کیجا سکتی ہے! جس کے بعد آپ نے طلقاء کا خطاب دے کر عام معافی کا اعلان کر دیا اور بلال نے بام کعبہ پر اذان کی آواز بلند کر دی۔

اس موقع پر سرکارؐ نے مسجد الحرام میں ایک تاریخی خطبہ بھی ارشاد فرمایا تھا جس میں حسب ذیل حقائق کا اعلان فرمایا تھا:

ایہا الناس! اللہ نے جاہلیت کی نخوت اور آبار و اجداد پر تفاخر کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔ تم سب آدم سے ہو اور آدم خاک سے بنے تھے۔ بہترین بندہ خدا بندہ متقی و پرہیزگار ہے۔ انسان کی دو ہی قسمیں ہیں۔ متقی جو خدا کی بارگاہ میں محترم ہے اور فاسق و فاجر جس کی کوئی عزت نہیں ہے۔ مسلمان آپس میں ایکدوسرے کے بھائی ہیں اور سب مل کر ایک ہاتھ کی حیثیت رکھتے ہیں . . . . .“۔

مجرمین کا انجام

یوں تو سرکار دو عالمؐ نے مجرمین کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا تھا لیکن دس افراد ایسے تھے جن کے بارے میں یہ اعلان فرمادیا تھا کہ ان کا قتل بہرحال ضروری ہے چاہے غلاف کعبہ

ہی سے کیوں نہ وابستہ ہو جائیں۔ ان کے افراد کے اسما یہ ہیں:

عکرمہ بن ابی جہل۔ ہبار بن الاسود۔ عبداللہ بن ابی سرح۔ مقیس بن حبابہ کندی۔ حویرث بن نفیل۔ عبداللہ بن خطل۔ صفوان بن امیہ۔ وحشی بن حرب (قاتل جناب حمزہؓ) عبداللہ بن زبعری۔ حارث بن طلالہ۔

اس کے علاوہ چار عورتیں بھی تھیں:

ہند بن عتبہ۔ سارہ۔ قریبہ۔ فرتنا

عمومی معافی کے مقابلہ میں ان افراد کے قتل کا حکم اس بات کی علامت ہے کہ اسلام اپنے مجرمین کو معاف کر سکتا ہے لیکن جن کے جرائم کا تعلق دوسرے بندگان خدا سے ہے انھیں کسی قیمت پر معاف نہیں کیا جا سکتا ہے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

صدائے ناقوس

حرث اعور کا بیان ہے کہ میں مقام حیرہ میں امیرالمومنینؑ کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک دَیر سے ایک نصرانی کے ناقوس (سنکھ) بجانے کی آواز سنائی دی۔ آپ نے فرمایا کہ حرث تمھیں معلوم ہے کہ یہ ناقوس کیا کہہ رہا ہے؟۔ حرث نے عرض کی کہ سرکار اللہ، اس کا رسولؐ اور رسول کے ابن عمؑ بہتر جانتے ہیں۔ میں ان اسرار کو کہاں سمجھ سکتا ہوں۔

فرمایا: یہ بے ثباتی دنیا کا مرثیہ پڑھ رہا ہے اور زبان حال سے انسانوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ سنو! اس ناقوس سے یہ آواز آرہی ہے:

سبحان اللہ حقاً حقاً — ان المولیٰ صمد یبقیٰ
یحلم عنا رفقاً رفقاً — لولا حلمہ کنا نشقیٰ
صدقا صدقا — ان المولیٰ یسئلنا
یوا فقنا یحاسبنا — یا مولانا لاتھلکنا
وتدارکنا واستخدمنا — واستخلصنا حلمک عنا
قدجرّانا عفوک عنا — ان الدنیا قد غرتنا
واشتغلتنا واستغوتنا — یا بن الدنیا مھلا مھلا
یا بن الدنیا دقادقا — تفنی الدنیا قرنا قرنا
ما من یوم یمضی عنا — الا یھویٰ منا رکنا
قد ضیعنا دار تبقیٰ — واستوطنتنا داراً تفنی
تفنی الدنیا قرنا قرنا — کلا موتیٰ دفنا دفنا

کلّا موتیٰ کلّا دفنا — کلا فیھا موتا دفناً
فنا وًا فیھا کلا موتیٰ — نقلاً نقلاً دفناً دفناً
یا بن الدنیا مھلا مھلا — زِنْ ما یاتی وزنا وزنا
لولا جھلی ما ان کانت — عندی الدنیا الّا سجنا
خیراً خیراً سیئاً حزنا — حزنا ماذا من ذاکم ذا
أَمْ ذا ترجو تنجو تخشیٰ — تردیٰ عجل قبل الموت الوزنا
ما من یوم یمضی عنا — الا اوھیٰ منا رکنا
ان الموتیٰ قد انذرنا
امنا نحشر عُزلانا

(سفینۃ البحار ۲/۶۰۸)

ابوطالبؑ اور عظمت کردار کی چہار دیواری

اسلامی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو پوری تاریخ اسلام کی چودہ صدیوں میں کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں ملتا ہے جس کو اس قدر عظمتیں نصیب ہوں جو جناب ابوطالب کو نصیب ہوئی ہیں اور جن عظمتوں نے ابوطالبؑ کو اس منزل پر پہونچا دیا ہے جہاں تک عام مسلمان کا طائرِ فکر بھی پرواز نہیں کر سکتا ہے۔

جناب ابوطالبؑ کے ذاتی مجاہدات اور خدمات ایک طرف ہیں۔ ان کا اعتراف تو مرنے کے بعد بھی رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے جب جنازہ کے ساتھ چلتے چلتے یہ فرما رہے تھے کہ "چچا خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے مجھے بچپنے میں پالا ہے اور کفار کے شر سے بچایا ہے" اور مسلمان تاریخ بھی اب تک ان خدمات کا انکار نہیں کر سکی ہے۔

ان سارے خدمات کے علاوہ پروردگار نے انھیں یہ شرف دیا ہے کہ انھیں عصمت وعظمت کی چہار دیواری میں ساکن بنا دیا ہے اور ان کے چاروں طرف عظمت کردار کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور ہر کردار دشمن کو زبان کھولنے سے روک رہا ہے اور ایمان ابوطالبؑ کی راہ میں سدِ سکندری بنا ہوا ہے جسے توڑنے کی مجال کسی کلمہ گو اور مسلمان میں نہیں ہے۔

جناب عبدالمطلبؑ

جناب ابوطالبؑ کے والد گرامی جن کی آغوش تربیت میں انھوں نے تربیت پائی ہے اور جنھوں نے وقت آخر ابوطالبؑ کو پیغمبر کی تربیت اور نگہداشت کا ذمہ دار قرار دیا تھا ان کے ایمانی کردار کا یہ عالم تھا کہ جب مکہ میں خانۂ کعبہ کا بچانے والا کوئی نہ تھا اور اللہ کا

گھر ابرہہ کے ہاتھوں تباہ ہو رہا تھا تو عبدالمطلب ہی تھے جنھوں نے ابرہہ کا سامنا کیا تھا اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا تھا کہ یہ گھر لاوارث نہیں ہے۔ اس کا ایک مالک ہے اور مالک بھی غافل و بے خبر یا بیکس و مجبور نہیں ہے بلکہ عنقریب وہ اپنے گھر کو بچالے گا جس کے بعد ابابیل کے لشکر نے آکر ابرہہ کی فوج کا خاتمہ کر دیا اور عبدالمطلب کی صداقتِ بیان اور عظمت کردار کھل کر سامنے آگئی اور دنیا نے دیکھ لیا جب بیت خدا کا بچانے والا کوئی نہ تھا تو عبدالمطلبؑ کام آئے تھے اور جب رسول خداؐ کا بچانے والا کوئی نہ تھا تو ابوطالبؑ کام آئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام کی احسان فراموش دنیا نے نہ اُس کردار کی قدر کی اور نہ اِس کردار کی عظمت کو پہچانا اور دونوں کو تاریخ کے اندھیروں میں ڈال دیا۔ اب اسلام کے واقعی مہر و ماہ وہ افراد ہیں جو اس وقت کفر کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے تھے اور اب اسلام کے آسمان پر چمک رہے ہیں۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

فاطمہؑ بنت اسد

جناب ابوطالبؑ کی عظمت کردار کی چہار دیواری میں ایک دیوار جناب فاطمہؑ بنت اسد کا کردار ہے جن کی عظمت اور دیانت و امانت کا اقرار ساری اسلامی دنیا نے کیا ہے اور آپ کے وہ فقرات آج بھی زینت تاریخ بنے ہوئے ہیں جو آپ نے حضرت علیؑ کی ولادت کے موقع پر دیوارِ کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر ادا کئے تھے:

"خدایا! میں تجھ پر ایمان رکھتی ہوں اور تیرے تمام رسولوں اور صحیفوں پر ایمان رکھتی ہوں۔ تجھے اس گھر کا اور اس کے معمار کا واسطہ اور اس مولود کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے میری مشکل کو آسان کر دے۔"

اور انھیں فقرات کی بنا پر سارا عالم اسلام ان کے اسلام و ایمان کا اعتراف رکھتا ہے اور کوئی اس موضوع پر بحث نہیں کرتا ہے جب کہ اسلام کا مسلہ ہے کہ اسلام و کفر میں رشتہ نہیں ہو سکتا ہے اور اگر رشتہ ہو گیا ہے اور بعد میں عورت مسلمان ہو جائے تو یہ رشتہ فوراً ختم ہو جائے گا اور اسلام کفر کا محکوم بن کر نہیں رہ سکتا ہے۔ اور یہ اسلام کا مسلہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے ایک

لمحہ کے لئے بھی یہ اشارہ نہیں دیا ہے کہ فاطمہؑ بنت اسد مومنہ ہیں یا ایمان لاچکی ہیں لہذا اب ان کے رشتہ کو ختم ہوجانا چاہیئے بلکہ آپ نے ہمیشہ انھیں چچی جیسا درجہ دیا اور ان کے رشتۂ ازدواج کا لحاظ رکھا جو اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے ابوطالبؑ کے اسلام وایمان کو مستند قرار دیا تھا ورنہ آپ کا فرض تھا کہ اس رشتہ کا خاتمہ کراتے اور خاتمہ ممکن نہ ہوتا تو کم سے کم اس کے بقاء و دوام کا اعلان نہ کرتے۔

سرکار دو عالمؐ

پروردگار عالم نے اپنے پیغمبرؐ کو اس قدر بے نیاز بنایا تھا کہ ان کی گردن پر کسی کا احسان نہیں رکھا ہے اور ساری کائنات کو ان کا ممنون کرم رکھا ہے۔ یہاں تک کہ ہجرت کے موقع پر جب قریب ترین صحابی ابوبکر نے اپنا اونٹ پیش کرنا چاہا تو آپ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ نبیؐ کسی کا احسان نہیں لیتا ہے اور پھر اس کے بعد اس نظریہ کی عملی تفسیر کے لئے ان کی دو سو کی اونٹنی کو نو سو درہم میں خرید فرمایا تاکہ منّت واحسان کا کوئی شائبہ بھی نہ رہ جائے جبکہ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ ابوطالبؑ نے دادا کے انتقال کے بعد سے مسلسل آپ کی تربیت کی ہے۔ آپ کو دشمنوں کے شر سے بچایا ہے۔ اپنے پاس سے کھلایا پلایا ہے۔ اپنے بچوّں کو آپ کے بستر پر لٹا کر آپ کی جان بچائی ہے اور اس طرح کے مسلسل احسانات کئے ہیں اور آپ نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں فرمایا کہ نبیؐ کسی کا احسان نہیں لیتا ہے تو جب وہ رسولؐ جو صحابی کا احسان قبول نہیں کرتا ہے۔ کسی کے احسان کو قبول کرلے تو اس کے اسلام وایمان کا کیا ذکر ہے۔ وہ ہر "سابق الاسلام" سے پہلے مسلمان ہے اور ہر "مرد مومن" سے پہلے صاحب ایمان ہے اور شائد اسی حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے پروردگار نے اسے "کل ایمان" کا باپ بنادیا تھا تاکہ جو صاحب ایمان بھی اس کے ایمان کا انکار کرے وہ ناخلف اولاد کہا جائے اور اس کی عظمت ایمان پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔

اولاد ابوطالبؑ

جناب ابوطالبؑ کی عظمت کردار کی چوتھی دلیل ان کی اولاد ہے جن کی تاریخ میں کوئی

مثال نہیں ہے۔ ابوطالبؑ کو پروردگار نے براہ راست یہ اولاد عنایت کی تھی طالب، عقیل، جعفر، علیؑ۔ امّ ہانی۔

طالبؔ کا تفصیلی تذکرہ تاریخ میں نہیں ہے لیکن جس قدر بھی ہے وہ ان کی عظمت کردار کی دلیل ہے۔

عقیلؔ وہ مرد باخبر وصاحب بصیرت تھے جن کے علم انساب سے لوگ خوف زدہ رہا کرتے تھے اور جن سے اپنے عقد کے موقع پر باب مدینۃ العلم نے بھی مشورہ کیا تھا۔

جعفؔر وہ مرد مجاہد ہیں جنھوں نے اسلام کے پہلے وفد کی قیادت کی ہے اور عیسائی دنیا میں تہلکہ برپا کردیا ہے۔ ان کے مرتبہ کے لئے ان کا طیّار ہونا ہی کافی ہے۔

علیؑ وہ صاحب کردار اور کل ایمان ہیں جن کے بارے میں سرکار دو عالمؐ کا صریحی ارشاد ہے کہ انسان وجنّات مل کر بھی ان کے فضائل کا حساب کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے ہیں۔

اور شاید اسی لئے آیت مباہلہ نے انھیں نفس رسولؐ کا خطاب دے دیا تھا کہ جس طرح رسولؐ کے کمالات کا احصاء ناممکن ہے اسی طرح علیؑ کے فضائل کا شمار کرنا بھی ناممکن ہے۔

امّ ہانؔی وہ مقدس خاتون ہیں جن کے گھر کو پروردگار نے معراج کی بنیاد بنادیا تھا اور اپنے حبیب کو معراج کی منزلوں میں انھیں کے گھر سے بلایا تھا۔

شہداء کربلا

حضرت ابوطالبؑ کی بلاواسطہ اولاد کے بعد اگر ان کی نسل کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ جس قدر قربانیاں اسلام کی راہ میں اولاد ابوطالبؑ نے دی ہیں دنیا کی کسی نسل اور کسی ذریت نے نہیں دی ہیں۔ حد یہ ہے کہ اگر کربلا کی قربانیوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ بھی تمامتر اولاد ابوطالبؑ ہی کی قربانیاں ہیں اور ان کے علاوہ بنی ہاشم میں کوئی نہیں ہے۔

قدرت نے بھی ابوطالبؑ کے اس شرف کو اس قدر نمایاں کیا کہ ترتیب شہدا میں بھی ابوطالبؑ کے خدمات و مجاہدات کا مکمل لحاظ رکھا اور ہر قربانی کو عظمت ابوطالبؑ کی ایک دلیل بنا دیا۔

کربلا میں بنی ہاشم کی قربانیوں میں پہلا نام علی اکبرؑ کا آتا ہے۔ ان کے تقدم کا ایک راز تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ شبیہ پیغمبرؐ تھے اور امام حسینؑ ان کے ذریعہ دشمنوں پر حجت تمام کرنا چاہتے تھے اور دنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ جو قوم شبیہ پیغمبرؐ پر رحم نہ کرے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ایک امکان یہ بھی ہے کہ یہ بھی ابوطالبؑ کے خدمات کا ایک اثر ہو کہ ان کی معنوی اولاد میں سب سے پہلا نام سرکار دو عالمؐ کا ہے جنھیں ابوطالبؑ نے اولاد کی طرح پالا تھا اور جو انھیں اپنا باپ کہہ کر یاد فرماتے تھے۔ لہٰذا قدرت نے چاہا کہ جب اولاد ابوطالبؑ منزل قربانی میں قدم رکھے تو سب سے پہلے سب سے بڑے معنوی فرزند کی قربانی اس کی شبیہ کی شکل میں پیش کی جائے، اس کے بعد دیگر قربانیوں کی باری آئے۔

جناب ابوطالبؑ کی براہ راست اولاد میں طالب کے بعد پہلے صاحب اولاد جناب عقیل تھے لہٰذا سب سے پہلے اولاد عقیل نے قربانی دی۔ عبداللہ بن مسلم بن عقیل۔ محمد بن مسلم بن عقیل۔ جعفر بن عقیل۔ عبدالرحمٰن بن عقیل۔ عبداللہ اکبر بن عقیل۔ محمد بن سعید بن عقیل۔ جعفر بن محمد بن عقیل۔ احمد بن محمد بن عقیل۔

اس کے بعد دوسرے فرزند جناب جعفر طیار تھے لہٰذا اولاد عقیل کے بعد اولاد جعفر طیّار نے قربانی پیش کی عون بن عبداللہ بن جعفر۔ محمد بن عبداللہ بن جعفر۔

اس کے بعد آخری فرزند مولائے کائناتؑ تھے تو ان کی اولاد کی باری آئی اور آپ کی اولاد میں پہلے امام حسنؑ تھے لہٰذا پہلے ان کی اولاد کام آئی قاسم بن الحسن۔ عبداللہ بن الحسن۔ احمد بن الحسن۔

اس کے بعد امام حسنؑ کے دوسرے بھائیوں کی باری آئی عمر بن علیؑ۔ عثمان بن علیؑ۔ جعفر بن علیؑ۔ عباسؑ بن علیؑ۔

آخر میں امام حسینؑ نے اپنی قربانی پیش کی لیکن امام حسینؑ پورے جہاد کے سربراہ تھے لہٰذا انھوں نے اپنی قربانی سے پہلے اس دستاویز شہادت پر آخری مہر لگا دی تا کہ کوئی انصاف پسند اس مظلومیت اور معصومیت پر کسی طرح کا شک نہ کر سکے اور جس طرح طویل ترین دستاویز پر بھی مہر چھوٹی ہی لگائی جاتی ہے اسی طرح آپ نے دستاویز شہادت پر چھ ماہ کے بچہ علی اصغرؑ کی شہادت کی مہر لگا دی اور جب دستاویز مکمل و مستند ہو گئی تو اسے لیکر بارہ احدیت میں حاضر ہو گئے۔ "الٰهی رضا برضاك وصبراً علیٰ بلائك وتسليماً لأمرك يا غياث المستغيثين"۔

روحی وارواح العالمین له الفداء والسّلام علیٰ من اتبع الهدیٰ۔

سلمان فارسی

نقش زندگانی

نام ۔ سلمان

کنیت ۔ ابوعبداللہ ۔ ابوالحسن ۔ ابواسحاق

ولادت ۔ صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکی ہے ۔ وفات البتہ ۳۳ھ میں مدائن میں ہوئی ہے اور وہیں دفن ہوئے ہیں ۔

عمر مبارک ۔ تین سو سال یا اس سے کچھ کم یا زیادہ ۔

پیشہ ۔ ابتدائے زندگی سے گورزی تک کھجوروں کی چٹائی تیار کر کے بیچا کرتے تھے اور اسی سے اپنا آذوقہ فراہم کرتے تھے ۔

مکان ۔ ایک مدت تک درخت اور مکانات کے زیر سایہ زندگی گذارتے رہے جب لوگوں نے بیحد اصرار کیا تو ایک معمولی مکان بنا لیا ۔

والد محترم ۔ ایک دیہاتی آدمی تھے جو اصفہان کے ایک قریہ کے رہنے والے تھے اور جناب سلمان کی وہیں ولادت ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود تمام مذہبی کتابوں کا علم حاصل کیا اور انھیں معلومات کی روشنی میں تلاشِ پیغمبرؐ میں نکل پڑے ۔ امام صادقؑ نے آپ کو علم کا بحرِ ناپیدا کنار قرار دیا ہے اور آپ نے انھیں علوم کی بنا پر خوارج کے حالات اور کربلا کے واقعات کی قبل از وقت خبر دے دی تھی ۔

منزلت

• صاحب استیعاب نے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ اگر دین ستارہ ثریا پر ہوتا

تو سلمان اسے بہر حال حاصل کر لیتے ۔ (حاشیہ اصابہ ۲/ ۵۸)

• ام المومنین عائشہ کا بیان ہے کہ سلمان کے لئے رسول اکرمؐ کی خدمت میں ایک وقت معین تھا جب وہ سرکار سے مستقل استفادہ کیا کرتے تھے ۔ یہانتک کہ ان کا تقرب ہم سے بھی کچھ زیادہ ہو گیا تھا ۔ (استیعاب حاشیہ اصابہ ۲/ ۵۹)

• امام صادقؑ کا ارشاد ہے کہ رسول اکرمؐ اور مولائے کائنات نے انھیں وہ علوم تعلیم کئے تھے جس کا متحمل کوئی دوسرا شخص نہیں تھا ۔ جناب فاطمہؑ نے بھی آپ کو ایک مخصوص دعا تعلیم کی تھی ۔

• امام صادقؑ ہی نے منصور بن بزرج سے فرمایا تھا کہ انھیں سلمان فارسی نہ کہو ۔ سلمان محمدی کہو ۔

اسلام و آزادی

کہا جاتا ہے کہ جناب سلمان کی ابتدائی زندگی غلامی کی زندگی تھی اور دس افراد کی غلامی کے بعد رسول اکرمؐ کی غلامی میں آئے تھے اور آپ نے انھیں آزاد کرایا تھا ۔ اسی غلامی کے سہارے اپنے علاقہ سے حجاز اور حجاز میں مدینہ تک پہونچے ۔

پہلی ملاقات رسول اکرمؐ سے مقام قبا میں ہوئی جہاں آپ نے صدقہ کے خرمے پیش کئے اور آپ نے اصحاب کو دیدیئے ۔ دوسری ملاقات مدینہ کے اندر ہوئی جہاں ہدیہ کے خرمے پیش کئے اور حضورؐ نے نوش فرمالئے ۔ جس کے بعد یقین ہو گیا کہ یہ نبی آخر الزماں ہیں اور پھر بقیع میں ایک جنازہ کی مشایعت میں مُہرِ نبوت بھی دیکھ لی اور جمادی الاولیٰ ۱ھ میں اسلام کا اعلان کر دیا ۔

آزادی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۵ھ میں جنگ خندق کے بعد آزاد ہوئے ہیں اور اسی لئے جنگ بدر و احد میں شریک نہیں ہو سکے ہیں ۔ لیکن اس میں تینوں باتیں قابلِ اشکال ہیں :

۱۔ جنگ خندق کا مسئلہ خود بھی اختلافی ہے ۔ علامہ نودی نے شرح مسلم میں اسے ۴ھ

میں قرار دیا ہے۔ (حاشیہ ارشاد الساری ۸/۲۴)
ولی الدین عراقی کا دعویٰ ہے کہ جنگ خندق سنہ ۵ھ ہی میں مشہور ہے۔ (تاریخ خمیس ۱/۴۸۰، المواہب اللدنیہ ۱/۱۱۰)

ان حضرات کے علاوہ تقریباً دس مصنفین نے اپنی کتابوں میں اسی قول کو اختیار کیا ہے اور ابن خلدون کا تو اس بات پر شدید اصرار بھی ہے۔

۲۔ بعض روایات کی بنا پر آپ مکہ ہی میں آزاد ہو گئے تھے۔ (مستدرک حاکم ۳/۶۰۲)

صاحب نفس الرحمان کے قول کی بنا پر آپ سنہ ۱ھ میں اسلام لانے کے فوراً بعد آزاد ہو گئے تھے اور رسول اکرمؐ نے آپ کو اسی وقت خرید لیا تھا بلکہ بعض روایات کی بنا پر آپ ہی نے ابو بکر کو اسلام لانے کا مشورہ مکہ کی زندگی میں دیا تھا۔

۳۔ کتاب سلیم بن قیس میں اس امر کی صراحت پائی جاتی ہے کہ آپ جنگ بدر و احد میں بھی شریک ہوئے تھے اور شاید اسی لئے حضرت عمر نے آپ کا وظیفہ پانچ ہزار قرار دیا تھا جو اہل بدر کا مخصوص وظیفہ تھا۔

بعض مصنفین نے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے سلمان سے فرمایا کہ تم اپنے مالک سے آزادی کا سودا کر لو اور جب انھوں نے تین سو کھجور طے کر لئے تو حضورؐ نے اصحاب سے چندہ کرا کے سلمان کو آزاد کرا لیا اور وہ جنگ خندق میں شریک ہو گئے۔

حالانکہ یہ بات اس دستاویز آزادی کے سراسر خلاف ہے۔ آزادی کا سودا رسول اکرمؐ نے کیا ہے اور ساری قیمت آپ ہی نے ادا کی ہے۔ اس میں اصحاب کا کوئی دخل نہیں ہے اور وہ اس طرح کہ رسول اکرمؐ گٹھلی زمین میں بوتے جاتے تھے اور حضرت علیؑ پانی دیتے جاتے تھے اور درخت تیار ہوتا جاتا تھا۔ چالیس وقیہ سونا بھی آپ نے ایک پتھر کو سونا بنا کر ادا کیا ہے۔ (نفس الرحمان ص ۲۱، بحار ۲۲/۳۶۷، اکمال الدین ص ۱۶۵)

مجمع الزوائد ۹/۳۳۷ کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے بیج بونا شروع کئے لیکن جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو رسول اکرمؐ نے اپنے دست مبارک سے گٹھلیاں زمین میں دفن کیں (اور مولائے کائنات نے سقایت کا فرض انجام دیا)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جناب سلمان کو آزاد کرانے کا کام رسول اکرمؐ نے انجام دیا ہے۔ اسی لئے مورخین نے آپ کو موالی رسول اکرمؐ میں شمار کیا ہے۔ (رجال ابو داؤد ص ۱۷۵، طبری طبع استقامہ ۲/۴۹۹، شرح نہج البلاغہ معتزلی ۱۸/۳۴، حلیۃ الاولیاء ۱/۱۹۵، استیعاب بر حاشیہ اصابہ ۲/۵۷)

خود جناب سلمان نے عمر بن الخطاب کے خط میں اپنے کو "مولیٰ رسول اللہ" قرار دیا ہے اور ابن عباس نے خواب میں دیکھ کر سوال کیا تھا کہ کیا آپ غلام پیغمبرؐ نہیں ہیں؟ اور انھوں نے تصدیق کی تھی کہ بے شک!۔
(نفس الرحمان ص ۲۱)

جس کے بعد تاریخ دمشق ۱/۴۶۹ یا مستدرک حاکم ۳/۵۹۹ کی اس روایت کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی ہے کہ آپ کو حضرت ابو بکر نے خرید کر آزاد کیا ہے۔
— جناب سلمان کے اسلام کے بارے میں سرکاری روایات سے قطع نظر کر لیا جائے تو حقیقت امر یہ ہے کہ آپ نے مکہ میں اسلام قبول کیا تھا اور آپ ہی نے رسول اکرمؐ سے گذارش کی تھی کہ اجازت دیں تو ابو بکر کو اسلام کی دعوت دی جائے کہ وہ بچوں کے معلم ہونے کی بنا پر گھروں میں اچھا اثر رکھتے ہیں اور آپ نے اس رائے کو پسند فرمایا تو جناب سلمان نے انھیں اسلام کی طرف راغب کیا۔
(نفس الرحمان ص ۴۸، کشکول عبیدلی)

اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ایک اعرابی نے سلمان کے بارے میں رسول اکرمؐ سے سوال کیا کہ کیا وہ مجوسی نہیں تھے؟ آپ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ انھوں نے اپنے ایمان کو چھپا کر رکھا تھا اور اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ (اختصاص ص ۲۲۲۔ بحار ۲۲/۳۴۷۔ قاموس الرجال ۴/۴۲۹۔ نفس الرحمان ص ۴)

زہد و تقویٰ

زہد کا عام تصور یہ ہے کہ انسان کی زندگی بالکل خشک اور سادہ ہو جائے اور

وہ مال دنیا سے بیزار اور متنفر ہو جائے حالانکہ واقعیت اس کے بالکل برخلاف ہے — مولائے کائنات نے ارشاد فرمایا ہے کہ "زہد یہ نہیں ہے کہ تم کسی شے کے مالک نہ ہو۔ زہد یہ ہے کہ کوئی شے تمھاری مالک نہ بننے پائے"۔

سلمان مولائے کائنات کے مکتب فکر کے عظیم ترین شاگرد اور پروردہ تھے۔ لہٰذا جب ان سے کہا گیا کہ آپ اپنا آذوقہ کیوں ذخیرہ کرتے ہیں۔ اگر کل مر گئے تو اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ — تو انھوں نے فرمایا کہ تم فنا کے بارے میں کیوں سوچتے ہو۔ بقا کی امید کیوں نہیں رکھتے ہو؟ — یاد رکھو انسان معیشت کی طرف سے مطمئن رہتا ہے تو نفس اسے دھوکہ نہیں دے پاتا ہے۔ (قاموس الرجال ۴/۴۲۵)

لیکن اس صورت حال کے باوجود سلمان کی زندگی اس قدر سادہ تھی کہ جب مدائن میں آگ لگی تو وہ گھر سے قرآن اور تلوار لے کر نکل گئے اور باقی سامان کی کوئی فکر نہ کی اور صاف اعلان کر دیا کہ ہلکا سامان رکھنے والے ہی نجات یافتہ ہوتے ہیں۔ (قاموس الرجال ۴/۴۲۵، نفس الرحمان ص ۱۴۰)

اس واقعہ سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ سلمان کی نگاہ میں انسان کی زندگی کے لئے تلوار اور آخرت کے لئے قرآن ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی سامان کا رہنا اور نہ رہنا کوئی فرق نہیں رکھتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ انسان زندگی کو سنوارنے کے لئے قرآن کا محتاج ہے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تلوار کا محتاج ہے۔ نفی و اثبات کی ان دو طاقتوں کے جمع ہو جانے کے بعد پھر کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔

سلمان، قرآن اور تلوار دونوں کے موارد اور منافع سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ اسی لئے خندق کے موقع پر سرکار دو عالمؐ نے خندق کھودنے کا حکم انھیں کے مشورہ پر دیا تھا۔ (انساب الاشراف بلاذری ۱/۳۴۳، طبری ۲/۵۶۶، مغازی واقدی ۲/۴۴۵)

طائف میں منجنیق نصب کرنے کا مشورہ بھی سلمان ہی نے دیا تھا۔ (انساب الاشراف ۱/۳۶۶)

مسلمانوں نے اکثر جنگوں میں فتوحات کا قائد سلمان ہی کو قرار دیا تھا۔ (مسند احمد ۵/۴۴۴، حلیۃ الاولیاء ۱/۱۸۹)

مِنّا اھل البیت

سرکار دو عالمؐ کے اس ارشاد کے بارے میں دو روایات پائی جاتی ہیں:

ایک روایت یہ ہے کہ جب سلمان نے خندق کھودنے میں انصار و مہاجرین سے زیادہ کام کیا اور انھوں نے ان کے کام کو اپنے حساب میں درج کرنا چاہا تو رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ سلمان کا حساب نہ انصار میں ہے نہ مہاجرین میں۔ "سلمان ہم اہل بیت سے ہیں"۔ (طبقات ابن سعد ۴ ق ۱/۵۹، اسد الغابہ ۲/۲۳۱، نفس الرحمان ص ۲۴)

دوسری روایت یہ ہے کہ سلمان بزم پیغمبرؐ میں وارد ہوئے اور اصحاب نے انھیں صدر محفل میں جگہ دے دی تو عمر نے فوراً اعتراض کر دیا کہ یہ عجمی عربوں کا صدر کس طرح ہو گیا ہے۔ تو رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ انسان سب کنگھی کے دانوں جیسے ہیں، عرب و عجم کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ فضیلت صرف تقویٰ سے ہے۔ سلمان خشک نہ ہونے والا سمندر اور تمام نہ ہونے والا خزانہ ہے۔ سلمان ہم اہل بیت سے ہیں۔ (اختصاص ص ۳۴۱، نفس الرحمان ص ۲۹)

پہلی روایت اگرچہ زیادہ مشہور ہے لیکن دوسری بھی قرین قیاس ہے کہ حضرت عمر کی زندگی میں عرب و عجم کا تفرقہ آخری منزل تعصب پر پہونچا ہوا تھا اور رسول اکرمؐ کا فرض منصبی تھا کہ اس تصور کی مکمل تردید فرماتے اور اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے۔

اس تعصب کی آخری حد یہ تھی کہ جناب سلمان نے امتحاناً حضرت عمر کی لڑکی سے عقد کا پیغام دیدیا تو انھوں نے صرف عجمیت کی بنا پر انکار کر دیا۔ (عیون الاخبار ابن قتیبہ ۳/۱۲۶۸، العقد الفرید ۶/۹۰، قاموس الرجال ۴/۴۲۷، نفس الرحمان ص ۱۴۱)

لمحۂ فکریہ

اس مقام پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے اختلاف نظر میں حضرت عمر نے

انھیں گورنر کیسے بنایا اور حضرت سلمان نے اسے قبول کیونکر کر لیا؟ ۔ لیکن اس کا جواب دو لفظوں میں یہ ہے کہ سلمان نے مولائے کائنات کے حکم سے قبول کیا تھا اور مولا یہ چاہتے تھے کہ دنیا کو میرے اصحاب کی صلاحیت کا علم ہو جائے اور اسلام کا واقعی نقشہ منظر عام پر آجائے اور حکومت کی مجبوری یہ تھی کہ اس کے پاس سلمان جیسی کوئی شخصیت نہیں تھی اور حکومت کے استحکام کے بعد اب کوئی خطرہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ علامہ ابن شہر آشوب کا خیال ہے کہ یہ جناب سلمان کے قتل کی ایک سازش تھی جس کی مثال محمد بن ابی بکر وغیرہ کی زندگی میں موجود ہے اور حکومتوں سے بعید بھی نہیں ہے۔ (الدرجات الرفیعہ ص ۲۱۵)

ابوذر غفاری اور عشقِ رسولؐ

سرکار دو عالمؐ نے بعثت کے بعد خفیہ دعوت اسلام کا سلسلہ شروع کیا اور کسی طرح حالات کا تقاضا نہیں تھا کہ اس دعوت کا اعلان کیا جائے۔ چنانچہ چند افراد نے اسلام قبول بھی کر لیا لیکن اس کا اعلان نہ ہو سکا۔ اتفاق سے جناب ابوذر (جُذب بن جُنادہ) مکہ مکرمہ آگئے اور انھوں نے رسول اکرمؐ کی رسالت کی خبر کے ساتھ قرآن مجید کی چند آیتیں بھی سُن لیں اور ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سرکار کی خدمت میں آکر اسلام قبول کر لیا۔

آپ چوتھے یا پانچویں شخص تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا اور اسی بنا پر آپ کا شمار سابقین اولین میں ہوتا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے سرکار دو عالمؐ سے دریافت کیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ۔ فرمایا کہ اپنے وطن واپس جاؤ۔ جب میری دعوت کا اعلان ہو جائے تو پھر آجانا۔

ابوذر نے عرض کی سرکار کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ لیکن آخر اس طرح اسلام کب تک مخفی رہے گا اور اس دعوت کا اظہار کس طرح ہوگا؟

آپ نے فرمایا کہ ابھی حالات خطرناک ہیں۔ افراد کم ہیں اور دشمن زیادہ۔ اذیت کا شدید ترین خطرہ ہے۔

ابوذر نے عرض کی حضور میں اس وقت تک واپس نہ جاؤں گا جب تک اسلام کا اعلان نہ ہو جائے۔ آپ اجازت دیں کہ یہ کام میں شروع کروں؟

آپ نے فرمایا کہ اس طرح شدید ترین اذیت کا اندیشہ ہے اور قتل ہو جانے کے

بھی امکانات ہیں۔

ابو ذر نے نہایت دلیری سے جواب دیا کہ اگر فقط مصائب اور قتل کا مسئلہ ہے تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں آج ہی اعلان کروں گا اور کفار کو پہلا چیلنج دیدوں گا۔

یہ کہہ کر مسجد الحرام میں آئے اور بلند آواز سے کلمۂ شہادتین زبان پر جاری کر دیا۔ کلمہ کا سُننا تھا کہ لوگ ٹوٹ پڑے اور بیحد زد و کوب کیا۔ یہانتک کہ قتل کا اندیشہ بھی پیدا ہوگیا کہ عباس بن عبد المطلب نے نہایت درجہ ہوشیاری سے آواز دی۔ قریش والو! تمھاری عقلوں کو کیا ہوگیا ہے؟ تمھارے قافلۂ تجارت ارض غفار سے بھی گذرتے ہیں۔ ان کے قبیلہ والے ناکہ بندی کر دیں گے۔ یہ سننا تھا کہ لوگوں نے جان بخش دی۔ لیکن ابو ذر اسی عالم میں دوسرے روز پھر مسجد میں آئے اور اسی طرح کا اعلان پھر کیا۔ کفار نے پھر زد و کوب کیا اور عباس نے پھر نجات دلائی۔

ایک روز ایک عورت کو خانہ کعبہ کے قریب بُتوں سے دعا کرتے دیکھ لیا تو فرمایا کہ احمق۔ جاہل۔ ان سے مانگتی ہے جو سُننے سمجھنے کے لائق بھی نہیں ہیں حاجت روائی کیا کریں گے۔ جس پر پھر ہنگامہ ہوگیا اور اس طرح مکہ کی فضا میں ایک عجیب و غریب دہشت پھیل گئی۔

سرکار دو عالمؐ نے دیکھا کہ ابو ذر کا مجاہدانہ مزاج کسی باطل کو برداشت نہیں کرپاتا ہے اور مکہ کے حالات ایسے اعلانات کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ لہٰذا آپ نے ابو ذر کو مبلغ بنا کر بھیج دیا۔ اور انھوں نے اپنی تبلیغ سے ایک مرتبہ میں نصف قبیلہ غفار کو مسلمان بنا لیا اور اس کے بعد اپنے کارِ تبلیغ کو مسلسل جاری رکھا۔ یہانتک کہ سرکار ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے اور ابو ذر آپ کی ہدایت کے مطابق خدمت سرکار میں آگئے اور تاحیات انھیں قدموں سے وابستہ رہے۔ یہانتک کہ ایک مرتبہ سرکار نے فرما دیا کہ "آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابو ذر سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے"۔ اور یہ ایسی سند ہے جس سے بالاتر کسی سند کا امکان نہیں ہے۔ اعلان اس پیغمبرؐ کی زبان سے ہوا ہے جسے جان کے دشمن اور خون کے پیاسوں نے بھی صادق تسلیم کیا ہے اور حکم الٰہی ہے کہ ہر مسلمان کو صادقین کیساتھ رہنا چاہیئے۔

۔ابو ذر کی تاریخ حیات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے اسلام میں باطل کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور سرکار دو عالمؐ نے بھی ان کے اس جذبۂ ایمانی و قربانی کی قدر کی ہے۔ ابو ذر کا یہی جذبہ احقاق حق تھا جو آخر حیات تک باقی رہا اور انھوں نے نہ مدینہ سرکار کی پرواہ کی اور شام کی حکومت کی۔ بلکہ ہر مقام پر احقاق حق کا فرض انجام دیتے رہے اور باطل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔

۔ابو ذر کا ایک شرف یہ بھی ہے کہ وہ سرکار دو عالمؐ کی طرف سے پہلے مبلغ اسلام ہیں جنھیں سرکار نے ان کے قبیلہ کی ہدایت کے لئے مکہ سے واپس کیا اور انھوں نے چند روز کے اندر سارے قبیلہ کو مسلمان بنا لیا۔ ابو ذر کی یہ صلاحیت تاحیات باقی رہی۔ چنانچہ جب مدینہ سرکار نے انھیں مدینہ سے نکال کر شام بھیج دیا اور شام کی حکومت نے ان کے احتجاج سے عاجز آکر انھیں پہاڑی علاقوں کی طرف شہر بدر کر دیا تو انھوں نے "جبل عامل" کے علاقہ میں وہ تبلیغ حق دی کہ جس کا سلسلہ آجتک قائم ہے اور جنوب لبنان میں محبانِ اہلبیتؑ اور مجاہدانِ اسلام و ایمان کی عظیم ترین طاقت پائی جاتی ہے اور سارا علاقہ علم و عرفان اور جہاد و قربانی کا مرکز بنا ہوا ہے۔

۔ابوذر کا ایک شرف یہ بھی ہے کہ انھوں نے مولائے کائناتؑ کے سابق الاسلام ہونے کی تائید کی ہے۔ (استیعاب ۲/۶۵۶، المواہب اللدنیہ ۱/۴۵)

۔فتح مکہ کے موقع پر جب سرکار دو عالمؐ نے چاہا کہ ابو سفیان کو شوکتِ اسلام سے باخبر کر دیا جائے تو آپ نے جن فوجوں کو ابو سفیان کے سامنے سے گذارا۔ ان میں ایک فوج بنی غفار کی بھی تھی جس میں تین سو سپاہی تھے اور اس کی قیادت جناب ابو ذر کے ہاتھ میں تھی۔

۔ابو ذر کے عشق رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ جب حضور جنگ تبوک کے موقع پر مدینہ سے چلے اور تمام مسلمانوں کو جہاد کا حکم دے دیا تو انھیں مسلمانوں میں ابو ذر بھی شامل تھے۔ چلتے چلتے ایک مقام پر ابو ذر کا اونٹ بیٹھ گیا۔ وہ اسے اُٹھانے کی کوشش کرتے رہے یہانتک کہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ ابو ذر نے اسے اسی مقام پر چھوڑ دیا اور سارا سامان پُشت پر لاد کر چل دئے کہ سرکار دو عالمؐ تک پہونچ جائیں۔ راستہ میں ایک مقام پر پانی نظر آگیا۔ ابو ذر نے مشکیزہ کو بھی بھر لیا اور اسے بھی لاد کر چلے۔ یہانتک کہ سرکار دو عالمؐ کی خدمت میں حاضر ہوگئے ــــ آپ

زحمت سفر کی بنا پر کافی خستہ حال بھی ہو گئے تھے اور پیاسے بھی تھے۔ آپ نے اصحاب سے پانی طلب کیا۔ ابو ذر نے فورًا پانی حاضر کر دیا۔

آپ نے ابو ذر کے چہرہ کی حالت دیکھ کر فرمایا کہ تم بھی تو پیاسے ہو تم نے کیوں نہیں پیا۔ عرض کی پہلے آپ پئیں گے۔ اس کے بعد غلام سیراب ہوں گے۔ (بحار جلد ۲۱)

ابو ذر کے اس فقرہ سے محبّت اور عشق کا صحیح تصوّر اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ محبت محبوب سے کام لینے کا نام نہیں ہے۔ محبّت محبوب کے کام آنے کا نام ہے۔ اور جس نے بھی محبوب کو نظر انداز کر کے اپنی فکر کی اس نے محبّت نہیں کی ہے بلکہ تجارت کی ہے۔ چاہے وہ ہجرت کی رات اونٹ کا سوار ہو۔ یا احد کے میدان میں پہاڑوں کی جانب فرار۔

محبّت پانی نہیں چاہتی ہے۔ محبّت قربانی چاہتی ہے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

ابو حمزہ الثمالی

ان کا اسم گرامی ثابت ہے اور والد کا اسم گرامی دینار جن کی کنیت ابو صفیہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ابو حمزہ بن دینار وارد ہوا ہے اور بعض میں ثابت بن ابو صفیہ۔

۔ یہ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ ثُمالہ بنی ازد کی ایک شاخ ہے اور اس کے مورث اعلیٰ عوف بن اسلم تھے جنھیں ثمالہ کے لقب سے اس لئے یاد کیا جاتا تھا کہ ثمالہ کے معنی ہیں "بچا ہوا" اور وہ اپنے قبیلہ کی ایک جنگ میں سب کے قتل ہو جانے کے بعد بچ گئے تھے لہٰذا انھیں ثُمالہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ (لفظ ثمالہ کو تینوں طرح پڑھا جا سکتا ہے ثَمالہ، ثُمالہ، ثِمالہ۔

۔ فضل بن شاذان کہتے ہیں کہ امام رضا علیہ السلام نے ان کے بارے میں فرمایا کہ ابو حمزہ اپنے دور میں سلمان محمدی کی حیثیت کے مالک تھے اور انھوں نے چار اماموں کی خدمت کا شرف حاصل کیا تھا۔ امام زین العابدینؑ۔ امام محمد باقرؑ۔ امام جعفر صادقؑ۔ امام موسیٰ کاظمؑ۔

۔ علی بن ابی حمزہ راوی ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے ابو بصیر سے ابو حمزہ کی خیریت پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ آجکل بیمار ہیں۔ فرمایا کہ کوفہ واپس جانا تو میرا سلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ تم فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ کو دنیا سے سفر کر جاؤ گے۔

ابو بصیر نے عرض کی کہ حضور! ابو حمزہ آپ حضرات سے کافی مانوس ہیں اور آپ کے شیعوں میں ہیں۔ فرمایا بے شک! ہمارے پاس ان کے لئے خیر ہی خیر ہے۔

عرض کی کیا آپ کے شیعہ آپ کے ساتھ رہیں گے؟

فرمایا، اگر انھوں نے خوفِ خدا پیدا کیا اور نبیؐ کے احکام کا خیال رکھا ہے اور گناہوں سے پرہیز کیا ہے تو یقیناً ہمارے ساتھ بلکہ ہمارے درجہ میں رہیں گے۔

علی بن ابوحمزہ کا بیان ہے کہ ہم اسی سال واپس آئے اور چند دنوں کے بعد ابوحمزہ نے انتقال فرمایا۔

— ابوحمزہ سے ایک تفسیر کی روایت بھی کی گئی ہے اور ان کی ایک کتاب نوادر بھی ہے۔

— ابوحمزہ کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ان کی بچی کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ وہ جراح کے پاس علاج کے لئے لے گئے۔ وہ اندر ڈریسنگ کا سامان لینے چلا گیا اور بچی برابر گریہ کرتی رہی۔ ابوحمزہ بیچین ہو گئے اور خدا کی بارگاہ میں عرض کی خدایا! اب یہ کیفیت دیکھی نہیں جاتی ہے۔ اتنے میں جرّاح باہر آیا اور اس نے ہاتھ میں دیکھا کہ اس میں کوئی شکستگی کے آثار نہیں ہیں۔ ابوحمزہ نے واپس آکر یہ واقعہ امام سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جب دعا رضائے الٰہی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو پلک جھپکنے سے پہلے قبول ہو جاتی ہے۔

— بعض دشمنوں نے دیگر محبانِ اہلبیتؑ کی طرح ابوحمزہ کو بھی متہم کرنا چاہا ہے اور یہ روایت نقل کی ہے کہ ابوحمزہ نبیذ پیا کرتے تھے اور بعد میں تائب ہو گئے تھے۔ حالانکہ اس روایت کے دو راوی ہیں اور دونوں یا غیر معتبر ہیں یا انھوں نے ابوحمزہ کو دیکھا تک نہیں ہے اور اس طرح کی بے سروپا روایت نقل کر دی ہے اور اسے امام کی طرف منسوب کر دیا ہے جس کی تفصیل آیۃ اللہ الخوئیؒ طاب ثراہ نے معجم رجال الحدیث جلد سیوم میں نقل کی ہے اور ابوحمزہ سے نقل ہونے والی روایات کی تفصیل بھی درج فرمائی ہے۔

— ابوحمزہ کے شرف کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ امام سجادؑ نے انھیں وہ دعا تعلیم کی جسکی نظیر معصومینؑ کی دعاؤں میں بھی نہیں ملتی ہے۔ ابوحمزہ کی دعائے سحر اپنی نظیر آپ ہے جس میں معرفت کے بے پناہ دروس و تعلیمات اور تزکیۂ نفس کے بیحساب وسائل و ذرائع پائے جاتے ہیں۔ ماہ مبارک کی راتوں میں سحر کے وقت اس دعا کا پڑھنے والا ہی محسوس کرتا ہے کہ امام سجادؑ نے ابوحمزہ کو کیا چیز عنایت کر دی ہے اور ان کے مرتبہ کو کس قدر بلند کر دیا ہے۔

علماء ورثۂ انبیاء

• انبیاء کی شان یہ ہے کہ "ما آتاکم الرسول فخذوہ و ما نہاکم عنہ فانتھوا" ایتاء پیغمبرؐ کے مطابق عمل ضروری ہے۔ چاہے وہ ایتاء بذریعہ قول ہو یا بذریعہ عمل یا بذریعہ سکوت۔

• رسول کی زندگی تین اعتبار سے حجّت ہے۔ ان کا قول بھی حجّت ہے اور ان کا عمل بھی سند ہے۔ کسی عمل پر ان کی خاموشی بھی استناد کا درجہ رکھتی ہے بشرطیکہ اس خاموشی میں کوئی خاص مصلحت یا تقیہ وغیرہ کے حالات نہ ہوں۔

• ایتاء پہونچانا ہے اور اعطاء عطا کرنا۔ اعطاء میں مال کے ذاتی ہونے کا تصور واضح ہے لیکن ایتاء پہونچا دینا ہے۔ اس میں ذاتی ملکیت کا تصور واضح نہیں ہے۔ اسلام نے زکوٰۃ میں ایتاء کا حکم اسی لئے دیا ہے تاکہ مالک نصاب کو یہ احساس پیدا ہو کہ اب وہ مال زکوٰۃ کا مالک نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مالک وہ مستحق ہے جس تک پہونچانا اس کی ذمہ داری میں شامل ہے۔

• ان دونوں کا ایک فرق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعطاء میں مستحق کو آنا پڑتا ہے اور ایتاء میں صاحب مال کو پہونچانا پڑتا ہے۔ شاید یہی راز تھا کہ پروردگار نے قرآن کو ایتاء قرار دیا ہے "لقد اتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم" اور وجود فاطمہؑ کو اعطاء قرار دیا ہے "انا اعطیناک الکوثر"۔

• قرآن مجید نے رسول کے ایتاء اور حکم کو واجب العمل قرار دیا ہے لیکن ان کی سیرت کو نمونہ بنایا ہے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" اس لئے کہ رسول جو

حکم دیتا ہے اس میں مخاطب کی حیثیت دیکھی جاتی ہے اور جو عمل کرتا ہے اسے اپنی حیثیت کے مطابق انجام دیتا ہے اور رسولؐ کی حیثیت کے مطابق عمل انجام دینا امت کے امکان سے باہر ہے۔ کہاں رسول اکرمؐ کا اخلاص عمل اور کہاں لفظ "قربۃ الی اللہ"۔
شاید یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنی جیسی نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ اپنے انداز نماز کا حکم دیا ہے "صلّوا کما رأیتمونی اصلّی"۔

• رسول اکرمؐ کے ایثار کی دو قسمیں ہیں: بلا واسطہ اور بالواسطہ۔ اپنے آخری دور حیات تک بلا واسطہ احکام الٰہی پہونچاتے رہے اور میدان غدیر میں اعلان کر دیا کہ "من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ" یعنی اس کا حکم میرا حکم ہے۔ اس کے بعد جب امامت آخری منزل پر آکر غیبت اختیار کرنے لگی تو اعلان ہوا "اما الحوادث الواقعۃ فارجعوا فیھا الیٰ رواۃ حدیثنا" یعنی اب ایثار بذریعہ علمائے اعلام ہوگا اور اس طرح علماء ورثۂ انبیاء قرار پا گئے۔

• رسول۔ امام اور عالم کے حجّت خدا ہونے کا بنیادی فرق یہ ہے کہ رسولؐ و امامؑ معصوم ہوتے ہیں لہٰذا ان کا قول و عمل سب حجّت ہے لیکن امام نے عالم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب وہ کوئی حکم دے یا فیصلہ کرے تو اسے قبول کرے کہ وہ فیصلہ حکم خدا سے ہوتا ہے اور میں نے اسے اپنی حجت قرار دیا ہے۔ گویا اس کی حجیت قول اور حکم تک محدود ہے۔ اس کا عمل حجّت نہیں ہے۔ یہ شان رسول اور اولی الامر کی ہے کہ ان کی اطاعت مطلقہ کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے ہر عمل کی عصمت کی ضمانت لی گئی ہے۔

• واضح رہے کہ عمل اور ترک کا معیار ایثار رسول ہے چاہے بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ اس کے علاوہ کوئی شے معیار عمل و ترک نہیں ہے۔ نہ خواب نہ استخارہ۔ نہ رسم و رواج اور نہ تقویم و جنتری۔ یہ تمام باتیں کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں ان کا احکام الٰہیہ کے مدرک و مآخذ ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

• قرآن مجید نے ایثار رسولؐ کو اس لئے معیار قرار دیا ہے کہ دنیا میں ایثار کرنے والے بہت ہیں اور سب کی حیثیتیں آپس میں مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر رسول کے احکام کو شریعت

کہا جاتا ہے اور سلاطین و حکام کے احکام کو سیاست، عوام الناس کے قوانین کو رسم و رواج کہا جاتا ہے اور خواتین کے احکام کو توہّمات۔

• دنیا کی ہر رسم ابتدا میں کسی ضرورت سے پیدا ہوتی ہے اور بعد میں وہی سنت و سیرت بن جاتی ہے ورنہ مرکری کے دور میں فاتحہ میں موم بتی کا کیا کام ہے یا ایرفریشنر کے ہوتے ہوئے لوبان کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

• رسول کے ایثار کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ اس کی حیثیت کبھی ابتدائی ہوتی ہے جیسے احکام شریعت۔ اور کبھی امضائی ہوتی ہے کہ سماج میں کوئی طریقۂ کار رائج ہوتا ہے اور رسولؐ اسے منظور کر لیتا ہے۔ یہ منظور کر لینا بھی خدائی حکم کے بیان کا ایک حصّہ ہے اور ان دونوں کے علاوہ ایثار کی کوئی تیسری قسم نہیں ہے۔

• انبیاء کرام کی ایک شان یہ بھی ہے کہ عقیدہ اور احترام سب کا لازم ہے لیکن عمل ایک ہی کی شریعت پر ہوگا۔ یہی حال علماء کرام کا بھی ہے کہ احترام سب کا ضروری ہے لیکن عمل ایک ہی فتوی پر ہوگا جو اعلم وقت اور مرجع تقلید ہوگا۔ اس کے علاوہ دوسرے حضرات کا فرمان واجب العمل نہیں ہے لیکن واجب الاحترام ہے۔!

بحرالعلوم

علامہ طباطبائی السید مہدی بن السید مرتضیٰ بن السید محمد البروجردی۔ آپ کا لقب بحرالعلوم تھا سلسلۂ نسب امام حسنؑ سے ملتا ہے۔ کربلائے معلیٰ میں ۱۱۵۵ھ پیدا ہوئے، اور نجف اشرف میں ۱۲۱۲ھ میں انتقال فرمایا۔

علمار شیعہ میں بعض وہ افراد جن کی شہرت تقویٰ اور پرہیزگاری کے نام سے زیادہ ہوئی ہے۔ ان میں آیۃ اللہ بحرالعلوم کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ آپ کے بارے میں تمام علمار کا اتفاق ہے کہ امام زمانہ سے مسلسل ملاقات کیا کرتے تھے اور امام سے حاصل ہونے والی ہدایات کو مختلف انداز سے لوگوں تک پہونچایا کرتے تھے۔

امام زمانہؑ کی غیبت کبریٰ کے بارے میں روایات میں یہ نکتہ پایا جاتا ہے کہ اس دور میں مشاہدہ کا دعویٰ کرنے والے کی تکذیب کرنا ضروری ہے اور اس کے دعویٰ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے اور شاید اس کا راز یہ ہے کہ امام علیہ السلام کو یہ معلوم تھا کہ اب اصل ظہور سے پہلے میرے ظاہر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تو اگر ملاقات کے ادعار کا راستہ کھل گیا تو ہر شخص روزانہ ایک ملاقات کا دعویٰ کرے گا اور میری طرف سے جدید ترین احکام بیان کرے گا۔ میرے چاہنے والے اس مصیبت میں پڑ جائیں گے کہ اگر میری طرف منسوب حکم کی اطاعت نہ کریں تو گویا ان کی عاقبت خطرہ میں پڑ جائے گی اور اطاعت کرلیں گے تو واقعاً میرا دین خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اس لئے اس مصیبت کا صحیح علاج یہ ہے کہ ملاقات کے راستہ کو بند نہ کیا جائے۔ ملاقات کے ادعا کے راستہ کو بند کر دیا جائے تاکہ اگر کوئی خاص پیغام پہونچانا ہے تو ایسے افراد کو ذریعہ بنایا جائے جن پر لوگ احکام کے بارے میں

اعتماد کرتے ہیں اور وہ ہمارے احکام کو ادعائے ملاقات کے بغیر بھی پہونچا سکیں۔ ان کا مقصد احکام کا پہونچا دینا ہو۔ ملاقات کا دعویٰ کر کے شخصیت بنانا نہیں ہے۔

آقائے سید مہدی بحرالعلوم انھیں افراد میں تھے جن پر قوم کو اعتماد تھا اور تمام اہلبیتؑ کے روایات و احکام قوم سے بیان کیا کرتے تھے اور قوم اسی کے مطابق عمل کیا کرتی تھی۔ ان کے لئے کوئی مشکل نہ تھی کہ وہ امام عصرؑ کے احکام لوگوں تک منتقل کر دیں اور ملاقات کا ادعا نہ کریں۔ چنانچہ وہ مختلف مناسب طریقوں سے ان احکام کی تبلیغ کر دیا کرتے تھے اور کبھی ملاقات کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔

میرے بعض اساتذہ کا بیان تھا کہ ان کا ایک انداز یہ تھا کہ بعض مسائل میں تمام علمار کے اختلافات کو نقل کرنے کے بعد اپنی رائے بیان کرتے تھے اور اس کی دلیل اجماع کو قرار دیا کرتے تھے۔ ایک مدت تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ آخر اس قدر اختلاف کے بیان کرنے کے بعد اجماع کے دعویٰ کی کیا گنجائش ہے۔ لیکن یہ اس وقت معلوم ہوا جب اس موضوع پر بحث سامنے آئی کہ علمار شیعہ کے نزدیک اجماع کی حیثیت کیا ہے اور یہ طے پایا کہ اتفاق امت کوئی شے نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی حکم الٰہی طے ہو سکتا ہے۔ البتہ امت کے اتفاق سے اگر یہ انکشاف ہو جائے کہ زمانہ کا امام بھی ان کے ساتھ ہے اور ان کے خلاف کوئی بیان نہیں دیتا ہے تو یہ اتفاق شمولیت معصوم کی بنا پر قابل اعتبار ہو جائے گا۔ گویا اجماع کی کل حیثیت رائے معصوم کا انکشاف ہے۔ اس کے علاوہ اتفاق امت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

علامہ بحرالعلوم اسی نکتہ کے تحت اختلافات کو نقل کرنے کے بعد اجماع کا ذکر کیا کرتے تھے تاکہ اہل علم محسوس کرلیں کہ اجماع کے پردہ میں امام عصرؑ کی رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے ورنہ اصل اجماع کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۔ ان کی روحانیت کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ صاحب مفتاح الکرامہ سید جواد عاملی طاب ثراہ مصروف طعام تھے کہ سید بحرالعلوم کے خادم نے آکر اطلاع دی کہ سید کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔ سید عاملی نے کھانا ترک کر کے سید بحرالعلوم کے مکان کا رُخ کیا۔ وہاں پہونچے

تو انھوں نے فرمایا کہ تمھارے ہمسایہ میں ایک شخص قرض کے خرمہ پر گذارا کر رہا تھا آج اسے قرض نہیں ملا اور وہ بچوں سمیت بھوکا ہے اور آپ کھانا کھا رہے ہیں۔ سید عاملی نے عرض کی کہ مجھے اس حالت کا علم نہیں ہے۔ فرمایا کہ علم ہوتا تو آپ کا شمار یہودیوں اور عیسائیوں میں ہو جاتا۔ جائیے یہ خوان لے جائیے اور اس غریب کو کھلا کر واپس آئیے۔ سید عاملی تشریف لے گئے جب صاحب خانہ کے سامنے پیش کیا تو اس نے کہا کہ میرے حالات کا علم کسی کو نہیں ہے۔ آپ سے کس نے بتایا ہے؟ فرمایا بحر العلوم نے۔ اس نے کہا بے شک یہ سید بڑے عجائب و غرائب کا مالک ہے۔

ـ اپنے انتقال سے قبل فرمایا کہ میری نماز جنازہ مرزا مہدی شہرستانی پڑھائیں گے۔ لوگوں نے تعجب کیا کہ وہ کربلا میں ہیں اور راستہ طویل ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہوگا لیکن جیسے ہی جنازہ حرم میں داخل ہوا مرزا مہدی شہرستانیؒ نظر آگئے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ حضور کیسے آگئے؟ ـ فرمایا کہ میں بیماری کی خبر سُن کر کربلا سے روانہ ہو گیا تھا اور اب جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہو گئی۔

ـ آپ کی جلالت قدر کا یہ عالم تھا کہ آیۃ اللہ شیخ جعفر النجفی اپنی تمام تر عظمت و جلالت کے باوجود آپ کی جوتیوں کی خاک اپنے عمامہ سے صاف کیا کرتے تھے۔

ـ آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے والد نے خواب دیکھا تھا کہ امام رضاؑ نے محمد بن اسماعیل بن بزیع کے ذریعہ ایک شمع بھیجی ہے جسے پشت بام پر روشن کر دیا گیا تو زمین سے آسمان تک نور کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔

فضیل بن عیاض

بصرہ یا کوفہ کا رہنے والا تھا عقیدہ کے اعتبار سے شیعہ نہ تھا لیکن علمائے رجال نے اسے ثقہ اور معتبر قرار دیا ہے اور اس نے امام جعفر صادقؑ سے روایات بھی نقل کی ہیں۔ بلکہ بعض علمائے اعلام کا خیال ہے کہ کتاب مصباح الشریعہ کا راوی یہی شخص ہے اور اس نے امام صادقؑ کے مواعظ و ارشادات سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور بعض مقامات پر بالمناسبۃ اپنے عقائد کو بھی شامل کر دیا ہے۔

امام صادقؑ سے ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ حضرت نے سوال کیا کہ بتاؤ شحیح کے معنی کیا ہیں (جس کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے نفس کو شح سے محفوظ کر لیا تو اس کی زندگی یقیناً کامیاب ہے) ـ فضیل نے عرض کی بخیل۔ فرمایا بخیل وہ ہوتا ہے جو اپنے مال میں بخل کرتا ہے ـ اور شحیح وہ ہوتا ہے جس سے دوسرے کا خرچ کرنا بھی برداشت نہیں ہوتا ہے اور اس کی خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ جو جس کے پاس ہے سب اُس کے پاس آکر جمع ہو جائے۔ حرام و حلال کا امتیاز مٹا دیتا ہے۔ شکم سیر کبھی نہیں ہوتا ہے اور خدائی رزق پر قناعت بھی نہیں کرتا ہے۔

• خود فضیل کے کلمات بھی وعظ و نصیحت کے ذیل میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور چونکہ اس کا شمار زاہدوں میں ہوتا تھا اس لئے صوفیائے اسلام نے اس کے بہت سے کلمات وارشادات و کمالات و کرامات نقل کئے ہیں۔

فضیل کا ایک مشہور مقولہ یہ ہے کہ تین افراد کی بداخلاقی اور غصہ پر ملامت نہیں کی جا سکتی ہے۔ روزہ دار۔ مریض اور مسافر۔ گویا کہ روزہ دار بھوک پیاس سے اور مریض بیماری

سے چڑچڑا ہو جاتا ہے اور مسافر اپنے سفر ہی سے حواس باختہ رہتا ہے لہٰذا ان افراد سے بداخلاقی کوئی بعید نہیں ہے۔ اگرچہ کمال انسانیت یہی ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو رکھے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے روزہ بدنام ہو جائے یا خود اس کی عقل کا اعتبار اُٹھ جائے۔

دوسرا مقولہ یہ ہے کہ تین عادتوں سے سنگدلی پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ کھانا، زیادہ سونا اور زیادہ کلام کرنا۔ کہ ان امور سے ایک طرح کی سُستی اور بےحسی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ انسانیت کی حساسیت کو کم کر دیتی ہے اور وہ مسائل حیات سے غافل ہو جاتا ہے۔ (سفینۃ البحار)

• فضیل کی دلچسپ تاریخ حیات یہ ہے کہ اپنے علاقہ میں مشہور ڈاکو تھا اور مسافروں کو سرِ راہ لوٹ لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک لڑکی پر عاشق ہو گیا اور رات کے وقت اس کے گھر میں داخل ہونے کے لئے ہمسایہ کے مکان کی چھت پر چڑھا۔ بلندی پر جانے کے بعد محسوس ہوا کہ جیسے کوئی جاگ رہا ہے اور باتیں کر رہا ہے۔ ذرا غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص تلاوت قرآن کر رہا ہے۔ اور غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس آیت کریمہ کی تلاوت کر رہا ہے "الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ" (کیا صاحبانِ ایمان کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل یادِ خدا کے سامنے جھک جائیں۔)

یہ سُننا تھا کہ اس نے فوراً توبہ کر لی اور ایک خرابہ میں جاکر بیٹھ گیا۔ وہاں کچھ مسافر بھی ٹھہرے ہوئے تھے اور سفر کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے کہ رات میں سفر کیا جائے یا صبح کا انتظار کیا جائے۔ ایک شخص نے مشورہ دیا کہ اس وقت آرام کیا جائے ورنہ رات کے سفر میں فضیل کے لوٹ لینے کا خطرہ ہے۔

فضیل کے دل پر اس بات نے بیحد اثر کیا اور اس نے علاقہ بھی چھوڑ دیا۔ مکہ میں جاکر مسجد الحرام میں معتکف ہو گیا اور روز عاشورہ ۱۸۷ھ کو انتقال کیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس کا فرزند علی بن فضیل اس سے بڑا زاہد تھا کہ اس نے قرآن مجید کی یہ آیت سُنی "وتری المجرمین یومئذ مقرنین فی الاصفاد سرابیلھم من

قطران و تغشیٰ وجوھھم النار"۔ "قیامت کے دن دیکھو گے کہ مجرمین زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ ان کے لباس قطران (بھڑک دار تیل) کے ہوں گے اور آگ انھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوگی) اور سُنتے ہی بیہوش ہو کر گر پڑا اور تھوڑی دیر میں انکشاف ہوا کہ دنیا سے انتقال کر چکا ہے۔

• فضیل کا ایک شاگرد حالت احتضار میں تھا۔ فضیل نے سورۂ یٰسین پڑھنا چاہا اس نے منع کر دیا۔ کلمۂ شہادتین شروع کیا اس نے کہا کہ میں اس کا قائل نہیں ہوں اور اسی حالت میں انتقال کر گیا۔ فضیل حیرت زدہ رہ گیا کہ آخر میرا عزیز ترین شاگرد ایسا کیسے ہو گیا۔ ایک دن خواب میں دیکھا اور سبب دریافت کیا تو اس نے کہا کہ مجھ میں تین عادتیں تھیں جن کا یہ اثر ہوا ہے۔ (۱) چغلخوری (۲) حسد (۳) ایک بیماری میں طبیب نے مجھے شراب بتا دی تھی اور میں کبھی کبھی شراب پی لیا کرتا تھا جس کا یہ انجام ہوا ہے۔ (سفینۃ البحار)

• ان واقعات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن فہمی انسان کے کردار میں کس طرح انقلاب پیدا کر دیتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بداخلاقی یا شراب خواری انسان کی عاقبت کو کس طرح برباد کر دیتی ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک

بشر حافی

ابوالنصر بشر بن الحارث بن عبدالرحمان المروزی البغدادی ۔ اپنے وقت کے مشہور ترین عرفاء اور زاہدوں میں شمار ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں رئیس گھرانے کی فرد ہونے کی بنا پر ہمیشہ لہو و لعب میں مشغول رہا کرتا تھا۔ بغداد میں سکونت تھی۔ ایک دن اتفاق سے ایک راستہ سے گذر رہا تھا دیکھا کہ ایک پرچہ زمین پر پڑا ہوا ہے اور اس پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا ہوا ہے۔ بشر کو غیرت آگئی اور اسے اٹھا کر خوشبو سے دھو کر ایک دیوار پر رکھ دیا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ "تم نے میرے نام کو پاکیزہ بنایا ہے میں دنیا و آخرت میں تمھارے نام کو پاکیزہ بنا دوں گا"۔ اس بات کا بشر پر اسقدر اثر ہوا کہ صبح ہوتے ہی اس نے توبہ کر لی اور زاہدوں کی صف میں شامل ہو گیا۔

لیکن اس کے مقابلہ میں توبہ کی دوسری روایت زیادہ قرین قیاس ہے کہ ایک دن امام موسیٰ کاظمؑ اس کے گھر کے قریب سے گذر رہے تھے اور گھر سے گانے بجانے کی آوازیں بلند تھیں۔ اتفاق سے کنیز اسی وقت کوڑا پھینکنے کے لئے دروازہ پر آگئی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ گھر کسی غلام کا ہے یا آزاد کا؟ ۔ اس نے فوراً جواب دیا "آزاد کا ہے"۔ فرمایا "بے شک اگر بندہ ہوتا تو اپنے مالک کی اطاعت کرتا اور اس طرح کے لہو و لعب میں مشغول نہ ہوتا"۔

کنیز گھر کے اندر واپس آئی۔ بشر نے پوچھا کہ دروازہ پر کس سے بات کر رہی تھی؟ اس نے کہا کہ ایک بندۂ خدا گذر رہا تھا۔ اُس نے گھر کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے جواب

دیا تو وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ "اگر بندہ ہوتا تو اپنے مالک کی اطاعت کرتا۔ بشر یہ سُن کر ننگے پیر دوڑ پڑا اور کچھ دور چل کر امام کو دیکھ لیا اور قدموں پر گر کر توبہ کر لی اور پھر حافی (ننگے پیر) کے نام سے مشہور ہو گیا۔

خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ بشر، علی بن خشرم کے چچازاد بھائی تھے اور زہد و تقویٰ میں سب سے بالاتر تھے۔ ان کی روایتیں بھی بہت ہیں لیکن انھوں نے اسے اپنا پیشہ نہیں بنایا تھا اور اسی بنیاد پر اپنی کتابوں کو اپنے ہی ہاتھ سے دفن کر دیا تھا۔

ابراہیم الحربی سے یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ میں نے بشر سے زیادہ کامل العقل اور سلیم البیان بغداد میں کوئی شخص نہیں دیکھا ہے۔ بشر کے ہر بُن مو میں عقل پائی جاتی تھی اور ان کا زہد و تقویٰ بھی شہرۂ آفاق تھا۔

کلمات حکمت

انقلاب کردار کے بعد بشر نے وہ منزل حاصل کر لی کہ ان کے اقوال کلمات حکمت میں شمار ہونے لگے۔ چنانچہ تاریخ نے ان کے چند حکمت آمیز اقوال کا حوالہ دیا ہے:

- ۔ دنیا میں عالم کا عذاب یہ ہے کہ اس کی دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔
- ۔ جو دنیا کا طلبگار ہو اُسے ذلت کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔
- ۔ آخرت کو اپنا سرمایہ قرار دو تاکہ جو دنیا مل جائے اسے فائدہ سمجھو۔
- ۔ عبرت کے لئے یہ کافی ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ مر چکے ہیں اور ان کی یاد سے دل زندہ ہوتے ہیں اور کچھ لوگ زندہ ہیں اور انھیں دیکھ کر سنگدلی پیدا ہوتی ہے۔
- ۔ اصحاب حدیث سے خطاب کر کے فرمایا کہ ان حدیثوں کی زکوٰۃ بھی ادا کیا کرو اور کم سے کم دو سو میں سے پانچ پر تو عمل کیا کرو۔
- ۔ پوچھا کہ سوکھی روٹی کس طرح کھاتے ہیں؟ فرمایا کہ میں عافیت کو شوربہ کے طور پر استعمال کرتا ہوں (کہ اسی کے طفیل میں یہ حلق سے اُتر بھی جاتی ہے اور ہضم بھی ہو جاتی ہے بلکہ اس کی نعمت کا بھی احساس ہوتا ہے)۔

• ۔ قناعت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اس کی یہی خوبی کافی ہے کہ اس سے بے نیازی کی لذّت حاصل ہوتی ہے۔

• ۔ خطیب بغدادی نے محمد بن نعیم سے نقل کیا ہے کہ میں بشر کی عیادت کے لئے گیا اور کہا کہ کچھ موعظہ فرمائیے تو فرمایا کہ اس گھر میں ایک چیونٹی ہے جو گرمی میں دانے جمع کرتی ہے تاکہ سردی میں استعمال کرے لیکن جب کھانے کا وقت آتا ہے تو چڑیا آکر چیونٹی اور دانہ دونوں کو اٹھالے جاتی ہے اور نہ دانہ کام آتا ہے اور نہ امیدیں۔

میں نے کہا کہ کچھ اور فرمائیے۔

فرمایا اس شخص کے بارے میں کیا پوچھتے ہو جس کا مکان قبر۔ گذرگاہ صراط اور موقف قیامت ہے اور پھر نہیں معلوم ہے کہ انجام جنت ہے یا جہنم۔ اس کی مصیبت کسقدر عظیم ہے اور اس کا رنج کسقدر دائمی ہے۔ نہ گریہ میں سامان تسلیت ہے اور نہ خوف میں سامان امن۔

۔ بشر کا انتقال ۲۲۷ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں بغداد میں ہوا اور ان کی نسل میں ان کے نواسہ عبدالکریم بن محمد الدیباجی مشہور ترین علمار شیعہ میں تھے۔ اس کے علاوہ ان کی تین بہنیں مضغہ۔ مخہ۔ زبدہ بھی زہد و ورع و تقوی میں خاصی شہرت کی مالک تھیں۔

(الکنی والالقاب ۲/۱۶۸)

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

سقراط

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے یونان میں جس فلسفہ کا زور تھا ــــ اور جس کی صدائے بازگشت آجتک عالم فلسفہ میں سُنائی دے رہی ہے۔ اس کے مشاہیر ترین فلاسفہ تھے۔ پہلے مرحلہ میں سقراط۔ اس کے بعد اس کا شاگرد افلاطون ــ اس کے بعد اس کا شاگرد ارسطو۔ جس کے خیالات عالم عربیت میں منتقل ہوکر بنیادی حیثیت اختیار کر گئے، اور دور حاضر تک اس کے بنائے ہوئے اصول منطق کام کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب اس شکلی منطق میں حقیقی منطق کا بھی اضافہ ہوگیا ہے اور بہت سے اصول یا تبدیل ہوگئے ہیں یا کم از کم ان میں ترمیم ضرور ہوگئی ہے۔

سقراط ۔ ۴۷۰ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۳۹۹ ق۔م میں تقریبًا ۷۰ سال کی عمر میں جام زہر پی کر دنیا سے رُخصت ہوگیا۔

سقراط کے فلسفہ کا مرکز "انسان کی اپنی معرفت" تھی اور اس نے اسی کام کے اصول مرتب کرکے ایک علم اخلاق کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اس کی تعلیم زبانی اور سوال وجواب کے انداز سے ہوتی تھی۔ کوئی مخصوص نصاب تعلیم نہ تھا۔ اس کا تمامتر زور اس بات پر تھا کہ اس کے شاگرد اپنے نفس کی معرفت حاصل کرلیں اور اس طرح ان کے اخلاقیات کی اصلاح ہوجائے۔ (المنجد)

اسلامی تعلیمات میں مولائے کائنات کا یہ فقرہ انتہائی مشہور ہے کہ "جس نے نفس کی معرفت حاصل کرلی اس نے خدا کو پہچان لیا" ــ سقراط کی زندگی میں قبل مسیح اسی حقیقت

کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس کا دَور اصنام پرستی کا دَور تھا۔ لیکن اس نے معرفت نفس کے نتیجہ میں عقیدۂ توحید تک رسائی حاصل کرلی اور اصنام پرستی کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کردی وہ اصولی طور پر سفسطا اور موجودہ نظام حکومت دونوں کا مخالف تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اسے کفر و الحاد کے الزام میں گرفتار کراکے عدالت میں پیش کردیا۔ گیارہ ضمیر فروش علمار اور قاضیوں نے اس کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔ عدالت نے اس سے سوال کیا کہ تمھارے حق پر ہونے کی دلیل کیا ہے؟

اس نے برجستہ کہا "گرفتاری"۔

حکومت اور علمار کے پاس میرے دلائل کا جواب ہوتا تو مجھ سے بحث کرتے۔ مجھے گرفتار نہ کرتے۔ گرفتاری اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے پاس میرے حقائق کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس کے بعد جب سزا دینے کا وقت آیا اور زہر کا پیالہ لاکر رکھا گیا تو اس نے نہ کوئی خوشامد کی اور نہ معافی مانگی بلکہ نہایت ہی جرأت مندی کے ساتھ پیالہ کو اٹھا کر پی لیا اور علم و توحید کی راہ میں اپنی جان کا عظیم نذرانہ پیش کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گرفتار کرنیوالے حاکم اور فتویٰ دینے والے قاضی کا نام مٹ گیا لیکن سقراط کا نام آج بھی تاریخ کے صفحات پر جگمگا رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سقراط ماہر اخلاقیات اور صاحب تزکیہ نفس ہونے کی بنا پر بہت سے حقائق سے آشنا ہوگیا تھا لیکن علم بشر میں افراط و تفریط کا پہلو ہونا ضروری ہے۔ بشریت کے پاس عصمت کا کمال نہیں ہوتا ہے۔ یہ کمال انبیار و مرسلین اور اولیار خدا کو دیا جاتا ہے اور اسی بنا پر ان کی زندگی میں مکمل اعتدال اور توازن ہوتا ہے۔

سقراط کے تصور اخلاق کے غیر واضح ہونے کا اثر تھا کہ وہ تجرّد کی زندگی گذار رہا تھا اور اسے شادی بھی تزکیہ نفس کے خلاف دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ جب لوگوں نے شادی کے بارے میں اصرار کیا تو اس نے شرط رکھی کہ میں بدترین اور بدصورت عورت سے شادی کرسکتا ہوں تاکہ میرے ضبط نفس میں فرق نہ آنے پائے اور مجھے اذیت کوشی کا انعام ملتا رہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ سقراط ریاضت کے اعمال میں مصروف تھا کہ اُدھر سے بادشاہ وقت

کا گذر ہوگیا۔ بادشاہ نے دھوپ میں ایک بندۂ خدا کو اعمال انجام دیتے دیکھا تو رحم کھا کر قریب آکر کھڑا ہوگیا اور پوچھا کہ اگر کوئی ضرورت ہو تو فرمائیے۔ میں آپ جیسے انسان کی خدمت انجام دینا چاہتا ہوں۔

اُس نے کہا کہ پہلی خواہش تو یہ ہے کہ اپنی ریاست کے سایہ کو مجھ سے دور کر لیجئے۔ مبادا کہ میری زندگی پر بھی ریاست کا سایہ پڑجائے ــ بادشاہ نے اس انداز کو دیکھ کر سخت حیرت کا اظہار کیا اور مزید اصرار کیا کہ مجھے خدمت کا موقع دیجئے؟ ــ اس نے کہا کہ یہ مکھیاں بہت اذیت دے رہی ہیں انھیں ہٹا دیجئے۔؟

بادشاہ نے کہا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔

اُس نے کہا کہ پھر حکومت کرنے کا شوق کیوں ہے۔ جب ایک مکھی کا اختیار بھی آپ کے پاس نہیں ہے۔

استنتاج

- سقراط کا تصور اخلاق ناقص تھا اس لئے شادی سے گریز کررہا تھا ورنہ انسان تو ازواج کے درمیان رہ کر بھی مکارم اخلاق کی تکمیل کرسکتا ہے۔
- سقراط اس قدر ریاضت کے بعد بھی اپنے نفس کے بارے میں خوفزدہ تھا اور اسی لئے بدصورت عورت کی تلاش میں تھا ورنہ سرخ و سفید عورت بھی انسان کے کردار کو متاثر نہیں کرسکتی ہے۔
- سقراط نے اس حقیقت کا اعلان کردیا ہے کہ گرفتار کرلینا اور قتل کردینا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے پاس دلائل کا کوئی جواب نہیں ہے اور اسی آئینہ میں حکام عصر اور ائمہ طاہرینؑ کی زندگیوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔
- سقراط نے یہ بھی واضح کردیا کہ عام انسان اخلاق کے ساتھ ریاست نہیں چلا سکتا ہے حالانکہ صاحبان عصمت کردار دونوں کام انجام دے سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُنکی ریاست آمریت کے انداز کی نہ ہوگی۔
- سقراط کے بیان سے واضح ہوگیا کہ حکومت کا حق انھیں افراد کو ہے جن کی حیوانات پر بھی حکومت ہو اور مکھیاں ان کے جسم اقدس پر قدم نہ رکھ سکتی ہوں۔

خمینیت کیا ہے؟

ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد سے دشمنان انقلاب و اسلام مستقل اس فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ خمینیت کیا ہے جس نے اتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا ہے اور ۲½ ہزار سالہ شاہی نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ کسی نے اس خمینیت کو "روحِ خدا" سے تعبیر کیا ہے تو کسی نے فتنہ و فساد سے۔

امریکہ کے صدر کارٹر کو مستقل یہ پریشانی تھی کہ یہ روحانیت کون سی شے ہے جس کا نام بار بار خمینی کی زبان پر آتا ہے اور جس کی جھلک خمینی کے نام میں پائی جاتی ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ خمینیت نہ کوئی ازم ہے نہ نظام۔ نہ کوئی دین ہے نہ مذہب خمینیت اسلام کی عملی تجسیم کا نام ہے اور خمینیت احکامِ دین کو کتابوں کے دفتر سے نکال کر زندگی کے میدان تک پہونچا دینے کا دوسرا نام ہے۔ اس کے علاوہ خمینیت اور کوئی شے نہیں ہے۔ دنیائے غرب بلکہ دنیائے شرق نے بھی چونکہ اسلام کو مجسم شکل میں عرصۂ حیات میں کام کرتے نہیں دیکھا ہے لہذا انھیں خمینیت اسلام سے الگ ایک چیز دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ جو لوگ اسلامی تعلیمات سے آشنا ہیں اور ان کے ذہن میں اسلامی تعلیمات کا عملی نقشہ ہے انھیں خمینیت میں اسلام کے علاوہ کوئی شے نظر نہیں آتی ہے اور خمینیت عین اسلام دکھائی دیتی ہے۔

خمینیت کے وہ امتیازات جنھوں نے اسے ایک جدید فکر یا نظریہ کا نام دیدیا ہے اور جن سے عالم اسلام بھی بے خبر اور نا آشنا تھا۔ ان کی ایک اجمالی فہرست یہ ہے:

۱۔ آیۃ اللہ خمینیؒ نے انتخابات میں اکثریت کو واقعیت سے آشنا بنایا ہے جب کہ دنیا

کے نظریات میں اکثریت ایک فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دنیاوی جمہوریت میں اگر کسی علاقہ میں ایک لاکھ رائے دہندگان ہیں اور دس امیدوار ہیں جنکو بالترتیب ۱۵-۱۴-۱۳-۱۲-۱۱-۹-۸-۷-۶-۵ ہزار ووٹ حاصل ہوئے تو پندرہ ہزار ووٹ پانے والے کو اکثریت کا نمائندہ کہا جاتا ہے حالانکہ حقیقت امر یہ ہے کہ اس کی تائید کرنے والے پندرہ ہزار ہیں اور مخالفت کرنے والے ۸۵ ہزار۔ امام خمینیؒ نے اسی فریب کا راز فاش کیا تھا اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ اکثریت مجموعی افراد کے ۵۱ فیصد کا نام ہے صرف حصہ لینے والوں یا رائے دینے والوں میں کسی ایک فرد کی اکثریت رائے کا نام نہیں ہے۔

۲۔ امام خمینیؒ نے عدل و انصاف کے تقاضوں کے تحت ویٹو پاور کے خلاف آواز بلند کی کہ چند افراد کو طاقت کے زور پر تمام دنیا کی رائے کو نظر انداز کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ ہر صاحب نظر کو یہ حق ہونا چاہیئے یا ہر ملک کو برابر کی حیثیت ہونی چاہیئے۔ اسلحوں کی فراوانی یا دولت کی ریل پیل کسی ملک کی عقل یا اس کے عدل و انصاف میں اضافہ نہیں کر سکتی ہے۔

۳۔ سیاسی دنیا نے اپنے مفادات کے تحفظ اور اپنی فتنہ انگیزی کے جواز کے لئے سفارت خانوں کو ملکی قوانین سے آزاد کر دیا تھا تاکہ ہر ملک میں سفارت کے نام پر فتنے برپا کریں اور کسی کو ٹوکنے کا اختیار نہ ہو۔ امام خمینیؒ نے اس فریب کاری کا راز بھی فاش کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ مغربی دنیا کا یہ قانون دوسرے ملک کے مہمانوں کے احترام پر مبنی نہیں ہے بلکہ اپنی خفیہ کارگذاریوں کی پردہ پوشی پر مبنی ہے لہذا اس کا محاسبہ بھی ضروری ہے۔

۴۔ دنیاوی نظام میں جنگ بندی کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے جس قدر زمین پر قبضہ کر لیا ہے اس کے قبضہ کو باقی رکھا جائے اور جنگ بند کر دی جائے۔ گویا مظلوم کو نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے" اور ظالم اپنے قبضہ کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

امام خمینیؒ نے اس مکاری کا بھی راز فاش کر دیا اور صاف اعلان کر دیا کہ جنگ بندی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ظالم مظلوم کے علاقہ کو خالی کرے۔ اس کے بعد جنگ بند کرنے کا نام لے ورنہ جنگ بندی ظالم کی حمایت اور مظلوم پر مزید ظلم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

۵۔ سیاسی دنیا میں ایک عرصہ سے امریکہ اور روس کے مقابلہ میں ایک تیسری دنیا کا

تصور کام کر رہا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس دنیا کی کوئی بنیاد نہ تھی اور اس کی بنیاد کے نام پر صرف ناوابستگی کا حوالہ دیا جارہا تھا جب کہ حقیقی اعتبار سے ناوابستہ کوئی نہ تھا اور نہ رہ سکتا تھا۔

امام خمینیؒ نے اسلامی دنیا کو یہ شعور دیا کہ تیسری دنیا آباد کرنا ہے تو اس کی بنیاد اسلام کو ہونا چاہیے جس کے پاس ایک مستقل سیاسی نظام بھی ہے اور جس کے ماننے والوں کے پاس پچاس ملک بھی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی فکر کو تیسری دنیا کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا ہے۔

۶۔ دنیا کی حکومتوں میں پارلیمنٹ کی کارروائیوں سے عام طور سے سارے عوام بالکل بے خبر رہتے ہیں اور انھیں ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے نمائندہ کیا کر رہے ہیں اور ان کی پارلیمنٹ ہاؤس میں کیا حیثیت ہے بلکہ بعض اوقات تو ایسے لوگ منتخب ہو کر پہونچ جاتے ہیں جنھیں یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور وہ بالکل جاہل مطلق ہوتے ہیں۔

امام خمینیؒ نے اس کے برعکس پارلیمنٹ کی کارروائیوں کو عوام کے لئے ٹیلی کاسٹ کرنے کا حکم دے دیا تاکہ عوام کو ان کی نمائندوں کی کارکردگی کا علم ہو سکے اور پارلیمنٹ عوام سے کٹ کر حکام کی ایک جماعت نہ بن جائے۔

۷۔ امام خمینیؒ کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ انھوں نے جنگ کی صورت حال کو ہرگز صیغۂ راز میں نہیں رکھا بلکہ اپنے عوام کو حالات سے مکمل طور پر باخبر رکھے رہے جو بات سیاسی دنیا میں ناقابل تصور ہے۔

۸۔ امام خمینیؒ نے ساری دنیا میں فوجی حکومت کی شدید مخالفت کی اور بزور طاقت قائم ہونے والی ہر حکومت کو ناجائز قرار دیا اور جمہوری نظام قائم کرنے کے لئے عوامی رائے کو ضروری قرار دیا۔

۹۔ امام خمینیؒ نے حکومت کے تحفظ کے ساتھ اس امر کو بھی ضروری قرار دیا کہ اقلیت کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور کسی مقام پر اکثریت کو یہ خیال نہ پیدا ہو کہ حکومت ان کے ہاتھ میں ہے تو دوسرے افراد یا جماعتوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے جس طرح عملی طور پر بیشمار حکومتوں میں ہو رہا ہے اگرچہ سب کا ادّعا یہی ہے کہ ہمارے یہاں مکمل طور پر آزادی پائی جاتی ہے۔

۱۰۔ امام خمینیؒ نے مشرق و مغرب کے خلاف واقعی آزادی کا نعرہ دیا اور دنیا پر واضح کردیا

کہ مسلمان مشرق و مغرب کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اور اسے کسی کی احتیاج نہیں ہے۔

امام خمینیؒ کا یہ تصور ناوابستہ ممالک کا تصور نہیں تھا اور نہ تیسری دنیا کا عمومی تصور تھا۔ اسکا مقصد مکمل طور پر ذہنی آزادی کا حصول تھا اور مشرق و مغرب کو ان کی اوقات سے باخبر بنادینا تھا۔

۱۱۔ امام خمینیؒ نے سیاست اور دین کے رابطہ کو اس طرح واضح فرمایا کہ اسلام میں سیاست دین کی حاکم نہیں ہے محکوم ہے۔ سیاست دین کی محکوم بنی رہے تو عین دین ہے اور دین پر حکومت کرنے لگے تو مکمل بے دینی ہے اور اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۲۔ امام خمینیؒ نے طاقت کے زور پر حکومت کی مخالفت کے ساتھ وراثت کے زور پر حکومت کا بھی انکار کردیا اور کسی قیمت پر اپنے فرزند کو کسی عہدہ پر فائز نہیں ہونے دیا۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

عالمی سیاست

کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے کو دُہراتی ہے۔ دنیا کا سارا کاروبار عمل اور ردعمل پر چل رہا ہے۔ عمل رُک جائے تو زندگی جامد ہو جائے اور عمل صادر ہو جائے تو اس کا ردعمل بھی ضروری ہے۔ یہی ردعمل ایک دن پرانے حالات کا نقشہ پیش کرتا ہے تو انسان کو احساس ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے کو دُہرا رہی ہے۔

ماں باپ نے اولاد کے سامنے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ناشائستہ حرکات کیں۔ لوگوں کی غیبت کی۔ غریبوں کا منہ چڑھایا اور یہ سب اس اطمینان کی بنا پر کیا کہ بچہ نافہم ہے ہمارے حرکات وسکنات اور اقوال واعمال سے باخبر نہیں ہے۔ انھیں اس امر کا احساس نہیں ہے کہ کیمرہ بھی نافہم اور بے عقل ہوتا ہے لیکن تصویر لے لیتا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر بھی بے شعور اور بے ادراک ہوتا ہے لیکن آوازیں محفوظ کر لیتا ہے۔ اس کے بعد جب کیمرہ تصویر کو دوبارہ پیش کرتا ہے اور ٹیپ ریکارڈر آوازوں کو دوبارہ سناتا ہے تو انسان کو اپنے ماضی کا احساس پیدا ہوتا ہے لیکن اب وقت گذر چکا ہے۔ اب افسوس اور شرمندگی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔

کیمرہ کی تصویر اور ٹیپ ریکارڈر کی آواز کی طرح تاریخ کے واقعات ہیں کہ جب عمل و ردعمل کے نتیجہ میں یہ واقعات دوبارہ منظر عام پر آتے ہیں تو انسان کو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے ماضی میں سخت غلطی کی ہے اور کل غلطی نہ کی ہوتی تو آج یہ ردعمل دیکھنے میں نہ آتا۔

چھوٹی سطح پر اپنے ملکوں میں زمینداروں اور تعلقہ داروں کے مظالم کو یاد کیجیے اور پھر ان مظالم کا جائزہ لیجیے جو آج مختلف اطراف میں مسلمانوں پر ہو رہے ہیں اور مسلمان فریاد کر رہا ہے کہ ہم مظلوم ہیں اور کفر نے اسلام پر حملہ کر دیا ہے۔ اسے اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ کل جب

تمھارے ہاتھ میں اقتدار تھا تو تم نے اس سے بدتر برتاؤ کیا تھا۔ دشمن آج تمھارے جان ومال کا دشمن ہے۔ تم نے تو کل عزت وآبرو کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ جس تاریخ میں خالد بن ولید جیسے جانباز ہوں جو صحابیٔ رسولؐ کو قتل کر کے اس کی زوجہ سے منہ کالا کریں وہ تاریخ کس دشمن اسلام کے کس ظلم کا شکوہ کر سکتی ہے۔

عالم اسلام آج جن مصائب سے دوچار ہے۔ ان کا مختصر خاکہ یہ ہے:

۱۔ جس طاقتور کو جہاں موقع مل جاتا ہے، مسلمانوں کی زمین پر قبضہ کر لیتا ہے۔ روس نے افغانستان پر قبضہ کیا۔ اسرائیل نے فلسطین کی سرزمین پر قبضہ کر لیا۔ عراق مدتوں ایران کی زمین پر قابض رہا۔ مختلف ممالک مختلف ممالک کی چیرہ دستیوں اور غاصبانہ حرکتوں سے عاجز اور فریادی ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بات نئی ہے جس کے خلاف احتجاج کیا جائے یا خود عالم اسلام میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور مسلمان اپنے اعمال کے خمیازہ کو برداشت کر رہا ہے۔

۲۔ دنیا کی سب سے بڑی جماعت جسے حلال مشاکل کے طور پر ایجاد کیا گیا ہے اسمیں مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یونائیٹڈ نیشن میں جن ملکوں کو ہر ایک کے فیصلہ کو مسترد کر دینے کا حق ہے۔ ان میں کوئی ایک ملک بھی اسلامی نہیں ہے اور نہ سارے عالم اسلام کو مل کر یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ بھی کسی فیصلہ کے خلاف ویٹو کا حق استعمال کر سکیں۔ کیا یہ کھلی ہوئی اسلام اور مسلمان کی توہین نہیں ہے؟ — یقیناً ہے۔ لیکن مسلمان کیا کرے۔ اس نے خود بھی یہی کیا ہے۔ جب اس کے ہاتھ میں اقتدار آگیا تو اس نے خدا اور رسولؐ کے فیصلوں کو ویٹو کر دیا۔ عوامی فیصلوں کا کیا ذکر ہے۔

۳۔ ایک عجیب وغریب قیامت یہ ہے کہ یو۔ این۔ او (U.N.O.) میں فقط دوسروں کے مسائل میں ویٹو کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ اگر بڑے ملک کے خلاف سارے ممالک مل کر فیصلہ کر دیں تو اسے بھی یہ حق ہے کہ وہ سب کے فیصلوں کو ٹھکرا کر اپنے مفادات کا تحفظ کرے۔ گویا اس امر کا بھی امکان ہے کہ جو مدعا علیہ ہو وہی فیصلہ کرے اور مدعی کے سارے حقوق کو ضائع وبرباد کر دے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال انتہائی افسوسناک اور حیرت انگیز ہے لیکن مشکل یہ ہے

کہ مسلمان اس مرحلہ پر بھی آواز بلند کرنے کے قابل نہیں ہے کہ اس نے روزِ اوّل یہی غلطی کی ہے اور اسلام کے سب سے پہلے مقدمہ (فدک) میں مدعا علیہ کو حاکم بنا دیا ہے اور اس کے فیصلہ کی بنا پر بنتِ رسولؐ تک کا حق ضائع کر دیا ہے اور ایسے اندھیرے ماضی کے ہوتے ہوئے مستقبل میں انصاف کی کون سی شمع جلائی جا سکتی ہے۔

۴۔ آج سارا عالم، اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس سے صلح کرنے پر تُلا ہوا ہے اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف آواز بلند کرے تو وہ مفسد، فتنہ پرداز اور اسلامی مفادات کا دشمن ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو اسرائیل کل تک دشمن تھا وہ آج دوست کس طرح ہو گیا۔ جس سے کل ایک ایک انچ زمین خالی کرانے کا مطالبہ ہو رہا تھا اسے ایک پورے ملک کی زمین دینے پر رضامندی کا اظہار کس طرح کر دیا گیا۔ کیا غاصب تھوڑے عرصہ تک غاصب رہنے کے بعد مالک ہو جاتا ہے اور اسے مالکانہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔

آزادیٔ ہند کی تاریخ گواہ ہے کہ انگریز نے ہندوستان میں تقریباً ڈیڑھ سو سال غیر رسمی طور پر اور تقریباً سو سال تک رسمی طور پر حکومت کی اور اسی کے طفیل میں اتنا بڑا اقتدار حاصل کر لیا کہ اس کے ملک میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ہندوستانی قوم کو یہ احساس تھا کہ ہمارے ملک میں غاصب کی حیثیت سے داخل ہوا ہے۔ اسے یہاں حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ زمین ہندوستانی قوم کی ہے۔ اس پر ہندوستانی قوم کو حکومت کرنا چاہیئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی چند باشعور پڑھے لکھے لیڈر پیدا ہو گئے، ساری قوم کا شعور بیدار ہو گیا اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں انگریز کو ملک بدر کر دیا گیا اور اس امر کا اعلان کر دیا گیا کہ غاصب سو سال بھی قابض رہے تو غاصب ہوتا ہے مالک نہیں ہوتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عالم اسلام کے پاس اتنا شعور بھی نہیں ہے جتنا ہندوستان کے مشرکین و کفار کے پاس تھا۔ یہ مشرکین و کفار پتھر اور خدا کا فرق نہیں سمجھتے تھے لیکن غاصب اور مالک کا فرق سمجھتے تھے۔ عالم اسلام کے پاس تو اتنا شعور بھی نہیں ہے۔ وہ اسرائیل جس نے کل مسلمانوں کی سرزمین پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا آج ایک حقیقت بن گیا ہے اور اب مسلمانوں کو سر چھپانے کی جگہ دے رہا ہے اور سارے مسلمان اس بھیک کو پا کر خوش ہو رہے ہیں۔

یہ سب کیا ہے؟ یہ ایک تاریخی غلطی کا ردعمل ہے۔ اگر کل غاصب کو مالک کا درجہ نہ دے دیا گیا ہوتا تو آج یہ نوبت نہ آتی اور اگر کوئی غاصب ظلم کرتا تو کم سے کم یہ احساس تو باقی رہتا کہ یہ غاصب ہے۔ مالک نہیں ہے۔ الحمد للہ کہ مدرسہ اہلبیتؑ میں آج تک یہ شعور باقی ہے اور اس کے شاگرد مستقل طور پر غاصب کو غاصب قرار دے رہے ہیں اور کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

۵۔ دورِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ دفتر و بازار، کھیت اور سڑک پر تو ظلم ہو ہی رہا ہے۔ اس عالمی ادارہ میں بھی ظلم ہو رہا ہے جسے عالمی عدالت کے نام سے قائم کیا گیا ہے اور کسی طرف سے کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہو رہی ہے اور شائد یہ بھی اسی حادثہ کا ردعمل ہے کہ مسلم عدالت میں روزِ اول سے ظلم ہی ہوا ہے انصاف نہیں ہوا ہے ورنہ مسلمان ضرور احتجاج کرتا اور خاموش تماشائی نہ بنا رہتا۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

اصطلاحات علماء

کھلی ہوئی بات ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن کے افہام و تفہیم کا دار و مدار اس کی اصطلاحات پر ہوتا ہے اور اصطلاحات کو پہچانے بغیر کوئی انسان کسی علم کے بارے میں مکمل اطلاع حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ اصطلاح درحقیقت اس تعبیر کا نام ہے جس کے ذریعہ بہت سے مسائل کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور تفصیلات کے بیان سے نجات حاصل ہو جاتی ہے اور چونکہ تمام اہل فن اس نقطہ پر اتفاق اور مصالحت کر لیتے ہیں لہٰذا اس کا نام اصطلاح پڑ جاتا ہے۔

اصطلاح کبھی لغت سے قریب تر ہوتی ہے کہ زبان جاننے والا کسی مقدار میں اس کے مفہوم کا اندازہ کر سکتا ہے جس طرح شریعت کی زبان میں صوم و صلوٰۃ جیسے الفاظ ہیں کہ ان کے اپنے اصطلاحی معانی ہیں لیکن بہرحال ان کا کسی نہ کسی مقدار میں لغت اور زبان سے تعلق ہے اور کبھی کبھی دونوں میں بظاہر کوئی رابطہ نہیں ہوتا ہے اور زبان جاننے والا بہرحال اس کے مفہوم کا اندازہ نہیں کر سکتا ہے جیسے اکثر علوم کی اصطلاحات کا حال ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ کا انتخاب کسی مناسبت ہی سے ہوتا ہے لیکن مناسبت اس قدر مجہول ہوتی ہے کہ اس کا اندازہ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

ذیل میں علم فقہ و رجال و ادب کی بعض اصطلاحات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے تاکہ واقعی علم حاصل کرنے والے افراد ان اصطلاحات سے باخبر رہیں اور زبان دانی کے زور پر اجتہاد کرنے والے اپنی اوقات سے باخبر ہو جائیں اور انھیں یہ احساس ہو جائے کہ دنیا کا کوئی علم استاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ہے اور ہر علم کے اسرار و رموز کو پہچاننے کے لئے اس کے ماہرین کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا بہرحال ضروری ہے۔

حافظ۔ عرف عام میں ہر حفظ کرنے والے کو اور اہل مذہب کے درمیان حافظ قرآن کو کہا جاتا ہے لیکن علم حدیث کی اصطلاح میں اس کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے جسے ایک لاکھ حدیثیں متن اور سند دونوں کے ساتھ یاد ہوں۔

حاکم۔ عرف عام میں حکومت کرنے والے یا قضاوت کرنے والے کو کہا جاتا ہے لیکن علم حدیث کی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا علم تمام احادیث کو محیط ہو اور ہر فرقہ کے احادیث پر مکمل اطلاع رکھتا ہو جیسے حاکم نیشاپوری ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن محمد بن حمدویہ المعروف "ابن البیّع" صاحب کتاب "مستدرک علی الصحیحین" جس میں ان تمام احادیث کا حوالہ دیا گیا ہے جو بخاری اور مسلم کے شرائط کی بنا پر صحیح ہیں لیکن ان کا تذکرہ ان دونوں حضرات نے نہیں کیا ہے۔

حاکم نیشاپوری کا بیان ہے کہ میں نے آب زمزم پی کر یہ دعا کی تھی کہ خدایا! مجھے فن تصنیف کا سلیقہ عنایت فرما جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اسقدر تصانیف کا مالک ہو گیا ہوں۔ ۳۲۱ھ میں ولادت ہے اور ۴۰۵ھ میں وفات۔ ذہبی نے انھیں رافضی خبیث کے لفظ سے یاد کیا ہے کہ ان کا اعلان تھا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" بخاری اور مسلم کے شرائط کی بنا پر صحیح ہے لیکن ان دونوں افراد نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہی حال حدیث طیر کا بھی ہے۔ (سفینۃ البحار)

حلبی۔ حلب شام کا ایک شہر ہے جہاں کے لوگ اپنی علمی استعداد اور فطری ذہانت میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ ابن کثیر کے بیان کے مطابق جب صلاح الدین ایوبی نے مصر پر قبضہ کرنے کے بعد حلب کا رخ کیا تو وہاں کے حاکم نے عوام سے جنگ میں حصہ لینے کا مطالبہ کیا۔ شیعوں نے یہ شرط رکھی کہ اذان میں "حیّ علیٰ خیر العمل" کو شامل کیا جائے۔ مسجد اعظم ان کے حوالے کر دی جائے۔ جنازہ کے آگے ائمہ طاہرینؑ کے نام پڑھے جائیں اور شرعی معاملات ابو المکارم حمزہ بن زہرہ الحسینی کے حوالے کر دئے جائیں۔ جس کی بنا پر وہاں تشیع کا چرچا ہو گیا۔

علمار حدیث کے نزدیک حلبی آل ابی شعبہ کی ایک پوری جماعت کو کہا

جاتا ہے جن میں محمد اور عبیداللہ فرزندان علی بن ابی شعبہ شامل ہیں۔
فقہاء کی اصطلاح میں حلبی تقی الدین حلبی کو کہا جاتا ہے اور حلبیان ابوالصلاح اور ابن زہرہ کو کہا جاتا ہے اور حلبیون ان دونوں حضرات کیساتھ ابن البراج کو شامل کر کے اطلاق کیا جاتا ہے۔

حلّی۔ حلّہ عراق کا ایک شہر ہے جو کبھی مرکز علم و فقاہت رہ چکا ہے۔ علامہ حلی کی شہرت ساری کائنات میں ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں حلی جناب ابن ادریس کو کہا جاتا ہے اور حلیان ابن ادریس اور محقق ابوالقاسم صاحب شرائع الاسلام کا لقب ہے اور حلّیون میں ان دونوں کے ساتھ ابن سعید الحلی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

عربی۔ ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو عرب ہو چاہے دیہاتی ہو۔ لیکن اعرابی صرف دیہاتی کو کہا جاتا ہے چاہے عرب نہ ہو۔ یہی حال عجمی اور اعجمی کا ہے کہ عجمی ارض عجم سے تعلق رکھنے والا ہے چاہے فصیح البیان ہو اور اعجمی جس کا لہجہ واضح نہ ہو چاہے عرب ہو۔!

علمی نوادر

اس مقام پر ان علمی نوادرات کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کے بارے میں لوگوں میں بیشمار غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض فقرات حدیث میں داخل نہیں ہیں اور لوگ انھیں حدیث تصور کرتے ہیں اور بعض احادیث ہیں جنھیں مقولہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مختلف شخصیات یا واقعات ہیں جن کے بارے میں طرح طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں اور ان کی صحیح صورت حال کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب تحقیقات راقم الحروف کے نہیں ہیں بلکہ مختلف علماء اعلام کی تحریروں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ بیسویں صدی کے عظیم ترین محقق آیۃ اللہ مرعشی طاب ثراہ جن کی تصنیفات عام طور سے ایسے علوم اور معلومات کا مدرک ہوتی ہیں اور مقدمہ احقاق الحق خصوصیت کے ساتھ ایسے حقائق و معارف کا مخزن ہے۔

• کرشی و عیبتی (میرا مخزن و مرکز) یہ لفظ صرف انصار کے بارے میں وارد ہوا ہے۔
(بخاری و مسلم)

• امام حسنؑ نے اپنے خطبہ کے دوران فرمایا تھا کہ رسول اکرمؐ نے ساتؐ مواقع پر ابوسفیان کو ملعون قرار دیا ہے۔ روز دعوت ثقیف۔ یوم العیر بدر۔ یوم احد۔ یوم احزاب۔ یوم حدیبیہ۔ یوم الجمل الاحمر۔ یوم عقبہ۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۲/۱۰۲ طبع مصر)

• امیرالمومنینؑ برابر چار افراد پر لعنت کیا کرتے تھے اللّٰھم العن معاویۃ اولاً وعمرواً ثانیاً وابا الاعور السلمی ثالثاً وابا موسیٰ الاشعری رابعاً۔ (شرح النہج حدیدی ۲/۲۸۸ طبع مصر)

• مصباح الشریعہ جیسی کتابیں اور "لنا مع اللہ حالات" جیسی حدیثیں مستند نہیں ہیں۔ (مقدمہ احقاق الحق ۱/۱۸۴)

• انشاء اللہ دو طرح لکھا جاتا ہے۔ کام مشکوک ہوتا ہے تو "ان شاء اللہ" اور صرف تبرّکاً کہنا ہوتا ہے تو "انشاء اللہ"۔ (مقدمہ احقاق الحق ۱/۲۴۲)

• حسنات الابرار سیئات المقربین کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ ابوسعید خزاز صوفی متوفی ۲۸۰ھ کا مقولہ ہے۔ (مقدمہ احقاق الحق ۱/۳۳۵)

• دعائے صنمی قریش بحار کے باب القنوت میں موجود ہے اور علماء نے اس کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔

• بلکفہ ایک گروہ ہے جو خدا کے بلا کیفیت رویت کا قائل ہے۔

• زردشت ایک مرد فارس تھا جس نے دعوائے نبوّت کیا تھا۔ یہ نہ نبی تھا اور نہ اس کی کتاب آسمانی ہے لہٰذا مجوسیوں کو اہل کتاب میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

• مجوسیوں کے پاس حسب ذیل کتابیں پائی جاتی ہیں:

اوستا۔ زند۔ پاژند۔ جاماسپ نامہ وغیرہ۔

• صاحب دبستان المذاہب کوئی مرد معتبر نہیں ہے۔ بظاہر کوئی غیر مسلم ہے جس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔

• "لولاک لما خلقت الافلاک" حدیث قدسی کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم یعنی نقل بالمعنی ہے (اللؤلؤ المرصوع)۔ مقدمہ احقاق الحق ۱/۴۳۰

• "کنت کنزاً مخفیاً" بھی حدیث قدسی کے الفاظ نہیں ہیں۔ (مزیل الخفاء۔ تمییز الطیب۔ لآلی موضوعہ)

• لفظ لاجرم میں جرم بمعنی شک بھی استعمال ہوتا ہے اور بمعنی بُد و مُحالہ بھی۔ اس لفظ کو حقاً کے معنی میں بطور قسم بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ (مجمع البحرین طریحی)

• ملاحدہ الموت کو ملاحدہ۔ باطنیہ۔ اباحیہ۔ دعوتیہ۔ اسماعیلیہ۔ زنادقہ۔ صباحیہ وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا قائد حسن صباح تھا جس نے الموت کے قلعہ پر قبضہ کرکے علاقہ میں گمراہی کو رواج دیا تھا متوفی ۵۱۸ھ۔ الموت قزوین اور دیلم کے درمیان پایا جاتا ہے۔

• تجرید الاعتقاد کی شرح قدیم تسدید القواعد مؤلفہ شمس الدین محمود بن عبدالرحمان اصفہانی متوفی ۷۴۶ھ کو کہا جاتا ہے اور شرح جدید شرح قوشجی کو کہا جاتا ہے۔

• جناب بہلول کا اصلی نام وہب بن محمود الکوفی تھا اور آپ امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کے اصحاب میں شمار ہوتے تھے۔

• "عند الامتحان یکرم الرجل أو یھان" مقولہ نہیں بلکہ امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے۔ (الغرر والدرر آمدی لفظ عند)

• غول بیابانی کوئی وہمی شے نہیں ہے۔ ایک برفی مخلوق ہے جس کا وجود پہاڑوں پر پایا جاتا ہے۔ (مقدمہ احقاق الحق ۲/۱۲۵)

• سلاطین دنیا میں مصر کے ہر بادشاہ کا لقب فرعون۔ عجم کے بادشاہ کا لقب کسریٰ۔ روم کے بادشاہ کا لقب قیصر۔ تُرک کے بادشاہ کا لقب خاقان اور حبشہ کے بادشاہ کا لقب نجاشی تھا۔

• فاضل تفتازانی کی تحقیق ہے کہ حسب ذیل دس الفاظ متضاد معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جَون (سیاہ و سفید)۔ صریم (صبح و شام)۔ سدفہ (نور و ظلمت)۔ ظن (شک و یقین)۔ شف (قلیل و کثیر)۔ بین (وصل و فصل)۔ قرء (حیض و طہارت)۔ ہاجد (خوابیدہ و بیدار)۔ جلل (صغیر و کبیر)۔ رہوہ (بلندی و پستی)۔

• لفظ جبریل کے حسب ذیل تلفظ ہیں: جبرعیل۔ جبرقیل۔ جبرعل۔ جبراعل۔ جبرعال۔ طوبال۔ جبریل۔ جبرئیل۔ جبرییل۔ جبرین۔ جبار۔ (مقدمہ احقاق الحق ۲/۲۰۴)

• ابن کثیر۔ تاریخ و تفسیر میں ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر دمشقی متوفی ۷۷۴ھ کو کہا جاتا ہے اور علم تجوید میں عبداللہ بن کثیر قاری متوفی ۱۲۰ھ کو اور علم نجوم و فلکیات میں محمد بن کثیر فرغانی متوفی قرن سیوم کو کہا جاتا ہے۔

• ابوالفداء کا اطلاق ابن کثیر پر نہیں بلکہ اسماعیل بن علی بن محمود الایوبی پر ہوتا ہے جو آٹھویں صدی کا مورخ ہے۔

• خلیفہ دوم عمر بن الخطاب کی زوجہ ام کلثوم حضرت ابو بکر کی بیٹی تھیں جو اسماء بنت عمیس کے بطن سے تھیں اور محمد بن ابی بکر کی بہن تھیں۔ اسماء کے ساتھ امیر المومنینؑ کے گھر میں آگئی تھیں لہٰذا آپ کی پروردہ شمار کیجاتی تھیں۔ ان کا ایک فرزند زید بن عمر بتایا جاتا ہے۔

• رومی مہینوں میں دن پہلے ہوتا ہے اور رات بعد میں اور عربی مہینوں میں رات پہلے ہوتی ہے اور دن بعد میں۔ اس لئے کہ عربی مہینے رویت ہلال سے شروع ہوتے ہیں۔
(انساب بلاذری)

• حلف الفضول وہ معاہدہ ہے جس میں چند افراد نے اپنے مال سے رد مظالم کا عہد کیا تھا اور مظلومین پر رحم و کرم اور فضل و احسان کا معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدہ سے پہلے اسی نام کا ایک معاہدہ جرہم نے کیا تھا جس کے شرکا سب فضل کے مشتقات تھے۔ فضیل۔ فضال۔ مفضل۔ فضل۔ اس معاہدہ میں سرکار دو عالمؐ نے بھی شرکت فرمائی تھی کہ یہ اسلام کی تبلیغ کے لئے زمین ہموار کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔ (انساب الاشراف بلاذری)

• امام حسینؑ نے جناب زینب سے وصیت فرمائی تھی "یا اختی لاتنسینی فی نافلة اللیل"۔ "بہن مجھے نماز شب میں فراموش نہ کرنا"۔ (سعادة الدارین ص ۴۸۰)

تصحیح معلومات

علمی دنیا میں صرف معلومات کا فراہم کر لینا کوئی ہنر نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ اہمیت معلومات کی صحت کی ہے ورنہ غلط معلومات کا خزانہ بھی انسان کو عالم اور دانشور نہیں بنا سکتا ہے۔ دنیا کے دیگر مسائل کی طرح علمی دنیا میں بھی بیشمار غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کوئی غلط بات نقل کر دیتا ہے تو بعد میں آنے والے اس کی تحقیق کی زحمت بھی نہیں کرتے ہیں بلکہ شخصیت پر اعتماد کر کے اسی طرح نقل کر دیتے ہیں اور غلطی نسلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ وہ کوئی ایسا ہی صاحب نظر پیدا ہوتا ہے جسے ان حقائق کی صحت کی فکر ہوتی ہے اور وہ بیشمار کتب و صحف کا مطالعہ کر کے حقائق کو ڈھونڈھ نکالتا ہے اور غلطیوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔ ہماری اس بیسویں صدی میں ایک ایسی عظیم ہستی آیۃ اللہ سید شہاب الدین مرعشی طاب ثراہ کی تھی جن کے کتب خانہ میں تقریبًا دو لاکھ کتابیں تھیں اور سب ان کے مطالعہ سے گذر چکی تھیں لہٰذا وسعت معلومات میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا اور ایسے حقائق کو ڈھونڈھ نکالنے میں بیمثل و بینظیر شخصیت کے مالک تھے۔ ذیل میں ان کے تحقیقات کا ایک خلاصہ درج کیا جا رہا ہے جسے شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری طاب ثراہ کی کتاب احقاق الحق کی شرح میں مختلف مقامات پر درج فرمایا ہے:

۱۔ ابو حمزہ ثمالی۔ آپ کا اسم گرامی ثابت بن دینار تھا۔ امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں تھے اور کوفہ کے عظیم زاہدوں میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کا قبیلہ ثُمالہ کہا جاتا تھا جس کے معنی بقیہ کے ہیں کہ کسی جنگ میں تمام افراد کام آگئے تھے اور صرف مورث اعلیٰ بچے تھے جنھیں ثُمالہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ لفظ ثُمالہ ہے ثمالہ نہیں ہے۔

۲۔ فضل بن روز بہان۔ اہلسنت کی مشہور شخصیت ہے جس نے اپنی دانست میں علامہ حلیؒ کے تمام بیانات کا جواب فراہم کر دیا ہے۔ اس میں بہان کی بؔ پر زیر ہے زبر نہیں ہے۔

۳۔ روز بہان قاسانی۔ اس لقب کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ ایران کے کاشان کی عربی ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ماوراء النہر کے ایک قریہ کا نام ہے۔

۴۔ اعرابی اور عربی۔ ان دونوں کا فرق یہ ہے کہ اعرابی دیہاتی کو کہتے ہیں چاہے عربستان کے باہر کا ہو اور عربی عربستان کے رہنے والے کو کہتے ہیں چاہے دیہات ہی کا ہو۔

۵۔ اعجمی اور عجمی۔ کا فرق بھی یہی ہے اعجمی غیر فصیح زبان والے کو کہتے ہیں اور عجمی ملک عجم کے رہنے والے کا لقب ہے۔

۶۔ اِربلی۔ صاحب کشف الغمہ علی بن عیسیٰ کا لقب ہے۔ اس لفظ میں الفؔ اور بؔ دونوں پر زیر ہے۔ زبر نہیں ہے۔

۷۔ مُحال۔ یہ لفظ تین طریقہ سے استعمال ہوتا ہے۔ میم پر پیش ہو تو ناممکن کے معنی میں ہے۔ زبر ہو تو اس لکڑی کو کہتے ہیں جس پر چرخی لگا کر کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے اور زیر ہو تو طاقت کے معنی میں ہے۔

۸۔ ارباب لغت۔ یہ لقب اہل زبان کا ہے۔ اسے علم لغت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۹۔ نِظام۔ شرح شافیہ کے مصنف کا نام نِظام الدین ہے۔ یہ لفظ نُظّام نہیں ہے۔

(مقدمہ احقاق الحق ۱/۱۴۰)

۱۰۔ عَمر۔ یہ لفظ حیات اور دین کے معنی میں ہے جس کی جمع اعمار ہے لَعَمری میں عمر دین کے معنی میں ہے جیسے لَعَمر اللہ۔

۱۱۔ یافعی۔ یافع یمن کا ایک قبیلہ ہے۔ یہ کوئی قریہ اور گاؤں نہیں ہے۔

(مقدمہ احقاق الحق ۱/۲۰۱)

۱۲۔ ضیق الخِناق۔ خناق کے خؔ پر زیر ہے۔ یہ اس رسّی کو کہا جاتا ہے جس سے گردن باندھی جاتی ہے۔

۱۳۔ نُظّام۔ مذہب معتزلہ کی عظیم ترین شخصیت ابو اسحاق ابراہیم بن سیار بن ہانی بصری۔

۱۴۔ زرتشت۔ اسے زردشت اور زرادشت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سب ایک ہی شخص کے نام ہیں۔

۱۵۔ تُرّہات۔ اس میں تؔ پر پیش اور رؔ پر زبر اور تشدید ہے۔

۱۶۔ حذافیر۔ یہ حذفور کی جمع ہے۔ اس کا واحد حذفار بھی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ کے معنی ہیں "جمع کثیر"۔

۱۷۔ یوم البعاث۔ یہ اوس و خزرج کی جنگ کا دن ہے۔ اس میں عؔ ہے غؔ نہیں ہے۔ (سیرۃ حلبیہ)

۱۸۔ یزدجرد۔ یہ ایران کا بادشاہ تھا۔ اس کے نام میں دؔ پر زبر ہے اور جؔ پر زیر۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ